قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 23 ❖ شمارہ 02 ❖ دسمبر 2012ء

ماہنامہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	راؤ محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فراز علی نازش	0300-4214400

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: 63-C فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

بچپن سے دیکھتے سنتے آئے ہیں کہ دیمک بنیاد کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہمارے اطراف میں بھی دیمکوں کی یلغار ہے۔ برسوں پہلے ہمارے ہاں ایک "فلم انڈسٹری" ہوتی تھی جو حکومت کو تین سو فیصد ٹیکس ادا کرتی تھی یعنی خام فلم سے فلم بین تک پچاس پچاس فیصد تک ٹیکس ادا کرتے تھے مگر اسے ایسا تباہ کیا گیا کہ بین الاقوامی نمائش تو دور رہی ملکی نمائش بھی ممکن نہ رہی فلموں کے بعد ٹی وی نے وہ مقام حاصل کیا، ایسے ایسے فن پارے پیش کرنا شروع کیے کہ پاکستان تو پاکستان بھارت کے سرحدی شہر کی سڑکیں بھی پرائم ٹائم پروگرام کے وقت ویران ہونے لگی تھیں۔ اس کا توڑ کیبلز سسٹم نے کیا۔ ہر نئی چیز میں دلچسپی زیادہ ہوتی ہے لوگوں نے بھی دلچسپی لینا شروع کر دی مگر یہ وقفہ بھی طویل ثابت نہیں ہوا اور جلد ہی اسٹار پلس کا سحر ٹوٹ گیا اور یہ سحر توڑا خود نجی چینلز کے فن کاروں نے۔ ایسے معیاری اور اعلیٰ قسم کے ڈرامے پیش کرنا شروع کیے کہ لوگوں نے بے حیائی، گھریلو سازشوں کی ترغیب دینے والے انڈین ڈراموں سے منہ موڑ لیا۔ اب اس کا توڑ یہ تلاش کیا گیا کہ انڈین ڈراموں کو انتہائی ارزاں قیمت میں نجی چینلز کو فراہم کرنا شروع کر دیا گیا، تاجر اپنا فائدہ دیکھتا ہے، نجی چینلز کمانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ انہوں نے فوراً خریداری شروع کر دی۔ غیر ملکی ڈراموں نے ملکی ڈراما سازی پر گہرا وار کیا۔ ابھی وہ لوگ اس درد کو سہہ بھی نہ پائے ہیں کہ چینلز آپریٹرز کی جانب سے تمام تفریحی ملکی چینلز کی نمائش بند کر دی گئی۔ یہ کیسی سازش ہے کہ اپنی ہی صنعتوں کو خود ہی تباہ کرو۔ یہ کون لوگ ہیں جو ہر سطح پر ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کا جواب ڈھونڈیں کیونکہ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔ ملک و قوم کی ترقی ہے ورنہ بقول واصف علی واصفؒ:

بڑی محرومیاں لکھی گئیں اس کے مقدر میں
وہ راہی جو درختوں سے چرا کر لے گیا سایہ

معراج رسول

علامہ

سرگزشت

یکم جنوری 1904ء پٹنہ کے محلہ مغلپورہ میں اس نے جنم لیا۔ اس کے دادا یوپی کے شہر غازی پور سے اس شہر میں منتقل ہوئے تھے۔ دادا ریاض الحسن اپنے دور کے جیّد عالمِ دین اور محقق تھے۔ علم پروری انہوں نے وراثت پائی تھی۔ اسی لیے انہوں نے اپنے بیٹے مولوی خورشید حسن کو بھی پرورشِ قلم سے وابستہ کیا اور اسے شعبۂ تعلیم سے منسلک کرا دیا۔ خورشید حسن کی شادی عظیم آباد جو اَب پٹنہ کہلانے لگا تھا اس شہر کے ایک معتبر گھرانے میں کرائی۔ شادی کے صرف دو سال بعد خورشید حسن ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ خورشید حسن نے بیٹے کا نام جمیل رکھا۔ جمیل کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی پھر اسے قریبی مکتب میں اور بعد ازاں مدرسہ سلیمانیہ جو اس وقت پٹنہ کی ایک اہم درسگاہ مانی جاتی تھی جہاں دینی اور دنیاوی دونوں تعلیم دی جاتی تھی، وہاں بھیج دیا۔ جب 1915ء میں خورشید حسن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول، موتیاری ہوا تو انہوں نے بیوی بچوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ موتیاری شہر بہت چھوٹا تھا مگر اسکول میں دور دور سے مسلمانوں کے بچے تعلیم کے لیے آتے تھے۔ ضلع بھر کا یہ سب سے بڑا اسکول مانا جاتا تھا۔ انہوں نے اسی اسکول کی چھٹی جماعت میں جمیل کو داخل کرا لیا۔ مگر یہاں وہ زیادہ دن ٹک نہ سکے اور ان کا تبادلہ مظفر پور کر دیا گیا۔ وہ بیوی بچوں کے ساتھ مظفر پور آگئے۔ جمیل کو یہاں کے اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وہ دیگر مضامین میں تو بھرپور دلچسپی لیتا مگر حساب سے دور بھاگتا۔ دراصل اسے ریاضی سے چڑ تھی مگر مضمون نویسی میں ملکہ حاصل تھا۔ اس کی یہ خوبی اساتذہ کی نظروں میں اسے ممتاز بناتی چلی گئی۔ اسی دوران بہتر تعلیمی وسائل کی خاطر وہ مظفر پور سے اپنے ماموں زاد زاہد علی خان کے پاس کلکتہ چلے گئے۔ 1920ء میں کلکتہ آتے ہی مدرسہ عالیہ میں داخل ہو گئے، زاہد علی خان بھی اسی مدرسے میں معلم تھے۔ انہیں کلاس نائین میں داخلہ ملا تھا۔ 1922ء میں اسی مدرسے سے میٹرک کا امتحان دیا پھر 1925ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ 1928ء میں بی اے اور 1931ء میں ایم اے (فارسی) کی سند کلکتہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور روزنامہ "الہند" سے منسلک ہو گئے جو مشرقی ہند کا سب سے بڑا اردو اخبار مانا جاتا تھا۔ پھر روزنامہ عصرِ جدید سے وابستہ ہو گئے۔ مگر یہ وابستگی جزوقتی تھی۔ بیک وقت کئی نام سے کالم لکھتے رہے، جن میں مشہور قلمی نام "کوچہ گرد"، "علامہ جلاد القلم"، "اشتر صحرائی" اور "جم" ہیں۔ 1935ء میں جب خلافت کمیٹی نے مسلم کانفرنس کے بینر تلے اردو ادبی کانفرنس کا اہتمام کیا تو اس کی مجلسِ استقبالیہ کا صدر انہیں ہی نامزد کیا گیا۔ انہی کی کوشش سے مولانا ابوالکلام آزاد نے کانفرنس میں شرکت کی ہامی بھری تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کی علمی بصیرت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انہوں نے حکومت سے سفارش کی کہ جمیل کو صوبہ بہار کے شعبۂ اطلاعاتِ عامہ کا پبلسٹی آفیسر متعین کیا جائے اور انہیں اس عہدہ پر بحال کر دیا گیا۔ 2 دسمبر 1937ء کو انہوں نے یہ عہدہ سنبھالا مگر 1942ء میں جب انگریز و ہند چھوڑو تحریک چلی تو عدم تعاون تحریک کے تحت وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ حکومتِ برطانیہ نے انہیں گرفتار کر لیا۔ تقریباً ایک ماہ قید رہے۔ رہائی پاتے ہی واپس کلکتہ پہنچ گئے۔ مگر کلکتہ جنگِ عظیم دوم کی وجہ سے جاپانی بمباری کی زد میں تھا اس لیے شہر میں افراتفری کا سماں تھا۔ نوکری کی کوئی امید نہ تھی۔ مجبوراً اس شہر کو بھی خیرباد کہا اور جوش ملیح آبادی کے پاس بمبئی چلے گئے۔ جوش کے کہنے پر انہوں نے پریونٹی پروڈکشنز کے مالک آر کے شرما کے پاس نوکری کر لی۔ فلموں کے لیے گانے، مکالمے اور کہانیاں لکھتے رہے۔ جب کلکتہ پر سے جنگ کے بادل چھٹے تو وہ آر کے شرما کے ساتھ کلکتہ آگئے کیونکہ اس وقت کلکتہ کی فلم انڈسٹری بمبئی سے زیادہ بڑی تھی۔ تقریباً پانچ سال فلمی دنیا میں گزارنے کے بعد دوبارہ سے فروری 1947ء میں سرکاری نوکری میں آگئے۔ اس بار وہ صوبہ بہار میں شعبۂ نشر و اشاعت کے ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر ہوئے تھے۔ شاعرانہ مزاج تھا اس لیے زیادہ دن دفتر میں گزار نہ سکے اور پھر استعفیٰ دے دیا اور بطور پروفیسر شعبۂ اردو پٹنہ کالج سے منسلک ہو گئے۔ 1960ء میں اس ملازمت سے بھی سبکدوش ہو گئے۔ مگر یونیورسٹی ان کو چھوڑنے پر راضی نہ تھی اور ریسرچ فیلوشپ دے کر انہیں روک لیا۔ چنانچہ اب وہ "اردو مراثی اور ان کے تہذیبی اثرات" کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے لگے۔ ماہنامہ سہیل نے ان کے نام پر دو خصوصی نمبر نکالے۔ پہلا جولائی 1960ء اور دوسرا اکتوبر 1960ء میں۔ پہلے حصے میں ان کے مضامین اور ان کے فکر و فن کا جائزہ تھا۔ دوسرے حصے میں ان کے خدوخال اور سیرت و شخصیت کی تصویر کشی تھی۔ جوش نے "حسین اور انقلاب" نامی سیاسی رنگ میں مرثیہ 1941ء میں کہا جبکہ انہوں نے 1936ء میں "پیمانِ وفا" کہا تھا جو کافی مقبول ہوا تھا۔ اردو ادب میں خصوصاً مشرقی ہند کے اردو ادب میں اب تک ان کا طوطی بولتا ہے۔ انہیں لوگ علامہ جمیل مظہری کے نام سے پہچانتے ہیں۔ مگر یہ مولوی، مولانا نہیں ہیں، ادب کے علامہ ہیں۔ اردو ادب میں صرف دو افراد اس لقب سے پہچانے گئے ایک علامہ نیاز فتح پوری، دوسرے علامہ جمیل مظہری۔

☆☆☆

شہرِ خیال

☆ انجم فاروق ساحلی کا خلوص نامہ لاہور سے ”سب سے پہلے علی سفیان آفاقی صاحب سے ملاقات کی، انہوں نے فلمی الف لیلہ میں اخلاقی اظہار کا اچھا جائزہ قلمبند کیا۔ تاریخی ورثے کی حفاظت تو ضرور حکومتی سطح پر ہونی چاہیے لیکن اندرونِ لاہور میں ناجائز تجاوزات کی بھرمار ہے لوگ صفائی کا خیال بھی نہیں رکھتے، کچھ ذمے داریاں افراد کی بھی ہوتی ہیں۔ لاہور کے جن پارکوں میں حکومت کی طرف سے کچرے دان لگائے گئے ہیں وہاں بھی لوگ گندگی پھیلا دیتے ہیں۔ اب آتے ہیں تازہ شمارے کی طرف۔ جیسے ردی کے اوپر شدگی اس طرح اجالے کے اوپر پیش لگ جاتی تو اچھا تھا۔ اقتباسات اس مرتبہ کافی اچھے تھے مدیرِ سرگزشت نے کافی محنت سے انتخاب کیا۔ صفحہ نمبر 245 کا اقتباس دلچسپ تھا۔ رضیہ بٹ، بلاشبہ نامور مصنفہ تھیں جو ہم سے جدا ہو گئیں۔ حکیم وقت، اور معذور مسیحا، دونوں شخصیت نامے خوبصورت تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم قدآور اور معروف شخصیت تھے اور پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ تو شہرۂ آفاق ہیں۔ صفحہ نمبر 42 پر وحدت الوجود کے مسئلے کا اثباتی تذکرہ موجود ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے طالب علمی کے زمانے کے واقعات دلچسپی سے بھرپور تھے ذہین افراد اساتذہ کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ مشہور فلم رائٹر شبیر نیاز بھی انہی میں شامل تھے۔ میرے والد سعید ساحلی اسلامیہ کالج سول لائنز میں بشیر نیاز کے ساتھ کلاس میں موجود تھے۔ پروفیسر اختر الدین کلاس لے رہے تھے۔ انہوں نے انگریزی شاعری سے عیش ونشاط کی محفلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ”ان کا نشہ تمام عمر انسان پر طاری رہتا ہے“ بشیر نیاز نے اس کے جواب میں اٹھتے ہوئے کہا۔ ”شاعر نے جن محفلوں کا ذکر کیا ہے وہ وقتی طور پر طرب انگیز ہوتی ہیں لیکن انجام کار ان میں تلخی کا ذائقہ شامل ہو جاتا ہے اور اداسی ایک مرض بن جاتی ہے۔“ ”لوربوائے“ میں سندربن کا ماحول اچھا بیان کیا گیا ہے لیکن بار بار کہانی کے راستے میں حائل تھا۔ کہانی بہرحال واقعے کو ہی کہا جاتا ہے۔ معلومات اس کے تابع ہونی چاہیے۔ اصل واقعہ کم اور سپاٹ تھا۔ ناقابلِ یقین، ناقابلِ یقین ہی معلوم ہوئی۔ جادوگر، زیرِ مطالعہ ہے۔ سراب کی قسط مخصوص انداز میں اچھی ہیں۔ شہرِ خیال خطوط کی محفل بھرپور اور جاندار تھی۔ بشریٰ افضل صاحبہ، رانا حبیب الرحمٰن صاحب، رانا محمد سجاد، ایم اے خالق بھٹی تمام احباب کا بے حد شکر گزار ہوں انہوں نے تنقید فرمائی۔ بشریٰ افضل سو کے قریب میری کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ اب گرنے کا کیا غم بہرحال حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ ناصر حسین رند، ملک جاوید سرکانی درانی کے تبصرے علم کی کارفرمائی سے بھرپور تھے۔ ناصر حسین صاحب آپ نے گل گامش کی داستان کی طرف توجہ دلائی وہ قدیم ادبی شاہکار ہے لیکن اس میں طوفانِ نوح جیسا واقعہ ملتا جلتا موجود ہے۔ اس کے علاوہ گدھ کی کہانی جس میں اتانا بادشاہ گدھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر آسمان پر شجرِ تولید لانے کے لیے گیا تھا کیونکہ وہ بے اولاد تھا۔ (بیسویں صدی قبل از مسیح) موجود ہے۔ گل گامش کی داستانِ رزم والم کا شمار دنیا کے قدیم ترین نوشتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں گل گامش کی مافوق فطرت لمحوں اور حیات جاوداں کی ناکام جستجو کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ گل گامش اٹھائیسویں صدی قبل از مسیح میں مغربی عراق کی شہری ریاست ارک کا فرماں رواں تھا۔ گل گامش کی داستان کی لوحیں سب سے پہلے ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ آسٹن لیئرڈ کو 1841ء میں نینوا کی کھدائی میں ملی تھیں لیکن یہ لوحیں مدتوں تک لندن میوزیم کی الماریوں میں بند پڑی رہیں کیونکہ اس وقت تک کسی دانشور نے عکادی زبان سے واقفیت حاصل نہیں کی تھی۔ یہ خدمت ایک دوسرے نوجوان جارج اسمتھ نے سرانجام دی۔ بابل کے فرماں رواں حمورابی کا ضابطہ قوانین جو دوسو پچاس شقوں پر مشتمل ہے جامع اور بھرپور ضابطہ قانون ہے۔ اس کے علاوہ عراق، مصر اور کنعان (لبنان) کے قدیم باشندوں کے عقائد کا جائزہ سید سبط حسن، علامہ نیاز فتح پوری، سید علی عباس جلال پوری کے حوالے سے لیا جا سکتا ہے لیکن اس سے موجودہ مذہبی ڈھانچہ متاثر ہو جائے گا۔ اس لیے اس سے گریز کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر ساجد امجد علامہ نیاز فتح پوری یا سید سبط حسن کی سوانح حیات پر ہاتھ نہیں ڈالتے کہ وہ ترقی پسند، سوشلسٹ نظریات کے ترجمان تھے۔ بہرحال علامہ نیاز فتح پوری، سید سبط حسن اور علی عباس جلال پوری علمی طور پر بھرپور اور جاندار عالم تھے۔ سرگزشت میں ترقی پسندانہ نظریات کا ابلاغ نہیں ہوتا۔ دوسرا اہم خط ملک محمد جاوید سرکانی کا ہے۔ ریسٹر میللن اور آئین فلمنگ دونوں ہی شہرۂ آفاق ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ صاحبِ کردار ادیب کو شہرت اور مقبولیت زیادہ ملتی ہے۔ ایشیا میں ابنِ صفی کو

عمران کے منفرد کردار کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی، اگر جے کے رولنگ ہیری پوٹر کا کردار تخلیق نہ کرتی تو انگلستان اس کے لیے کیا کر سکتا تھا یا امریکن فلم کمپنیاں اسے کیسے خوش آمدید کہہ سکتی تھیں۔ ”گنز آف نیوران“ بہت بڑی فلم ہے اس میں شبہ نہیں۔ لیکن ڈاکٹر نو، گولڈ فنگر اور اسپائی ہیولوڈ می بھی شہرۂ آفاق فلمیں ہیں۔ اسٹیون اسپیلبرگ اور جیمز کیمرون آج کے کتنے ہی بڑے نام ہیں لیکن وہ بھی ”ریڈرز آف دی لوسٹ آرک“ اور ”ٹرولائز“ میں اس کو نہیں چھو سکے۔ مدیرِ سرگزشت کا دم غنیمت ہے کہ علمی تحقیقی جریدے میں آتے رہتے ہیں۔ ردی والا، لغزش اور بھوت آپ بیتیاں اچھی تھیں۔“

☆ عبداللہ بدلی شریف رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ”بندہ سرگزشت کا مستقل قاری ہے۔ سرگزشت کا حرف حرف دل کی آنکھوں سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میں اس وقت سراب پر تبصرہ کروں گا جس کی وجہ سے ہم جیسے مایوس دلوں کا جذبہ حب الوطنی بڑھتا جا رہا ہے، خصوصاً نومبر کے شمارے میں جب شہباز، سفیر کی ٹھنڈی سانس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ اس ملک کو میں نے تم نے نہیں بنایا اور نہ ہی میں یا تم چلا رہے ہیں بلکہ اللہ نے بنایا ہے اور اللہ ہی اسے چلا رہے ہیں، اسے پڑھ کر بے اختیار کاشف زبیر کے لئے ڈھیروں دعائیں نکلیں اور آپ کے لئے بھی۔“

☆ شاہد احمد خان کراچی سے لکھتے ہیں ”سرگزشت میں شائع ہونے والے مضامین کے حوالے سے عرض ہے کہ اس رسالے کے اکثر قارئین ان مضامین کو حوالہ کی حیثیت دیتے ہیں لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخی وواقعاتی مضامین میں مواد کی شمولیت خوب پرکھ کر کی جائے کیونکہ اکثر قارئین رسالے میں شائع ہونے والی معلومات کو انٹرنیٹ پر چیک کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بطور حوالہ ماہ ستمبر 2012ء کے شمارے میں شائع ہونے والے علی سفیان آفاقی صاحب کے مضمون کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ مضمون مذکورہ میں مشہور پنجابی گانے ”واسطہ ای رب داتوں جائیں وے کبوترا“ کے سلسلے میں صفحہ 115 پر درج ہے کہ فلم میں کبوتر نظر تک نہیں آتا جبکہ انٹرنیٹ پر موجود مندرجہ بالا گانے کی ویڈیو ہی کبوتر سے شروع ہوتی ہے اور گانے کے دوران بھی پیام بر کبوتر اڑان بھرتا نظر آتا ہے۔ یہ تذکرہ بطور تنقید نہیں بلکہ تجویز کے طور پر کیا گیا ہے۔ رسالہ اپنے ہم عصر رسائل میں اہم مقام رکھتا ہے اور ذرا سی بھی لاپرواہی معیار کو متاثر کر سکتی ہے۔ والسلام۔“

☆ ایس ظفر احمد کراچی سے رقمطراز ہیں ”کئی سال سے سرگزشت زیرِ مطالعہ ہے۔ بہت ہی مختصر الفاظ میں یہ عرض ہے کہ عشق ناکام نمبر کے لیے بھی ایک مضمون سوزِ عشق تحریر کیا تھا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے مگر وقت پر نہ بھیج سکا۔ پڑھیے اور پسند آ جائے تو شامل کر لیجیے۔ عشق ناکام نمبر میں، عشق مجازی سے عشق حقیقی، کا جواب نہیں۔ یہ سب پر بھاری تھا۔ ایک شمارہ آپ جنات، ان کی صفت، بھوت پریت اور چھل پیری، ہماری زندگی میں ان کا عمل دخل۔ کراچی کے اسٹار گیٹ کی کہانیاں جہاں رات کے وقت ایک خوبصورت عورت دلہن کے لباس میں لوگوں کو دکھائی دیتی ہے اور لفٹ لیتی ہے پھر اچانک غائب ہو جاتی ہے، شامل کریں پھر دیکھیں آپ کی شہرت!! (گزشتہ سال اگست کا اور اس سال جنوری کا شمارہ اسی موضوع پر تھا)“

☆ محمد فہیم نے کرک سے لکھا ہے ”اکتوبر کے سرگزشت میں پہلی سچ بیانی ”خالی ہاتھ، سوزوگداز سے بھرپور کہانی ہے۔ میں اس کہانی کے مرکزی کردار ”الف شین“ کو ایک پیغام دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ان کا محترمہ زرینہ صاحبہ کی پیشکش کو مسترد کرنا ایک غلط فیصلہ ہے میں یہ بات کتاب وسنت کی روشنی میں کہہ رہا ہوں۔ میرے علم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رضامندی پیشکش قبول کر لینے میں ہے۔ کسی جید عالم دین سے بھی یہ مسئلہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اگر سرگزشت کے ذریعے سے میرا یہ پیغام انہیں مل جائے تو نوازش ہوگی۔ ویسے میری خواہش ہے کہ میں براہِ راست ان سے رابطہ کروں۔ اگر آپ اس میں کوئی حرج نہ سمجھیں تو ان کا ایڈریس مجھے بھیج دیں۔ (ہم آپ کا خط شائع کر رہے ہیں اگر اجازت ملی تو ہم آپ کو ان کا پتا بھجوا دیں گے) سرگزشت مجموعی طور پر حد درجہ مفید ہے۔“

☆ درشہوار کی خانیوال سے آمد ”پہلی بار خط لکھ رہی ہوں اور بہت زیادہ ڈر بھی رہی ہوں کہ پتا نہیں میری تحریر آپ کو پسند بھی آتی ہے کہ نہیں (خوش آمدید! محفل میں شرکت کرنے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں محفل کے تمام ہی دوست بہت ملنسار اور محبت کرنے والے ہیں) جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت میرے پسندیدہ ڈائجسٹ ہیں لیکن موسٹ فیورٹ سرگزشت ہے، صرف میرا ہی نہیں بلکہ نانو امی، امی، ماموں جان، بھائی جان کو بھی پسند ہے (بہت شکریہ، آپ کی محبت کا) خط لکھنے کا شوق دوسرے خواتین وحضرات کو دیکھ کر ہوا۔ ڈاکٹر ساجد امجد، کاشف زبیر، ناہید سلطانہ، صفدر بیگ، علی سفیان آفاقی اور اسی نوع کے دوسرے رائٹر پسند ہیں اور زیادہ رومانٹک کہانیاں مجھے پسند نہیں۔ اب بات ہو جائے موجودہ سرگزشت کی، ارے واہ پہلی ہی کہانی میرے پسندیدہ رائٹر کی، بھئی مزہ آ گیا۔ اس کے بعد فلمی الف لیلہ پڑھی اور پھر پہلی سچ بیانی، باقی ماہنامہ زیرِ مطالعہ ہے اور بیت بازی میں جاوید بٹ اور عزیز احمد کے شعر بہت پسند آئے اگر شہرِ خیال میں خوش آمدید کہا یا تو مزید ہمت مرداں ورنہ پہلے کی طرح خاموش قاری، برائے مہربانی یہ بتائیے کہ خط کس تاریخ تک پہنچ جانا چاہیے۔ (15، 16 تک پہنچنے والے خطوط شامل ہوں گے) ایک سوال پابندِ سلاسل حضرات سے کہ وہ کس طرح قید وبند کی صعوبتوں میں ڈائجسٹ منگواتے، پڑھتے اور پھر خط لکھ کر پوسٹ کرتے ہیں۔ مجھے ان حضرات سے دلی ہمدردی ہے۔ ان کی تحریروں سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ بے گناہ ہیں اللہ سب کے حالوں پر رحم فرمائے، آمین۔“

☆ محمد اسلم مغل نے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے ”سرگزشت رسالے کا پُراسراریت نمبر منگوایا پڑھا بہت ہی معلوماتی مضامین

تھے۔ ناسٹر ڈیمس کے متعلق کبھی پڑھا تھا جس نے 21 دسمبر 2012 کو قیامت کا دن قرار دیا ہے جو کہ غلط ہے۔ قیامت کے وقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی قربِ قیامت کی نشانیاں بتا گئے ہیں، قیامت کا ٹھیک ٹھیک وقت آپ نے بھی نہیں بتایا۔ قیامت سے پہلے یاجوج ماجوج، خروجِ دجال، نزولِ مسیح، ظہورِ مہدی علیہ السلام، دابۃ الارض، قیامت سے چالیس سال پہلے قرآن کے حروف اس دنیا سے اٹھا لیا جائے گا اور وہ لوگ کعبۃ اللہ کو بھی منہدم کر دیں گے۔ ابھی تو ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی بھی ظاہر نہیں ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ناسٹر ڈیمس کے ذہن کو 2012 تک آئندہ کے حالات کے اشارے دیئے گئے اس کے بعد اس کا ذہن اندھیرے میں ہے۔ نبی پاک کا فرمان سچ ہے، ہم لوگوں میں بھی ایک شخص کی پیش گوئی کی دھوم ہے۔ میرے دادا صاحب پہلی جنگ عظیم میں جو 1914ء سے 1912ء تک رہی، فوج میں حوالدار تھے۔ فوجیں براستہ قندھار ایران عراق، اٹک آباد تک گئیں۔ اسی دوران قیامِ ایران کے وقفے میں دادا صاحب ولی نعمت اللہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ ان کے مزار پر یہ پیش گوئی لکھی ہوئی تھی۔ دادا صاحب نے وہاں سے نقل کی۔ انگریزی حکومت نے اس پیش گوئی کی اشاعت پر پابندی لگا رکھی تھی اسی لئے گھر میں سنبھال کر رکھی رہ گئی۔ اتفاقاً مجھے مل گئی وہاں سے میں نے لکھی، بہت سے لوگوں نے اصل پیش گوئی کے چند اشعار کے ساتھ من گھڑت اشعار لکھے ہیں، یہ پیش گوئی 570 ہجری بمطابق 1152 عیسوی لکھی گئی۔ 1191ء کو سلطان محمد غوری نے ہندوستان پر قبضہ کیا۔ اس میں مسلمانوں کی ہند میں آمد۔ امیر تیمور کا ہندوستان پر حملہ، بابر بادشاہ کا قبضہ ہند، مغلوں کی حکومت، انگریز کی آمد، مسلمانوں کی حالت زار، عثمانی خلیفہ عبدالحمید خامس سے حکومت کا چھن جانا، مصطفیٰ کمال کی حکومت جنگ بلقان، پہلی جنگ عظیم 4 سال 21 سال بعد دوسری جنگ عظیم 6 سال ایٹم بم کا گرانا۔ تقسیم ہند، وغیرہ کا ذکر ہے۔"

☆ تاثیر حیدری، اوچ شریف سے لکھتے ہیں "ایک عرصے سے جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت کا قاری ہوں۔ لیکن کبھی اس میں خط نہیں لکھا۔ یہ جسارت پہلی بار کر رہا ہوں۔ ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس کو کسی قریبی اشاعت میں جگہ ضرور دیں گے۔ آپ کی حوصلہ افزائی درکار ہے تاکہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھ سکوں۔ (کہانی پڑھ کر فیصلہ بتا دیا جائے گا)"

☆ اعجاز حسین سٹھار کا خلوص نامہ نور پور تھل سے "سرگزشت کا لیٹ پہنچنا معمول بن گیا ہے ہم سوچوں کے گھوڑے دوڑا کر تھک گئے ہیں لیکن یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ آخر یہ دفتر سے رختِ سفر باندھنے کے بعد پورا ہفتہ کس خوشی میں اور کہاں جا کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ (تاریخ اشاعت کی تبدیلی کا آپ نے بھی پڑھا ہوگا، اب 26، 27 کے بعد تلاش کریں) تبصرہ لیٹ ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی بے چینی ہمیں مار دیتی ہے۔ سرگزشت اپنی عادتوں سے مجبور ہے اور ہم اس کی محبت میں بے بس اور انتظار کی کوفت جھیلنے پر مجبور ہیں۔ شہرِ خیال میں خود کو مسندِ صدارت پر فائز دیکھ کر خوشی ہوئی یہ سب ادارے کے تعاون اور دوستوں کی حوصلہ افزائی سے اعزاز ملا ہے جس کے لیے میں سب کا شکر گزار ہوں۔ برادرم معراج رسول صاحب کچھ لکھنے کے شوقین دوستوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر رہے۔ چند مستقل لکھنے والے بڑے نام ہیں جو ہر ماہ نظر آتے ہیں۔ عام لکھاری کو بھی شاملِ اشاعت کیجیے آپ کو تحریر میں درستگی کی کھلی اجازت ہے۔ یوں آپس کا ربط بڑھے گا لیکن آپ دو ٹوک جواب دے کر حوصلہ شکنی کرتے ہیں یہ قطعی نامناسب بات ہے۔ (صفحات 8 ہیں اور خطوط بہت زیادہ اس لیے الفاظ کا استعمال کم سے کم کرنا مناسب ہے تاکہ قارئین کے خطوط جگہ پا سکیں، نئے حضرات کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ جبکہ ان کی تحریر پر بہت وقت خرچ ہوتا ہے کیونکہ معلومات کو خصوصی طور پر چیک کیا جاتا ہے۔ سچ بیانی میں تو کبھی کبھار ہی کوئی پرانا نام دیکھا ہوگا) فلمی الف لیلہ، نئے رنگ ڈھنگ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور پرانے لاہور کا خوش اسلوبی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ ریاض شاہد کا بڑا نام ہے۔ کہیں پڑھا تھا کہ نیلو بھیرہ ضلع سرگودھا کی رہنے والی تھی اب جیو شان سے صبح ٹی وی پر دیکھتے ہیں تو شان کی صورت دیکھ کر کئی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اس گزرے زمانے اور اپنی نوجوانی کو یاد کر کے آہیں ہی بھر سکتے ہیں لیکن اب پچھتاوے میں بے ساختہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارنے کے سوا اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ آفاقی بھائی شاید روا روی میں لکھ گئے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی سرحد کے بیٹے ہیں (صفحہ 177 کالم نمبر 2 کے آخر میں) حالانکہ قاسمی صاحب وادی سون ضلع خوشاب کے گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ بہرحال کام کی زیادتی اور عمر کو دیکھتے ہوئے ایسی سب غلطیاں قابلِ معافی ہیں لیکن تصحیح ضروری ہے۔ "لوریوائے" چاہے جتنے مصالحانہ جذبات شیرنی کے لیے رکھتا تھا لیکن اس کی درندگی کو کب نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ میں ان سب جرأت مند شکاریوں کی ہمت کی داد دیتا ہوں جو چیر پھاڑ کرنے والے دانت، کئی انچ لمبے نوکیلے ناخن اور انسان سے کئی گنا زیادہ طاقت رکھنے والے جانور سے کھلے آسمان تلے اور آمنے سامنے آ کر مقابلہ پر تل جاتے ہیں وہ کیسے بہادر جوان تھے جو موت کو سر پر کھڑے دیکھ کر ہمت نہیں ہارتے تھے آج کے جوان کی یہ حالت ہے کہ گھر میں بلی کود جائے تو کمرے میں دبک جاتے ہیں۔ واقعی ایسی تحریریں لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہیں، شائع کرتے رہا کریں۔ ناقابلِ یقین، سنسنی خیز، دلچسپ اور معلومات سے بھرا ہوا ہے لیکن میں اپنی محدود اسلامی معلومات کی حد تک بات کروں گا کہ جس عیسائی تک اسلام کا پیغام پہنچا اور وہ مسلمان نہ ہوا تو کیا وہ جنت میں جائے گا (ایک رونما واقعہ بیان کیا گیا۔ جنت جہنم کا ذکر کہاں سے آ گیا؟) سراب، میرا پسندیدہ سلسلہ ہے اور شہباز کی ہر مہم پر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب اور قابو سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اس کی لاابالی طبیعت کی سزا ہم پا رہے ہیں مجھے محترم کاشف زبیر سے ایک بات کہنی ہے کہ وہ ہر قسط کا خاتمہ کسی سنسنی خیز واقعہ یا حادثہ پر کرتے ہیں یوں قاری تجسس کا شکار ہو کر آنے والے واقعات و حالات کا بے چینی سے انتظار کرتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں یہ ایک غیر حقیقی سا ماحول بن رہا ہے اس لئے کبھی ہاتھ ہولا رکھیں اور روزمرہ کے معمولات کے ساتھ قسط ختم کریں۔"

☆ ولدار احمد چٹھہ حیدرآباد سے لکھتے ہیں "سرگزشت کچھ عرصہ سے زیرِ مطالعہ ہے مجموعی طور پر اس کی تمام کہانیاں اچھی ہوتی ہیں سراب میری پسندیدہ کہانی ہے البتہ سچ بیانیاں من گھڑت معلوم ہوتی ہیں جیسے پرائز باؤنڈ نامی کہانی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا پے در پے فرسٹ انعام ہی لگے۔ یہاں ہزاروں باؤنڈ لئے بڑی مشکل سے تھرڈ میں کوئی نمبر جگہ پاتا ہے۔ خیال رکھا کریں۔ شکریہ! ایک تجویز ہے کہ مسلمان سائنس دانوں پر بھی ہر ماہ لکھوائیں جو آج کل کی ترقی کی بنیاد بنے، جن سے مغرب نے استفادہ کیا۔ ہو سکے تو تاریخ بعید سے بھی کچھ شائع کیا کریں جیسے یوسف کے بعد مصر کا کیا ہوا، فراعین پھر کیسے چھا گئے۔ یا بابل و نینوا یا مہابھارت کے قصے۔ امید ہے کسی ایک تجویز پر آپ غور کریں گے (یہ تمام قصے شائع ہوتے رہے ہیں) علاوہ ازیں کچھ عرصہ قبل میں نے کچھ گیت آپ کو بھیجے تھے اور ان کے لئے علی سفیان آفاقی صاحب کی رائے اور مدد مانگی تھی اب تو ماشاء اللہ وہ صحت مند ہیں براہ مہربانی میرے گیتوں کے لیے کچھ کریں۔ (گیتوں کے لیے معذرت نزدیک کے کسی شاعر کو پہلے دکھا دیں تو بہتر ہے۔"

☆ مدیحہ خان، ماریہ خان، رمشا کنول چک بیلی خان راولپنڈی سے لکھتی ہیں "انکل معراج رسول کی باتوں پر کاش ڈاکو لیڈر عمل کریں، ملالہ کے ساتھ بڑا ظلم ہوا واقعی کیا یہ ظالم انسان نہیں ہیں؟ شریف الدین پیرزادہ صاحب کے بارے میں اخبارات یا ٹی وی پر دیکھتے پڑھتے ہیں۔ ہم مدیحہ خان و ماریہ خان صبح بچوں کو تیار کر کے خود بھی اسکول ڈیوٹی، جبکہ رمشا کنول، یونیورسٹی سے ٹاپ کے بعد کلاس ون آفسر اسلام آباد، ڈیوٹی کے بعد گھریلو خانہ داری وقت نکال کر پڑھنا، تفصیلاً تبصرہ کٹھن ہوتا ہے، ساتھیوں کے تبصرے بہت اچھے، صرف اتنی التجا مجلس کے بہن بھائی ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل نہ دیا کریں۔"

☆ تفسیر عباس بابر کا نامہ اوکاڑہ سے "محترم جناب معراج رسول کا تلخ و فکر انگیز اداریہ ملالہ یوسف زئی کے ساتھ جو کچھ ہوا یقیناً قابلِ مذمت اور باعثِ صد افسوس ہے۔ دہشت گردی، فرقہ واریت، نفاق و انتشار اور لاقانونیت وطنِ عزیز کا بنیادی مسئلہ اور المیہ ہے ایسے غیر یقینی اور نامساعد حالات میں ہر لمحہ، لمحہ فکریہ ہے سیاسی رہنماؤں اور خود غرض و بے حس حکمرانوں کی منافقانہ پالیسیاں شاعرِ مشرق و قائد ملت کی محنت کی تذلیل پر کمربستہ ہیں۔ یک صفحی سرگزشت میں ایک اور نابغہ روزگار شخصیت، شریف الدین پیرزادہ سے متعلق معلوماتی صفحہ بصد شوق ملاحظہ کیا۔ شہرِ خیال میں مسندِ صدارت پر اعجاز حسین سٹھار کا پراثر و مفصل تبصرہ تجزیہ اور مشاہدہ ان کی ذہنی مشقت و عرق ریزی کا نایاب نمونہ ثابت ہوا۔ کراچی سے سعید احمد چاند تلخ حقیقتوں سے "غم و نالاں نظر آئے احساس کے رنگ پہ یاس کا زنگ لگ جائے تو یہی ردِعمل ہوتا ہے۔ پشاور سے طاہرہ گلزار آپ کے حکم کے عین مطابق ہم شہرِ خیال میں حاضرِ خدمت ہیں یاد رکھنے کے لئے۔ نوازش، آپ کے خوبصورت و منفرد افکار و خیالات کا تسلسل باعثِ مسرت و طمانیت ہے۔ بہاولپور سے ناصر حسین رند کا مفصل و معلوماتی تبصرہ خاصے کی چیز تھا۔ چچھ سے ملک محمد جاوید سرکانی درانی کی شعلہ بیانی نے دعوتِ فکر کا خصوصی اہتمام کیا۔ امریکا سے ڈاکٹر ایم اے مالک کی تنقید قابلِ غور ہے۔ بہاولپور سے بشریٰ افضل ہم نے آپ کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا اور اللہ خیر آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم نے پانچ شادیاں کر رکھی ہیں دراصل محترمہ طاہرہ گلزار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی شادیوں کے دلچسپ انکشافات کر رہی تھیں۔ سدرہ بانو تا گوری، رانا محمد سجاد اور ایم اے خالق بھٹی کی بہترین گفت و شنید بھی متاثر کن رہی۔ خزینہ علم و ادب سے اک اور گوہرِ نایاب حکیم وقت ڈاکٹر ساجد امجد کی نہایت مہارت و مشاقی کے ساتھ کتب تواریخ کی ورق گردانی ایک نادرِ روزگار اور ادب کی معتبر شخصیت کی بیش قیمت معلومات سے بھرپور تحریر و تحقیق خاصے کی چیز ثابت ہوئی۔ کاشف زبیر کی ولولہ انگیز و سنسنی خیز شاہکار کاوش، سراب نے حسبِ روایت اس ماہ بھی میلہ لوٹ لیا۔ شہلا کے دردناک انجام نے کافی سے زیادہ افسردہ کیا۔ ابلیس کے پیروکاروں کا یہی انجام ہوتا ہے مرشد بھی یقیناً قانونِ مکافاتِ عمل سے مبرا نہیں ہے۔ ماہا کا دلچسپ کردار، اچانک ہی کلوز کر دیا گیا سرورق کی پراثر کہانی اندھیرے اجالے، زندگی بیشک درد سے عبارت ہیں۔"

☆ احمد خان توحیدی کی آمد کراچی سے "معراج رسول صاحب چند الفاظ باضمیر کیلئے کافی بے ضمیر کیلئے دفترِ بے کار، روزانہ کتنی ملالہ لقمۂ اجل صرف ایک مسلمانوں کی نااتفاقی دشمن یہی چاہتا ہے۔ کراچی میں پھر آگ و خون کا المناک واقعہ۔ اٹارنی جنرل، شریف الدین پیرزادہ کے بارے میں بہت پڑھا سنا، نجی حالاتِ زندگی لکھیں۔ شہرِ خیال میں غوطہ اعجاز سٹھار کرسیِ صدارت طویل تبصرہ، سعید احمد چاند آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں جمہوریت کے لبادہ میں ڈکٹیٹران سے مارشل لا بہتر تھا، تبصرہ اچھا ہے۔ طاہرہ گلزار پشاور قائداعظم کے اصول پر عمل کر کے ایٹم بم بنا سکتے ہیں۔ ریلوے انجمن وزرعی و صنعتی کفالت، ڈیم کیا چیز ہے؟ ہر جوان ڈاکٹر خان بن سکتا ہے مگر مافیا بننے نہ دے گی۔ ناصر رند بہاولپور، سلور جوبلی ضرور ضرور۔ تو معذور مسیحا مجبور نہیں، کہانی میرے پاس ہے۔ پرویز بلگرامی کا لاجواب انٹرویو میں نے بھی پڑھا تھا۔ معراج الدین مردان، آپ کا لاجواب تبصرہ کہ دشمن چنگاری ڈال کر فرار۔ شرپسند عناصر موقع کی تلاش میں ہیں اس لیے گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے کہ علمی ذخیرہ لائبریری جاہلوں نے جلادی، اف ہائے، بے ربط تحریر مطالعے کے بغیر تبصرہ کیسے ممکن؟ ملک جاوید سرکانی، دشمن یہی چاہتا ہے، لڑاؤ اور حکومت کرو۔ اسلام سے بڑھ کر پُرامن مذہب دنیا میں کون سا ہے؟ انجم فاروق لاہور، جب شمارہ 30 تاریخ کو ملے ڈیوٹی کے بعد مطالعہ کے بغیر تبصرہ مکمل کیسے ہو؟ بشریٰ افضل بہاولپور، سماجی خدمت کے لیے ایدھی صاحب سے ملیں باقی سب این جی اوز فراڈ ہیں۔ رانا جیب گوجرہ، مشرقی پاکستان کا نام لے کر قلبی دکھ تازہ کر دیا جمہوریت کا واویلا۔ ادھر ہم ادھر تم۔ 82 سیٹ لینے والے 151 سیٹ والوں کو جمہوری حق دے دیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ اسی لیے سب کا عبرت ناک انجام ہوا۔ استاد غلام علی خان ضرور حالاتِ زندگی لکھیں ایم اے خالق

بھٹی تبصرہ مختصر ویری گڈ۔ سب تبصرے اچھے۔"

☆ معروف شاعر قدیر رانا کا خط راول پنڈی سے "آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ دو مزاحیہ غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ اگر آپ کا معیار انہیں قبول کرلے تو کسی بھی آنے والی اشاعت میں باری باری شائع کر کے مشکور فرمائیں۔ آپ کی صحت اور ادارے کی ترقی کے لیے ہر وقت دعا گو رہتا ہے۔"

☆ ڈاکٹر انوار الحق کا خلوص نامہ لاہور سے "سرگزشت میرے مطالعے سے گزرتا رہتا ہے لیکن شہر خیال کی محفل میں پہلی بار شرکت کررہا ہوں۔ موجودہ مدیر کے آنے کے بعد سرگزشت متنوع، جامع اور بھرپور ہوئے ہیں۔ شہر خیال میں قارئین نے مضامین پر بھرپور خیال آرائی کی۔ حکیم وقت کے عنوان سے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے ایک اور بڑی شخصیت کو قارئین کے روبرو پیش کیا۔ معذور مسیحا، آذری کا دلیں، جہد زندگی، خط نستعلیق اچھی تحریریں تھیں۔ قلمی الف لیلا آج بھی دلچسپ ہے۔ سراب سنسنی خیز واقعات کے ساتھ اپنی دلچسپیاں برقرار رکھے ہوئے ہے۔ سچی آپ بیتیوں میں اندھیرے اجالے، سبق آزما، ترازو اچھی معلوم ہوئیں۔ ادارتی گفتگو میں حالات حاضرہ کا اچھا جائزہ قلم بند کیا گیا ہے۔ گزشتہ برس انجم فاروق ساحلی کی شکاریات کی کہانیاں شائع ہوئی تھیں۔ جن میں ایک شاید معرکہ جنگل تھی۔ ان کی کہانی کے واقعات دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ ایک اور جگہ انجم فاروق ساحلی کی کہانی شکاری بھی دیکھ چکا ہوں۔ جب میرے والد محترم جو روزنامہ مشرق سے چیف ایڈیٹر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ باحیات تھے اور ان کے پاس لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ اس وقت انجم فاروق ساحلی بھی آیا کرتے تھے۔ میرے والد مجلسی آدمی تھے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے، آمین۔"

☆ عزیز اللہ کا خط مقام نامعلوم سے "سرگزشت میں سچ بیانی میری اولین پسند ہے۔ وقتی طور پر ہم اپنے سارے دکھ درد بھول جاتے ہیں۔ پانچویں نمبر پر کہانی انصاف پڑھی تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دل کرتا ہے پاکستان کے پورے تھانوں اور چوکیوں پر چھٹ پڑوں۔ کسی ایک کے جھوٹ بولنا، گالیاں بکنا، غریبوں کو دبانا فطرت میں شامل ہے۔ چور، ڈاکو جیب کترے ان کے یار غار ہیں۔ انصاف کی گل ناز کی بددعائیں بے حیا بے لگام پولیس کو ساری حیاتی تڑپاتی رہیں گی۔ نومبر کی سب سچ بیانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ پچھلے کئی شماروں سے بہتر۔"

☆ محمد جاوید محمد خاں سرکانی برہ زئی، بچھ سے رقم طراز ہیں "سب سے پہلے اعجاز ستھار کو منصب صدارت کی مبارک باد۔ ناصر حسین رند صاحب آپ کی تجاویز سے اتفاق ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ جنہیں سمسن کہا جاتا ہے وہ کوئی حقیقی کردار نہیں بلکہ اولاد یعقوب علیہ السلام میں ایک نبی تھے جن کا نام شمعون تھا۔ ایک شمعون حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے بھی تھے جو کہ نبی نہیں تھے۔ جناب خالد کبیر اور ناصر حسین رند کی خدمت میں عرض ہے کہ سالانہ تجزیہ کرتے ہوئے خطوط کی گنتی میں میری ماہ ستمبر کی نصف حاضری کو بھی شمار کیجیے گا۔ جناب سعید احمد چاند، جناب معراج الدین، جناب رانا حبیب الرحمان، جناب احمد خان توحیدی، جناب رانا سجاد اور جناب عبدالخالق بھٹی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ڈاکٹر ایم، اے مالک صاحب مضمون تیار کرنے کے لیے حوالے اور استفادے کا ذریعہ کتاب ہی تو ہے یا پھر جدید ذریعہ انٹرنیٹ۔ اگر آپ کوئی مشورہ دیتے تو یہ اہلِ قلم وہاں سے بھی معلومات لے لیتے۔ ان کے علاوہ طاہرہ گلزار صاحبہ، انجم فاروق ساحلی صاحب، نوید نقوی صاحب، محمد عامر ساحل صاحب، بشریٰ افضل صاحبہ، سدرہ بانو ناگوری صاحبہ اور رانا محمد شاہد کے تبصرے خوب تھے۔ اب کچھ غلطیوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ صفحہ نمبر 54 کے ایک تراشے میں سہگل اور خورشید کی فلم پہلی دیوداس لکھا گیا ہے جو کہ ٹھیک نہیں کیونکہ اس سے پہلے ناول دیوداس پر ایک خاموش فلم بن چکی تھی اور دیوداس کے مصنف کا نام شرت نہیں بلکہ سشرت چندر چڑ جی ہے (مصنف کا نام شرت ہی ہے۔ سشرت نہیں۔ بنگلہ کے مصنف ہیں) جناب احمد ندیم قاسمی مرحوم کا تعلق پنجاب سے ہے جبکہ آفاقی صاحب شاید تیزی میں قتیل شفائی اور ضیا سرحدی کے ساتھ انہیں بھی سرحد کا بیٹا لکھ گئے۔ مسعود کھدر پوش کی شکاری قصوں کے ساتھ ان کی مفصل داستان حیات بھی شائع ہونی چاہیے کہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھے دیگر گزارش ہے کہ تبصرے میں نام کے ساتھ ہمارے گاؤں کا نام برہ زئی ضرور شائع کریں کیونکہ بچھ تو تقریباً سو دیہات پر مشتمل ایک وادی ہے جس میں پچاس تو میرے ہم نام موجود ہوں گے۔ اس دفعہ علمی آزمائش میں اپنا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کا مکتوب کراچی سے "انکل کا اداریہ پڑھ کر ذہن میں کئی سوالات نے سر اٹھایا ایسے سوالات نے جن کے جوابات شاید کوئی بھی نہ دے سکے مثلاً آج ہم لوگ جن مشکلات سے گزر رہے ہیں تو ہم نے کبھی خدا کے آگے رو رو کر سچے دل سے اس وطن عزیز کی خیر کی دعا مانگی یا پھر اور دوسرے موقعوں کی طرح اس پریشانی میں بھی ہم خدا کو بھولے ہوئے ہیں۔ اگر بھولے ہوئے ہیں تو ہم لوگوں کو شکوہ کرنا زیب نہیں دیتا۔ سراب اس بار چھوٹے چھوٹے واقعات سے لبریز تھی لیکن آخری واقعے نے دل کی دھڑکنوں کو زیر زبر کردیا۔ چو پر ہٹ، مونا اور سعدیہ اس میں سوار ہیں یہ ایسے مقام پر آکر باقی آئندہ ہوگیا کہ دل بے اختیار سوچتا رہ جائے گا کہ اب کیا ہوگا؟ لیکن اس موڑ پر تو کاشف زبیر بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کیا کروں؟ مونا اور سعدیہ کو چوپر سے زندہ کیسے نکالوں؟ واہ کاشف زبیر واہ۔ معذور مسیحا ریاض احمد لے کر آئے بہت خوب کیا۔ دلچسپ عجیب وغریب افسانہ حیات ہے۔ پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ کا لیکن میں کہیں پڑھا تھا کہ پروفیسر صاحب محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہیں صرف ان کی پلکیں جھپکتی ہیں اور پلکوں کی اس زبان کو کمپیوٹر الفاظ کی شکل دے کر آگے بڑھاتا ہے۔ ریاض احمد اسے بیان کرنا بھول گئے یا میں نے غلط پڑھا تھا۔ (جی ہاں، آپ صحیح ہیں۔ مضمون میں بھی یہی کہا گیا ہے) قلمی الف لیلا میں آفاقی انکل پرانے لاہور

کی یادوں کے ساتھ آئے ہیں اور پرانی تصاویر دکھا کر حیران کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم تو کراچی کے رہنے والے ہیں اور لاہور جا کر ابھی پیدا ہونے کا اعزاز بھی حاصل نہیں کیا۔ لہٰذا پرانے لاہور کی داستانوں سے کیا دلچسپی لیکن انکل کا اندازِ تحریر اور تذکرہ لاہور پڑھ کر دل کہہ اٹھا لاہور، لاہور ہے۔ انکل آفاقی کبھی پرانے کراچی کا تذکرہ بھی کیجیے گا۔ انکل آفاقی نے احمد فراز کے تذکرہ میں جوش کا ایک مصرع لکھا ہے۔ رسول نہ ہوتے تو قبول حق کے لیے، اہل نظر کو طلوع صبح کافی تھا۔ یہ طلوع صبح کا دلکش منظر کا تذکرہ ہے۔ پہلی سچ بیانی اندھیرے اجالے دل کے تاروں پر جھنکار بننے میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔ زرینہ کا اندھیرے اجالے کا سفر بڑا ہی کٹھن اور دشوار تھا مگر صبر وضبط کا دامن تھام کر وہ ایک بہتر اور اچھی زندگی کی حق دار ٹھہری۔ ردی والا میں خلیل کا بے مثال کردار متاثر کرگیا۔ قرآن پاک کی مقدس آیات کا احترام کر کے اس نے فلاح کا راستہ پالیا۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جسے ذہن ودل مدتوں فراموش نہیں کرسکیں گے۔ آخری تحریر سمجھوتا پراسراریت کے حوالے تھی۔ سطر سطر رونگٹے کھڑی کرنے والی اس تحریر کا انجام بھی خوب رہا۔ انکل 31 دسمبر کو میری چھوٹی بہن بشریٰ ناگوری اور میرے بھانجے زیان کی برتھ ڈے ہے تو ان کو بہت بہت سالگرہ مبارک۔"

☆ رانا محمد شاہد، بورے والا سے لکھتے ہیں "معراج رسول صاحب نے اداریے میں ایک انتہائی اہم اور گمبھیر نقطے پر قلم اٹھایا کہ ایک بڑے پیمانے پر پاکستانی اور مسلمانوں کو عالمی سازش کا نشانہ بنا کر دیوار کے ساتھ لگانے کا پروگرام جاری ہے۔ مسلمانوں اور پاکستانیوں کو دہشت گرد اور خطرناک قرار دے کر تنہا کرنے کی سازش تیار کی جارہی ہے۔ یک صفحی سرگزشت میں معروف قانون داں شریف الدین پیرزادہ کی زندگی کے گوشوں سے آگاہ کیا گیا۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ وہ تقریباً ہر دور میں کسی نہ کسی اہم عہدے پر براجمان رہے۔ شہر خیال میں اعجاز حسین ستھار فرنٹ پر موجود تھے۔ طاہرہ گلزار نے اپنے خط میں اپنی ہی خوب تعریف کرتی نظر آئیں۔ ویسے یہ کام اگر دوسرے کریں تو ہی بجا ہے۔ شعیب ملک کو کوئی گندی سیاست کی نذر کیوں کرنے گا۔ وہ تو خود سیاست کی بنا پر دوبارہ ٹیم میں آیا ہے۔ فائدے اس میں تین ہیں، ایک ثانیہ مرزا کا شوہر ہے۔ بھارت سے لڑکی بیاہ کر لایا ہے اور فردوس عاشق اعوان کے شہر کا ہے۔ کرکٹ کے علاوہ یہ تینوں خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ ناصر حسین رند کی تجاویز اچھی ہیں، ان پر ضرور عمل ہونا چاہیے۔ ملک محمد جاوید یہ ہمارا المیہ ہے کہ کسی بھی سطح کا احتجاج ہو، نقصان قومی املاک کا ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں فلاں جو ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں، یہ ان ممالک سے آتی ہیں جو گستاخی میں شامل ہیں تو بھی ہم وہ چیزیں نہیں چھوڑتے۔ ہاں احتجاج ہو تو جو کچھ کرتے ہیں، وہ سب کے سامنے ہے۔ بشریٰ افضل، آپ این جی او میں ضرور جایئے، کچھ اچھی بھی ہوں گی مگر ہمارے ہاں جو این جی اوز ہیں، وہ پس پردہ کیا کچھ کرتی ہیں، کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ مجموعی طور پر کچھ اچھا تاثر نہیں ہے۔ علم کے پیکر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے زندگی نامے سے ڈاکٹر امجد صاحب آگاہ کررہے تھے۔ علم سے محبت کرنے والی ایسی شخصیات بہت کم ملتی ہیں۔ "معذور مسیحا" اسٹیفن کنگ آج ایک زندہ لاش ہونے کے باوجود جو کام کررہا ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے، یقیناً اس کے کام نہ صرف مایوس انسانوں کے لیے امید کا پیغام ہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اسے زندہ رکھیں گے۔ ایک باغیانہ سوچ کے حامل گلوکار کی زندگی کا عکس ابن کبیر نے بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا۔ آخری جملہ ہی سب کچھ تھا۔ "جان ایک باغی ہے اور ہمارے ہاں باغیوں کو قبول نہیں کیا جاتا، انہیں قتل کیا جاتا ہے۔" شکاریات کے حوالے سے ایک بڑے لکھاری مسعود کھدر پوش کی تحریر کا انتخاب کیا گیا۔ صائمہ اقبال اور امیمہ سلیم کی تحریریں بھی معلومات اور دلچسپی سے بھرپور تھیں۔ سلمیٰ افتخار لاہور کا مشکور ہوں کہ انہوں نے میرے ایک مضمون سائنسی خبرنامے سے اقتباسات دیے۔ ان سے کہنا ہے کہ شہر خیال میں بھی اپنے خیالات کے ساتھ آئیں۔ حال ہی میں امریکا میں سینڈی طوفان آیا، یہ طوفان دنیا کے مکافات عمل ہونے کا ہی پیغام دیتا ہے کہ وہ امریکا جس نے دنیا میں دہشت گردی ختم کرنے کے بجائے اسے فروغ دیا، کو خود سمندری طوفان نے آگھیرا جس سے کم وبیش ایک کروڑ افراد متاثر ہوئے۔"

☆ رانا فیصل جاوید، علی پور سے لکھتے ہیں "اداریہ پڑھ کر مجموعی طور پر ایسی قوم کی کند ذہنی پر رونا آیا۔ اصل میں تیزی سے گردش کرتے حالات نے پاکستانیوں سے، مسلمانوں سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ اس میں سب سے بڑا ہاتھ الیکٹرانک میڈیا کا ہے کہ وہ بات کا بتنگڑ بنانے کے ماہر ہیں۔ مختصر تحریر اناڑی جنرل وسیع معلومات لیے ہوئے تھی۔ سراب میں یکسانیت بڑھتی جارہی ہے کبھی دشمن حاوی کبھی شہباز، سراب میں وادی کشمیر کا ذکر آیا، کاش کے ایسا ممکن ہو کہ شہباز بریف کیس کی تلاش میں مقبوضہ کشمیر چلا جائے۔ کم ازکم کشمیری بھائیوں سے تو ملاقات ہوگی۔ افسوس کے حکمرانوں کی بے حسی کی وجہ سے ہم نے اپنی شہ رگ کو بھلا دیا ہے۔ ہم نے کشمیری بھائیوں کو اکیلا چھوڑ رکھا ہے۔ نتیجتاً وہ بھی ہم سے روٹھتے جارہے ہیں۔ چند سال پہلے وہ کہتے تھے کہ ہم پاکستان کا حصہ ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اپنا ملک ہو۔ یہ سب حکمرانوں کی ناقص پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ قلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب نے کمال کردیا۔ لاہور کے اصل سے ہم کو روشناس کروایا۔ پچھلے ماہ میں لاہور میں تھا اس لیے محفل میں شریک نہیں ہوسکا موجودہ لاہور اور پرانے لاہور میں بہت فرق پیدا ہوگیا ہے۔ آفاقی صاحب نے ڈراموں کے حوالے سے جو لکھا سچ لکھا۔ اک وقت تھا دنیا میں پی ٹی وی کے ڈرامے مشہور تھے لیکن اب تو ایسے بکواس موضوعات پر ڈرامے بن رہے ہیں کہ ان کو دیکھ کر دنیا بھی خراب اور آخرت بھی۔ پی ٹی وی انتظامیہ کو غیرت کے چند قطرے حلق میں اتارنے چاہئیں۔"

☆ مہوش رفیق نے کراچی سے لکھا ہے "سب سے پہلے چھوٹا سا شکوہ ہے آپ سے کہ مجھے پرچہ بے حد لیٹ ملنے لگا ہے اور تبصرہ کرنے کے لیے ٹائم نکل جاتا ہے۔ اکتوبر اور نومبر کا ماہنامہ گاؤں گئی ہوئی تھی اس لیے نہیں پڑھ سکی۔ اس ماہ اعجاز حسین ستھار کا تبصرہ پڑھنے کو ملا

اور کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ مجھے بھی تبصرہ کرنا سکھادیں جی۔ تاکہ ہم بھی کرسی صدارت کا شرف حاصل کرسکیں۔ سعید احمد چاند کا تبصرہ جاندار لگا۔ شکریہ جی، ہم ویسے بھی ہوا کا تازہ جھونکا ہی ہیں۔ کوشش ہے کہ آپ سب کی امیدوں پر پوری اتروں مگر ڈاکٹر روبینہ نفیس کی کمی اپنی جگہ رہے گی، وہ کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں خیریت تو ہے نا (طبیعت خراب تھی) طاہرہ گلزار کا تبصرہ بھی بہت بہترین تھا۔ معراج الدین بھائی صاحب میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں پورے سرگزشت پر تبصرہ کرتی ہوں۔ شاید آپ کو میری اضافی باتوں پر تبصرہ پسند نہیں آیا ملک محمد جاوید سرکانی درانی کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ محمد عامر ساحل، بشریٰ افضل، رانا حبیب الرحمٰن، رانا محمد شاہد احمد خان توحیدی، رانا محمد سجاد صاحب ناراضی بجا تھی نا میری؟ پرچہ لیٹ ملنے لگا ہے (خطوط کی وصولی کی تاریخ بھی تو آگے کردی ہے۔ اب 5 کے بجائے 15 تاریخ تک کے خطوط شامل کیے جارہے ہیں) سب کے تبصرے پرجوش اور جاندار لگے۔ ایم۔ اے خالق بھی مختصر تبصرے کے ساتھ نظر آئے۔ میں نے صرف ایک کہانی پڑھی ہے ''بھجوتہ'' بہت زبردست لگی مگر اسے پراسرار نمبر میں ہونا چاہیے تھا اور میں ایگری ہوں ان کی بات سے درود شریف کی برکت سے ہی سب کچھ ممکن ہے۔ بہت ہمت والی خاتون تھیں کہ انہوں نے اکیلے ہی جنوں بھوتوں سے نمٹ لیا۔ انکل مجھے سالانہ ڈاک کا طریقہ بتادیں میں بذریعہ ڈاک منگوانا چاہتی ہوں کیونکہ بک اسٹال میں بہت لیٹ ملنے لگا ہے۔ (بہت آسان طریقہ ہے۔ سات سو روپے منی آرڈر سے بھیج دیں پرچہ جاری ہوجائے گا) ایک دو فرمائش اور ہیں امید ہے پوری کردیں گے۔ نمبر 1 احمد یار خان کے نام سے تو آپ واقف ہوں گے میں چاہتی ہوں ان کی تفتیش کی ایک کہانی آپ سرگزشت کی زینت بنادیں تو مہربانی ہوگی (بیٹی، احمد یار خان صرف سسپنس کے لیے لکھتے ہیں، عمر کا تقاضا ہے کہ زیادہ نہیں لکھ سکتے) نمبر 2 ملک صفدر حیات، صابر حسین راجپوت، محبوب عالم یا احمد یار خان کی زندگی پر تفصیلی مضامین دیں مہربانی ہوگی پلیز۔ آخر میں شہر خیال کے باسیوں کو سلام اور پلیز میرے لیے دعا کریں میرے ۔ اے فائنل کے امتحانات ہونے والے ہیں، میں کامیاب ہوجاؤں۔ (اللہ آپ کو بہت اچھے نمبروں سے کامیاب کرے! آمین)''

☆ طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے رقم طراز ہیں ''نومبر کے سرگزشت کے شہر خیال میں خطوط پڑھ کر بڑا اچھا لگا سب ہی خطوط اپنی جگہ خوب تھے۔ نگار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنتا اس لیے جمہوریت کے چیمپئن کے لیے کیوں اپنا وقت اور قلم کی طاقت ضائع کررہے ہیں معراج صاحب، ان کو کچھ بولو تو فوراً ان کی جمہوریت خطرہ میں پڑنے کا نعرہ خود ہی لگادیتے ہیں۔ بھائی میرپور خاص جیسے شہر میں جہاں دفتر جانے والوں کے لیے صبح سات بجے ٹرین چلتی تھی کراچی جانے والوں کے لیے خاص طور پر تاجر برادری کے لیے صبح 5 بجے مہران چلتی تھی اور شام کو واپسی 5 بجے شاہ لطیف چلتی تھی، سب بند۔ ایک ٹرین چلتی ہے دس بجے وہ بھی کبھی کبھی چلتی ہے۔ کبھی نہیں اب احتجاج کرو تو جمہوریت کو خطرہ بجلی کے لیے بولو تو جمہوریت کے لیے خطرہ۔ اب میں بولوں کے نا بولوں (بولو بولو) طاہرہ گلزار صاحبہ اور سٹار صاحب کے ساتھ ساتھ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ، توحیدی اور سجاد جب کے تبصرے بہت لاجواب رہے۔ حکیم وقت بھی خوب تحریر تھی معلومات میں اضافہ کرگئی پھر ترجمہ اور بوائے بڑی ہی دلچسپ اور خوبصورت کہانی، جواب نہیں جہد زندگی بھی کافی دلچسپ تحریر تھی۔ ناقابل یقین بھی بڑی ہی ناقابل یقین تحریر تھی۔ اچانک اسپتال میں جیسے بھونچال آگیا ایسے ہی یہاں تک پڑھتے ہوئے ہم بھی حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے اور جب نکلے تو کہانی ختم تھی۔ پراسرار، گلاب جیسی کہانی بہت عرصہ بعد پڑھنے کو ملتی ہے۔ کافی پراسرار مگر عزم ہمت کا پیکر جادوگر کا جواب نہیں فٹ بال کے کھلاڑی لیونل میسی کی کہانی عزم استقلال کی خوبصورت کہانی واقعی انسان ہمت کرے تو کیا کام ہے مشکل۔ آپ بیتیاں تلخ اور شیریں حقائق لیے ہوئے اپنے رنگ میں خوب ہیں انصاف اور انسان متاثر کن کہانیاں ہیں اور سبق آموز بھی۔''

☆ افتخار وڑائچ کالروی کی آمد، کالرہ دیوان سنگھ سے ''سرگزشت کا شمارہ اول سے قاری ہوں۔ شہر خیال میں حاضری برسوں بعد ہوئی ہے۔ (خوش آمدید) نومبر 2012ء کا شمارہ عید کی خوشیوں کو دوبالا کرگیا ہے۔ اس دور گرانی میں سرگزشت جیسے مؤقر اور معلوماتی علمی وادبی جریدے کی قیمت 60 روپے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آپ مبارک باد کے حق دار ہیں کہ آپ نے روز اول سے آج تک سرگزشت کا صوری اور معنوی معیار گرنے نہیں دیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد اور علی سفیان آفاقی کی تحریروں میں قدیمی اندرون لاہور کا ذکر پڑھ کر مزہ دوچند ہوگیا کیونکہ لاہور روز اولین سے ہی ہمارے لیے باعث کشش رہا ہے۔ لاہور کے باغات، کتب خانے، درس گاہیں مساجد، منادر، گوردوارے، کلیسا، امام بارگاہیں، خانقاہیں، قلعے، مڑھیاں، قبرستان، مقابر اور فصیل شہر کے صدیوں قدیم دروازے دلربائی جاذبیت اور انفرادیت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مزاحمت لاہور کی رگ حیات ہے۔ ہزاروں برسوں میں اس نے ان گنت غیر ملکی طوفانوں اور لشکروں کا سد راہ بننے کا شرف حاصل کیا ہے۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے اسی شہر بے مثال میں فرنگی استبداد کے خلاف صدائے بغاوت واحتجاج بلند کی تھی 19 مارچ 1940ء کو خاکسار مجاہدین نے بھی اسی قریہ انتخاب کی گلیوں کو اپنے لال لہو سے رنگین کیا تھا۔ 13 دروازوں کے اندر آباد لاہور کی ایک ایک اینٹ ہزاروں برسوں کی تاریخ وتمدن کی امین ہے۔ ہزار ہا تہذیبوں کی رنگارنگی اس بستی کی دھڑکنوں میں رچی بسی ہے۔ ہزاروں برسوں سے یہ شہر راوی کے نشیلے پانیوں سے اپنا دکھ درد بانٹ رہا ہے۔ لاہور خطۂ عشق محمد بھی ہے اور نواسۂ رسولؐ امام عالی مقام جناب حسینؓ کی ماتم سرا بھی ہے۔ لاہور ہی رام کی جنم بھومی بھی ہے، لاہور ہی داتا کی نگری بھی ہے۔ لاہور ہی ارجن کا مسکن بھی ہے لاہور ہی شاہ حسین کا مدفن بھی ہے۔ لاہور کے اوصاف حمیدہ کی فہرست بہت طوالانی ہے۔ لاہور رنگ برنگے تہواروں میلوں اور رونقوں کا نگر ہے۔ لیکن بدقسمتی سے لاہور کے اوراق گزشتہ کو سمیٹا نہیں گیا۔ ہم لاہور کے اوراق پارینہ کو خوش سلیقگی سے مدون نہیں کرپائے۔ آج تک لاہور کی اس پائے کی

تاریخ لکھی نہیں پائے جس درجے کی تاریخیں آگرہ فتح پور سیکری یا دہلی وغیرہ کی تحریر کی جاچکی ہیں۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے اور کسی فرد واحد کے بس میں بھی نہیں کہ وہ اس ہزار داستان قسم کے شہر کی صدیوں پرانی تاریخ یک وتنہا قلم بند کرے۔ ماضی میں بعض جرائد نے لاہور پر مستند اور ضخیم دستاویزی نمبر شائع کیے ہیں۔ اگر سرگزشت کا ایک لاہور نمبر شائع کیا جائے تو کیا کہنے۔ لاہوریات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک یادگار تحفہ کسی خزانہ عامرہ سے کم نہ ہوگا۔''

☆ ناصر حسین رند کا مکتوب بہاولپور سے ''خط لکھنے کا بالکل ارادہ نہ تھا لیکن سرگزشت میں اتنی زبردست تحریر تھی جن کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوتا۔ سب سے پہلے ملالہ کے بارے میں آپ کے خیالات سے صد فی صد متفق ہوئے۔ واقعی پاکستانی قوم ہر فرقے ہر مسلک کے لوگ آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احتجاج پر متحد ہوگئے تھے ایسے میں ملالہ کا واقعہ ہونا کس کے لیے فائدہ مند ہوا۔ اگر سرگزشت کے قارئین اس سازش کو جاننا چاہتے ہیں تو پھر وہ سرگزشت میں شائع ہونے والے شاہکار تحریر یروشلم کا مطالعہ فرمائیں، تمام بھید کھل جائے گا۔ وہ مہینہ آن پہنچا جس کا کافی عرصے سے انتظار تھا پراسرار مہینہ، 21 دسمبر 2012ء کی گھڑی آن پہنچی اس سے پہلے 12-12-12 ایسے پراسرار ہندسے ہیں جو پھر کبھی نہ آئیں گے اس کے بعد 31۔ دسمبر 2012ء اس سال کا آخری دن آخری رات تجسس سے بھرپور ہوگی۔ دسمبر سے پہلے پہلے 30 اکتوبر کو امریکا میں آنے والا سینڈی طوفان ان حالات کی ایک جھلک تھی۔ ویسے امریکا جس طرح کی فلم بناتا ہے اس طرح کے حالات سے دوچار ہوجاتا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر 9/11 والے واقعے سے پہلے ایک فلم بنائی تھی جس میں طیارہ ٹوئن ٹاور سے ٹکرا جاتے ہیں اس کے کچھ عرصے بعد ایسا ہی ہوا، یہ سب حیران کن ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ کا ذکر ادھر ہم نے کیا ادھر سرگزشت میں حاضر تھا یہ ہماری پیش گوئی تھی یا کہ سرگزشت کا جادو۔ ویسے ہاکنگ کی یہ مختصر تحریر تھی۔ آج کل وہ اپنی پلکوں کے ذریعے کمپیوٹر کی مدد سے کتاب لکھ رہا ہے۔ شاید قدرت نے اسے گوشت کا لوتھڑا اس لیے بنادیا ہے کہ وہ کائنات کے بھید کھول رہا تھا! ابھی اس پر بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ باہمت نمبر میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ جادوگر، لیونل میسی کی شاندار آپ بیتی تھی، جیسے ہمارے ہاں ایشیا میں تین سپر اسٹار ہیں دلیپ کمار، امیتابھ بچن، شاہ رخ خان ایسے براعظم امریکہ بلکہ دنیا کے سپر اسٹار برازیل کے ''پیلے'' ارجنٹینا کے میراڈونا اور لیونل میسی'' ناقابل یقین، بھجوتا اور پراسرار گلاب، اسرار سے بھرپور تحریریں تھی۔ رات کو پڑھنے کا مزہ دوبالا ہوگیا۔ پراسرار گلاب کے پودے کا اتنا طویل ہونا شاید اس وجہ سے تھا کہ اس کے نیچے جو قد آور انسان دفن تھے اس کا تعلق ان سے تھا۔ ویسے فرانس اور کئی اور ملک میں بہت لمبے لمبے انسانی ڈھانچے دریافت ہوئے۔ انٹرنیٹ پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ دوسری مخلوق بھی وجود رکھتی ہے۔ یاجوج ماجوج بھی اس دنیا میں موجود ہے اور دجال بھی دیو کی شکل میں کسی جزیرہ کے غار میں قید ہے۔ ہمارے ایک دوست نے عرب سے میسج بھیجا ہے۔ ''ڈیئر ناصر سرگزشت میں تمہارا خط پڑھا، تمہاری تجویز شاہ زور نمبر کے بارے میں جاننے کا تجسس ہوا۔ کاش سرگزشت ایسا نمبر شائع کرتا! اور اگر تم ان نام جیسے حضرت شمعونؑ، گل گاش، ہرکولیس، تارزن، دنیا کے طاقت ور انسان، شیر خدا حضرت علیؓ کا نام بھی شامل کردیتے تو سونے پر سہاگا ہوتا۔ تمہارا دوست عبدالرشید خان بلوچ سعودی عرب۔ (عبدالرشید کا شکریہ) سمیرا ساجد سمیرا تبسم کا نام آخر میں تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط میں دیکھ کر دل اداس ہوگیا۔ 16 تاریخ تک خطوط کی تاریخ بڑھا کر دل خوش کردیا ہے۔ (شکریہ)''

☆ بابر علی جمالی کا خط نواب شاہ سے ''بچپن میں ہی ابن صفی ایچ اقبال مظہر کلیم، اظہر کلیم کی کتابیں پڑھ کر میں وقت سے پہلے جوان ہوگیا اور نظر کمزور ہوگئی۔ یہ موٹا چشمہ چھٹی جماعت میں لگ گیا تھا۔ ایکس ٹو، بلیک زیرو، جولیا کیپٹن صفدر پر موو نے مزید دماغ خراب کردیا۔ ہر وقت شیخ چلی کی طرح خوابوں میں رہتے کہ کوئی انگوٹھی مل جائے اور پہنتے ہی ہم غائب ہوجائیں یا کوئی ایسا چشمہ مل جائے جس سے ہم سب کچھ دیکھ سکیں۔ آگے چل کر نواب محی الدین صاحب کی کہانیاں جو پڑھیں تو جو تھوڑی بہت کسر باقی رہتی تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ سسپنس ڈائجسٹ نے الیاس سیتاپوری صاحب مرحوم (اللہ جنت نصیب کرے) کی تاریخی کہانیاں شائع کرکے بہت نیکی کا کام کیا۔ مرحوم نے تقریباً پورے ڈائجسٹ کو سنبھال رکھا تھا ایک ہی کہانی پڑھ کر رقم وصول ہوجاتی تھی۔ اب میں نے بھی چھوٹی سی کوشش کی ہے جس میں بہت زیادہ غلطیاں ہوں گی امید ہے کہ نوک پلک سنوار کر جگہ دیں گے۔'' (اس پرچے سے فارغ ہوکر پڑھ لیا جائے گا پھر فیصلہ ہوگا کہ یہ سرگزشت کے مزاج کی کہانی ہے یا نہیں)

تاخیر سے موصول خطوط:

عارف حسین، سکھر۔ شاہ رحمٰن۔ نسیم الدین خان فہمی اللہ (نواں کوٹ)۔ نوید شہزاد، احسن فاروقی، محمد محمود، نازش انصار، وسیم منصور فاروقی، ملک میاں سرور (لاہور)۔ محمد ظفر، سید نجم الحسن، انجم تسلیم (سیالکوٹ) عاصم احسن، فاروق خان (جھنگ) نثار چغتائی۔ فہیم ارباز خان (ملتان) فرحان خان، رعنا ریاض (چنیوٹ) فرحت حسین، زینب مرزا، رضا احسن، نعمان (پشاور)۔ محمد رمضان، ادریس محمد خان (کراچی)۔ زہرہ گوہر (کراچی)۔

☆☆☆

ڈاکٹر ساجد امجد

زندگی کے کٹھن نشیب و فراز سے گزر کر شہرت کی بلندیوں کو چھو لینے والے قلم کار، جس کی ہر سطر میں گہرائی و گیرائی کا سمندر سمویا ہوتا تھا۔ اس نے ثابت کیا کہ فکر و فن کی دنیا کا کبھی زوال نہیں۔

اردو ادب کے ایک باکمال صاحبِ قلم کا زندگی نامہ

محل میں گویا سناٹے کا راج تھا۔ باتیں بھی سرگوشیوں میں ہو رہی تھیں۔ پھر آوازیں تیز ہوئیں۔ ایک کو دوسرا کچھ سمجھانے لگا، بتانے لگا۔

"راجا کے بیٹے پر قتل کا الزام آیا ہے۔ بیٹا اکلوتا ہے۔ اکلوتا نہ بھی ہو دو چار بھی ہوں تو بھی بیٹا تو بیٹا ہوتا ہے۔ مخالفین نے ایسا طوفان کھڑا کیا ہے کہ راجا کے لیے سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے۔ معاملہ عدالت میں نہ گیا ہوتا تو کچھ کیا بھی جا سکتا تھا۔ اب تو قانون کی جنگ ہے اور راجا جی۔ بیٹے کو بچا لیں یا سولی لٹکتا دیکھیں۔

وسطی ہند کی ریاست "سکتی" کے راجا کے اکلوتے بیٹے پر قتل کا الزام آ گیا تھا۔ مقتول کے وارث ایسے با اثر تھے کہ راجا کے سامنے آ گئے اور معاملہ عدالت میں لے گئے۔ اب راجا زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔ پیروی کے لیے کسی وکیل کا انتظام کرنا تھا۔ بیرسٹر آسوتوش اس قسم کے مقدمات کے لیے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ راجا نے انہیں خط لکھ دیا۔ امید تو یہی تھی کہ بیرسٹر صاحب خط کے جواب میں دوڑے چلے آئیں گے لیکن ان کے بجائے ان کا خط آ گیا۔

"میں بیماری کے سبب آنے اور پیروی کرنے سے معذور ہوں۔ اپنے بیٹے بیرسٹر رام تارا ناتھ کو بھیج رہا ہوں۔ میرے لڑکے کی قابلیت میں کوئی شک نہیں۔ آپ یہی سمجھیں گے جیسے میں آ گیا۔"

خط بڑی اپنائیت سے لکھا گیا تھا لیکن راجا کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کا لڑکا نہ جانے کس عمر کا کس قابلیت کا ہو۔ مقدمے کا کیا حشر ہو۔

ابھی وہ پوری طرح سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ خط کا پیچھا کرتے ہوئے سر آسوتوش کا بیٹا بھی آ گیا۔ تیس سے نکلتی ہوئی عمر، چہرے پر ذہانت کے آثار، شاندار لباس پہنے راجا کے سامنے کھڑا تھا۔

"میرا نام بیرسٹر تارا ناتھ ہے۔ ڈیڈی کا خط آپ کو مل گیا ہو گا۔"

"خط تو مجھے مل گیا لیکن میرا بیٹا اکلوتا ہے۔"

"میں بھی اکلوتا ہوں۔"

"آپ کی بات اور ہے۔ میرے بیٹے کی زندگی کا انحصار مقدمہ جیتنے پر ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ میری قابلیت پر شک کر رہے ہیں۔"

"قابلیت پر نہیں تجربے پر۔ آپ کی عمر نے کتنے

مقدمے دیکھے ہوں گے۔"

"میں سر آسوتوش کا بیٹا ہوں۔ میرے گھر میں قانون کی روٹی کھائی جاتی ہے۔ اگر آپ کے بیٹے نے قتل کیا بھی ہوگا تو میں اسے صاف بچالے جاؤں گا اور پھر ڈیڈی کے مشورے بھی مجھے ملتے رہیں گے۔ ان سے میں رابطے میں رہوں گا۔"

"وہ آجاتے تو مجھے اطمینان ہوجاتا۔"

"آپ اطمینان رکھیں بس آپ مجھے اپنی ریاست کے دیوان سے ملوادیں تاکہ میں ان سے کیس کے بارے میں ضروری معلومات لے لوں۔"

ریاست "سکتی" کے دیوان نواب برہان الدین تھے۔ تارا ناتھ کو ان کے پاس بھجوادیا گیا۔ نواب صاحب نے ایک وکیل کو بھی بلوالیا تھا تاکہ وہ معاملات کو قانونی اصطلاحوں کے ساتھ سمجھا سکے۔ وہ دونوں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ ایک لڑکی تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ باپ کے پاس مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو وہ جانتی تھی لیکن تارا ناتھ اس کے لیے اجنبی تھا۔ وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔ باپ سے کچھ بات کی اور واپس چلی گئی۔ تارا ناتھ کی آنکھیں اس کے ساتھ دروازے تک چلی گئی تھیں۔

"میری بیٹی تھی۔ معاف کیجیے گا آپ لوگ ڈسٹرب ہوئے۔"

تارا ناتھ ڈسٹرب ہوگیا تھا لیکن ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔

ضروری فائلیں دیکھیں، کئی سوالات کیے اور پھر راجا کے محل چلا گیا جہاں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

مہمان خانے میں پہنچتے ہی اسے نواب برہان الدین کی صاحبزادی کا خیال آگیا، کتنی شوخ اور چنچل تھی اور خوبصورت بھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی ہرنی راہ بھٹک کر صحرا باغ میں نکل آئی ہو یا کوئی تتلی راستہ بھول گئی ہو۔ اس نے چند باتیں کیں لیکن کتنی نرم تھی اس کی آواز، وہ اچانک بیرسٹر سے شاعر بن گیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ یہاں قانونی گتھیاں سلجھانے آیا ہے۔ اس نے جو نوٹس تیار کیے تھے انہیں نکالا اور ٹائپ رائٹر پر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن دیوان صاحب کا ڈرائیور موٹر لے آیا۔ اسے اپنا وکالت نامہ جمع کرانے عدالت جانا تھا۔ دیوان صاحب نے یہ موٹر اسی لیے بھیجی تھی۔

عدالت سے واپسی میں اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ دیوان صاحب کی کوٹھی پر لے چلے۔ اسے ان سے کوئی کام نہیں تھا لیکن کام تو نکالا جاسکتا ہے۔ وہ اس کیس کے بارے میں سوالات کرنے کے بہانے تراش سکتا تھا۔

دیوان صاحب گھر پر ہی تھے کیونکہ موٹر عدالت گئی ہوئی تھی۔ تارا ناتھ کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔

"اچھا ہوا آپ بھی آگئے۔ راجا صاحب نے طلب کیا تھا۔ آپ بھی ساتھ ہوں گے تو راجا صاحب کی اداسی دور کرنے میں مجھے مدد ملے گی۔ وہ اس مقدمے کے سلسلے میں بہت پریشان ہیں۔ آپ تسلی دیں گے تو انہیں اطمینان ہوجائے گا۔"

وہ موٹر سے اترنے بھی نہیں پایا تھا کہ راجا صاحب کے پاس جانا پڑ گیا۔ اسے دیکھ کر راجا کے چہرے پر بھی وہی خوشی دوڑ گئی تھی جس کا اظہار کچھ دیر پہلے نواب برہان الدین کا چہرہ کرچکا تھا۔

"میں نے کیس کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ بھگوان کی کرپا سے چند پیشیوں میں فیصلہ آپ کے حق میں کرلوں گا۔"

"میں آپ کو فیس نہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔"

"آپ کے وعدے نے مجھے بہت کچھ دے دیا۔"

اتنی گفتگو کے بعد سلسلۂ کلام ریاست کے انتظامات، مخالفین کی سازشوں اور اپنوں کی عداوتوں کی طرف چلا گیا۔ یہ باتیں دیوان اور ریاست سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے تارا ناتھ بڑھ چڑھ کر نواب برہان الدین کی تعریف کررہا تھا تاکہ وہ اس سے خوش ہوجائیں۔

جب محفل برخاست ہوئی اور وہ نواب صاحب کے ہمراہ باہر نکلا تو نواب صاحب اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے تھے۔

"بھئی تارا ناتھ، اس کیس کے سلسلے میں نہ جانے آپ کو کب تک یہاں رہنا پڑے۔ دل گھبراتا ہوگا۔ ہماری طرف نکل آیا کیجیے۔"

"میں نے آپ کے دیوان خانے میں شطرنج رکھی دیکھی ہے۔" تارا ناتھ نے کہا "کیا آپ شوق فرماتے ہیں۔"

"شوق تو ہمیں بھی ہے لیکن ہماری صاحبزادی کو تو جنون ہے۔۔ کھیلتی بھی اتنا اچھا ہے کہ ہمیں بھی مات دے جاتی ہے۔"

"نواب صاحب، ان کے ہاتھوں ہارنا ہمیں قبول نہیں۔ مزہ تو آپ کے ساتھ کھیلنے کا ہے۔"

"چلیے ہمارے ساتھ سہی۔ آپ آئیں تو سہی۔"

"مقدمے کی تیاری سے فرصت ملی تو ضرور آؤں گا۔"

وہ واقعی چند روز بے حد مصروف رہا۔ جب ذرا فرصت ملی تو وہ نواب صاحب کی طرف چلا گیا۔ اسے دیکھتے ہی نواب صاحب کے ایک اشارے پر نوکروں نے بساط بچھادی۔ نواب صاحب کو جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ رام ناتھ نہایت اچھا کھلاڑی ہے

اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ نواب صاحب کو صاف مات ہوگئی۔ نواب صاحب کو یہ "مات" شاید ہضم نہیں ہوسکی تھی۔ انہوں نے فوراً اپنی صاحب زادی کو طلب کرلیا۔ بساط پھر بچ گئی۔ رام ناتھ نے پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ یہ بازی وہ ہار جائے گا لیکن شکست تک جانے میں وہ بہت دیر لگادینا چاہتا تھا تاکہ وہ لڑکی دیر تک اس کے سامنے بیٹھی رہے

وہ سوچ سوچ کر پانسا چلتا رہا، مشکلات کھڑی کرتا رہا۔ اس بہانے باتیں کرنے کا موقع بھی ملتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ کوشش کے باوجود اس لڑکی نے ایسی غلط چال چل دی کہ رام ناتھ چاہتا بھی تو اسے شکست سے نہیں بچا سکتا تھا۔ رام ناتھ کو اپنے جیتنے کا افسوس ضرور ہوا لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں پھر بھی نہ آسکی کہ نواب صاحب کی صاحبزادی نے جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں شکست کیوں کھائی۔

مقدمے کی سماعتیں جاری تھیں۔ پوری ریاست میں اس کیس کو بڑی دلچسپی سے دیکھا جارہا تھا۔ ہر پیشی کے بعد راجا کے بیٹے کی جیت کے امکانات بڑھتے جارہے تھے اور بالآخر ایک دن وہ بھی آیا کہ عدالت نے اسے بے قصور قرار دے کر باعزت بری کردیا۔ راجا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ عدالت سے واپس آتے ہی اس نے رام ناتھ کو طلب کیا۔

"رام ناتھ، آج میں بہت خوش ہوں۔ تم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اب مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے دو۔ میں نے اسی دن کے لیے کوئی فیس طے نہیں کی تھی۔ جو فیس تم کہو گے میں وہ ادا کروں گا۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔" رام ناتھ شاید اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ اس نے وہ مانگ لیا جو وہ کئی مہینے سے سوچے بیٹھا تھا۔

"میں آپ کی ریاست کے دیوان نواب برہان الدین کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہی میری فیس ہوگی۔"

"رام ناتھ، تمہیں پتا ہے تم کیا مانگ رہے ہو۔"

"میں نے پورے ہوش وحواس میں بات کی ہے۔"

"فیس ہمیں ادا کرنی ہے۔ ہم سے وہ چیز مانگو جو ہمارے اختیار میں ہو۔"

"یہ تو آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ نواب صاحب سے درخواست کریں، آگے میری قسمت۔"

"رام ناتھ یہ تمہاری کیسی ضد ہے۔ تمہارا تعلق ہندو مذہب سے ہے اور وہ لڑکی مسلمان ہے۔ تم شادی شدہ ہو اور ایک لڑکے کے باپ بھی۔"

"میں ان حقائق سے انکار نہیں کرتا لیکن پھر بھی درخواست کروں گا کہ آپ بات کرکے دیکھیں۔ اس کے علاوہ میری کوئی فیس نہیں۔"

رام ناتھ نے فیس کی شرط اتنی کڑی رکھ دی تھی کہ راجا بااختیار ہوتے ہوئے بھی بے اختیار نظر آرہا تھا۔ اس نے رام ناتھ سے وعدہ کرلیا تھا لیکن اب بات چھیڑنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ وہ کسی کی لڑکی کو رام ناتھ کی بیوی بنانے پر اس کے والدین کو مجبور نہیں کرسکتا تھا لیکن بہر حال ریاست کا دیوان اس کا ملازم تھا۔ یہی ایک ایسی بات تھی جس سے راجا کی ہمت بندھی اور اس نے نواب برہان الدین کو بلا بھیجا۔

"نواب صاحب، اس وقت جو بات میں آپ سے کرنے والا ہوں اس کا تعلق نہ میری ذات سے ہے نہ ریاست کے مفاد سے اس لیے میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا البتہ آپ سے درخواست ضرور کروں گا کہ جو آپ سے کہوں اس پر ٹھنڈے دل سے غور ضرور کریں۔ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہوا تو مجھے خوشی ضرور ہوگی۔ میں سمجھوں گا آپ نے میری لاج رکھ لی۔"

"راجا صاحب، آپ نے کوئی بات کہتے ہوئے کبھی اتنی دیر نہیں لگائی۔ فرمائیے ایسی کیا بات ہے۔ مجھے آپ ثابت قدم پائیں گے۔ میں نے آج تک آپ کی کوئی بات نہیں ٹالی۔ شاید یہ بھی نہ ٹال سکوں۔"

"رام ناتھ بیرسٹر کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔"

"جاننا کیا، انہوں نے تو اپنی صلاحیتوں اور خوش اخلاقی سے میرے لیے اپنے دل میں جگہ بنالی ہے۔"

"انہوں نے میرے بیٹے کو سزائے موت سے بچایا ہے۔ یہ ان کا مجھ پر احسان ہے۔"

"یہ سب تو میرے سامنے کی بات ہے۔ میں تو خود آپ سے کہنے والا تھا کہ اسے فیس کے طور پر بھاری رقم ادا کی جائے۔"

"وہ اپنی فیس کی رقم مجھ سے نہیں آپ سے وصول کرنے پر بضد ہیں۔"
"میں خود انہیں انعام کے طور پر کچھ نہ کچھ دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"
"میں نے اسی لیے آپ کو بلایا ہے۔"
"کیا انہوں نے کوئی خاص فرمائش کی ہے۔"
"جی ہاں، بات تو عجیب سی ہے لیکن جب انہوں نے کہہ ہی دیا ہے تو مجھے آپ سے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"
"فرمائیے راجا صاحب!"
"وہ آپ کی صاحبزادی سے شادی کے خواہش مند ہیں۔"
"راجا صاحب، جہاں تک میرے علم میں ہے۔ وہ شادی شدہ ہیں اور پھر ان کا تعلق میرے مذہب سے بھی نہیں۔"
"میں یہ باتیں ان سے کرچکا ہوں۔ آپ میری خاطر ان باتوں کو نظرانداز کر کے کچھ سوچیں۔ بھابی جی سے بھی مشورہ کرلیں۔"
نواب صاحب کو غصہ تو بہت آیا لیکن راجا سے بگاڑ کرنا بھی عقل مندی نہیں تھی کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ راجا کا جھکاؤ رام ناتھ کی طرف ہے۔ انہوں نے اپنی بیگم سے مشورہ کرنے کا بہانہ کیا اور اٹھ کر چلے آئے۔
وہ اپنے محل میں پہنچے تو روایتی غصہ ان کے چہرے پر تھا۔ بیوی نے سنا تو وہ بھی تلملانے لگیں۔ شام تک دونوں کی یہی کیفیت رہی لیکن پھر یہ طے ہوا کہ کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ راجا کو ناراض کر کے انکار تو کیا جاسکتا تھا لیکن راجا اس کا بدلہ کسی اور طرح سے لے سکتا تھا۔
نواب صاحب اس باریک مسئلے پر کئی دن تک سوچتے رہے پھر بیگم کے مشورے سے دو ایسی شرائط تیار کرلیں جنہیں رام ناتھ قبول کر ہی نہیں سکتے تھے۔ پہلی شرط یہ تھی کہ تارا ناتھ کو مسلمان ہونا پڑے گا۔ دوسری شرط یہ کہ گھر داماد کے طور پر رہنا ہوگا۔
دونوں شرائط ایسی تھیں کہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی اور ایسی بھی تھیں کہ باپ کی طرف سے اس کا ردِعمل سخت ہونا تھا۔ ان خدشات کے باوجود رام ناتھ نے دونوں شرائط قبول کرلیں۔ تمام ماجرا باپ کو لکھ بھیجا کہ ان کا ردِعمل معلوم ہوسکے۔ وہ بھی تارا ناتھ کے باپ تھے۔ تارا ناتھ اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا تھا تو وہ اس سے بڑا قدم اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ وہ اسے اپنی جائداد سے عاق کردیں گے۔ پھر یہ دھمکی پوری بھی ہوگئی۔ ساری جائداد بیٹے کی پہلی بیوی اور اس کے بعد پوتے کے نام کر کے بیٹے کو عاق کردیا۔
رام ناتھ نے اسلام قبول کر کے بدرالدین نام اختیار کرلیا۔
رام ناتھ کی پہلی بیوی کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ آکسفورڈ کی گریجویٹ تھی اور بنگالی زبان کی شاعرہ تھی۔ چاہتی تو بڑا ہنگامہ کھڑا کرسکتی تھی لیکن اس نے بڑے پن کا ثبوت دیا۔ وہ نہ صرف شادی میں شرکت کے لیے "سکھی" پہنچی، بلکہ اپنے بیٹے "منوہر" کو بھی ساتھ لائی اور دلہن کے پاؤں کو ہاتھ لگوا کر کہا "یہ آپ کا بیٹا ہے۔ یقین ہے آپ کا تابع فرمان رہے گا۔"
بدرالدین کی پہلی بیوی کے اس طرزِ عمل نے سب کے دل جیت لیے۔ دونوں سوتنوں کے درمیان دوری کے باوجود ایک قربت سی آگئی جو خط و کتابت کے ذریعے ظاہر ہوتی رہتی تھی۔
بے چاری پریم پدا (بدرالدین کی پہلی بیوی) کی قسمت میں مصائب ہی مصائب تھے۔ شوہر نے دوسری شادی کرلی تھی۔ یہ صدمہ کیا کم تھا کہ شوہر کی نشانی اس کا بیٹا منوہر صرف نو سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔ اس بے چاری پر تو پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب وقت تھا کہ کوئی اس کی دلداری کرے۔ بدرالدین کے اس وقت تک دو بچے پیدا ہوچکے تھے۔ ایک بیٹا حسیب الدین اور ایک بیٹی ممتاز النسا۔
بدرالدین گھر میں آکر بیٹھے تھے کہ بیوی نے پریم پدا کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ "آپ اسے یہاں بلا کر کیوں نہیں رکھ لیتے۔ آپ نے اسے طلاق تو نہیں دی ہے۔"
"اب یہ نہیں ہوسکتا۔ میں نے تمہارے والد کی گھر دامادی کی شرط قبول کی ہے۔ اب مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے یہاں لاکر رکھوں۔ اور پھر پتا جی یہ بھی نہیں مانیں گے۔ انہوں نے اسے مجھ سے دور رکھنے کے لیے ہی تو جائداد اس کے نام کی ہے۔ میں بھی یہ نہیں چاہوں گا کہ وہ میری محبت میں کھنچی چلی آئے اور جائداد سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسے یہ مشورہ بھی دینا بھی مت۔ چلی بھی آئے گی۔ وہ ہے بھی ایسی۔"
"مجھ سے اس کا سونا پن دیکھا نہیں جاتا۔ بے چاری کی گود بھی اجڑ گئی۔"

"افسوس تو مجھے بھی ہے۔ منوہر میرا بھی تو بیٹا تھا۔ خدا کے کاموں میں کس کا دخل۔"
"ایک بات کہوں۔ اس سے کہو حسیب الدین کو گود لے لے۔ جیسے وہ یہاں رہ رہا ہے وہاں رہتا رہے گا۔ مجھے بھی سکون ملے گا کہ پریم پدا کے ساتھ ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔"
"مسئلہ پھر وہی آتا ہے کہ حسیب الدین رام ناتھ کا نہیں بدرالدین کا بیٹا ہے۔ میں مذہب اسلام قبول کرچکا ہوں اور چاہوں گا کہ میرا بیٹا بھی مسلمان بن کر رہے۔"
"یہ بات تو پریم پدا سے کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ بچے کو اسلامی تعلیم دلوانے کا وعدہ کرے تو بے شک وہ اسے اپنے پاس رکھ لے۔"
پریم پدا سے بات کی گئی تو وہ فوراً تیار ہوگئی۔ اسلامی تعلیم دلوانے کا وعدہ کیا اور حسیب الدین کو گود لے لیا۔
بیٹی ممتاز النسا اپنی مسلمان ماں کے پاس رہی۔
بدرالدین کو بچوں کی بہار دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ ممتاز النسا نے ابھی عمر کی تین منزلیں طے کی تھیں کہ بدرالدین کا انتقال ہوگیا۔
حسیب الدین اپنی ہندو ماں کے پاس پرورش پاتا رہا اور ممتاز النسا کو والدہ اور نانی کا پیار ملا۔ انگریزی پڑھانے کے لیے انگریز گورنس رکھ دی گئی۔
ممتاز النسا نہایت ذہین بچی ثابت ہوئی۔ کم عمری ہی میں اردو، ہندی اور انگریزی میں مضامین لکھنے لگی اس کے برعکس ماں کے لاڈ پیار نے حسیب الدین کو بگاڑ دیا۔ ہر قسم کے عیش و آرام کے باوجود وہ تعلیمی سلسلہ قائم نہ رکھ سکا۔

☆☆☆

میر صفدر شاہ نامی بزرگ عہد ہمایوں میں ایران سے آکر دہلی میں مقیم ہوئے تھے۔ بعد میں یہ خاندان پٹنہ (عظیم آباد) منتقل ہوگیا۔
اس خاندان نے پہلی مرتبہ اس وقت تاریخ میں جگہ بنائی جب اس خاندان کے ایک فرد میر مدن نواب سراج الدولہ کی افواج کے سپہ سالار بنے اور پلاسی کے میدان میں آخری دم تک نواب کے ساتھ رہے اور دادِ شجاعت دی۔ انہی میر مدن کے ایک پوتے جنگ آزادی کے دوران پٹنہ میں مجاہدوں کی قیادت کرتے ہوئے شہید ہوئے یہ میر وارث علی تھے۔ ان کے بیٹے میر شجاعت علی جان بچانے کی غرض سے ہمالیہ کی ترائیوں میں روپوش ہوگئے۔ جنگ آزادی دم توڑ گئی اور انگریزوں کی حکمرانی قائم ہوگئی تو انہوں نے اس خاندان کی تمام جائداد ضبط کرلی۔ چند برس بعد میر شجاعت علی، سید شجاعت حسین کے نام سے پٹنہ لوٹ آئے۔
سید شجاعت حسین کے دو بیٹے تھے۔ سید اکبر حسین اور سید اصغر حسین۔
جس خاندان کے افراد کبھی سراج الدولہ کے ہمراہ کبھی مجاہدین آزادی کے ساتھ انگریزوں سے لڑتے رہے وقت بدلا تو اسی خاندان کی اولادیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور انگریزی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئیں۔
سید اکبر حسین اسی خاندان کے فرد تھے جنہوں نے علی گڑھ سے میٹرک کیا اور ٹامس انجینئرنگ کالج رڑکی سے گریجویشن کرنے کے بعد اولاً سکھر بیراج اور پھر مہاندی (مدھیہ پردیش) میں نہری نظام سے متعلق بہ طور انجینئر خدمات سرانجام دیں۔
یہی سید اکبر حسین تھے جن کی شادی بدرالدین کی بیٹی ممتاز النسا سے انجام پائی۔ ممتاز النسا کی اس وقت عمر سترہ برس تھی لیکن ان کے مضامین تہذیب نسواں اور زیب النسا نامی رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے۔ علم و ادب سے ایسا شغف تھا کہ بمبئی اور کلکتہ سے کتابیں منگوایا کرتی تھیں۔ جو جائداد ان کے نام بحال ہوئی تھی اس کی دیکھ بھال بھی ان ہی کی ذمہ داری تھی۔ اکبر حسین تو ہفتے میں ایک بار گھر آتے تھے ورنہ ملازمت کے سلسلے میں باہر ہی رہتے تھے۔
ممتاز النسا کے دو بیٹے ہوئے مظفر حسین اور اختر حسین۔
اختر حسین کی عمر ابھی پورے تین سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے بچپن کو دو عظیم صدموں سے سابقہ پڑ گیا۔ پہلے نانی کا انتقال ہوا پھر ایک مہینے بعد ہی والدہ کا انتقال ہوگیا۔
اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری گھر کی ایک پرانی ملازمہ پیرن بی کے سپرد ہوئی جس نے یوں اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا جیسے مرغی اپنے پروں تلے چوزوں کو چھپا لیتی ہے۔ پیرن بی اس گھر پر آنے والی آفتوں سے غالباً ایسا ڈر گئی تھی کہ دونوں بچوں کو رشتے داروں کے گھر بھی نہیں جانے دیتی تھی۔ کوئی رشتے دار اگر کچھ کہتا تو پیرن بی یوں خم ٹھونک کر سامنے آتی کہ کسی کا کوئی زور نہ چلتا۔ وہ ایسی دبنگ تھی کہ اس کے سامنے کسی کی ایک نہ چلتی۔ اکبر حسین پہلے بیوی سے ڈرتے تھے اب پیرن بی سے ڈرنے لگے۔ ہفتے پندرہ دن میں ایک مرتبہ گھر آتے۔ بچوں کو دیکھتے اور چلے جاتے۔

اکبر حسین کی والدہ پٹنہ میں رہتی تھیں۔ ان کے اصرار پر اکبر حسین نے دوسری شادی کرلی۔ دوسری بیوی کو لے کر رائے پور آئے کہ بچوں سے ملوایا جائے۔ پیرن بی نے دیکھا کہ ایک غیر عورت گھر میں گھسی چلی آتی ہے اور اکبر حسین کے ساتھ ہے تو پوری بات سمجھ میں آگئی۔ اس نے جھٹ دروازہ بند کردیا۔

''یہ گھر مظفر اور اختر کی ماں کا ہے۔ کوئی اور عورت یہاں قدم نہیں رکھ سکتی۔''

''یہ کوئی اور عورت نہیں میری بیوی ہے۔'' اکبر حسین نے چیخ کر کہا۔

''ہوئی تو سوتیلی ماں۔ خدا جانے کس کس طرح بچوں کے کان بھرے۔ تم اپنی دلہن کو لے کر پٹنہ چلے جاؤ۔ یہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''بچوں سے تو پوچھ لو۔ شاید وہ ماں سے ملنا چاہیں۔''

''انہیں سگی سوتیلی کا فرق کیا معلوم۔ جب بڑے ہوجائیں تو معلوم کرلینا۔''

اکبر حسین کو بچوں سے مل کر واپس جانا پڑا۔

اب پیرن بی کی طرف سے اکبر حسین کو یہ اجازت تھی کہ ان کی دوسری بیوی پٹنہ میں رہے گی رائے پور میں نہیں رہ سکتی۔ اکبر حسین کئی کئی مہینوں تک اپنی بیوی کے پاس پٹنہ چلے جاتے۔ دونوں بچوں کو باپ سے دور اکیلے گھر میں رہنا پڑتا۔ اختر کچھ زیادہ ہی حساس تھا۔ اس نے اپنے لیے تنہائی اور گوشہ نشینی کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ باپ، سوتیلی ماں اور پیرن بی کی تکون میں وہ پیرن بی کی طرف جھکتا چلا گیا۔ باپ کی طرف سے وہ دوری پیدا ہوئی جو بعد میں بڑھتی ہی چلی گئی۔ جو محبت قربت سے جنم لیتی ہے اس کا موقع ہی نہ مل سکا۔ باپ کسی مہمان کی طرح گھر آتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ پیرن بی ہر وقت سوتیلی ماں کے خلاف اس کے دل میں زہر اتارتی رہتی تھیں اور وہ سوتیلی ماں لانے کا ذمہ دار باپ کو قرار دے کر اس کی طرف سے نفرت سی محسوس کرنے لگا تھا۔

اکبر حسین نہایت سادہ لوح تھے۔ ہر ایک پر اعتبار کرلیتے تھے لہٰذا بہت جلد مالی پریشانیوں نے انہیں گھیر لیا جائداد بھی اونے پونے فروخت ہوتی رہی یا دوسرے لوگوں کے ہتھے چڑھتی رہی۔ اختر کے ننھیال والے بچوں کی جائداد پر بہانے بہانے سے ہاتھ صاف کرتے رہے۔ بے چاری پیرن بی اس کی حفاظت کرسکتی تھی، اسے دیو پری اور جنات کی کہانیاں سناسکتی تھی۔ یہ کہانیاں اس کے تخیل کو نکھار سکتی تھیں لیکن اس بُڑھیا میں اتنی سمجھ تھوڑی تھی کہ وہ اس کی جائداد کی حفاظت کرتی، باپ کی عدم توجہی سے بچاتی یا اس کے ماموں حسیب الدین کی لوٹ مار سے اسے بچاتی جو ہر پھیرے میں بھانجوں کی جائداد کا کوئی نہ کوئی حصہ فروخت کر کے عیاشی میں اڑا رہے تھے۔

اختر حسین کا بچپن افسردگی اور ملال کی تصویر بن کر رہ گیا۔ ایک ایسے بچے کی طرح جس کا نہ کوئی باپ تھا نہ ماں، دوھیال تھی جہاں وہ جا نہیں سکتا تھا۔ ننھیال سے تعلق خود والد نے ختم کرلیا تھا۔ پیرن بی کی شفقت اور احتیاط باہر کے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے روکتی تھی۔ اس کی کل کائنات وہ کہانیاں تھیں جو وہ پیرن بی سے سنا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ ایسی ہی کہانیاں وہ بھی کسی کو سنائے۔ کبھی کبھی کوشش کرتا بھی تھا۔ پیرن بی سے کہانی سنتے سنتے پیرن بی کو کہانی سنانے لگتا تھا۔

ایک مرتبہ اکبر حسین پٹنہ سے رائے پور آئے اور اختر کی طرف غور سے دیکھا تو انہیں یوں لگا جیسے اختر اچانک بڑا ہوگیا ہے اور اب تک اسکول جانا شروع نہیں کیا۔

''پیرن بی، اختر میاں کتنے سال کے ہوگئے ہوں گے۔''

''خیر سے اس جون میں پانچ سال کے ہوجائیں گے۔''

''تم بھی بس کہانیاں سناتی رہتی ہو۔ اس کی تعلیم کی تمہیں فکر ہی نہیں۔ بھلا بتاؤ پانچ سال کا ہوگیا۔''

''میاں میں گھر میں بیٹھنے والی۔ یہ کام تو آپ کا ہے۔ ابھی جاؤ مولوی یاسین کے مکتب میں داخل کرادو۔ محلے کے بہت سے بچے وہیں جاتے ہیں۔''

اکبر حسین نے بھی انگریزی تعلیم سے پہلے ضروری سمجھا کہ اختر کو مذہبی تعلیم سے آراستہ کردیا جائے چنانچہ مولوی یاسین کے مکتب میں داخل کرادیا۔ بغدادی قاعدے سے آغاز ہوا۔ اس کے بعد قرآن مجید کا درس شروع ہوا۔ اختر بچپن ہی سے ذہین تھا۔ ذہین بچوں کی طرح سوالات کرنے کی عادت بھی تھی۔ وہ چند روز تو خاموشی سے سبق لیتا رہا لیکن بالآخر ایک دن بول ہی پڑا۔

''مولوی صاحب، آپ کیا پڑھا رہے ہیں میری تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں۔ آپ سمجھائیں بھی تو۔''

بات معقول تھی۔ مولوی صاحب کو چاہیے تھا کہ عربی عبارت کا ترجمہ کر کے اسے بتاتے، معنی سمجھاتے لیکن انہیں تو اختر کی اس جسارت پر ہی غصہ آگیا، تڑخ کر بولے۔

''خدا کا کلام بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ تیری سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔ جو پڑھا رہا ہوں، خاموشی سے پڑھتا رہ۔''

اختر اس وقت تو کچھ کہہ نہ سکا لیکن جب دوسرے دن مکتب جانے کا وقت ہوا تو اس نے جانے سے انکار کردیا اور پورا واقعہ من وعن بیان کردیا۔

''مولوی صاحب کہتے ہیں یہ خدا کا کلام ہے بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جب کوئی چیز سمجھ ہی میں نہ آئے تو پڑھنے سے کیا فائدہ۔ میں وہ تعلیم حاصل کروں گا جو میری سمجھ میں بھی آئے۔''

اکبر حسین کو بیٹے کے ان خیالات کا علم ہوا تو بات ان کی سمجھ میں بھی آگئی۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر اختر کو زبردستی بھیج بھی دیا تو کیا فائدہ ہوگا۔ اس کا پڑھنے میں دل نہیں لگے گا۔ وقت ضائع ہوگا۔ مولوی یاسین پر بھی غصہ تھا کہ انہوں نے ایسا جواب دیا۔

اختر نے مکتب جانا بند کیا تو مولوی صاحب نے اپنی ناکامی چھپانے کے لیے اکبر حسین کو قصوروار ٹھہرانا شروع کردیا۔ انہوں نے یہ بات مشہور کردی کہ اکبر حسین علی گڑھ میں پڑھ کر سرسید احمد کی پیروی میں نیچری خیال کے پیرو بن گئے ہیں۔ ان کا لڑکا بھی ان کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ یہ چرچا عام ہوا تو لوگوں نے اکبر حسین سے کہنا شروع کردیا۔

''آپ نہیں چاہتے کہ آپ کا بیٹا مذہبی تعلیم حاصل کرے۔ اس لیے آپ اسے مکتب نہیں بھیج رہے ہیں۔''

اکبر حسین نے بحث مناسب نہیں سمجھی اور یہ کہہ کر ٹالتے رہے ''لڑکا جب بڑا ہوگا تو مذہب کی معلومات خود حاصل کرلے گا۔''

رفتہ رفتہ لوگوں نے کہنا چھوڑ دیا۔

اکبر حسین نے اردو کے بجائے ہندی کے اسکول، میونسپل پرائمری اسکول رائے پور میں داخل کرادیا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا بننا ہے اور کیا پڑھنا ہے لیکن جیسے ہی اسے ہندی عبارت پڑھنے پر دسترس ہوئی، مطالعے کا شوق جنون کی حد تک اس پر غالب آگیا۔ اکبر حسین پٹنہ گئے ہوئے تھے کہ وہ ان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اس سے پہلے بھی اس کمرے میں جاتا رہا تھا لیکن تماشائی اور خریدار میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وہ آیا اور چلا گیا لیکن اب پڑھنے کا شعور آگیا تھا۔ کبھی اٹلس کھول کر بیٹھتا کبھی ڈکشنری کھول کر بیٹھ جاتا۔ کبھی ایک کتاب کبھی دوسری کتاب لیکن شوق ورق گردانی تک رہا۔ ابھی اتنی دسترس حاصل نہیں ہوئی تھی کہ اعلیٰ درجے کی ان کتابوں کا مطالعہ کرسکتا۔

وہ کچھ دنوں بے چین سا پھرتا رہا۔ پھر اسے ایک راہ سوجھ گئی۔ اس کی جیب میں کچھ پیسے تھے۔ وہ ہندی کی کتابوں کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس وقت وہ ہندی ہی پڑھ لکھ سکتا تھا۔ اس نے کہانیوں کی ایک کتاب خرید لی۔ اسے جیسے خزانہ مل گیا۔ اب تک وہ پیرن بی سے کہانیاں سنتا رہا تھا۔ خود پڑھنے کا مزہ ہی اور تھا۔ وہ اٹک اٹک کر پڑھتا رہا۔ دوسرے دن پھر کوئی نئی کتاب خریدنے پہنچ گیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ یہ کتابیں زیادہ تر قصے کہانیوں، غزلوں، گیتوں اور ناٹکوں پر مشتمل تھیں۔ یہ کتابیں اس کے تخیل میں رنگ بھرتی رہیں۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ ایسی ہی کہانیاں وہ خود لکھے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن ابھی وہ کیسے لکھ سکتا تھا۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ گھر کے قریب ایک کنویں کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے بچوں کے درمیان جا کر بیٹھ جاتا اور کتابوں میں پڑھی ہوئی کہانیاں مزے لے لے کر انہیں سناتا۔ کچھ کہانیاں اپنی طرف سے بھی گھڑ لیتا۔

وہ جہاں سے کتابیں خریدتا تھا، اس دکان کے مالک نے اس کا شوقِ مطالعہ دیکھتے ہوئے اسے ایک لائبریری کا پتا بتادیا۔

''کتابوں پر کب تک پیسے خرچ کروگے۔ لائبریری میں ہزاروں کتابیں ہوں گی۔ مزے سے پڑھو۔''

یہ لائبریری شہر کی پرانی بستی کے مندر میں واقع تھی۔ اس لائبریری کا انتظام مندر کے پجاری کے ذمے تھا۔

اختر مسلمان تھا۔ کبھی مندر نہیں گیا تھا، کتابوں کے لالچ میں اس نے مندر میں قدم رکھ دیا۔ پجاری نے اس کا خوب اچھی طرح سواگت کیا۔ ڈھیر ساری کتابیں اس کے سامنے رکھ دیں۔

پجاری نے اسے روز آتے اور دل لگا کر پڑھتے ہوئے دیکھا تو اسے یہ سہولت دے دی کہ وہ ایک کتاب گھر بھی لے جاسکتا ہے۔

ان کتابوں کا تعلق زیادہ تر جاسوسی اور طلسم وغیرہ سے ہوتا تھا لیکن بعض کا تعلق تاریخ سے بھی تھا اور اسے ایسی ہی کتابیں زیادہ مرغوب تھیں۔ انہی دنوں نپولین بوناپارٹ کی سوانح عمری اس کے سامنے آئیں اور وہ بہت دنوں تک نپولین بوناپارٹ بنا پھرتا رہا۔

وہ ساتویں جماعت میں تھا کہ ایک ہندو بنگالی استاد

نے .. مسلمان طالب علم ہونے کی وجہ سے اسے حکم دیا کہ وہ لائبریری میں آئی ہوئی اردو کتب کے نام رجسٹر میں درج کرے۔ استاد یہ سمجھے ہوئے تھے کہ مسلمان ہے اس لیے اردو تو آتی ہی ہوگی جبکہ اس کا حال یہ تھا کہ اردو کا ایک لفظ نہیں لکھ سکتا تھا۔ استاد کا حکم سنتے ہی وہ سہم گیا۔ وہ تو بغدادی قاعدہ چھوڑنے کے بعد اردو سے یک سر بے خبر ہوگیا تھا۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور حروف تہجی اسے یاد آگئے۔ ان حروف کی مدد سے اس نے حیرت انگیز طور پر کتابوں کے عنوانات پڑھ لیے اور رجسٹر پر انہیں منتقل کردیا۔ اسے ایسی خوشی ہوئی جیسے کوئی مہم جیت لی ہو۔ اسے یہ خوشی ہو رہی تھی کہ اب وہ ذرا سی کوشش سے اردو کی کتابیں بھی پڑھ سکے گا۔

اس کی تعلیم کا سفر طے ہو رہا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ تیز روی سے اس کی ذہانت آگے بڑھ رہی تھی وہ پڑھنے کے عمل سے گزر کر سوال کرنے کی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی نظر سے بعض ایسی انگریزی کتب گزریں جنہوں نے اس کے ذہن میں خدا کے وجود کو مشکوک کردیا۔ سرِشام آنگن میں چارپائی پر لیٹ کر گھنٹوں آسمان کو تکتا اور خود سے پوچھتا، یہ کائنات کب اور کیسے پیدا ہوئی اور زندگی کا مقصد کیا ہے۔ میٹرک تک آتے آتے اسے ان سوالات نے پریشان کردیا۔ اس کے ذہن نے اس دلیل کو تو قبول کرلیا کہ کائنات کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے لیکن اس کا منشا کیا ہے اور زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس کا جواب نہیں ملتا تھا۔ اس کا ایک دوست بسنت کمار بھی اسی قسم کے شکوک میں مبتلا تھا۔ دونوں ایسے مسائل سے گتھم گتھا تھے جنہیں آج تک بڑے بڑے نکتہ ور حل نہ کرسکے۔ ان کی خام خیالی یہ تھی کہ وہ ان مسائل کو حل کرلیں گے۔ سوچتے سوچتے سر دکھنے لگتا تو اسکول کی کتابیں پڑھنے بیٹھ جاتے۔ امتحان بھی تو دینا تھا۔

امتحان دے چکے۔ نتائج کا انتظار تھا۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ سوالات پھر سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔

''چلو علم کے سرچشموں کی طرف چلتے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب کوئی اور نہیں دے سکتا۔'' بسنت کمار نے ایک دن کہا۔

''ان سرچشموں سے تمہاری کیا مراد ہے۔''

''وہ سادھو ان رازوں کو ضرور جانتے ہوں گے جو دنیا چھوڑ کر پہاڑوں میں رہتے ہیں۔''

نوعمر اختر نے اس کی اس دعوت کو قبول کرلیا۔ دونوں لڑکے اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر رائے پور سے ڈیڑھ سو میل دور امر کنٹک نامی پہاڑ میں دریائے نربدا کے سرچشمے کے جنگلات میں سادھوؤں کے آشرموں کی طرف چل دیے۔

اس آشرم میں اس کی ملاقات سوامی پربھو سے ہوئی۔ وہ ایک طرح سے اس کی روحانی تربیت کرنے لگا۔ اپنی دانست میں اختر کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اختر کی پیاس بڑھتی رہی۔

سوامی پربھو سے اس کے مکالمے روز ہی ہوتے تھے لیکن ایک دن جو مکالمہ ہوا اس نے اختر کو مایوس کردیا۔ وہ سمجھ گیا کہ روشنی کہیں اور ملے گی۔

سادھو نے کہا۔ ''انسانی زندگی کے چار دور ہوتے ہیں۔ پہلا علم کی جستجو کا زمانہ جس سے تم گزر رہے ہو۔ پھر آدمی شادی بیاہ کے جنجال میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ عمر کا بڑا حصہ دنیا داری میں بسر ہوتا ہے۔ پھر بچے بڑے ہوجاتے ہیں۔ اس کو دنیا کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ دنیا کو اس کی۔ اگر وہ دانش مند ہے تو سب کو خیرباد کہہ کر جنگل کا رخ کرتا ہے اور باقی وقت حقیقت کی تلاش میں صرف کرتا ہے۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حصولِ علم دنیا میں رہ کر نہیں بلکہ دنیا سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔'' اختر نے کہا۔

''بالک، تو نے بالکل ٹھیک سمجھا۔''

اختر نے مایوسی سے گردن جھکائی ''اس علم کا کیا حاصل جو فرد کی ذات تک محدود ہوکر رہ جائے اور دنیا کو اس سے فائدہ نہ پہنچے۔''

اس طرف سے مایوس ہوکر اختر واپس چلا آیا۔ واپس آکر وہ پھر اپنی تنہائیوں میں ڈوب گیا۔ ماں کا انتقال ہوچکا تھا، والد دوسری شادی کرکے بیش تر باہر رہتے تھے، بڑے بھائی شاعر ہوگئے تھے اور کلکتہ میں رہنے لگے تھے۔ وہ تھا اور تنہائی۔ اس تنہائی نے اسے غور و فکر کی عادت ڈال دی تھی۔ غور و فکر بھی اپنے بارے میں نہیں اپنے ماحول اور کائنات کے بارے میں۔ اس کا انداز بالکل فلسفیوں کا سا ہوگیا تھا۔ اس کی تنہائی روحانی تنہائی تھی۔ وہ اپنے ہم عمروں سے بالکل مختلف تھا۔

والدہ کی رحلت اور ننھیال کی طرف سے درپیش مشکلات کے ساتھ ساتھ اختر کو والد کے غلط کاروباری فیصلوں اور ان کے باعث ان کی مالی پریشانیوں کی وجہ سے بھی بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا علم انہیں اس وقت ہوا جب میٹرک کے بعد اس نے اگلی منزلوں کی طرف بڑھنا چاہا۔ والد نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہہ دیا۔ ''میری آرزو تو یہ تھی کہ تم زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرو لیکن میں فی الحال اس قابل نہیں کہ تمہاری مدد کرسکوں۔''

وہ دھوپ میں کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس درخت کی چھاؤں میں بیٹھے۔ اس کا بڑا بھائی مظفر حسین شمیم کلکتہ میں تھا۔ اختر نے بھی سامانِ سفر باندھا اور کلکتہ پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ کئی مرتبہ رائے پور آیا لیکن کم از کم بیس سال بعد تک والد سے ملاقات نہ ہوسکی۔ دونوں کے درمیان فاصلے اتنے تھے کہ باپ کا خیال تک نہ آیا۔

کلکتہ جیسے بڑے شہر میں پہنچنے والا اختر حسین رائے پوری محض میٹرک کا طالب علم نہیں تھا بلکہ ایک بے چین روح تھی جسے ہندی، سنسکرت، اردو اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ابھی اس روح کی قسمت میں مزید بے قراریاں تھیں۔ ان ہستیوں سے ملاقات کا موقع ملا جو رائے پور میں کبھی نصیب نہیں ہوسکتی تھیں۔ کلکتہ صحافت اور سیاسی تحریکوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں اسے چراغ حسن حسرت، سلیم اللہ فہمی، محفوظ الحق اور نجیب اشرف ندوی کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ایک روز وہ رنگون ہوٹل کی طرف جانکلا۔ یہاں ایران کے ناکام انقلاب کے مجاہدین بیٹھا کرتے تھے۔ اسے ان لوگوں کی رفاقت ایسی پسند آئی کہ باقاعدگی سے رنگون ہوٹل جانے لگا۔

مسلم انسٹی ٹیوٹ میں مولانا وحشت کلکتوی، صلاح الدین خدا بخش، نواب نصیر حسین خیال جیسے دانش ور جمع ہوتے تھے۔ اختر کو ان دانش وروں کی گفتگو سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا رہا۔ آغا حشر، ابوالکلام آزاد وغیرہ سے بھی اسی کلکتہ شہر میں نیازمندی کا شرف حاصل ہوا۔

اسی دوران نجیب اشرف ندوی کے توسط سے اس کی ملاقات نیشنل لائبریری کے ناظم اعلیٰ خلیفہ اسد اللہ سے ہوئی۔ اس کتب خانے کے انکشاف نے اس کی دنیا کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس سے پہلے وہ ہر روز ٹرام میں بیٹھ کر ہگلی کے کنارے چلا جاتا تھا اور دریا کی سیر کرتا تھا لیکن اب اس کی منزل لائبریری تھی جو اس کی ذہنی سطح کو بلند سے بلند کرتی جارہی تھی۔

اس کے ذہن میں کب سے کئی کہانیاں کروٹیں لے رہی تھیں۔ کلکتہ کے علمی ماحول نے اسے اکسایا۔ وہ ایک روز قلم، کاغذ لے کر بیٹھ گیا اور اپنی زندگی کا پہلا افسانہ پراجیت، ہندی زبان میں لکھا۔ یہ افسانہ اس نے اپنے جدِ امجد میر مدن کی وفاداری کے پس منظر میں لکھا تھا۔

وہ چونکہ اوائل عمری ہی میں انگریزی ادب کا بھرپور مطالعہ کرچکا تھا اور اشتراکیت کے بارے میں بھی اس کا مطالعہ اور جستجو بڑھ چکی تھی جس کے نتیجے میں عالمی ادبی رجحانات کے ساتھ اس کا تعلق استوار ہوچکا تھا اس لیے اس افسانے کی اشاعت کے ساتھ ہی اسے ایک پختہ کار افسانہ نگار کا مقام حاصل ہوگیا۔

اس کے بھائی نے اس کا زورِ قلم دیکھا تو اسے اس قلم کو وسیلہ روزگار بنانے کا مشورہ دیا۔

''والد کی حالت تم دیکھ ہی رہے ہو۔ ان سے کسی قسم کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ تم ہندی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہو۔ اگر اس زبان میں مضمون نویسی کی مشق بڑھاؤ تو اپنے تعلیمی اخراجات خود برداشت کرسکتے ہو۔ خالی وقت میں بے شک افسانے لکھتے رہو۔''

اختر نے اس مشورے کو قبول کیا چنانچہ وہ ہندی مضامین مختلف اخبارات و جرائد میں چھپوانے لگا۔ ہندی ماہ نامہ وشال بھارت سے اس کا خاص تعلق استوار ہوگیا اور مدیر پنڈت بنارسی داس سے برادرانہ تعلقات قائم ہوگئے۔

اخبار ''وشوامتر'' میں جونیئر سب ایڈیٹر کی اسامی خالی تھی۔ پنڈت بنارسی داس کے مشورے پر وہ اخبار کے مدیر بابو مول چند کے پاس پہنچ گیا۔ بابو مول چند اس کم عمر مسلمان کو اپنے سامنے دیکھ کر سخت حیران ہوئے۔

''آپ تو مسلمان ہیں؟''

''جی ہاں''

''آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کو ہندی پر مطلوبہ دسترس حاصل ہے۔''

''آپ امتحان لے سکتے ہیں۔''

''آپ اس اداریے کو ہندی میں ترجمہ کردیں۔''

اختر نے مدیر کے مطالبے پر اداریہ بغیر لغت کی مدد سے ترجمہ کردیا۔ مدیر حیرت سے کبھی اسے دیکھ رہا تھا کبھی کاغذ کو۔

اخبار کے مالک کی مرضی کے برخلاف اختر کو منتخب کرلیا گیا۔ اسے کم عمر ترین اخبار نویس کا امتیاز حاصل ہوا۔ اسے شہر میں منعقدہ جلسوں اور جلوسوں میں شرکت اور ان کی روداد سنانے کی عملی تربیت دی گئی۔ اس طرح اس کی سیاسی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس دوران اسے مسلم لیگ اور کانگریس کے بڑے بڑے قائدین اور ان کی زیرِ صدارت

جلسوں اور جلوسوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

صحافتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ودیا ساگر کالج میں رات کی شفٹ میں داخلہ لے لیا۔ آٹھ بجے رات سے صبح ڈھائی بجے تک دفتر میں کام کرتا۔ وہاں سے [illegible] چل کر گھر لوٹتا اور سو رہتا۔ دن کے گیارہ بجے تیار ہوکر پڑوس میں رنگون ریستوران جا بیٹھتا۔ کچھ کھا پی کر ٹرام میں بیٹھ کر دوپہر تک لائبریری جا پہنچتا اور چار بجے تک باقاعدگی سے پڑھتا اور نوٹس تیار کرتا۔ وہاں سے سیر کرتا ہوا کالج آتا اور وقت گزار کر دفتر کی راہ لیتا۔

کلکتہ میں اشتراکیت پسندی کا دور ہوا تو نوجوان اختر اس کے سحر میں گرفتار ہوگیا۔ دفتری ضروریات کے لیے وہ مزدور کسان پارٹی کے دفتر میں بھی جانے لگا جو اشتراکی نظریات کے پرچار کے لیے بنائی گئی تھی لیکن حکومتی پابندیاں ایسی تھیں کہ تمام کام زیرزمین ہو رہا تھا۔ اختر کا خلوص دیکھ کر وہاں کے انچارج کو یقین آگیا کہ یہ لڑکا محض صحافتی ضروریات کے لیے یہاں نہیں آتا بلکہ اشتراکیت سے دلچسپی بھی رکھتا ہے۔ اس نے انگلستان، امریکا اور ماسکو سے شائع ہونے والا اشتراکی لٹریچر اسے پہنچانا شروع کردیا۔ یہ ہندوستان والوں کے لیے بالکل نیا نظریہ زندگی تھا جس سے اختر کی واقفیت ہوئی تھی۔ اس لٹریچر نے اسے ایسا مسحور کیا کہ کبھی وہ کسان مزدور پارٹی کے دفتر کے چکر لگاتا اور کبھی کالج اسکوائر کے چائے خانوں میں بیٹھے بنگالی دہشت پسندوں سے خبریں جمع کرتا اور ''وشوامتر'' کے صفحات پر لرزہ خیز سرخیاں لگانے کے لیے مواد حاصل کرتا۔

کچھ دنوں سے ایک لڑکا اس کے ساتھ کام کرنے لگا تھا۔ اختر اس کی قابلیت اور اشتراکیت کے لیے اس کا جذبہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوا اور دن رات اس کے ساتھ رہنے لگا۔ چند مہینے بعد وہ اچانک غائب ہوگیا۔ پھر معلوم ہوا وہ دہلی کے اطراف سے گرفتار ہوا ہے۔ اختر کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ بھگت سنگھ کا ایک مفرور ساتھی کندن لال تھا جو نام بدل کر اس کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

کندن لال نے کچھ دن کلکتہ میں بھی گزارے تھے اس لیے یہاں بھی تفتیش شروع ہوئی اور پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔

ایک روز وہ دفتر پہنچا تو بابو مول چند (مدیر) اس کے انتظار میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ خالص بنگالی لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے۔

''اختر بابو، ابھی کے ابھی کلکتہ چھوڑ دو۔''

''ایسی کیا غلطی ہوگئی مجھ سے۔''

''غلطی تو مجھ سے ہوئی کہ اس پاپی بھگت سنگھ کے ساتھی کو میں نے ملازم رکھ لیا اور تجھے بھی ہاتھ سے کھویا۔''

''وہ گیا تو گیا۔ مجھے کیوں ہاتھ سے کھوتے ہو۔''

''ابھی پولیس آئی تھی۔ اس کے ساتھیوں کو گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جارہے ہیں۔ تمہیں بھی اس کا ساتھی سمجھا جارہا ہے۔ اس وقت تو میں نے پولیس کو روانہ کردیا ہے لیکن پولیس پھر آئے گی۔ تم آج کلکتہ چھوڑ دو۔''

''کچھ خبریں لایا ہوں۔ وہ تو بتادوں۔''

''تم سالا مانتا کیوں نہیں ہے۔ خبریں جائیں بھاڑ میں۔ تم ابھی کلکتہ چھوڑ دو۔ کچھ دن کے لیے سہی۔ ابھی تو جاؤ۔''

بابو مول چند نے اسے دفتر میں پوری طرح گھسنے بھی نہیں دیا۔ وہ گھر پہنچا اور بھائی (مظفر حسین شمیم) کو ساری بات بتائی۔ ان کے پاس بھی کچھ ایسی خبریں تھیں جن کے مطابق آج رات کے وقت اختر کی گرفتاری متوقع تھی۔ انہوں نے اختر کو اس رات کے لیے کسی دوست کے گھر بھیج دیا اور ہدایت کردی کہ صبح ہوتے ہی پہلی گاڑی سے علی گڑھ روانہ ہوجائے۔ کسی دوست کے نام خط بھی لکھ دیا۔

لاشعوری طور پر ہندی کا ادیب اردو کے گڑھ کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ کلکتہ میں بھی اردو کا چلن تھا لیکن علی گڑھ تو اردو کا گڑھ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، سبط حسن وغیرہ ستاروں کی کہکشاں کی طرح علی گڑھ کے آسمان کو سجا رہے تھے۔ یہ سب کے سب یونیورسٹی کے بڑے بااثر طلبہ میں سے تھے۔ اس روشنی میں ایک اور روشنی کا اضافہ ہوگیا۔ یہ تھا اختر حسین رائے پوری۔

اختر حسین علی گڑھ آنے سے قبل ہی سوشلسٹ نظریات سے واقف ہوچکا تھا۔ علی گڑھ آنے کے بعد بھی اس نے اپنے خیالات کسی سے نہیں چھپائے بلکہ تبلیغ کی طرح اپنے خیالات... دوسرے نوجوانوں تک پہنچانے شروع کردیے۔ اس نے اپنے ہم خیالوں کے ساتھ مل کر ''پیام'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا۔ اخبار نویسی کی تربیت وہ کلکتہ ہی میں لے چکا تھا۔

انہیں دنوں مشہور کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر محمد اشرف لندن سے علی گڑھ وارد ہوئے۔ یونیورسٹی کے لائبریرین بشیر الدین احمد ان کے دوست تھے۔ وہ خود بھی سوشلزم کو پسند کرتے تھے۔ ایک صحرا میں دو دیوانے جمع ہوئے تو یہ طے ہوا کہ ایک جگہ بیٹھ کر دونوں سینہ کوبی کیا کریں۔ ڈاکٹر اشرف کی ملاقاتیں ان کی بیٹھک پر ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ سوشلزم سے دلچسپی رکھنے والے بھی آنے لگے۔ اختر حسین بھی اس اسٹڈی سرکل کا ایک اہم ممبر بن گیا۔

علی گڑھ ہی میں اس نے اپنا پہلا اردو افسانہ ''زبان بے زبانی'' لکھا اور علامہ نیاز فتح پوری کے جریدے ''نگار'' میں توصیفی کلمات کے ساتھ شائع ہوا۔ یہیں اس نے ''ادب اور زندگی'' کے نام سے وہ اہم مقالہ لکھا جس نے کچھ ہی عرصہ بعد قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کے لیے فکری اساس مہیا کردی۔ اس مقالے میں اس نے ایسی جرات دکھائی کہ اقبال کے نظریات پر شدید تنقید کرڈالی جس کی گونج بہت دور تک اور بہت دیر تک سنائی دی۔

اختر کے افسانے کی اشاعت نے اسے اچانک مشہور کردیا تھا۔ پڑھی لکھی لڑکیوں میں اس انوکھے افسانے کی خوب شہرت ہوئی تھی۔ حمیدہ بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی جس نے اس افسانے کو پسند کیا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ صاحب کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

ایک دن ڈاکٹر اشرف کی اہلیہ کی ملاقات حمیدہ سے ہوئی۔ حمیدہ کے بھائی شوکت عمر، ڈاکٹر اشرف کے دوست تھے۔ اس رشتے سے وہ وہاں آئی ہوئی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ اچانک چھت پر جانے لگی تو ڈاکٹر اشرف کی اہلیہ نے اسے اوپر جانے سے روک دیا۔

''اوپر مت جانا بہت بڑا نقصان اٹھاؤ گی۔''

''آپ نے کیا شیر پال رکھے ہیں۔''

''شیر تو نہیں ایک خونخوار بندر ضرور پال لیا ہے۔''

''وہ تو پنجرے میں ہی گا۔''

''مصیبت تو یہی ہے کہ اسے پنجرے میں بھی نہیں رکھ سکتی۔''

''کھل کر بتائیں بات کیا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب نے کسی لڑکے کو اوپر کا کمرا کرائے پر دے دیا ہے یا شاید یوں ہی رہنے کو دے دیا ہے۔ اس لڑکے کی قلمیں کوئی چھ انگل ہیں۔ ٹوکرا بھر سر پر بال۔ موٹے ہونٹ، علی گڑھ میں میاں صاحب پڑھتے ہیں مگر شیروانی نہیں پہنتے۔ ان حضرت کی قمیص جانے کس طرح کی ہے۔ چیکا چپٹا کالر، ایک کالی ڈوری چاروں طرف بندھی ہوئی۔ ایسے ہی آستینوں کے کف۔''

''یہ تو بڑا دلچسپ نقشہ آپ نے کھینچا۔ کبھی آتے جاتے اشارہ کردیجیے گا۔ ہم بھی دیکھ لیں گے۔ ویسے نام کیا ہے ان موصوف کا۔''

''جیسا خود ہے ویسا نام ہے۔ اختر نان پوری، میں تو کہوں وہ کچوری بھی اپنے نام کے ساتھ ٹانک لے تو زیادہ بہتر ہو۔ اوپر سے غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔''

''توبہ ہے آپ تو بہت ہی چڑی ہوئی ہیں۔''

''ایسا عجیب الخلقت تمہارے گھر آکر رہے تو تمہارا بھی یہی حال ہو۔''

حمیدہ کو نہ جانے کیوں یقین ہوگیا کہ یہ لڑکا یقیناً اختر حسین رائے پوری ہے جسے یہ نان پوری کہہ رہی ہیں۔

حمیدہ نے ڈاکٹر اشرف کے گھر جلد جلد آنا شروع کردیا تاکہ وہ بھی اس حلیے کی تصدیق کرلے جو وہ بیگم اشرف کی زبانی سن چکی تھی۔

ایک روز وہ وہاں آئی ہوئی تھی کہ اس نے اختر کو اپنے کمرے سے نیچے اترتے ہوئے دیکھ لیا۔ جھٹ بھاگتی ہوئی گئی اور اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ابھی صرف نویں کلاس میں پڑھتی تھی اور ایسی جرات کا مظاہرہ۔

''آپ افسانے لکھتے ہیں؟''

''جی ہاں آپ کو کوئی اعتراض۔''

''ایسے ہی الٹے سیدھے لکھتے ہوں گے۔''

''جب کچھ پڑھا ہی نہیں تو تبصرہ کیوں کرتی ہو۔''

''سنا ہے آپ کا ایک افسانہ ''نگار'' میں چھپا ہے۔''

''شکر ہے آپ نے نگار کا نام تو سنا ہے۔''

''آپ وہ پرچہ جس میں آپ کا افسانہ ہے پڑھنے کے لیے دے سکتے ہیں۔''

''بھجوادوں گا۔'' اس نے کہا اور بے نیازی سے اترتا چلا گیا۔ حمیدہ بھی اسے گھونٹ کر پی گئی۔ بہت بعد میں اس نے بھی اختر کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا۔

''قد میں نہ لمبے نہ ٹھگنے مگر دکھاوٹ میں لمبے لگتے تھے۔ صاف رنگ، ناک نقش میں یہ بات کہ ہونٹ خاصے موٹے مگر آنکھوں کی ذہانت شاید ہونٹوں کی موٹائی کی پردہ داری کرلیتی تھی۔ دیکھنے والی نظریں ان کی کشادہ پیشانی آنکھوں کی ذہانت اور گہرائی کی طرف متوجہ ہوجاتی تھیں۔ سر پر گھنے بال ٹوپی کا استعمال ندارد۔''

اختر نے وہ رسالہ ایک روز اس کے حوالے کردیا۔

جس صفحے پر اس کا افسانہ تھا اس پر ایک پرچہ پِن کر دیا تھا۔
"آپ کی ہمت اور جسارت دادطلب تھی ورنہ ایک ہندوستانی لڑکی کسی غیر مرد وئے سے بات کرے اور کوئی شے مانگے۔ میں نے اب تک ایسا سنا نہ دیکھا۔ واپس نہ کیا تو جرمانہ لینا ہم خوب جانتے ہیں۔ آپ کی جسارت اور خوش مزاجی کی داد دیے بنا رہا نہ گیا۔ اس لیے مجبوراً رسالہ پیشِ خدمت ہے۔"

حمیدہ نے اس رسالے کی وصولی کو اپنی عظیم فتح سمجھا۔ اس کے افسانے کو ایک نہیں دو تین بار پڑھا۔ اُسے یہ افسانہ ڈگر سے ہٹ کر لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ لکھنے والے نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ خونِ جگر سے لکھا ہے۔ اس کی زندگی محرومیوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے پر کوئی سننے والا نہیں۔ محبت کا بھوکا اتنا کہ امربیل پر مٹا جاتا ہے۔ ایک انسان کا برگد کے پیڑ کی طرح تنِ تنہا رہ کر اطراف کی چہل پہل اور لوگوں کی خوشیوں کو حسرت سے دیکھنا اور سوچنا، بار بار یوں سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ ایسے لوگوں کی زندگی میں جو بھی ہمدردی اور محبت کی رنگ آمیزی کر سکے گا تو وہ صرف اس کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی ذات کے لیے خوشیاں بٹورے گا۔"

وہ جب رسالہ واپس کرنے لگی تو اس نے بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک نوٹ رسالے کے ساتھ منسلک کر دیا۔
"بندی حضور کی خدمت میں شکریہ پیش کر کے امیدوار رہے گی کہ گاہے گاہے ہم کو ہر وہ رسالہ جس میں آپ کا افسانہ شائع ہو عنایت فرماتے رہیں گے۔
آپ کی امانت اس دعا کے ساتھ واپس کر رہی ہوں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔"

اختر بھی سمجھ گیا تھا کہ لڑکی باذوق ہے اور کیوں نہ ہو شوکت عمر کی پوتی ہے ظفر عمر جیسے ادیب کی بیٹی ہے۔ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی اس میں دلچسپی رکھتی ہے ورنہ یوں اس کے پیچھے نہ پڑتی لہٰذا اس نے رسالوں کی ترسیل میں خوب فیاضی سے کام لیا۔ حمیدہ کو کبھی ساقی اور کبھی نگار پڑھنے کو ملتے رہے حتیٰ کہ بعض اوقات ہندی کا رسالہ بھی دے دیا جاتا۔

اختر کا افسانہ "میرا بچپن" انہی دنوں اس کی نظر سے گزرا۔ اختر کا ماضی اس کی نظروں کے سامنے کھل کر آ گیا۔ اس کے دل میں عجیب سی کسک اٹھی کہ یہ شخص جو بظاہر بڑی اکڑ فوں رکھتا ہے اندر سے کتنا تنہا ہے، کیا اس کا کوئی نہیں۔ کیا اس کو سمجھنے والی کوئی کبھی مل جائے گی؟ پر خدا کرے ایسی ہو جو اس کو سمجھ سکے۔ وہ کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد "میرا بچپن" پھر پڑھنے بیٹھ گئی۔

اختر نے اپنے بچپن کے واقعات کو بڑے سلیقے سے افسانے کے روپ میں ڈھال دیا تھا۔ اپنی والدہ کی رحلت اور ماما (پیرن بی) سے اپنی بے وفائی کو بری طرح محسوس کیا تھا۔ ماما کو تنہا چھوڑ جانے کا جرم اسے نادم کرتا رہتا ہے۔ یہ پشیمانی افسانے کے آخری پیراگراف میں رقت آمیز انداز میں ظاہر ہوئی ہے۔

"اب وہ مر چکی ہے تو میں اس کی قبر کے پاس یہ کہنے آیا ہوں کہ تیرے ساتھ میرا بچپن بھی دفن ہے۔ دونوں بے جسم، بے جان بے روح ہیں۔ دونوں زندہ نہ ہوں گے، دونوں میری باتیں نہ سنیں گے۔ اس ماما نے جب آنکھیں بند کیں تو گویا خلوص و محبت کی آنکھیں میرے لیے بند ہو گئیں۔ میرے دل کا سارا خون اس کی آنکھوں کے اس ایک بوند آنسو کا بدل نہیں ہو سکتا جو میری رخصت کے وقت اس کی سفید پلکوں پر اٹکا ہوا تھا۔"

حمیدہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یہ بچپن کسی کا بھی ہو سکتا ہے لیکن میرا دل کہتا ہے یہ اختر کا بچپن ہے۔ اس کا کوئی بھی نہیں وہ بالکل تنہا ہے۔ اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینے والی کوئی اور کیوں ہو میں ہی کیوں نہیں۔ کاش ایسا ہو سکے۔ کاش ایسا ہو جائے۔

وہ اس کے ہر افسانے میں اس کے دل کی پکار سنتی رہی۔ اسے اس کا ہر افسانہ اس کی آپ بیتی معلوم ہوتی تھی لیکن یہ آپ بیتیاں ایسے شاندار اسلوب میں بیان کی گئی تھیں جن کی مثال حمیدہ کو اور کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ یہ افسانے ایک ایسے عہد میں لکھے جا رہے تھے جب ترقی پسندی اور رومانیت متصادم نظر آتے تھے۔ اس نے دونوں کی خصوصیات کو ملا دیا تھا اور ایک منفرد اسلوب دریافت کر لیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ ترقی پسند فکر کو رومانی لہجے اور آہنگ میں سمو کر اپنے افسانوی اسلوب کا حصہ بنا رہا تھا۔ اس نے ایک طرف ٹیگور کی رومانوی لے کو اپنے لحن کا حصہ بنایا تو دوسری طرف جدید مغربی افسانے کی تکنیک سے بھی استفادہ کیا۔

اس وقت تک ترقی پسند ادب کا نام بھی کسی نے نہیں سنا تھا۔ وہ خود اس کا مطالعہ اور ذوق تھا جو اسے اس راستے پر چلا رہا تھا۔ اس نے بہت کم عمری میں اس راز کو پا لیا تھا کہ

کوئی بھی حساس اور مخلص ادیب اپنے ماحول کے مسائل کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

حمیدہ جوں جوں اس کے افسانے پڑھتی گئی اختر کے خیالات اس کے دل میں اترتے چلے گئے۔ اس کا اسلوب، مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور سب سے بڑھ کر شدتِ احساس اس کے لہو کا حصہ بنتے چلے گئے۔

اختر کی ذات سے اس کی ہمدردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی طرف سے لکھے گئے خطوط سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ اسے ہر طرح کی محرومیت کا احساس ہے کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے۔ حمیدہ کے چاروں طرف خوشیاں بکھری ہوئی تھیں لیکن وہ کس طرح انہیں سمیٹ کر اختر کی جھولی میں ڈال دیتی۔ یہ زمانہ بھی ایسی پابندیوں کا تھا کہ صرف خطوط کا تبادلہ ہی کام آ سکتا تھا یا کبھی کبھی سب کی موجودگی میں ملاقات کے چند لمحات، ان لمحات میں دل کی نہیں ملک و قوم ہی کی باتیں ہو سکتی تھیں۔

"اخبار پڑھیں، کچھ سیریس کتابیں پڑھیں۔ افسانوں اور ناولوں کی دنیا سے باہر آئیں۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ اس وقت یونیورسٹی میں کمیونزم نامی ایک مرض کے جراثیم بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں اور ہم سب کی کوشش ہے کہ جلد سے جلد اور تیزی سے اس مرض کو پھیلایا جائے۔ آپ خواتین کو بھی اس نیک کام میں شریک ہو جانا چاہیے...... مٹی کی مورتیاں بن کر اگر ملک کی آدھی آبادی بیٹھی رہے گی تو کام کیونکر بنے گا۔"

حمیدہ کے امتحان سر پر تھے لہٰذا اسے بورڈنگ منتقل ہونا پڑا۔ اب اختر کو اس تک خطوط پہنچانا مشکل نظر آنے لگا۔ بے تابی تھی کہ روز اختر کو خط لکھنے پر اکساتی تھی۔ ایک دھوبن تھی جس کا نام شگورن تھا۔ اختر نے اس سے رابطہ کیا۔ حمیدہ کو بڑا عجیب سا لگا کہ ایک دھوبن اس کی پیغام رسانی کرے۔ اس نے مجاز کی بہن صفیہ سے رابطہ کیا اور صفیہ کے توسط سے ساقی اور نگار بھجوائے جانے لگے جن میں ایک خط ضرور ہوتا تھا۔

اختر اور یونیورسٹی کے دوسرے بااثر سوشلسٹ طلبہ کے خلاف دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اختر کو یقین ہونے لگا تھا کہ وہ کسی بھی وقت یونیورسٹی سے نکال دیا جائے گا۔ ممکن ہے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑے۔ اب اس معاشرے کو اس کی ایک کمزوری ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس کا نام تھا "حمیدہ" اختر ڈرنے لگا تھا کہ کہیں حمیدہ اس سے نہ چھن جائے اس نے اسے اپنی کمزوری نہیں طاقت بنانا چاہا۔ اس کے لیے حمیدہ کو اعتماد میں لینے کی ضرورت تھی۔ اس مرتبہ حمیدہ کو جو خط ملا اس کی زبان اور تیور ہی کچھ اور تھے۔

"تمہیں حاصل کرنے کے لیے نہ اپنی خودی کو سرنگوں ہونے دوں گا اور نہ ضمیر فروشی کروں گا۔ میں آزاد ہوں اور یونہی رہوں گا۔ آج نہیں تو کل جیل جانے کے لیے کمربستہ رہوں گا۔ میں تمہیں عیش سے نہیں رہنے دوں گا نہ اس کی کوشش کروں گا۔ اب تم خود اپنے دل سے پوچھو کہ اس کے باوجود ایسے آدمی کا ساتھ دے سکتی ہو یا نہیں۔ نہ کوئی وعدہ کرتا ہوں نہ ترغیب دیتا ہوں۔ اتنا اوچھا نہیں کہ اپنے لیے کوئی قربانی کرنے کو کہوں۔ یہ تو میرے اخلاص پر مبنی ہے۔ میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہے گی کہ جس سے محبت کی میں اسے راحت سے دیکھوں۔ میں نے تو اغراض و مقاصد کی یگانگت کا ذکر صرف اس لیے کیا تھا کہ تم میری شورش طلب زندگی دیکھ لو سمجھ لو اور یہ جان لو کہ ایسے آدمی سے صرف تب ہی نبھ سکتی ہے جب اس کی ذات سے نہیں بلکہ ان چیزوں سے ہمدردی ہو جن کے لیے وہ زندہ ہو۔ بابا! تمام مردوں کے معیار سے مجھے کیوں جانچتی ہو جو گھر بار سے بے نیاز، نہ نام اور نمود کا خواہاں نہ دولت، غرض کا بندہ۔ اختر دوسروں سے کچھ تو مختلف ہو۔"

گردشوں نے گھر دیکھ لیا تھا۔ ایک عاشق کو محبوبۂ دلنواز سے ابھی اور کچھ دور رہنا تھا۔ محبوبہ کو تو رحم آ چکا ہے اور وہ عزم کر چکی تھی کہ اپنے بے پایاں خلوص سے اختر کے دل میں روشن ہونے والی ملک و قوم کی خدمت کی چنگاری کو مدھم کرنے کے بجائے تیز تر کر دے گی۔ اسے رحم آ گیا تھا کہ وہ دل سے سوچ رہی تھی لیکن یونیورسٹی کی انتظامیہ دل سے نہیں سرکاری پالیسیوں سے سوچ رہی تھی۔ وہ اسے وطن دوست نہیں وطن دشمن سوچ رہی تھی۔

وہ بی۔اے کر چکا تھا کہ اسے 1934ء میں اس کی سیاسی و نظریاتی سرگرمیوں کے نتیجے میں یونیورسٹی چھوڑ دینے کا حکم مل گیا۔

یہ وہ دور تھا جب سجاد ظہیر انگلستان سے واپس نہیں آئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا کوئی دفتر ہندوستان میں قائم نہیں ہوا تھا۔ ترقی پسندی سے کوئی واقف بھی نہیں تھا۔ اختر نے اپنے مطالعے کے زور پر ان خیالات کو اپنایا تھا اور اب اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار تھا۔

یونیورسٹی سے نکلنا اس کے لیے حادثے سے کم نہیں

تھا۔ اسے علی گڑھ بھی چھوڑنا پڑا۔ فاقوں کی نوبت آگئی۔ بمبئی گیا پھر دلی میں ایسا بیمار پڑا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ جیب میں پیسے نہیں بیماری نے گھر دیکھ لیا۔ بڑی مشکلوں سے ڈاکٹر انصاری تک رسائی ہوئی۔ انہوں نے نسخہ تجویز کیا مگر اس شرط پر کہ دو مہینے چپ چاپ پڑے رہو۔ بستر سے اٹھا تو کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچ گیا۔

اپنے ایک دوست کے نام ایک خط میں تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ ہندی دنیا میں اختر نامی ایک آوارہ بھی رہتا تھا۔ وہ پٹواری کی جریب کی طرح زمین ناپتا لاہور چلا آیا۔ علی گڑھ بمبئی دلی کہیں اسے پناہ نہ ملی۔ اس دوران مسلسل بیمار اور بے کار رہا۔''

''ادبِ لطیف'' میں جز وقتی کام مل گیا جس سے گزارا چلتا رہا۔

☆☆☆

حیدر آباد دکن میں مولوی عبدالحق تن تنہا علم و ادب کے دریا بہا رہے تھے۔ انہوں نے رسالہ ''اردو'' جاری کیا تھا جس میں وہ تحقیقی مضامین تواتر سے شائع کر رہے تھے۔ ان مضامین کی اشاعت سے اردو زبان کی تاریخ میں کئی صدی کا اضافہ ہوگیا تھا۔ اردو زبان کی نشوونما، رسم الخط، زبان و ادب پر خود بھی مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔ قدیم اردو پر ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رسالہ اردو کے ذریعے پڑھنے والوں تک پہنچ رہا تھا اور اردو کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافہ کر رہا تھا۔

شبلی نعمانی کے استعفیٰ دینے کے بعد انجمن ترقی اردو کا دفتر (دہلی) بھی بند پڑا تھا۔ اس کے لیے ایک ایسے متحرک آدمی کی ضرورت تھی جو انجمن کے جسم میں روح پھونک دے۔ قرعہ فال مولوی عبدالحق کے نام نکلا لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد دکن میں تھے۔ انہوں نے دفتر کا سامان وہیں منگوالیا۔ سامان کیا تھا ایک پرانا صندوق تھا۔ اسے کھولا تو اس میں ایک رجسٹر، چند پرانے مسودات، ایک قلم دوات باقی اللہ کا نام۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگے کہ اب کیا کریں۔ خدمتِ اردو کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ جو کچھ کمایا تھا ایک ایک کرکے خرچ کرنے لگے۔ پھر اہلِ سرمایہ کے پاس گئے۔ ان کے ذاتی مراسم اور نیک نامی کی بدولت مملکت آصفیہ نے فیاضانہ مدد کی۔ انجمن کے مرجھائے ہوئے پودے میں جان پڑنی شروع ہوگئی۔

انجمن کے کام کو ظاہر کرنے کے لیے ہی ''رسالہ اردو'' کا اجرا کیا گیا تھا۔

جب کام بہت بڑھ گیا تو انجمن کے دفتر کے لیے علیحدہ مکان کی ضرورت پڑی۔ یہ ایک پہاڑی نما ٹیکری پر بنی نہایت شاندار کوٹھی تھی۔ گیٹ اور کوٹھی میں آدھ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ سڑک ایک بہت بڑے لان کے ساتھ گھومتی ہوئی پورچ تک آتی تھی۔ پھولوں کی کیاریاں پھولوں سے بھری ہوئی۔ لان کے اوپر ایک طرف بڑا گھنا برگد کا درخت تھا۔

اندر داخل ہوجایئے تو پہلے بڑا ڈرائنگ روم پھر ایک بڑا ہال کمرے میں دیواروں کے چاروں طرف کتابوں کی بہت اونچی اونچی الماریاں۔ درمیان میں ایک لمبی میز اور بہت سی کرسیاں، اس کے ساتھ ایک اور کمرا جو مولوی عبدالحق کا اپنا دفتر تھا۔ اسی طرح چند اور کمرے تھے۔

مولوی عبدالحق نے ہر بڑے آدمی کی طرح ایسے لوگ تیار کرلیے تھے جو ادبی کاموں میں ان کی معاونت کرسکیں اور اب بھی ایسے لوگوں کی ضرورت تھی۔

عبدالحق کی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے حکومت حیدر آباد نے اردو زبان کی جدید و مکمل لغت کی تالیف ان کے سپرد کی۔ یہ کام اتنا بڑا تھا کہ برسوں کی محنت درکار تھی۔

مولوی صاحب کو اردو انگریزی ڈکشنری کے لیے ایک معاون کی ضرورت تھی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کو مولوی صاحب کی اس ضرورت کا علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اختر حسین رائے پوری ضرورت مند بھی ہے اور اس کام کے لیے موزوں بھی۔ انہوں نے اسے ترغیب دی کہ وہ مولوی صاحب کے پاس حیدر آباد چلا جائے۔ اختر بھی مولوی صاحب کو اردو کے بڑے آدمیوں میں شمار کرتا تھا۔ انجمن کے کاموں اور ''اردو'' کی خدمات سے واقف تھا فوراً تیار ہوگیا لیکن حمیدہ کا سوال پھر درمیان آیا۔ اس نے حمیدہ کے والد ظفر عمر کو ایک خط تحریر کیا اور حیدر آباد چلا گیا۔ وہ خط یہ تھا۔

''ایک بندۂ ناچیز جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو، پر علم کی دولت کے خزانے کی چابی مٹھی میں تھامے ہوئے مزید اس کو حاصل کرنے کے عزم کے ساتھ اس کی سمت رواں دواں ہے۔ آپ کی صاحب زادی حمیدہ عمر کے لیے خواست گار ہے اگر قبول کرلیں تو زہے نصیب اور قبول نہ فرمائیں تو شکوہ آپ سے نہیں بلکہ خدا سے ہوگا جو بڑا رحیم و کریم ہے۔''

خط لکھنے کے بعد وہ اورنگ آباد مولوی عبدالحق کے

پاس چلا گیا اور مولوی صاحب کی معاونت کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ لغت نویسی، مضمون نویسی، تبصرہ نگاری اور ادبی معلومات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اختر کے اورنگ آباد چلے جانے کے بعد حمیدہ کے والد نے اس خط پر غور کیا جو اختر نے لکھا تھا۔

لڑکا خود پیغام بھیجے یہ عجیب سی بات ضرور تھی لیکن جرأت مندانہ تھی۔ ظفر عمر نے اس جرأت کو پسند ضرور کیا تھا لیکن اس کا خاندان کیسا ہے وہ خود کیسا ہے یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے وہ خط اپنے بیٹے حمیدہ کے بھائی شوکت عمر کے سامنے رکھ دیا اور مشورے کے طالب ہوئے۔

شوکت عمر نے جواب دیا ''اس لڑکے کو میں اور جمیلہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں اتنا ضرور کہتا ہوں کے اختر نام ہی کا نہیں بلکہ وقت کے ساتھ درحقیقت ایک روشن ستارہ اور بخت اختر بن کر رہے گا۔ یہ مولوی عبدالحق کے ساتھ رہ کر چھ ماہ سے کام کر رہے ہیں۔ ان سے دریافت کرلیں کہ ان کی ذاتی رائے کیا ہے اور پھر فیصلہ جو بھی آپ اور اماں کریں گی۔''

ظفر عمر کے لیے مولوی عبدالحق کا نام اجنبی نہیں تھا اور پھر جب اختر ان کے ساتھ رہ رہا تھا تو ان سے بہتر اسے کون جانتا ہوگا۔ انہوں نے مولوی صاحب کو خط لکھ دیا اور اختر کے بارے میں رائے طلب کی۔

کچھ دن بعد مولوی صاحب کا خط لڑکی کے والد کو موصول ہوا۔

''سید اختر میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اس دوران مجھے ان کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ جن سے زندگی بھر میرا سابقہ رہا ان میں قابل ترین ہیں۔ یہ صرف انگریزی اور اردو کے ہی اچھے عالم نہیں بلکہ سنسکرت ہندی، بنگلہ اور گجراتی زبانوں کا بھی علم رکھتے ہیں۔ یہ تو انتہائی مہذب و شائستہ ہیں، نہایت روشن خیال ہیں۔ فی الحال وہ میرے ساتھ اردو لغت کے کام میں مصروف ہیں۔ اس کے بعد یہ بطور پیشہ صحافت اختیار کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر انہیں کافی مدد ملے جو میں انہیں دینے کو تیار ہوں یہ بہت کامیاب ہوں گے۔''

میں ان کے خاندان کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ والد سے کوئی تعلق نہیں مگر اس میں ان کا اپنا قصور نہیں بلکہ سوتیلی والدہ کا ہاتھ ہے۔

میں یہ سب آپ کو بڑی رازداری سے لکھ رہا ہوں جیسے حمیدہ میری اپنی بیٹی ہو۔ میری تو یہ رائے ہے کہ آپ کو اس معاملے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے اور فیصلہ کرلینا چاہیے کہ اختر کو دامادی کا شرف بخشیں۔''

اس کے بعد ظفر عمر صاحب کے پاس سوچنے کے لیے کیا رہ گیا تھا۔ انہوں نے مولوی صاحب کی خدمت میں اپنا جواب تحریر کردیا۔

''...... میں آپ کے فیصلوں کی بہت قدر کرتا ہوں اور موجودہ حالات میں آپ کا مشورہ ماننے اور حمیدہ کی اختر سے شادی طے کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا...... اختر سے مشورے کے بعد شادی کی تاریخ کا تعین میں آپ پر چھوڑتا ہوں جو کہ انتہائی سادہ تقریب میں ہو کیونکہ میں فضولیات پر یقین نہیں رکھتا۔''

مولوی صاحب نے بھی ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی رضامندی پر کن الفاظ میں اپنی خوشی اور تشکر کا اظہار کروں۔ میں آپ کے فیصلے پر بہت خوش ہوں۔ اختر آپ کے اس قدر مشفقانہ خط

سے بہت متاثر ہوئے۔ کچھ دیر تو وہ کچھ اس طرح عالمِ مسرت میں رہے کہ میں ذرا سا گھبرا گیا۔ وہ حقیقت میں اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ آپ یقین رکھیں اور مطمئن رہیں۔ وہ آپ کے لائق داماد ثابت ہوں گے۔ آپس کی گفت و شنید کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شادی کرسمس کے ہفتے یعنی 29 دسمبر 35ء میں ہو کیونکہ اس صورت میں' میں ان کے ہمراہ اس پُرمسرت تقریب میں شرکت کر سکوں گا۔''

29 دسمبر کو چلنے والی ٹرین اگلے دن صبح گیارہ بجے علی گڑھ پہنچی تو مولوی صاحب کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ عموماً انہیں جھگڑالو اور غصہ ور سمجھا جاتا تھا لیکن جب اختر کی برات اسٹیشن پر اتری تو اختر کے دوستوں کے ساتھ مل کر ان کی تک بندیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

لَلا رو پیالا ئیو ہے
لَلا کی شادی کر دیں گے
کر دیں گے بھئی کر دیں گے

مجاز کی شوخیاں مشہور تھیں۔ ممکن ہے مولوی صاحب ان شوخیوں کو پسند بھی نہ کرتے ہوں لیکن اس وقت تو وہ متانت بھول کر لڑکوں میں لڑکے بنے ہوئے تھے۔

دلہن کے گھر پہنچے تو براتیوں کے لیے خیمے لگے ہوئے تھے۔ سب کے خیمے الگ الگ تھے۔ قریب ہی امرود کا باغ تھا۔ غالباً یہ مجاز ہی کی شرارت ہوگی کہ خیموں میں ٹھہرنے کے بجائے امرود کے باغ میں بسیرا کیا۔ مولوی صاحب یہاں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ سب نے طرح طرح کے بول گھڑ کر گانا شروع کر دیا اور مولوی صاحب انہیں ڈانٹنے کے بجائے ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ ادھر دلہن والے ڈھونڈ رہے تھے کہ براتی کہاں گئے۔ گانوں کے شور سے معلوم ہوا براتی تو باغ میں ہیں۔ انہیں وہاں سے بلایا گیا کہ مہمانوں سے ملاقات تو ہو۔ ایک بجے کہا گیا کہ کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ کھانے کا کمرا بہت بڑا تھا۔ کم از کم چوبیس آدمیوں کی میز لگی ہوئی تھی۔ سرخ وردی میں بینڈ باجے والے منتظر کھڑے تھے کہ کھانا شروع ہو تو وہ دُھن چھیڑیں۔ جیسے ہی مہمانوں نے کھانا پلیٹوں میں نکالا، نفیری بجنے لگی۔

مولوی صاحب کو پھر شرارت سوجھی۔

''وہ بھئی، اس توں توں پی پی میں کھایا تو کچھ جائے گا نہیں۔ چلو پی ہی لیں۔'' یہ کہہ کر سامنے رکھی ٹماٹر ساس کی بوتل کھول کر غٹ غٹ پینے لگے۔ بس پھر کیا تھا ساتھ آئے ہوئے دوستوں نے بھی یہی کیا۔ آخر بینڈ والوں کو باہر بھیجا گیا۔ تب جا کر کھانا شروع ہوا۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مولوی صاحب تھوڑی دیر کے لیے بچے بن گئے ہیں۔ مغرب کے بعد نکاح تھا۔ نکاح کے دوران بھی وہ اسی طرح شرارتیں کرتے رہے۔ آخر اللہ اللہ کر کے ایجاب و قبول کا مرحلہ طے ہوا۔

''میں ایک سہرا لکھ کر لایا ہوں۔ پیشِ خدمت ہے۔'' کسی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔

''سہرا آپ کس خوشی میں پڑھیں گے۔'' مولوی صاحب گرجے ''خوش ہونے کے حق دار ہم ہیں کہ دلہن لے جا رہے ہیں۔ ہم سہرا خود لکھ کر لائے ہیں۔''

شاعر ساتھ آئے تھے۔ مولوی صاحب نے مجاز اور ساغر نظامی کو اپنے پاس بلایا۔ سب ایک ساتھ کھڑے ہو گئے اور سہرا گانا شروع کر دیا۔ مولوی صاحب تال دیتے جا رہے تھے۔

اِک بنجارا یار ہمارا
پھرتا تھا یوں مارا مارا
جیسے ہو اک مرغ بے چارا
ڈھونڈے سہارا ڈربے کا
یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
مندر کی مندر کی
بہن کھلونا بھائی تماشا
آگے تانگا پیچھے گھوڑا
خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا باوا

یہ سب بابائے اردو کی تک بندی تھی۔ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا متین بوڑھا سب کے ہنسنے کا ایسا سامان مہیا کرے گا۔

یہ ہنسی نہیں تھی ان کے اندر چھپے ہوئے وہ ارمان تھے جو وہ اردو کو پالنے پوسنے میں فراموش کر چکے تھے۔ وہ اپنی شادی سے بھاگ چکے تھے۔ اب جو موقع ملا تو پھٹ پڑے۔

کئی دن کی مہمان داری کے بعد حیدرآباد کے لیے روانگی کا وقت آ گیا۔ چار سیٹر ایک ڈبا بک کرایا گیا تھا لیکن جب اندر گئے تو چھ سیٹر نکلا۔ ایک بنگالی جوڑا اپنے دو عدد بچوں کے ساتھ پہلے ہی براجمان تھا۔ مولوی صاحب کا پارا چڑھ گیا۔

''یہ ہاشمی فرید آبادی بھی فضول سے آدمی ہیں۔ بکنگ ان کے ذمے تھی۔ یہ بکنگ کرائی ہے۔''

بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا۔ سامان رکھنا پڑا۔

ریل نے اسپیڈ پکڑی ہی تھی کہ اچانک حمیدہ کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے میکے سے کتنی دور جا رہی ہے۔ وہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر رونے لگی۔ مولوی صاحب کی مشفق آنکھوں سے یہ منظر چھپا نہ رہ سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھے اور حمیدہ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

''سنو، ہم کو سمندر، دریا اور جھرنوں کا پانی بہت اچھا لگتا ہے مگر یہ آنکھوں کا بہتا پانی قطعی پسند نہیں۔ سر اندر کرو اور اپنے ڈبے کی آب و ہوا اور دیگر ہم سفروں پر غور کرو۔ اب ہمیں ان سے نمٹنا ہے۔''

وہ بے چاری کچھ بھی نہیں سمجھ سکی کہ نمٹنے سے کیا مطلب ہے۔ اس نے آنسو پونچھے اور سر اندر کر لیا۔ مولوی صاحب نے چپکے سے اختر کے کان میں کچھ کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ اچانک دونوں بنگالی بچوں کی زوردار چیخیں نکلیں، بنگالی برتھ پر تھا۔ اس نے اوپر سے بنگالی میں بچوں سے کچھ پوچھا۔ بچوں نے بنگالی میں ہی جواب دیا اور مولوی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد بچے پھر زور سے چیخے۔ اس مرتبہ وہ اختر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ حمیدہ نے دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ کی چونچ بنائے منہ ٹیڑھا ترچھا کر کے بچوں کو ڈرا رہے تھے۔

''بڑا شاب! آپ کیا کرتا ہے۔ بچوں کو کیوں ڈراتا ہے۔ کیا آپ پاگل آدمی ہے۔'' اوپر سے اس بنگالی نے پوچھا۔

''اور کیا۔ باہر ڈبے پر لکھا نہیں دیکھا کہ اس ڈبے میں دو پاگل بھی سفر کریں گے۔'' مولوی صاحب نے کہا اور بچوں کے بجائے ماں، باپ کو ڈرانے لگے۔ اختر بھی ہولناک آوازیں نکالنے لگا۔

وہ بنگالی جوڑا جھٹ نیچے اترا، دونوں بچوں کو سینے سے لگایا، سامان سمیٹا اور دروازے کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ کوئی اسٹیشن قریب تھا۔ ریل کے رکتے ہی بچوں کو لے کر نیچے اتر گئے۔

اختر اور مولوی صاحب بچوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ اب حمیدہ کی سمجھ میں آیا کہ ماجرا کیا تھا۔ بنگالی جوڑے سے کمرا خالی کرانا تھا اس لیے دونوں فرضی پاگل بنے ہوئے تھے۔

شیر خاں کیپٹن کرنل، شہید
(1970-1999)

نشانِ حیدر کے اعزاز یافتہ۔ انہیں سندھ رجمنٹ کی ایک بٹالین میں کمیشن ملا اور وہ لائن آف کنٹرول پر اپنے عسکری فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے اس دوران دشمن کی صفوں کے اندر جا کر کئی حملے کیے، نیز دشمن کے کئی حملوں کو پسپا بھی کیا۔ 1999ء میں کارگل میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں پاکستان کا سب سے بڑا جنگی اعزاز نشانِ حیدر عطا کیا۔ وہ نوا کلی صوابی کے باشندے تھے۔ شہادت کے بعد ان کے آبائی گاؤں میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

مرسلہ: زاہد گل، صوابی

ڈبا خالی ہوتے ہی مولوی صاحب کو اپنا حقہ یاد آیا۔ تمباکو کی خوشبو ڈبے میں پھیل گئی۔

انہی ملی جلی شرارتوں میں سفر کٹ گیا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ انجمن کے دفتر میں اترا۔ مولوی عبدالحق کی خوشی یہاں بھی دیدنی تھی۔ ایک ایک کمرا دکھاتے پھر رہے تھے۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی۔ بڑی بوڑھیوں کی طرح چابیاں بہو کے ہاتھ میں تھما دیں۔

''سب نوکروں کی تنخواہیں اب تم دینا اور بشیر کو کھانا پکانے کو بتا دیا کرنا۔''

یہ تو گھر کے بزرگ کا حال تھا۔ شوہر کی طرف سے بھی وہ خوش قسمت رہی۔ ازدواجی زندگی کے پہلے ہی دن وہ قاعدے سے جوتے کے اسٹینڈ پر اپنے جوتے چپلیں رکھنے کے بعد اختر کے جوتے رکھ ہی رہی تھی کہ اختر آ گیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟''

حمیدہ کے ہاتھ سے جوتے گر گئے ''آپ کے جوتے اسٹینڈ پر قاعدے سے رکھ رہی تھی۔''

اختر نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ''دیکھیے، اب کبھی میرے جوتوں کو ہاتھ مت لگائیے گا۔''

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شاعر اور ادیب بیویوں سے ناز نخرے اٹھواتے ہیں۔ اس کے لیے سخت گیری اختیار

کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اختر کا رویّہ بالکل مختلف تھا۔ اس کی منصبی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ کبھی کسی شاہ کار کا ترجمہ کرنے میں مشغول ہے، کبھی کسی افسانے پر کام ہو رہا ہے، کبھی ڈکشنری کے پروف پڑھنے میں وقت گزر رہا ہے۔ اتنی مصروفیات کے باوجود وہ بیوی کی تفریح کے لیے وقت نکال ہی لیتا تھا۔ اپنے دوستوں سے ملوانے لے جاتا تھا اور پھر انجمن کے دفتر ہی میں کام کے بعد کھیل کا سامان مہیا کردیا تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ حمیدہ دن بھر کے سناٹے سے بور ہوجاتی ہوگی۔ نہ آس نہ پڑوس نہ گھر میں کوئی عورت۔ دفتری اوقات کے بعد کچھ کھیل کا سامان بھی ہونا چاہیے۔ ایک دن اختر آیا تو تاش کی دو گڈیاں ساتھ تھیں۔

”تم مجھے اور مولوی صاحب کو تاش کھیلنا سکھاؤ تاکہ ہم لوگ روز رات کو تمہارے ساتھ تاش کھیل سکیں۔“

”آپ لوگوں کو تاش کھیلنے نہیں آتے؟“

”کبھی سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“

”چلو ہم سکھادیں گے۔“

حمیدہ نے دونوں کو تاش کھیلنا سکھادیے۔ مولوی صاحب کام کے وقت کام کے عادی تھے لہٰذا دن بھر حمیدہ کی مجال نہیں تھی کہ مولوی صاحب سے ہنس کر بات کرسکے۔ کھیل کا وقت ہوتا تو مولوی صاحب بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے۔ پھر شطرنج آگئی شطرنج کھیلی جانے لگی۔

☆☆☆

اختر نے اب تک افسانہ نگاری میں اپنے لیے بہت اہم جگہ بنالی تھی۔ اس کے افسانوں میں وہ تمام موضوعات نظر آنے لگے تھے جو ترقی پسندی کی بنیاد بننے والے تھے۔ گویا اس کا قلم وقت سے آگے سفر طے کررہا تھا۔ اس نے موضوعات کے اعتبار سے مذہبی و معاشرتی عقائد و روایات کے کھوکھلے پن اور مذہبی، سماجی و سیاسی اداروں کے منافقانہ رویّوں کو اپنے لیے زیادہ پسند کیا۔ اس کے بعد اس نے عورت کی حالتِ زار اور اس کے جسمانی و نفسیاتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس نے محبت کے نشاطیہ رنگ کو کبھی اہم نہیں سمجھا بلکہ اس چبھن کو اہمیت دی جو محبت کی ناکامی عطا کرتی ہے۔

وہ اردو افسانے کا ابتدائی دور تھا اور رومانیت کی دنیا میں گھرا ہوا تھا اختر نے اسے ایک ہی جست میں زندگی کی حقیقتوں سے ہم کنار کردیا۔

افسانہ نگار تو بہت سے ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ بھی تھا لیکن اردو میں تنقید کی حالت اب سے بھی زیادہ خراب تھی۔ ایک ایسی تنقید جو مغربی علوم سے واقفیت کے بعد وجود میں آئی ہو، اسے اختر نے اردو میں رواج دیا۔ ”ادب اور زندگی“ لکھ کر تو اس نے ادیبوں کے نظریات کو ایک نئی دنیا عطا کی ہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چند ایسے یادگار تنقیدی مضامین لکھے جو اختر کے بغیر نہ لکھے جاتے۔ اردو شاعری میں عورت کا تخیل، سوویت روس کا ادب، سوویت تھیٹر، ادبی ترقی پسندی کا مفہوم، وغیرہ وہ مضامین تھے جو بتا رہے تھے کہ اس کا پڑھا لکھا ذہن اسے ایک تنقید نگار کے منصب پر فائز کرنے والا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ بعد میں لکھے جانے والے مضامین کے بعد بھی جہاں تک اس کے تنقیدی افکار کا تعلق تھا ان کی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ترقی پسند تحریک کے قائدین اس کے بنیادی خیال کو رد کرنے سے قاصر رہے۔

ترجمہ نگاری میں بھی اس نے ایک خاص مقام پیدا کیا۔ سنسکرت، بنگالی، انگریزی اور فرانسیسی شاہ کاروں کے تراجم کیے۔

ان تصنیفات و تراجم کے ساتھ ساتھ اختر کا نظریاتی سفر بھی پوری توانائی کے ساتھ جاری رہا۔ مولوی صاحب کے منع کرنے کے باوجود اس کی دوستیاں ترقی پسند اذہان کے حامل ادیبوں اور شاعروں سے پروان چڑھتی رہیں۔ یہاں اس کی دوستی مخدوم محی الدین سے ہوگئی۔ مولوی صاحب اس دوستی سے نالاں تھے۔

”تم ایک علمی آدمی ہو۔ یہ دوستیاں تمہیں سیاست کے خارزار میں گھسیٹ لیں گی۔ اس طرح میرا بھی نقصان ہوگا اور اردو ادب کا بھی۔“

اختر ان کی بات کہاں ماننے والا تھا۔ ریاست کی پولیس ان سرپھرے نوجوانوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اختر کی بے احتیاطی یہاں بھی کام دکھا رہی تھی۔ ان نوجوانوں کی ملاقاتیں سروجنی نائیڈو کے بیٹے کے فلیٹ میں ہوا کرتی تھیں جہاں مستقبل کے پروگرام بنتے تھے۔ ایک ادبی انجمن بھی بناڈالی جسے حیدر آباد کی ترقی پسند تحریک کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیے۔

مولوی صاحب اختر کی ضد سے ناخوش تھے۔ وہ ترقی پسند دوستوں کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ پھر ایسا واقعہ پیش آیا کہ اختر کا دل اچاٹ ہوگیا۔

مولوی صاحب نے ادب عالیہ کے سو شاہ کاروں کو

اردو میں منتقل کرنے کی اسکیم پر غور شروع کردیا تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اختر سے بھی کردیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ڈکشنری کا کام ختم کرتے ہی اس تجویز پر عمل پیرا ہوا جائے گا۔ اختر کو بھی اس میں ایسا انہماک ہوا اور یہ کام ایسا دلچسپ معلوم ہوا کہ وہ فہرست بنانے بیٹھ گیا۔ کن شاہ کاروں کو جگہ ملے گی کن کو نہیں۔

مولوی صاحب اس کی سرگرمیوں سے روز بروز خفا ہوتے جارہے تھے۔ انہوں نے سو شاہ کاروں کو اردو میں منتقل کرنے کے خیال کو ترک کردیا بلکہ کسی سے یہ بھی کہہ دیا کہ اختر کی طبیعت میں ایسی وحشت ہے کہ مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کس دن اٹھ کر چلا جائے۔

اختر کو یہ بات اتنی بری لگی کہ اس نے مولوی صاحب سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے مولوی صاحب سے تو بات نہیں کی لیکن دوستوں سے کہنا شروع کردیا کہ وہ دہلی چلا جائے گا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ خبر مولوی صاحب تک پہنچ جائے گی۔ یہی ہوا بھی۔ خبر پہنچ گئی۔ مولوی صاحب کی شفقت بھی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اختر سے اس کی تصدیق کرتے۔

پریشانی دونوں طرف تھی جسے حمیدہ نے بھی محسوس کیا۔

”مولوی صاحب آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ انہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ ان سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“

”تم نے ان سے کچھ پوچھا تھا؟“

”پوچھا تھا۔ مجھے لگا جیسے انہیں معلوم ہے لیکن مجھے بتانا نہیں چاہ رہے ہیں۔“

”ان کی تو مجھے خبر نہیں لیکن میں اس لیے پریشان ہوں کہ انہیں کیسے بتاؤں کہ میں اب زیادہ دیر ان کے ساتھ نہیں چل سکتا۔“

”آپ کو ان سے ایسی کیا شکایت ہوگئی۔“

”ابھی تو نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ آگے چل کر ان کے ساتھ میرا نباہ نہیں ہوسکے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ کسی اختلاف یا بدمزگی سے قبل کوئی اور راستہ اختیار کرلوں۔“

”آپ دہلی کیوں جانا چاہتے ہیں۔“

”میں دہلی جاکر اپنا اخبار نکالنا چاہتا ہوں اور مجھے خبر ہے وہ اجازت نہیں دیں گے۔ ان کی تنہائی کا خیال بھی آتا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد وہ بالکل تنہا ہوجائیں گے۔ تم سے تو وہ بے حد مانوس ہوگئے ہیں۔“

”پھر یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اگر آپ نے دلّی جانے کی ٹھان ہی لی ہے تو میں ان سے بات کرلوں گی۔ وہ اپنا غصہ مجھ پر اتار لیں گے۔ جو کچھ کہنا ہوگا مجھ سے کہہ لیں گے۔ بعد میں آپ بات کرلیجیے گا۔“

اختر مطمئن ہوگیا۔ حمیدہ نے وعدے کے مطابق مولوی صاحب سے ذکر چھیڑ دیا۔ ”اختر دہلی جانا چاہتے ہیں۔“

”مجھے معلوم تھا وہ چلا جائے گا۔“

”آپ سے کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔“

”اب انجمن کا دفتر بھی دہلی منتقل ہونے والا ہے۔ سال ڈیڑھ سال ٹھہر جاؤ پھر سب ساتھ چلیں گے۔“

”اختر اتنے دن ٹھہر نہیں سکیں گے۔ وہ وہاں جاکر اخبار نکالنا چاہتے ہیں۔ اتنے عرصے میں اخبار جم جائے گا پھر آپ بھی وہاں ہوں گے۔“

”تم لوگ چلے جاؤ گے اور میں یہاں اکیلے جھک ماروں گا۔“

یہ حمیدہ سے ان کی محبت تھی جو انہیں طیش دلا رہی تھی ورنہ اندر سے وہ تیار ہوگئے تھے کہ اختر کو دہلی چلا جانا چاہیے۔ وہ پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اختر ایک دن صحافت کی دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ انہوں نے اجازت دے دی۔

اختر حیدر آباد سے دہلی چلا آیا۔ حیدر آباد سے روانہ ہوتے وقت اختر حسین رائے پوری ایک مضمون نگار، افسانہ نگار، نقاد، مترجم اور مرتب کی حیثیت سے متعارف ہوچکا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کی شہرت اسے اخبار کے ڈکلریشن میں معاون ہوگی۔ اس نے حکومتِ ہند سے ”جہاں نما“ کے نام کا ڈکلریشن لینے کے لیے درخواست دے دی۔

اس درخواست کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ حیدر آباد میں اس کی سرگرمیاں کیا رہی ہیں۔ وہ پکا کمیونسٹ سمجھا جانے لگا تھا۔ مخدوم محی الدین کی دوستی اسے مہنگی پڑی تھی۔ اس نے گھبرا کر مولوی صاحب کو خط لکھا۔ انہیں بھی تعجب ہوا کہ حکومت کی طرف سے ٹال مٹول کیوں کی جارہی ہے۔ اس پر بھی تعجب تھا کہ ایک ہزار کی ضمانت طلب کی گئی ہے۔

ٹال مٹول کی یہ کیفیت بھی ختم ہوگئی۔ طویل انتظار کے بعد اخبار کے ڈکلریشن کی درخواست حکام نے مسترد کردی۔ اب وہ دھوپ میں کھڑا تھا۔ پاؤں تھکے نہیں تھے اور آگے بڑھنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ اپنی الجھنوں میں گرفتار تھا اور سجاد ظہیر جواب ہندوستان واپس آچکے تھے اس سے یہ توقع لگائے بیٹھے تھے کہ وہ اپنا اور حمیدہ کا مستقبل تاریک کرکے دلّی میں قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کے لیے خود

کو وقف کردے گا۔

اس کی مسلسل لاتعلقی دیکھ کر سجاد ظہیر نے بیان دیا۔

"میں اختر رائے پوری سے یہ توقع کرتا تھا کہ وہ دلی کی انجمن کی صرف رہنمائی ہی نہیں بلکہ ان مشکلات پر قابو حاصل کرنے کے لیے خود ایک جوشیلے اور دوڑ دھوپ کرنے والے نوجوان بنیں گے لیکن ان سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی اب بڑے ادیبوں کے زمرے میں آگئے ہیں۔ کچھ نجی مالی مشکلات کچھ دنیا میں ترقی کرنے کی خواہش ترقی پسند ادب کی مشکل ذمہ داریوں سے انہیں دور کھینچتی جارہی ہے۔"

اختر ان ادیبوں میں سے نہیں تھا جو اپنی ادبی ذمہ داریاں پوری کرنے کی تگ و دو میں بیوی بچوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ وہ چاہتا تھا حمیدہ ہمیشہ خوش رہے۔ اس کے لیے کسی مستقل ذریعۂ آمدنی کی ضرورت تھی۔ وہ قلم سے کما سکتا تھا۔ اسی کے لیے کوشاں تھا۔

اس نے ترقی پسند ادب اس وقت تخلیق کیا تھا جب کوئی ترقی پسندی کے نام سے بھی واقف نہیں تھا اور اب اسے رجعت پسندی کے طعنے مل رہے تھے۔ یہ صورت حال اس کے لیے حوصلہ شکن تھی۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ دہلی سے چلا جائے گا لیکن کہاں جائے گا، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

کوئی ملازمت نہیں تھی۔ اخبار نکالنے کا خواب چکنا چور ہوگیا تھا۔ وہ اپنے ہندی میں لکھے ہوئے افسانے لے کر بیٹھ گیا۔ انہیں اردو کا روپ دیا۔ کچھ افسانے اردو میں لکھے ہوئے پہلے سے موجود تھے۔ ان سب کو ترتیب دیا اور نو افسانوں کے اس مجموعے کو "محبت اور نفرت" کے نام سے مرتب کرکے ساقی بکڈپو دہلی کے حوالے کردیا۔

مولوی عبدالحق سے اس کے تعلقات میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی لیکن مولوی صاحب اختر کو انجمن کی طرف سے کام دیتے رہے لیکن ان کی ناراضی کا اظہار اس وقت کھل کر سامنے آگیا جب وہ ڈکشنری شائع ہوئی جس کی تیاری میں اختر نے مولوی صاحب کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ مولوی صاحب نے معاونین میں اختر کا ذکر تک نہیں کیا۔

حمیدہ اختر سامنے بیٹھی تھی۔ ڈکشنری اختر کے ہاتھ میں تھی۔ پھر اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ ڈکشنری ہاتھ سے چھوٹی اور قدموں میں آگری۔ حمیدہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اختر کا چہرہ زرد تھا۔ شدت ضبط سے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے

"اختر کیا ہوا۔ اس ڈکشنری میں ایسا کیا ہے۔"

"حمیدہ تم تو گواہ ہو۔ اس ڈکشنری کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ اس ڈکشنری کے لیے ہی مولوی صاحب مجھے علی گڑھ سے اورنگ آباد لے کر گئے تھے۔ میں وہاں پہنچتے ہی عالمگیر کی چہیتی ملکہ رابعہ زمانی کے مقبرے کے بنگلے کے ایک کمرے میں بیٹھ کر لغت نویسی میں مصروف ہوگیا۔ لفظ و معنی کی تلاش میں ایسا محو ہوگیا جیسے کوئی کیمیاگر جڑی بوٹیوں میں ہوتا ہے۔ پھر جب انجمن کا دفتر حیدر آباد منتقل ہوا تو نادر منزل میں اور لوگوں کے ساتھ تمہارا اختر بھی اس سنجیدہ کام میں لگ گیا۔ اس کے بعد تو تم بھی آگئی تھیں۔ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اور اب دیکھو انہوں نے دیباچے میں میرا ذکر تک نہیں کیا۔"

"آپ ٹھیک طرح سے دیکھیں۔ کہیں نہ کہیں ذکر کیا ہوگا۔"

"مجھے دکھ یہ نہیں کہ دو سال کی محنت ضائع ہوئی بلکہ دکھ یہ ہے کہ میرا قبلہ گاہ ٹوٹ گیا۔ میں نے مولوی عبدالحق کو بہت بڑا آدمی سمجھا تھا۔ اب یہ قلق ہے کہ میں نے ایک بڑے آدمی کو کھو دیا۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی صاحب نے آپ کا نام کیوں نہیں دیا۔"

"معاوضہ تو بہر حال مجھے مل ہی گیا تھا لیکن اگر نام آجاتا تو ٹھیک تھا۔" اختر نے کچھ ایسی دل شکستگی سے کہا کہ حمیدہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تم بھی مولوی صاحب سے کچھ نہ کہنا۔ وہ بڑے آدمی ہیں انہیں شرمندگی ہوگی۔"

اختر کئی دن بجھا بجھا رہا لیکن ہمیشہ کے لیے بجھ جانا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اتنے صدمے جھیلے تھے کہ ضبط کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

"کلکتہ سے بابو مول چند اگروال کا خط آیا ہے۔"

"اچھا؟ کیا لکھتے ہیں۔"

"کلکتہ آنے کی دعوت دی ہے اور "وشوامتر" کی ادارت کی پیش کش کی ہے۔"

"پھر آپ کیا سوچ رہے ہیں"

"ابھی میں نے کوئی جواب نہیں دیا ہے"

"میں تو کچھ دن سے کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اگر آپ کلکتہ چلے گئے تو دور دراز علاقے کے ایک صحافی بن کر رہ جائیں گے جبکہ آپ کا عالمانہ وقار کسی اور راستے کا متقاضی ہے۔ آپ بیرون ملک جا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیوں

حاصل نہیں کرتے۔"

"وسائل؟"

"آپ ارادہ کریں تو وسائل بھی مہیا ہوجائیں گے۔"

حمیدہ نے امید کی شمع روشن کردی تھی۔ اسے سنسکرت پر جو عبور حاصل تھا پی ایچ، ڈی کے لیے اسی سے متعلق کوئی موضوع اختیار کیا جاسکتا تھا۔ اس نے "ہند قدیم کی زندگی سنسکرت ادب کے آئینے میں" کا موضوع اختیار کیا اور فرانس جانے کا ارادہ کرلیا۔

اختر کے ایک ہی بھائی تھے مظفر شمیم، کلکتہ کے ابتدائی دنوں میں اختر نے انہی کے پاس قیام کیا تھا۔ پھر مظفر لاہور چلے گئے اور اختر تلاش روزگار میں منزلیں بدلتے رہے۔ دونوں بھائیوں میں اس کے بعد ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اختر اور حمیدہ پیرس جانے کے لیے بمبئی پہنچے تو مظفر ان دنوں بمبئی میں تھے۔ اختر نے منٹو کے گھر قیام کیا تو مظفر اس سے ملنے آئے۔ باتوں باتوں میں اختر کے کیبن کا نمبر معلوم کرلیا۔ وکٹوریا جہاز سے روانگی تھی شمیم وہاں بھی آگئے اور قلیوں کو لے کر سامان رکھوانے اندر چلے گئے۔ یہ معلوم ہی نہ ہوسکا کہ انہوں نے کیا کیا چیزیں رکھوادیں۔

جہاز روانہ ہوگیا۔ روانگی کے کئی گھنٹے بعد وہ کیبن میں آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں کے پلنگوں پر موٹے موٹے گدے، لحاف اور تکیے ایک ایک رسی کے ٹکڑے سے بندھے رکھے ہیں۔ میز پر ایک بڑا پتیلا رکھا تھا۔ ڈھکن کھول کر دیکھا تو بھنا ہوا گوشت، ایک کپڑے میں دو درجن شیرمال تھے۔

یہ سب دیکھ کر اختر کی خودداری کو ٹھیس لگی "تم نے دیکھا شمیم صاحب نے کیا حرکت کی ہے۔"

روم میٹ کو پانچ پاؤنڈ دیے کہ رات کو کسی طرح دونوں بستر، پتیلا اور شیرمال سمندر میں پھینک دیں۔"

اختر کا یہ سفر خالص تعلیمی نوعیت کا تھا لیکن وہ محض طالب علم نہیں تھا کہ مقالہ لکھتا اور واپس آجاتا۔ وہ تو جہاں جاتا تھا سیاحت کے سامان جمع کرلیتا تھا۔ دوستوں کے جھرمٹ میں گھر جاتا تھا۔

پیرس میں اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ اس کے حل کی سبیل یوں نکلی کہ معروف ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم (جن کے شوہر سے اس کی ملاقات دہلی میں ہوچکی تھی) نے ایک فرانسیسی وکیل کی بیوہ مادام مارتاں کے گھر کا ایک خالی کمرا اس کی رہائش کے لیے مختص کردیا۔

اختر نے فرانسیسی زبان سیکھنی شروع کردی۔ پہلے وہ انگریزی اخبار پڑھتا پھر فرانسیسی اخبار میں ان خبروں کو دہراتا اور مشکل الفاظ کے مطالب ڈکشنری میں دیکھتا جاتا۔ پھر بازار میں نکل جاتا۔ سائن بورڈ اور نرخ ناموں کا مطالعہ کرتا۔ رات کو گھر آتا تو مادم مارتاں سے فرانسیسی بولنے کی مشق کرتا۔ جب اس زبان کی کچھ شناخت ہوگئی تو سوربون یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور کام کا آغاز ہوگیا۔

ابتدا ہی میں دیارِ غیر میں اسے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ گیا جب فضل جی داؤد بھائی ٹرسٹ کی جانب سے متوقع وظیفہ اسے نہ مل سکا۔ وشوامتر کے لیے کالم نگاری جاری تھی لیکن اس کی آمدنی ناکافی تھی۔ سخت مشکل۔

ایک امریکی ہفت روزہ کے نمائندہ کو پٹیالہ کے علیل مہاراجا کی اوباشی اور مظالم سے متعلق تیس صفحات پر مشتمل مضمون درکار تھا۔ نمائندے نے اختر سے ملاقات کی اور بھاری معاوضے کے عوض مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ اختر کو یہ گوارا نہیں ہوا کہ وہ ایک علیل راجا کے خلاف مضمون لکھے۔ اس نے سخت ضرورت کے باوجود صاف انکار کردیا۔ حمیدہ نے اس انکار کے باوجود وائسرائے ہند کی قائم کردہ کمیٹی کی رپورٹ کے لیے وائسرائے ہند کی سیکریٹریٹ میں ہیڈ کلرک اور منٹو کو اخباری تراشوں کے لیے لکھ دیا۔

اختر نے حمیدہ کے اصرار پر اور مواد کی فراہمی کے بعد اس شرط پر مضمون لکھ دیا کہ اس کا نام شائع نہیں کیا جائے گا۔ اس مضمون سے اسے سو پونڈ حاصل ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی انگریزی مضامین لکھ کر وہ اپنے اخراجات پورے کرتا رہا۔

قیام یورپ نے اس کی فکری تربیت کی۔ یہاں اسے ایشیا، یورپ اور لاطینی امریکا کے مجاہدوں اور فنکاروں سے ملاقاتوں کا موقع ملا۔ اشتراکی رہنماؤں سے میل جول کے مواقع ملے۔ اشتراکی گروہوں کی باہمی رقابت کا بھی اندازہ ہوا۔ ان روسی ادیبوں سے ملاقات کی جو انقلاب کے بعد اپنا گھر بار چھوڑ کر فرانس چلے آئے تھے۔

ان مشاہدات اور میل جول کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ اس کے دل میں اشتراکیت کی جانب سے شکوک پیدا ہونے شروع ہوگئے اور آیندہ کے لیے ایسے امکانات پیدا ہوگئے کہ اس کے اور ترقی پسندوں کے مابین فاصلے بڑھ جائیں۔

اس اکھاڑ پچھاڑ کے درمیان بھی اس نے ادبی کام جاری رکھے۔ سہ ماہی "اردو" کے لیے ادبی معلومات بھیجتا رہا۔ پیام شہاب، کالی داس کے سنسکرت ناٹک شکنتلا اور

گورکی کی آپ بیتی کی جلد اول کے تراجم کیے۔ ''جسم کی پکار اور دل کا اندھیرا'' نامی اس کے شاہ کار افسانے بھی اسی دوران تحریر ہوئے۔ فرانس ہی میں وہ ایک بیٹے کا باپ بنا۔

اسی قیام کے دوران جنگ عظیم دوم بھی چھڑ گئی۔ اختر کے پروفیسرز کو بھی فوج میں بھرتی کر کے محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا لہٰذا اس کی ڈاکٹریٹ میں تاخیر ہوتی چلی گئی تاہم جنوری 1940ء کے آخر میں اس کے زبانی امتحان کی تاریخ مقرر ہوئی اور یوں 20 جون 1940ء کو اسے ڈگری جاری کردی گئی۔

حمیدہ کو اس سے زیادہ اس کی فکر رہتی تھی۔ جیسے جیسے اس کی ڈاکٹریٹ مکمل ہونے کے دن قریب آرہے تھے۔ حمیدہ کو یہ فکر ہورہی تھی کہ وہ ہندوستان جا کر کیا کریں گے۔ وہ ہندوستان واپس آنے والا تھا۔ حمیدہ اس سے پہلے علی گڑھ پہنچ گئی تھی۔ انفارمیشن آفیسر کی ایک اسامی اخبارات میں مشتہر ہوئی۔ حمیدہ نے اس اسامی کے لیے اپنے شوہر کی طرف سے درخواست دے دی۔ حمیدہ کو امید تھی کہ انٹرویو کی تاریخ سے قبل ہی وہ واپس آجائے گا لیکن اس کی واپسی سے قبل ہی انٹرویو کی تاریخ آگئی۔ حمیدہ خود دہلی پہنچ گئی۔ اختر کے کوائف ہی اتنے جاندار تھے کہ اس کی غیر موجودگی میں تقرری کے احکام صادر ہوگئے۔

1940ء میں ایسے اعلیٰ سرکاری عہدے پر تقرری کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اختر وطن واپس لوٹ آیا تھا۔ ابھی پوری طرح سامان کھولا بھی نہیں تھا کہ حمیدہ نے خوش خبری سنادی۔

''ایک شاندار نوکری آپ کا استقبال کرنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔''

''تمہارا خاوند کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ نوکریاں تو اس کے آگے پیچھے پھریں گی۔''

''پھریں گی نہیں پھر چکیں'' حمیدہ نے شوخی سے کہا۔ آپ کی غیر موجودگی میں میں نے درخواست دے دی تھی۔ انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے آپ کی تقرری بھی ہوچکی۔''

اختر کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ''آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے کہ میں انگریز کے انفارمیشن کے محکمے کی ملازمت کرلوں گا۔''

''اس میں حرج کیا ہے۔''

''حرج ہے۔ تم نہیں سمجھوگی۔ میں فاشزم اور سامراجیت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں باغی ہوں مجھے باغی رہنے دو۔ شیر کو پنجرے میں بندمت کرو۔ روٹی کمائی ہے کسی طور بھی کمالوں گا۔''

اس کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ حمیدہ کچھ کہتی۔ اسے افسوس ضرور ہوا تھا کہ اس کے میاں نے اتنی اچھی نوکری ہاتھ سے جانے دی۔

مہینوں گزر گئے وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اہلِ قلم کی دست گیری کے اس وقت دو ذرائع تھے۔ ریڈیو اور فلمی دنیا۔

اختر کے ایک دوست نے اسے آگاہ کیا کہ بمبئی ٹاکیز کو انگریزی کے ساتھ ساتھ تمام ہندوستانی زبانوں کے افسانوی ادب سے شناسا ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو خاکہ، سنیریو اور فلمی کہانی کی تکمیل میں عمومی معاونت کے قابل ہو۔ اختر کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً رابطہ کرلے۔

فلمی دنیا نہ اس کے معیار کی تھی نہ اس کے شوق کی لیکن ضرورت اشد تھی اس لیے وہ رابطہ کرنے کے لیے سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

بمبئی ٹاکیز کو فلم کمپنیوں میں بڑا اعزاز حاصل تھا کیونکہ اس کی باگ ڈور ہمانسو رائے جیسے صاحب نظر ہدایت کار اور دیویکا رانی جیسی اداکارہ کے ہاتھ میں تھی۔

احمد شاہ پطرس بخاری آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر تھے۔ اختر کی ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اختر کو ریڈیو کی ملازمت کی ترغیب دی۔ ملازمت یہ بھی سرکاری تھی لیکن پطرس باتیں بنانے کے ماہر تھے۔ اختر کو شیشے میں اتارلیا۔ ن۔م راشد، کرشن چندر، منٹو وغیرہ ریڈیو سے وابستہ ہوچکے تھے۔

''سرکاری دفاتر کی پابندی نہیں ہے، پڑھے لکھوں کا اجتماع ہے اور یہ کہ فاشزم کے خلاف جو چاہو کہو البتہ انگریز کو اچھا نہیں تو برا بھی نہ کہو۔''

یہ تھا پطرس کا اعلان نامہ۔ اختر نے فلمی دنیا کا رخ کرنے کے بجائے آل انڈیا ریڈیو پر اپنی پہلی سرکاری ملازمت کا آغاز کردیا۔ اس کے فرائض میں انگریزی اور ہندوستانی میں نشر کی جانے والی خبروں کی تدوین۔ ہندوستانی (اردو) میں تبصرے لکھنا اور خود ہی پیش کرنا تھا۔

اس ملازمت کے چند مہینے بعد ہی وہ دریا گنج دہلی سے اٹھ کر پرانی دہلی کی ایک کوٹھی میں آگیا جس کے بازو میں صدیوں پرانا قدسیہ باغ اور پشت پر جمنا ندی گزرتی تھی۔ کوٹھی بہت بڑی تھی۔ کرایہ پورے پچاس روپے تھا۔ اتنا کرایہ اکیلے کیسے دیا جاتا تو آدھی کوٹھی ریڈیو کے ایک

ساتھی مسٹر بھاٹیہ کو دے دی، دونوں مل کر آدھا آدھا کرایہ دیتے رہے۔

اس نے اس ملازمت کے بعد اخلاقی طور پر ضروری سمجھا کہ دیویکا رانی کو اپنی سرکاری ملازمت سے آگاہ کردے اس نے دیویکا رانی کو خط لکھ دیا۔

دیویکا رانی اس کی طرف سے پوری طرح مایوس نہیں ہوئی۔ اس نے جواب میں لکھا۔

''آپ کا خط پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ معاملہ صرف اسی صورت مناسب رہے گا۔ اگر ہم باہم مل کر آپ کی تقرری کے بارے میں گفتگو کریں۔ جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے کہ آپ سرکاری عہدے پر فائز ہوچکے ہیں جس نے آپ کو بڑی حد تک تلافی کا موقع دیا ہے۔

اگر دورانِ تعطیلات ... آپ ملاقات کے لیے بمبئی آنے کی زحمت گوارا کرسکیں تو یہ نہایت مناسب رہے گا۔ تب شاید ہم کسی نکتے پر متفق ہوسکیں۔ ہم آپ جیسے تجربہ کار نوجوان کی قدر کرتے ہیں۔

دورانِ تعطیلات بمبئی جانے کی نوبت نہ آسکی۔ اختر نے ریڈیو کی ملازمت اختیار کرلی تھی اور فلمی دنیا سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ مجبوری کی بات اور تھی۔

ریڈیو کی ملازمت دو سال چل سکی۔ کچھ بیماری کچھ اندرونی سازشیں۔ وہ استعفیٰ دینے پر مجبور ہوگیا۔ استعفیٰ بیماری کے سبب دیا گیا تھا لیکن پس پردہ معاملات کچھ اور بھی تھے۔

ریڈیو سے نجات ملی تو ایک مرتبہ پھر اس کی آوارگی نے پاؤں پھیلائے۔ ایک مرتبہ پھر اخبار نکالنے کا خیال آیا۔ نئے عزم کے ساتھ ''جہاں نما'' کے لیے ڈکلریشن حاصل کیا۔ کاغذ بھی خرید لیا تھا مضامین بھی جمع کرنے شروع کردیے تھے لیکن اخبار نہ نکل سکا۔ اس کے عزیز دوست سندر لال گرفتار کرلیے گئے۔ انہوں نے اپنے رسالے وسووانی کی اعزازی ادارت اس کے سپرد کردی۔ اب اسے ان کی رہائی تک یہ رسالہ نکالنا تھا۔ اسی عرصے میں اسے DAWN کے معاون ایڈیٹر کی پیش کش ہوئی۔ وہ اسے قبول بھی کرلیتا لیکن ایم اے او کالج، امرتسر کی انتظامیہ نے اسے وائس پرنسپل (مع پروفیسر شعبہ تاریخ) کی پیش کش کی تو اس نے یہ سوچ کر اسے فوراً قبول کرلیا کہ اس ملازمت میں اتنا وقت مل سکتا تھا کہ سندر لال کے رسالے کی ادارت کا بار اٹھا سکتا تھا۔ وہ امرتسر چلا گیا۔

کالج کی ملازمت میں اتنا وقت مل سکتا تھا کہ وہ ادبی مشاغل کو جاری رکھ سکے۔ اسی ملازمت کے دوران گورکی کی آپ بیتی کا ترجمہ مکمل کیا، ادب اور انقلاب کو ترتیب دیا، اکثر افسانے لکھے جو بعد میں ''زندگی کا میلہ'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

1944ء میں اختر کی زیرِ صدارت مشاعرہ ہورہا تھا۔ مجید لاہوری نے بنگال کے قحط پر ''خدا سے کچھ نہ کہو'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ نظم کا پڑھنا تھا کہ مشاعرے میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں کو اعتراض تھا کہ اس میں خدا کی شان میں گستاخی کا پہلو نکلتا ہے۔ مشاعرہ بدنظمی کا شکار ہوکر ختم ہوگیا۔

لوگ سمجھ رہے تھے بات آئی گئی ہوگئی لیکن دوسرے دن شہر کی دیواریں پوسٹروں سے آراستہ تھیں۔ علما نے کفر کے فتوے شائع کیے تھے جو اخبارات کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اختر نے مشاعرے کے سامعین کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے مشاعرے میں تقریر بھی کی تھی لہٰذا زیادہ نزلہ اس پر گرا تھا۔ کالج انتظامیہ اس صورتِ حال سے گھبرا گئی اور اختر سے استعفیٰ طلب کرلیا۔ گاما پہلوان، اختر کے خسر کا معتقد تھا۔ اس کے پٹھے کالج میں گھس آئے۔ ایسا ہنگامہ کھڑا کیا کہ انتظامیہ نے اختر کو استعفیٰ واپس لینے پر رضامند کرلیا۔

اختر نے استعفیٰ واپس لے لیا تھا لیکن امرتسر سے دل

سیلولر فون

سیلولر فون دراصل کسی شہر کو ایک خیالی سدو تما علاقہ (Imaginary Hex gonal Areas) میں تقسیم کرتا ہے۔ جسے سیل کہتے ہیں۔ یہی ایک سیل اس کی بنیادی اکائی (Basic Unit) ہوتی ہے۔ سیلولر ٹیلی فون سسٹم مندرجہ ذیل تین اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ بی ٹی ایس، بی ایس سی اور ایم ایس سی پر ایک سیل کے پاس ایک بیس ٹرانس ریسیور ہوتا ہے، جو ایک اور بیس اسٹیشن کنٹرولر (BCS) سے بذریعہ کیبل ایک مخصوص خرد رولہر سے منسلک رہتا ہے۔ تمام بیس اسٹیشن کنٹرولر سے ایک سینٹر کنٹرول سے جڑے رہتے ہیں۔ جسے موبائل سوئچنگ سینٹر کہتے ہیں۔ یہی موبائل سوئچنگ سینٹر پورے سیلولر ٹیلی فون سسٹم کا مرکزی حصہ ہے، جو کہ پبلک سوئچ ٹیلی فون نیٹ ورک اور آئی ایس ڈی این کے ذریعے اس پورے سسٹم کو باہر کی دنیا سے جوڑتا ہے۔

مرسلہ: ناظم حسین، کوٹ سپران

اچاٹ ہوگیا تھا جیسے تیسے ایک سال اور گزارا اور 1945ء میں اس ملازمت کو بھی خیر باد کہہ دیا اور دہلی چلا آیا۔

اس تمام عرصے میں اختر کی ترقی پسندی ماند پڑ چکی تھی۔ اس کے باوجود قیام امرتسر اور قیام دہلی کے دوران اسے انجمن ترقی پسند مصنفین کا مقامی صدر منتخب کیا گیا۔ لیکن وہ کوئی فعال کردار ادا نہیں کرسکا اس کی واحد وجہ یہی تھی کہ وہ ترقی پسندوں کی بہت سی سرگرمیوں سے خود کو دور رکھنا چاہتا تھا اور پھر وہ بتدریج اپنی منصبی اور دفتری ذمہ داریوں کی نذر ہوتا چلا گیا اور انجمن کے لیے کوئی فعال کردار ادا نہ کرسکا۔

برطانوی حکومت ہند نے جنگ عظیم دوم کے بعد ہندوستان کی تعلیمی ترقی کے منصوبے پر مشتمل ایک رپورٹ تیار کی تھی جس پر عمل درآمد کے لیے معاون مشیروں کی چند اسامیوں کو مشتہر کیا گیا تھا۔ اختر نے بھی درخواست دے دی اور قیام پاکستان سے دو سال قبل 1945ء کو شملہ جا کر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

ترقی پسندوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک باغی اور خلاق ذہن سرکاری دفتروں کی نذر ہوگیا۔ انگریز دشمنی انگریز دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

اختر توجیہات پیش کرتا رہا لیکن ترقی پسندوں نے اسے رجعت پسند قرار دے کر اس سے لاتعلقی اختیار کرلی۔ اب وہ ان کے کام کا نہیں رہا تھا۔

اختر نے 1929ء میں جب رائے پور چھوڑا تھا، باپ سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ اکبر حسین پٹنہ میں مستقل رہائش پذیر ہو چکے تھے۔ اختر شہروں شہروں گھومتا رہا لیکن نہ وہ کبھی باپ سے ملنے گیا نہ باپ نے خیریت دریافت کی۔ 1946ء کی ایک صبح تھی کہ اختر کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' اختر نے پوچھا۔

''میں اکبر حسین۔''

اختر بھاگتا ہوا گیا اور دروازہ کھول دیا۔ اکبر حسین اس کے والد سامنے کھڑے تھے۔

''میں اپنی ان دیکھی بیٹی سے ملنے اور تمہارے بچوں کو دیکھنے آیا ہوں۔''

اختر نے سر جھکا دیا اور پھر ان کے سینے سے ایسے لپٹے جیسے بچہ ماں کی گود میں چھپ جاتا ہے۔

یہ ملن سترہ سال بعد ہو رہا تھا لیکن یہ رفاقت دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور محض ایک برس بعد اپریل 1947ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

تقسیم ملک کے اعلان کے ساتھ ہی جو کام جہاں تھا وہیں رک گیا۔ سرکاری ملازمین کو آپشن دیا گیا کہ وہ ملازمت کے لیے پاکستان اور ہندوستان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اختر کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان نہ جائے۔

''جو نقشہ میرے ذہن میں ہے اس میں آپ کے لیے ایک خاص جگہ ہے۔ آپ پاکستان نہ جائیں۔''

بعض مخلص دوستوں کا مشورہ تھا کہ مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام کے وسیع پیمانے پر انتظامات کیے جا رہے ہیں، اسے پاکستان چلے جانا چاہیے۔ اس نے مولانا ابوالکلام آزاد کی مخالفت کے باوجود پاکستان کی ملازمت کے عہدنامے پر دستخط کردیے۔

وہ 13 اگست کو کراچی پہنچا اور 16 اگست کو اپنے دفتر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

پاکستان آمد کے بعد حکومت کی طرف سے انہیں نیپئر بیرک کا 9 نمبر گھر الاٹ ہوا۔ 10 نمبر مکان کارنر کا تھا۔ حمیدہ نے سوچا مکان خالی تو پڑا ہے کارنر کے مکان پر قبضہ کرلیا جائے۔ سامان وہاں رکھوا دیا گیا۔ اختر، حمیدہ کی اس حرکت پر سخت ناراض ہوا اور جیسے ہی اس مکان کے الاٹی پہنچے اختر نے برملا کہہ دیا، آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ یہ مکان آپ کو الاٹ ہوا ہے۔ سامان باہر کروا کر اپنا گھر لے لیں۔''

حمیدہ سے ایک مرتبہ اور ایک نادانی ہوئی۔ نادانی کیا نئے ملک میں بچوں کے مستقبل کے لیے اسے یہی کرنا تھا۔ اس نے اختر کے تعلقات کا فائدہ اٹھایا اور اسکول کھولنے کے لیے چیف کمشنر کراچی کی منظوری سے جمشید روڈ پر ایک دومنزلہ کوٹھی الاٹ کرالی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اختر خوش ہوں گے۔ اس نے کاغذات اختر کے ہاتھ میں تھمائے اور چابی اس کے سامنے رکھ دی۔

''آپ کو تو کبھی فائدہ اٹھانا آیا ہی نہیں۔ ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئے ہیں۔ کیا ہمارا اس ملک پر اتنا بھی حق نہیں۔''

''ہم اس نئی مملکت کو سہارا دینے آئے ہیں۔ اس لیے نہیں آئے کہ لوگوں کی جائدادوں پر قبضہ کریں۔'' اختر نے برہمی سے کہا اور الاٹمنٹ کے کاغذ پرزے کرکے ہوا میں اچھال دیے۔ حمیدہ مجبور ہوگئی اور بادل ناخواستہ چابی کمشنر کو لوٹا دی۔

باپ کو تو وہ ہندوستان ہی میں دفن کر آیا تھا۔ بھائی

سے ملاقات 1948ء میں ہوئی جب وہ بمبئی سے ہجرت کرکے کراچی چلے آئے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب اختر کلکتہ گیا تھا اور بھائی کے پاس قیام کیا تھا اور اب وہ اس خستہ حالت میں آئے تھے کہ اختر کے پاس رہنے پر مجبور ہوگئے۔ ملاقات اب بھی بہت کم ہوتی تھی۔ صبح جب اختر دفتر کے لیے تیار ہوکر نکلتا تو شمیم سو رہے ہوتے۔ اختر شام کو گھر آتا تو شمیم دوستوں سے ملنے ملانے جا چکے ہوتے۔

پاکستان کی حمایت کرنے کا نقصان اختر کو برداشت کرنا پڑا۔ اسے رجعت پسند قرار دیا جانے لگا جبکہ وہ صرف یہ کہتا تھا کہ نوزائدہ مملکت کو استحکام بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ دن رات کام کیا جائے۔ حصول آزادی کے بعد ترقی پسندوں کا کہنا تھا، یہ تمام ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس کی راہ ہموار کرنے کے لیے کام کریں۔ مراد یہ تھی کہ اس کی سمت کا تعین اور قیادت کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھوں میں ہو۔ اختر اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا اسی لیے معتوب قرار دیا گیا۔ ترقی پسند نقادوں نے اس کی تخلیقات کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب میں اختر کا مرتبہ متعین نہ ہوسکا۔ اختر نے دل برداشتہ ہوکر قلم ہی ہاتھ سے رکھ دیا۔ قیام پاکستان کے بعد اس نے نہ لکھنے کے برابر لکھا۔ اس کی ایک وجہ اس نے یہ بھی بتائی کہ منصبی ذمہ داریوں کی وجہ سے اتنا وقت ہی نہ مل سکا کہ وہ تخلیق ادب کے لیے وقت نکالتا۔ اس کی افسانہ نگاری زوال پذیر ہونا شروع ہوگئی۔ تنقید نگاری پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔ تراجم نے بھی دم توڑ دیا۔

قیام پاکستان کے بعد دونوں طرح کے لوگ یہاں آئے۔ وہ بھی تھے جنہوں نے پاکستان کو مال غنیمت کا انبار خانہ سمجھا۔ وہ بھی تھے جنہوں نے اس نئے ملک کو ان قدروں کا امین سمجھا جو اسلام کے اولین دور پر نقش تھیں۔ یہ لوگ ان قدروں کی روشنی میں قومی زندگی کی تعمیر کے خواہاں تھے۔ اختر کا شمار انہی لوگوں میں تھا۔ لیکن سازش پسند ایسے لوگوں کے خلاف سازشوں کے جال بُنتے رہے۔

1950ء کے اواخر میں اسے ایسا محسوس ہوا کہ سازشوں کا داؤ چل گیا ہے۔ ملک کے مستقبل کے لیے شبانہ روز محنت اور لگن ضائع جا رہی ہے۔ اپنی قابلیت کے باوجود ملک چھوڑنے یا کسی غیر ملکی ادارے کی ملازمت کا اسے خیال تک نہیں آیا تھا۔ اب تک وہ معاون مشیر تعلیم، ڈپٹی مشیر تعلیم، ڈپٹی سیکریٹری تعلیم، صدر ثانوی تعلیمی بورڈ وغیرہ کے مناصب پر فائز رہا تھا۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں اسے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کے بعد وہ ملک سے باہر جانے کا سوچنے لگا تھا چنانچہ جب اسے یونیسکو کی طرف سے پیش کش ہوئی تو وہ انکار نہ کرسکا حالانکہ اس سے پہلے وہ اقوام متحدہ کے محکمہ اطلاعات میں جانے سے انکار کر چکا تھا۔

اختر کو یونیسکو کی ملازمت اختیار کرکے جانا تھا اور بچوں کے ساتھ جانا تھا۔ اس کا بھائی اس کے ساتھ رہتا تھا اور شاعری کے علاوہ کچھ کرتا بھی نہیں تھا۔ وہ ساتھ جا نہیں سکتا تھا۔ حمیدہ نے ناظم آباد میں کرائے کا مکان لے کر دے دیا۔ فرنیچر سے آراستہ بھی کردیا۔

اختر کی پہلی تقرری یونیسکو کے ہیڈ کوارٹر پیرس میں ہوئی جہاں وہ شعبہ ترقی ثقافت کے سربراہ اور ریڈنگ میٹریل پروجیکٹ کا نگراں مقرر ہوا۔

دو سال بعد مشرقی ایشیا کے لیے یونیسکو کا علاقائی دفتر کراچی میں قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تو اختر کو اس کا ڈائریکٹر مقرر کرکے کراچی بھیج دیا گیا۔

1965ء کے اوائل میں اختر کا تبادلہ کراچی سے صومالیہ کے دارالحکومت موگادیشو ہوگیا۔ ایک سال یہاں گزارا تھا کہ اس کا تبادلہ ایران کے دارالحکومت تہران کردیا گیا۔

اختر تہران ہی میں تھا کہ کراچی میں اس کے بھائی مظفر حسین شمیم کا انتقال ہوگیا۔ وہ تہران سے اس کی تدفین میں کیسے آتا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان فاصلے کی جو لکیر حائل ہوگئی تھی آخری دم تک باقی رہی۔

تہران سے وہ ایک مرتبہ پھر پیرس چلا گیا اور ریٹائرمنٹ تک وہیں رہا۔

ملازمت سے فارغ ہونے اور کراچی آجانے کے بعد اس کا بیشتر وقت دوستوں کے ساتھ گزرنے لگا۔ تمام دوست جمع ہو جاتے اور مختلف مسائل پر گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ اختر کو فی البدیہہ گفتگو میں کمال حاصل تھا۔ جو مسئلہ بھی زیر بحث آتا، اختر کی گفتگو سننے کے لائق ہوتی۔ شطرنج کا شوق لڑکپن سے تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد فرصت ملی تو اس شوق نے جنون کی شکل اختیار کرلی موسیقی کا بھی شوق رہا تھا لہٰذا مہینے میں ایک بار دوستوں کو مدعو کرتا اور موسیقی کی محفل سجاتا۔

اردو لغت بورڈ کراچی کو اس کی خدمات کی ضرورت پڑی۔ بورڈ کے سیکریٹری شان الحق حقی تھے۔ انہوں نے رابطہ کیا۔ اختر کی رضامندی کے بعد بورڈ نے اسے کام دے دیا۔ اختر مشغول ہوگئے۔ بینائی کے مسائل کا آغاز

1960ء ہی میں ہوگیا تھا۔ دائیں آنکھ سرخ رہنے لگی تھی لیکن دواؤں سے یہ سرخی دور بھی ہوجاتی تھی۔ جب وہ ایران میں تھا تو اس بیماری نے ایک مرتبہ پھر شور مچایا۔ ایران سے فرانس آئے تو بھی یہ بیماری ساتھ لائے۔ علاج معالجے سے تکلیف دور ہوجاتی تھی اور پھر ابھر آتی تھی۔

جب اس نے لغت بورڈ میں کام شروع کیا تو تکلیف بڑھنے لگی۔ حمیدہ کو فکر لاحق ہوئی۔ ڈاکٹروں نے بھی مشورہ دیا کہ وہ آنکھوں پر اتنا زور نہ ڈالے۔ وہ ان مشوروں کو بالائے طاق رکھتا رہا۔ جب ایک آنکھ کی بینائی بہت خراب ہوگئی تو بورڈ سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی۔

اب اسے کوئی ایسا کام کرنا تھا جس میں آنکھ پر زور نہ پڑے۔ اس کی سبیل اس طرح نکل آئی کہ جامعہ کراچی نے بطور وزیٹنگ پروفیسر اس کی خدمات حاصل کرلیں۔

بینائی کے مسائل الجھتے جارہے تھے۔ ڈاکٹر کرمانی اور ڈاکٹر ایم۔ اے شاہ جیسے اعلیٰ معالجین، بینائی کی بحالی کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ دو مرتبہ آپریشن بھی ہوئے لیکن تاریکیاں اس کا مقدر بن گئیں۔ 1978ء میں اس کی بینائی بالکل زائل ہوگئی۔ کتابیں اور اخبار بھی پڑھنے سے محروم ہوگیا۔ کوئی لڑکا اسے اخبار پڑھ کر سنا دیتا۔ حمیدہ سے کہتا سورہ رحمٰن ترجمے کے ساتھ پڑھ کر سنائے۔ بینائی زائل ہوجانے کے بعد بھی مطالعے کے سوا معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

صبح پانچ بجے سو کر اٹھ جاتا۔ چھ بجے سے سات بجے تک ورزش کرتا۔ پھر لان پر اپنے بیٹے سلمان کے ساتھ چہل قدمی کرتا۔ ایک پیالی چائے پیتا اور شیو کرتا۔ غسل کرکے پتلون قمیص، موزے جوتے پہن کر اس طرح تیار ہوجاتا جیسے دفتر جانے کے لیے تیار ہوتا تھا۔ اپنی مخصوص جگہ بیٹھ جاتا اور ناشتا لگانے کو کہتا۔ کسی سے اخبار سنتا۔ خانساماں آجاتا ”سرکار حکم کریں آج کیا پکایا جائے۔“ وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ کچھ بھی پکا لو بلکہ جو چیز پکانے کو کہتا اس کے خواص شمار کرواتا۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا اس میں گزر جاتا۔ پھر وہ خاتون آجاتی جو اسے کتابیں پڑھ کر سنانے پر مقرر تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولے کے لیے کمرے میں چلا جاتا۔ چار بجے کے قریب اٹھتا۔ غسل کرکے کپڑے تبدیل کرتا۔ برآمدے میں آکر بیٹھ جاتا۔ شام کی چائے آجاتی۔ چائے کے درمیان حمیدہ کچھ نہ کچھ پڑھ کر سناتی رہتی۔ بیٹا سلمان آجاتا۔ اس کے ساتھ لمبی واک پر چلا جاتا۔ واپس آتا تو کوئی نہ کوئی دوست آیا ہوتا۔ اس کے ساتھ محفل جم جاتی۔

یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا کہ اس کی بینائی زائل ہوگئی تھی۔ تمام ڈاکٹروں کو دکھالیا گیا تھا۔ اب اس نے اپنی میڈیکل رپورٹس امریکا بھیجیں اور ماہرینِ امراضِ چشم سے رابطہ کیا۔ 1980ء میں وہ اپنے بیٹے نوید کو لے کر امریکا چلا گیا۔ ڈاکٹروں نے مسلسل معائنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ آپریشن غلط ہوئے ہیں اور آپریشن کے بعد احتیاط نہیں کرائی گئی لہٰذا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

یہ ایسی خبر تھی کہ کوئی بھی ہوتا مایوسی کا شکار ہوجاتا اور وہ جس کا اوڑھنا، بچھونا ہی مطالعہ تھا اس کے دل پر کیا گزری ہوگی لیکن اختر نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کی زبان پر کبھی یہ نہیں آیا کہ اس کی بینائی زائل ہوگئی ہے بلکہ کسی کے سامنے ذکر آتا تو یہی کہتا کہ میری بینائی کچھ کمزور ہوگئی ہے۔ اس کے معمولات میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔

1986ء میں اس نے حمیدہ اور بیٹے سلمان کو ساتھ لیا اور لندن روانہ ہوگیا۔ اس نے سنا تھا کہ لندن میں ایک نیا علاج چشم دریافت ہوا ہے۔ اس کی قسمت میں اجالے تھے ہی نہیں۔ ان ماہرین نے بھی مایوسی کا اظہار کیا۔ جواب یہی تھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

لکھنا لکھانا یکسر موقوف ہوگیا تھا۔

ماہ نامہ افکار کے مدیر صبا لکھنوی کو خیال گزرا کہ اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت شائع ہونی چاہیے۔ انہوں نے جتنی بھرپور زندگی گزاری ہے اس کی روشنی میں یہ خودنوشت صرف اختر کی سوانح نہیں ہوگی بلکہ نصف صدی کا قصہ دہرایا جائے گا۔ بہت سے انکشافات ہوں گے۔

افکار کے صفحات پر ”گردِ راہ“ کے عنوان سے اس کی سوانح قسط وار شائع ہونے لگی پہلی قسط 1976ء میں شائع ہوئی۔

ساتویں قسط شائع ہوئی تھی کہ کم ہونے والی بینائی اتنی کم ہوگئی کہ یادداشتوں کا یہ سلسلہ روک دینا پڑا۔

اب یہی ہوسکتا تھا کہ وہ بولتے رہیں اور کوئی ان کے خیالوں کو قلم بند کرتا چلا جائے، یہ طریقہ تحریر کچھ زیادہ کارآمد نہیں۔ سوچ کر لکھنے اور املا کرانے میں بہت فرق پڑجاتا ہے لیکن مجبوری تھی لہٰذا املا کے ذریعے ”گردِ راہ“ کی قسطیں مکمل کی گئیں۔ 1986ء میں گردِ راہ مکمل ہوگئی۔

ان کے دور بیٹھے دوستوں کو یہ شکایت ہمیشہ رہی کہ

اختر اس سے اچھی اور بھرپور کتاب لکھنے پر قادر تھے۔
اس رائے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ یہ خودنوشت املا کے ذریعے لکھوائی گئی۔ بہت سے واقعات نظرانداز ہوگئے۔ نظرثانی سے گزر ہی نہیں سکی۔ اس کے باوجود یہ اپنے دور کی سب سے اہم خودنوشت ہے۔

1991ء کی گرمیوں کی ایک دوپہر میں اختر کو شدید کھانسی اٹھی اور پھرتے ہوگئی۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی ہوا لیکن نئی بات یہ تھی کہ پورے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ اس کا بیٹا نوید اسے آغا خان اسپتال لے گیا جہاں مختلف قسم کے ٹیسٹ ہوتے رہے بالآخر نمونیہ تشخیص ہوا۔ مزید ٹیسٹ ہوئے تو معدے کے السر کا بھی انکشاف ہوا۔ زندگی بھر کبھی پیٹ کے درد کی شکایت تک نہیں ہوئی تھی اور اب معدے کے السر کا کہا جارہا تھا۔ ناک اور منہ میں نلکیاں لگادی گئیں۔ ڈرپ بھی لگادی گئی۔ تیسرے روز تے ہوئی لیکن خون کی۔
ڈاکٹروں نے اجازت لی کہ پیٹ کا آپریشن کیا جائے گا۔
آپریشن کے بعد ہوش آیا تو طبیعت بالکل پُرسکون تھی۔ ذہن بھی پوری طرح بیدار تھا۔ ادیب دوستوں کی آمد شروع ہوئی تو طبیعت مزید بحال ہوگئی۔ ہر ایک سے اس کے مزاج کے بارے میں باتیں کررہا تھا۔ شاعری کا دور بھی چلتا رہا۔ مذہب اور سیاست پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ یہی خیال کیا جارہا تھا کہ آہستہ آہستہ صحت نصیب ہوتی جائے گی۔ چھٹے دن آپریشن کے زخم سے خون رسنا شروع ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے دیکھا اور سبب یہ بتایا کہ اندرونی ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر آپریشن کرنا پڑا۔
آٹھواں دن تھا کہ حمیدہ کو اپنے پاس بلوایا۔
”حمیدہ بیگم، اپنا ایک پاؤں میرے ہاتھ کے پاس رکھیے گا۔“
”کیا کہہ رہے ہیں۔ اس طرح تو میں گر جاؤں گی۔“ حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
”کسی چیز کا سہارا لے لیجیے۔“
حمیدہ حیران تھی کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ بہرحال حمیدہ نے سہارا لیا اور ایک پاؤں ان کے ہاتھ کے پاس رکھ دیا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ حمیدہ کے پاؤں پر رکھ دیا۔
”حمیدہ بیگم، میری زیادتیوں کو معاف کردیجیے گا۔“
حمیدہ بیگم رونے لگیں تو ہنس کر کہا ”گھبرایئے نہیں۔ یہ شکر بھیجیے کہ آپ کے چاروں بیٹے سعادت مند ہیں۔ میں نہیں بھی رہا تو یہ تمہارا خیال رکھیں گے۔“
”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اب تو آپ ٹھیک ہونے کے قریب ہیں۔“
”آپ کا خیال ٹھیک ہوگا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو اس دنیا میں آتا ہے، جاتا بھی ہے۔“
آنکھیں بند کرلیں جیسے ان قریبی عزیزوں کے بارے میں سوچ رہے ہوں جو اس دنیاں میں آئے اور چلے گئے۔ اس موقع پر فطری طور پر باپ کی یاد آئی ہوگی۔ بڑے بھائی کی موت کا خیال آیا ہوگا جس کی تدفین میں بھی وہ شریک نہیں ہوسکا تھا۔ ماں کا مرنا تو خیر یاد ہی نہیں ہوگا۔ تین سال کے بچے کی بساط ہی کیا!!
یکم جون کو حمیدہ کو گھر بھجوادیا گیا۔ اس رات باپ کے پاس سلمان رکا تھا۔ اس سے باتیں کرتے رہے۔ فارسی کے اشعار ترجمہ کرکے سناتے رہے۔ اچانک اختر کی سانس تیز ہوگئی۔ سلمان نے ڈاکٹر کو بلالیا۔ ڈاکٹر نے پٹی کے بہانے سے سلمان کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ یہ 2 جون 1992ء پانچ بجے صبح کا عمل تھا کہ تمام ڈاکٹرز کمرے سے باہر نکل آئے۔
”اب اختر صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔“
انتقال کے وقت ان کی عمر 80 برس سے دس دن کم تھی۔
اختر کی نماز جنازہ بدھ 3 جون کو بعد نماز عصر مسجد رحمانیہ میں ادا کی گئی اور پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان میں سپردِخاک کردیا گیا۔ پھر وہ تمام رسمیں ادا کی گئیں جو مرنے کے بعد ادا ہوتی ہیں، یہ خبر قومی روزناموں نے نمایاں طور پر شائع کی۔ ادبی صفحات ان کی علمی وادبی خدمات سے بھر گئے۔ ادبی تنظیموں نے قراردادیں پیش کیں۔
صدر پاکستان غلام اسحاق خان نے مرحوم کی اہلیہ کے نام تعزیتی مراسلہ تحریر کیا جس میں مرحوم کی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔
شیخ الجامعہ اور رئیس الجامعہ کے دستخطوں سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینے کا اعلان کیا گیا۔

دور یک ساغر تسنیم معافی، بودہ
دورۂ اختر اردو کہ بیابان رسید
141ھ ہجری

ماخذات

اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر خالد ندیم
ہمسفر، حمیدہ اختر

ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ آسمان پر تاریکی کی دبیز چادر تنی تھی اور دسمبر کی سرد ہواؤں میں یاسیت تیر رہی تھی۔ وہ شام بھی اداس اور یخ تھی، امریکی ریاست الونائی کے جڑواں شہر اربانا، شیمپین کے باسیوں نے قبل از وقت ہیٹر چالو کردیے۔ خود کو گھر کی چاردیواری میں محصور کرلیا جہاں تحفظ کا احساس اُن کے وجود کو گرماتا تھا کہ آج شام سڑکوں، بازاروں پر پُراسرار چُپ کا راج تھا۔ بہتر یہی تھا کہ باہر ٹھٹھرنے کی بجائے گھر میں آتش دان کے سامنے بیٹھا جائے۔

ابنِ کبیر

اس نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہوٹل کے جھوٹے برتن دھونا شروع کیا مگر اپنی تعلیمی رفتار کم نہ ہونے دی۔ وہ آگے بہت آگے جانا چاہتا تھا۔ جو ہمت پر کمر بستہ ہو اس کی مدد قسمت ضرور کرتی ہے آج وہ کھرب پتی ہے۔

ایک باہمت شخص کی روداد زندگی

مگر اُس سرد شام... ہر کوئی اتنا خوش نصیب نہیں تھا۔ شہر کے کئی باسی سڑکوں پر تھے اور ٹھنڈ کو اپنے وجود میں اترتا محسوس کررہے تھے۔

اُن ہی میں ایک پاکستانی نوجوان بھی تھا جو پہلی بار الونائی کی سرد ہواؤں کے رُوبرو آیا تھا جنہوں نے اُس کا جسم چھید ڈالا تھا، وطن سے دوری کا زخم ہرا کردیا تھا۔

اُس کے جسم پر ایک کوٹ تھا جو اُس نے امریکا آنے سے چند روز قبل لاہور میں لگنے والے ایک بچت بازار سے خریدا تھا۔

بڑے بوڑھے سچ ہی تو کہا کرتے تھے۔"سستا روئے بار بار، مہنگا روئے ایک بار!"

کوٹ سرد، کٹیلی ہواؤں سے مقابلے میں ناکافی ثابت ہورہا تھا۔ گلے میں پڑا مفلر بھی اِس جنگ میں بے کار نکلا۔ کپکپانا اُس کا مقدر تھا کیونکہ ہوسٹل ابھی دُور تھا اور اسے پیدل ہی سفر طے کرنا تھا۔ جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ بس پکڑ سکتا۔

بہ ظاہر وہ ایک عام سا نوجوان تھا، اپنے ہزاروں ہم وطنوں جیسا جو امریکا میں قسمت آزمانے آئے اور پھر وقت کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئے، جدوجہد کی گھاٹیاں عبور کرتے ہوئے ہمت ہار بیٹھے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے چہرگی کا شکار ہوگئے۔

ہاں، دیکھنے میں تو وہ ایک عام سا نوجوان ہی تھا... مگر اُس کی قسمت خاص تھی۔ بہت خاص!

چند برس بعد وہ شہرت کے افق پر ایک روشن ستارے کے مانند چمکنے والا تھا، پر اُس سرد شام... یونیورسٹی آف الونائی میں زیرِ تعلیم، ٹھنڈ سے کپکپاتے اُس نوجوان کو اِس بات کا قطعی ادراک نہیں تھا۔ یہاں تک کہ داتا دربار کے پہلو میں بیٹھا بوڑھا دست شناس بھی اپنے تمام تر تجربے کے باوجود یہ اندازہ نہیں لگایا پایا کہ اُس کے سامنے کھڑے نوجوان کے ہاتھ میں چند ایسی لکیریں پوشیدہ ہیں جو بین الاقوامی شہرت کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

لاہور کی اُس حبس زدہ دوپہر، نوجوان کے ہاتھ پر کھدے نقشے سے الجھتے ہوئے درخت کی چھاؤں میں بیٹھے دست شناس کے جھریوں زدہ چہرے پر الجھن ابھر آئی تھی جس سے اُس کے چہرے پر پھیلی یاسیت کچھ گہری ہوگئی۔

لکیریں بہت پُر پیچ تھیں۔ دست شناس کو نئے زاویے سے سوچنے کی تحریک دے رہی تھیں لیکن اس دوپہر گرمی کچھ زیادہ تھی اور دست شناس کا معاوضہ تھوڑا، سو اس نے نئے زاویوں سے سوچنے سے اجتناب برتا اور اُن امکانات کو جو نوجوان کے ہاتھ کی لکیروں میں پوشیدہ تھے، نظر انداز کرنے ہی میں بہتری جانی۔

کئی ساعتوں تک عدسے سے اس کا ہاتھ دیکھنے کے بعد دست شناس نے گہری آہ بھرتے ہوئے کہا۔"مجھے معاف کرنا نوجوان! تمہارے مستقبل میں روشنی کی قلت ہے!"

ان تلخ الفاظ نے تپتی دھوپ میں کھڑے پندرہ سالہ نوجوان کے چہرے پر ناامیدی بکھیری دی لیکن جلد ہی وہ چھٹ گئی۔ اب اس کی جگہ رجائیت تھی، امید تھی۔

نوجوان کی پشت پر داتا دربار تھا اور آنکھوں میں روشنی۔ اس نے جیب سے دو روپے کا نوٹ نکالا، دست شناس کے حوالے کیا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ محنت کا جویا تھا، سر میں کچھ کر گزرنے کا سودا سمایا تھا جو چند روز بعد اسے امریکا لے جانے والا تھا۔

"نوجوان، تمہارے مستقبل میں روشنی کی قلت ہے!" کیا دست شناس نے سچ کہا تھا۔

نہیں۔ وہ غلط تھا۔ نوجوان کی قسمت خاص تھی۔ اُس کے ہاتھ میں چند ایسی لکیریں تھیں جو بین الاقوامی شہرت کی جانب اشارہ کرتی تھیں۔ مگر اس شام... ماحول پر سناٹا طاری تھا اور دسمبر کی سرد ہواؤں میں یاسیت تیر رہی تھی۔

☆☆☆

اُس کا نام شاہد تھا... شاہد خان۔ سنِ پیدائش 1950۔ جائے پیدائش لاہور... زندہ دلوں کا شہر، قدیم تہذیب و ثقافت کا مرکز!

گو کہ ابھی پاکستان ایک نوزائیدہ ریاست تھی، اُسے معرضِ وجود میں آئے فقط تین برس گزرے تھے، مہاجرین کی آمد جاری تھی، وسائل کی قلت تھی لیکن لاہور میں، زندہ دلوں کے شہر میں زندگی عروج پر تھی۔

یہ شہر تقسیم کے سانحے سے نکل آیا تھا اور اب اپنی ہی قوت سے سانس لے رہا تھا۔

شہر کی تنگ گلیوں میں جا بہ جا قدیم طرزِ تعمیر کے نمونے بکھرے پڑے تھے۔ ماحول پر فنونِ لطیفہ کے چوکھے رنگ غالب تھے۔ ادیب، شاعر اور مصور اُس کی سڑکوں، چائے خانوں کا حسن تھے۔ فلمی صنعت اپنے قدم جما رہی تھی۔ الغرض لاہور زندہ تھا اور وہاں متوسط طبقے کی طرزِ معاشرت تیزی سے فروغ پا رہی تھی۔

شاہد کا تعلق بھی متوسط طبقے سے تھا۔ ایک ایسے خاندان سے جہاں وسائل اور مسائل، دونوں ہی کی بہتات تھی، اعتدال نہ تھا۔

اس کے اہلِ خانہ کا مزاج معتدل تھا، جیسے عام طور سے سفید پوش گھرانوں کا ہوتا ہے۔ کم میں گزارہ کرنا، اپنا بھرم قائم رکھنا، چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا۔

شعور کی دہلیز عبور کرنے کے بعد اس نے اپنے بڑوں کو کنسٹرکشن کے کاروبار میں الجھا پایا۔ بڑوں کی اِسی بھاگ دوڑ کے طفیل اُس کے گھر کا چولھا جلتا تھا۔ والدین کی خواہش تھی کہ وہ بھی اس کام میں اُن کا ہاتھ بٹائے لیکن اسے تو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا، وہ بھی بیرونِ ملک، کسی اعلیٰ درس گاہ سے۔

جس زمانے میں شاہد اسکول میں زیرِ تعلیم تھا، نوجوان خال خال ہی بیرونِ ملک جانے کا خواب دیکھا کرتے تھے، گو کہ ان دنوں ویزے کا حصول آج کی طرح دشوار نہیں تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ شاہد اپنے ملک سے محبت نہیں کرتا تھا۔ حب الوطنی کا جذبہ اس کے سینے میں ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ اسے اپنی شناخت پر فخر تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک سپنا بھی تو تھا۔

وہ انجینئر بننا چاہتا تھا اور راسخ ارادہ کرچکا تھا کہ وہ کسی امریکی ریاست سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرے گا۔

امریکا اس زمانے میں اکلوتی عالمی طاقت نہیں تھا۔ سوویت یونین کے زوال میں ابھی کئی برس باقی تھے۔ دنیا میں دو قطبی نظام رائج تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم نے دنیا کو دو ٹکڑوں میں منقسم کردیا تھا۔ ایک جانب امریکا تھا اور دوسری جانب سوویت یونین، جس کے کمیونسٹ نظریات تیزی سے قرب و جوار کی ریاستوں کو لپیٹ میں لے رہے تھے۔

ایسے وقت میں شاہد نے امریکا جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن امریکا ہی کیوں؟

اِس بابت زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ امریکا سپنوں کی سرزمین تھی۔ وہاں دنیا کی بہترین درس گاہیں تھیں، جمہوریت تھی، شخصی آزادی کا چرچا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب بھی ترقی پذیر ممالک کے نوجوان بیرونِ ملک جانے کا سوچتے، ذہن میں پہلا خیال امریکا ہی کا آتا۔

اور یہی کچھ ستاروں پر کمند ڈالنے کے خواہش مند شاہد کے ساتھ ہوا!

☆☆☆

لاہور سے ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شاہد نے فوراً امریکی سفارت خانے میں اسٹوڈنٹ ویزے کے لیے درخواست جمع کروادی۔ اس موقع پر دوستوں نے سمجھایا کہ امریکا جانے سے بہتر ہے، وہ یہیں کسی اچھی یونیورسٹی میں داخلہ لے لے۔

"پاکستانی یونیورسٹیاں دنیا کی کسی درس گاہ سے کم نہیں۔" یہ الفاظ بچپن کے دوست کی زبان سے عطا ہوئے تھے۔

دوستوں کے مشورے تو خلوص پر مبنی تھے لیکن ناصح بننے والے بیشتر افراد کا مقصد فقط اُس کے سپنے چُرانا تھا۔

"میاں، امریکا جارہے ہو۔ کیا سوچا ہے، وہاں جاتے ہی چاروں طرف سے پیسوں کی بارش ہونے لگے گی؟ بھائی وہاں ایک ڈالر کمانے کے لیے بھی خون تھوکنا پڑتا ہے۔" ایک بڑے میاں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

ایک اور رشتے دار نے بھی طنز کرنے کا موقع ڈھونڈ نکالا۔"بھائی، حصولِ علم ہی کی خواہش لے کر جارہے ہو ناں، کوئی اور ارادہ تو نہیں؟ برا مت ماننا۔ میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ ہمارے نوجوان سوچتے ہیں، امریکا میں آزادی ہے۔ گھر سے دور ہوں گے، خوب موج مستی کریں گے۔ تم تو اچھے خاندان کے ہو۔ بس اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھنا۔"

ایک محلے دار بھی اِس معاملے میں کود پڑا۔"بیٹا، وہاں قیام و طعام کا کیا بندوبست کیا ہے؟ تم تو اسٹوڈنٹ ویزے پر جارہے ہو؟ کیا کہا... وہاں جا کر محنت مزدوری کرو گے؟ بیٹا، کبھی یہاں محنت مزدوری کی ہے؟ نہیں ناں۔ اپنوں کے سامنے محنت کرتے ہوئے شرم آتی ہوگی، ہے ناں؟ مزدوری ہی کرنی ہے، تو یہیں کرو۔ دیارِ غیر جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس نوع کے تبصروں اور تجزیوں کی جانب شاہد نے قطعی توجہ نہیں دی۔ اس کا مقصد تو اسٹوڈنٹ ویزے کا حصول تھا۔

اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

ویزا مل گیا۔ پاسپورٹ تو تیار تھا ہی۔ اب اسے کسی درس گاہ میں داخلہ لینا تھا۔ نظرِ انتخاب 1867 میں قائم ہونے والی قدیم درس گاہ یونیورسٹی آف الونائی پر ٹھہری۔

اس زمانے میں شرائط اتنی کڑی نہیں تھیں۔ سولہ سالہ شاہد نے چند ضروری فارم بھرے، درخواست ارسال کرتے

وقت بنیادی تقاضوں کا خیال رکھ۔ اور پھر صبر کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔

کہتے ہیں، صبر کا پھل میٹھا ہوتا تھا۔ ایک دوپہر ڈاکیے نے دروازے پر دستک دی۔ شاہد نے دروازہ کھولا تو اُس نے مسکراتے ہوئے امریکا سے آنے والا ایک سفید لفافہ اُسے تھما دیا اور بخشش کی امید پر وہیں کھڑا ہو گیا۔

کانپتے ہاتھوں سے شاہد نے لفافہ چاک کیا۔ خط پڑھتے وقت اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ تاہم جلد ہی اندیشوں کی جگہ مسرت نے لے لی۔ اُسے یونیورسٹی آف الونائی میں داخلہ مل گیا تھا۔

جب ڈاکیا شاہد کے دروازے سے لوٹا، وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی جیب میں پانچ روپے کا کڑک نوٹ تھا اور وہ آج شام فلم ''لوری'' دیکھنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

☆☆☆

کالی، مست گھٹاؤں نے آسمان پر گھر کر لیا۔ بادلوں کے ارادے خطرناک تھے۔ اور جب وہ برسے، شہر جل تھل ہو گیا۔

مون سون کا موسم اس بار بڑی شدت سے لاہور سے ٹکرایا تھا لیکن برستا آسمان اُس کی تیاریوں میں رخنہ نہیں ڈال سکا۔

1967 میں جب شاہد امریکا جانے والے جہاز میں سوار ہوا، دل میں تجسس اور تاسف دونوں ہی جذبات بیک وقت موجزن تھے۔

ایک جانب نئے تجربات سے گزرنے کی للک چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتی تھی تو دوسری جانب لاہور سے دُوری آنکھوں میں اداسی بھر دیتی تھی۔

جوں ہی جہاز رن وے پر دوڑنا شروع ہوا، اس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

جہاز کے اڑان بھرتے ہی لاہور کی گلیاں اور مکانات یکدم سکڑنے لگے۔ گزرتے لمحات کے ساتھ دور ہونے لگے۔ اس دوری نے اس کے جوان دل کو سُونے پن سے بھر دیا۔

اُس نے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ وہ سڑکیں، وہ بازار جہاں اُس کا بچپن گزرا تھا، تیزی سے دُور ہٹ رہے تھے۔ اور جوں جوں جہاز بلند ہوتا جا رہا تھا، روح کا سُونا پن بڑھتا جا رہا تھا۔

یکدم کھڑکی سے نظر آنے والی دنیا دھندلا گئی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

اس نے آنسو پونچھے۔ ایک بار پھر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے مکانوں کی قطار نظر آ رہی تھی جن میں شاید ایک مکان اُس کا بھی تھا جہاں اُس کا حسین بچپن گزرا تھا مگر اب... وہ مکان یادِ ماضی بن گیا تھا۔

اُس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔ شکستگی عیاں تھی۔ جہاز پلک جھپکتے ہی لاہور کی حدود عبور کر گیا۔ لاہور... جو زندہ دلوں کا شہر تھا... جہاں داتا دربار کے پہلو میں ایک معمر دست شناس بیٹھا تھا۔

☆☆☆

نہیں... فقط نیا ماحول کہہ دینا کافی نہیں۔ وہ تو ایک نئی دنیا تھی۔

امریکا، خوابوں کی سرزمین، حقیقتاً اُن تصاویر سے زیادہ پُرشکوہ تھا جو شاہد اخبارات و رسائل میں دیکھا کرتا تھا۔ وہ اُس کے تصور سے زیادہ تیز رفتار تھا، اُس کے تخیل سے کئی برس آگے تھا۔

''تو یہ ہے امریکا!'' اس نے خود سے کہا مگر آواز ساتھ نہیں دے سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ امریکا کی وسعت کو اپنے تخیل کی پرواز سے زیادہ بلند پاتا تھا۔ اُسے وقت درکار تھا، اس نئی تہذیب، نئے ماحول کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے، اس سے ہم آہنگ ہونے کے لیے۔

جو رقم وہ اپنے ساتھ لایا تھا، وہ خاصی قلیل تھی۔ اہلِ خانہ کی جانب سے امداد کے امکانات بھی معدوم تھے۔ گھر والے تعلیمی اخراجات میں تو معاونت کر سکتے ہیں، لیکن روزمرہ کے اخراجات پورے کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ والدین نے بہ مشکل اسے امریکا بھیجنے کا انتظام کیا تھا، یونیورسٹی کی داخلہ فیس کا پہلا حصہ بھی بڑے جتن کے بعد جمع کروا گیا تھا۔ ان حالات میں وہ اپنے گھر والوں کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔

قیام ہوسٹل میں تھا جس کا کرایہ بہت زیادہ نہیں تھا، البتہ اُسے اپنے طعام اور روزمرہ کے اخراجات کے لیے رقم کا بندوبست کرنا تھا۔ جو رقم جیب میں تھی، اُس سے کھینچ تان کر فقط چند ماہ ہی نکل سکتے تھے۔

امریکا آنے سے پہلے جہاں اُسے حاسد ناصح ٹکرائے، وہیں خوش قسمتی سے چند اچھے لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جن میں سے چند امریکا میں قیام کا تجربہ رکھتے تھے۔

اُن میں کراچی سے تعلق رکھنے والا اُس کا ایک خوش مزاج دوست بھی شامل تھا جس نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ کس طرح امریکا میں تعلیم جاری رکھتے ہوئے چھوٹی موٹی ملازمتیں کر سکتا ہے۔

''طالب علموں کے لیے ملازمت کے چند گھنٹے مقرر ہیں مگر تمہاری ضروریات تقاضا کریں گی کہ تم قانونی حدود سے تجاوز کر جاؤ۔'' اُس نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''بے شک یہ غیر قانونی ہے لیکن یہ تمہاری ضرورت ہے۔ اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' شاہد کے لہجے میں تذبذب تھا۔

''یہ بات تم وہاں رہتے ہوئے سمجھ جاؤ گے۔'' اُس نے آنکھ ماری۔

ائرپورٹ سے باہر آنے کے بعد جب شاہد نے ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، تو وہ اپنے دوست کی کہی ہوئی بات کا مطلب سمجھ گیا۔

وہاں کئی ایشیائی تھے۔ پاکستانی اور ہندوستانی نمایاں نظر آتے تھے۔ سکھوں کی مخصوص پگڑی کو بھی بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا تھا۔ چند ٹیکسی ڈرائیور تو ایسے تھے جو چہرے مہرے سے پکے لاہوری لگتے تھے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ایک ٹیکسی کی جانب بڑھا جس میں نصب ٹیپ ریکارڈ سے میڈم نور جہاں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

ڈرائیور نے خوشدلی سے شاہد کی جانب دیکھا۔ چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ شاہد کو اُس کے انداز میں اپنائیت محسوس ہوئی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا جو ایک فلاحی تنظیم وائی ایم سی اے کے دفتر کی جانب بڑھنے لگی جہاں کیمپین کے دیگر سرائے خانوں کے برعکس آپ فقط دو ڈالر میں رات گزار سکتے تھے۔ شاہد اس رقم کو پاکستانی روپے میں منتقل کرنے کے تردّد میں نہیں پڑا۔ وہ جانتا تھا، اِس شہر میں اس سے کم نرخوں پر رات کے لیے کمرا تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ وائی ایم سی اے کی عمارت کے سامنے اترنے کے بعد اُس نے جیب سے پرس نکالا۔ کرایہ ادا کیا اور پھر مصافحے کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ ''بھائی، تم سے مل کر لاہور سے دوری کا غم کم ہو گیا۔''

ٹیکسی ڈرائیور مسکرایا۔ ''مجھے خوشی ہوئی کہ میری وجہ سے تمہارے غم میں کمی واقع ہوئی، لیکن بھائی جی، میرا تعلق لاہور سے نہیں، امرتسر سے ہے۔ اللہ حافظ!''

ٹیکسی آگے بڑھ گئی اور چند ساعتوں بعد تاریکی میں گم ہو گئی۔

''اللہ حافظ!'' شاہد نے دھیرے سے کہا۔ اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔

اُس رات وہ بے خوابی کا شکار رہا۔ کیمپین کی رات، لاہور کی مرطوب راتوں سے مختلف تھی۔ خاصی سرد تھی!

☆☆☆

جدید رنگ، کشادہ عمارت، طویل راہداریاں، روشن کمرے، چہکتے لڑکے، مہکتی لڑکیاں اور مشفق اساتذہ!

یونیورسٹی کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں اُسے تھوڑا وقت لگا۔

راہ میں کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ ایک پاکستانی کے لیے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک کی ایک بڑی درس گاہ کے مزاج کو سمجھنا سہل نہیں تھا لیکن انجینئر بننے کی خواہش اتنی پُرقوت تھی کہ وہ ہر رکاوٹ عبور کرنے کے لیے تیار تھا۔

خوش قسمتی سے وہاں اُسے اچھے لوگ ملے۔ اُس کے مانند چند اور ایشیائی نوجوان بھی وہاں زیرِ تعلیم تھے جنہوں نے شاہد کی بھرپور رہنمائی کی۔ البتہ سب سے زیادہ حوصلہ ایک ضعیف العمر برطانوی استاد نے دیا جو قیامِ پاکستان سے قبل چند برس لاہور میں گزار چکا تھا اور تھوڑی بہت اردو جانتا تھا۔

اُس معمر شخص نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں شاہد سے کہا۔ ''نوجوان، میرے تجربے کے مطابق پاکستانی بہت ذہین ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھار ان کی صلاحیتیں اظہار کے نئے ماحول کا تقاضا کرتی ہیں۔ ممکن ہے، تمہاری صلاحیت اور ذہانت کا نصیب پاکستان کے بجائے امریکا میں اپنا جادو جگاتا ہو۔''

شاہد کے لہجے میں حوصلہ تھا۔ ''میں بھی یہی امید رکھتا ہوں جناب۔''

مکینیکل اینڈ انڈسٹریل انجینئرنگ اُس کا شعبہ تھا اور وہ جی لگا کر محنت کر رہا تھا۔ مغربی درس گاہوں کے معیارات بہت بلند ہوتے ہیں۔ نظری تعلیم پر عملی تجربات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ شاہد کو بھی تھیوری سے نکل کر پریکٹیکل کی دنیا میں قدم رکھنا پڑا۔ اپنے مضمون کو سمجھنے کے لیے کمرۂ جماعت کے بجائے تجربہ گاہوں کا رخ کرنے پڑا۔ اسائنمنٹ بنانے کے لیے گھنٹوں سر کھپانا پڑا۔

یہ سب آسان نہیں تھا، مگر وہ بے حد پُرتجسس تھا۔ اور یہی تجسس اُسے آگے بڑھا رہا تھا۔ ایشیائی دوستوں کی صحبت بھی مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ الغرض کشادہ عمارت، طویل

راہداریوں اور روشن کمروں کا وہ تجربہ پُرجوش تھا۔

گہما گہمی کے اُن لمحات میں شاہد اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ ایک مشکل تیزی سے اُس کی جانب بڑھ رہی ہے۔

☆☆☆

وہ کرسمس کی شام تھی۔ جڑواں شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ روشن درخت استادہ تھے۔ موسم سرد لیکن دل پذیر تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی ہلکی ہلکی برف گرنے لگی جس نے ماحول میں پھیلی مسرت کو مہمیز کیا اور الونائی کے باسیوں کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا لیکن... شاہد اُس شام اداس تھا۔

وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔ باہر قدرت کا پُراسرار حسن پھیلا تھا جس میں نیلی روشنی تھی، برف تھی، پُرسکون ٹھنڈ تھی لیکن اس کے لیے ہر منظر اپنے رنگ کھو چکا تھا۔

کرسمس کی اس خوبصورت شام شاہد کے ایشیائی دوستوں نے خوب جشن منایا۔ انہیں مقامی دوستوں کی جانب سے کئی دعوت نامے موصول ہوئے تھے اور وہ اُس تہوار سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا چاہتے تھے لیکن شاہد اُن کے ساتھ نہیں جاسکا، اُس گہرے صدمے کے باعث جس سے وہ آج صبح دوچار ہوا تھا۔

بیدار ہونے کے بعد جب ناشتے کا بندوبست کرنے کے لیے اُس نے وہ صندوق کھنگالا جس میں وہ رقم رکھا کرتا تھا تو سکتے میں آگیا۔

وہاں چند ہی نوٹ تھے، جس کا مطلب تھا کہ مصائب کا آغاز ہوگیا ہے۔

یہ احساس اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا کہ یونیورسٹی کی گہما گہمی، نئے ماحول کی رنگنی اُسے کسی اور دنیا میں لے گئی۔ وہ غافل ہوگیا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ فضول خرچ ہوگیا تھا۔ بس، وہ اِس جانب توجہ نہیں دے سکا کہ پس انداز کی ہوئی رقم تیزی سے ختم ہورہی ہے۔

کھڑکی کے سامنے کھڑے شاہد نے گہرا سانس لیا۔ وہ جانتا تھا کہ گھر والوں کی جانب سے یکم جنوری کو رقم روانہ کی جائے گی، جسے امریکا پہنچنے میں یقینی طور پر چند روز لگیں گے۔ اور جو رقم اس کے پاس ہے، وہ اگلے دس دنوں کے لیے ناکافی ہے۔ یہی احساس اس کی پریشانی کا سبب تھا۔

اچانک کھٹکا ہوا۔ شاہد نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے پر حامد کھڑا حیرت سے پلکیں جھپک رہا تھا۔

''ارے شیڈ، تم پارٹی میں نہیں گئے؟'' افغانستان سے تعلق رکھنے والے نوجوان نے شاہد کو اُس کے ''نک نیم'' سے پکارا تھا۔ ''میں یہاں سے گزر رہا تھا، تو تمہارے کمرے میں روشنی دکھائی دی۔ خیریت تو ہے؟''

''وہ... بس۔'' شاہد نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔

حامد چند ساعت یونہی کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پر تذبذب تھا۔ پھر اچانک وہ معاملہ سمجھ گیا۔ اور کیوں نہ سمجھتا، وہ بھی دیارِ غیر میں تھا اور ماضی میں اپنی غفلت کے باعث معاشی مشکلات کا سامنا کر چکا تھا۔ ٹھیک شاہد کے مانند، جو اپنی غفلت کے باعث آج شام گہرے صدمے میں تھا۔

حامد آگے بڑھا اور شاہد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''دوست، اتنے رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے حوصلہ بڑھایا۔ ''ہم سب وطن سے دور ہیں اور ہم سب کو معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیا تم نے دیگر دوستوں سے اس کا ذکر کیا؟''

شاہد نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا کیا۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں۔'' حامد مسکرایا۔ ''چلو ہم اس بارے میں کل غور کریں گے۔ کیوں ناں آج کوئی خاص افغانی ڈش آزمائیں۔ میرے ایک دوست نے دعوت کا انتظام کیا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔''

''مگر... اس وقت...'' شاہد ہچکچایا۔

''ہم کل کوئی ملازمت تلاش کرلیں۔ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت۔ لیکن آج کی شام غارت کرنا دانش مندی نہیں۔ چلو!''

کچھ دیر بعد حامد اور شاہد سڑک پر تھے جہاں برف گر رہی تھی!

☆☆☆

اُس کے سامنے برتنوں کا ڈھیر تھا۔ منیجر کچھ فاصلے پر کھڑا کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جہاں وہ آج صبح ہی اپنے ایک پاکستانی دوست کے توسط سے ملازم ہوا تھا، انتہائی قلیل معاوضے پر۔

برتن مانجھنے کے عوض اُسے فی گھنٹا سوا ڈالر ادا کیے جانے تھے۔ یہ انتہائی معمولی رقم تھی اور امریکی قوانین کے زاویے سے یہ کھلا استحصال تھا لیکن شاہد احتجاج نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ایک طالب علم تھا، ورک پرمٹ کے بغیر ملازمت اختیار کرنا، لیبر قوانین سے استفادہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

چالاک تاجر ایشیائی طالب علموں کو درپیش اس دقت سے خوب فائدہ اٹھاتے۔ وہ انہیں قلیل تنخواہ پر ملازم رکھ لیتے، گھنٹوں کے حساب سے معمولی ادائگی کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ مجبور نوجوان کبھی سٹی کونسل جا کر شکایت درج نہیں کروائیں گے۔

اور شاہد بھی مجبور تھا۔ اس کے سامنے برتنوں کا ڈھیر تھا، منیجر کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ نیو ایئر کی رات تھی۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جشن کا سماں تھا۔ شہر کی سڑکوں پر مسرت رقصاں تھی۔ آتش بازی کے مظاہرے ہورہے تھے۔ مرد اور عورتیں، بوڑھے اور بچے، ہر کوئی اُس جشن کا حصہ تھا... ماسوائے شاہد کے، جو تیزی سے سنی ہوئی پلیٹیں دھو رہا تھا۔

وہ ایک محنتی نوجوان تھا، ارادوں کا پکا تھا۔ لیکن جب اسے برتن دھوتے دھوتے تین گھنٹے بیت گئے، تھکن اس کے وجود میں اترنے لگی۔

اور جب پانچ گھنٹے گزرنے کے باوجود برتنوں کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، تب اُس کی آنکھوں میں دھیرے سے نمی چلی آئی لیکن اگلے ہی پل اُس محنت کش نے آنسو پونچھ لیے۔

جب وہ ہوٹل سے باہر نکلا، سورج طلوع ہو چکا تھا۔ تھکن سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ ہاتھوں پر کپکپاہٹ طاری تھی، لیکن وہ خوش تھا، کیونکہ جیب میں آٹھ ڈالر تھے اور اس رقم کو وہ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنے والا تھا۔

سڑکوں پر رات برپا ہونے والے جشن کے نشانات بکھرے تھے، جنہیں پھلانگتا ہوا، جیبوں میں ہاتھ اڑسے وہ اُس کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں وہ فقط دو گھنٹے کی نیند لینے والا تھا۔

اسائنمنٹ کی تیاری کے لیے ٹھیک آٹھ بجے اُسے یونیورسٹی کی لائبریری پہنچنا تھا!!

☆☆☆

وقت دوڑ رہا تھا۔ موسم بدل رہے تھے لیکن شاہد کے معمولات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

دن یونیورسٹی میں گزرتا تھا۔ تجربہ گاہ اور کتب خانوں میں سر کھپانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں لوٹتا۔ آدھے گھنٹے آرام کرتا۔ پھر مزدوری کے لیے باہر نکل پڑتا، موسم کی پروا کیے بغیر، اس بابت سوچے بغیر کہ جسم آرام کا تقاضا کر رہا ہے۔ آرام کے لیے ابھی تھوڑا انتظار کرنا تھا۔

کچھ عرصے تو وہ اُسی ہوٹل میں برتن دھوتا رہا جس کا منیجر انتہائی کنجوس اور سخت گیر تھا۔ پھر قسمت اسے دوسرے ہوٹل میں لے گئی جس کی مالکن ایک شفیق برطانوی عورت تھی۔

اس تبدیلی کے نتیجے میں معاوضہ سوا ڈالر سے بڑھ کر ڈیڑھ ڈالر فی گھنٹا ہوگیا۔ چند ماہ وہاں گزرے۔ پھر ایک مخلص دوست کے توسط سے وہ نسبتاً بہتر ہوٹل کے کچن میں جا پہنچا جہاں برتن مانجھنے کے عوض اُسے دو ڈالر فی گھنٹا ادائگی کی جاتی تھی۔

اِس عرصے میں محنتی شاہد نے اپنی تعلیم کی جانب سے غفلت نہیں برتی۔ وہ ایک قابل طالب علم تھا۔ اساتذہ کا چہیتا۔ امتحانی نتائج بھی خاصے حوصلہ افزا تھے جو اس کی شب و روز کی محنت کا نتیجہ تھا۔ محنت... جو اُس پاکستانی کی قوت تھی۔

وہ اپنے اہل خانے سے بھی مسلسل رابطے میں رہا۔ ٹیلی فون کی عیاشی کا تو متحمل نہیں ہوسکتا تھا، البتہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

اپنے طویل خطوں میں اس نے کبھی گھر والوں کو اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان میں امید افزا احساسات سموئے۔ اپنی تعلیمی کامیابیوں کا تذکرہ کیا۔ اپنی دن رات کی محنت کو، برتن مانجھنے کی اذیت کو اپنے تک رکھا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ وقت جلد گزر جائے گا۔ جو سپنا اس کی آنکھوں میں ہے، ایک دن وہ سچ ہوگا۔

''میرے مستقبل میں روشنی کی قلت نہیں، فراوانی ہے!'' جب کبھی وہ ٹوٹ جاتا، تھک جاتا، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر خود کو یہ پیغام دیتا۔

برتن دھونے کے کام سے جان چھوٹی، تو وہ دیہاڑی پر پینٹ کرنے لگا۔ یہ انتہائی محنت طلب کام تھا۔ سردی گرمی کی پروا کیے بغیر وہ گھنٹوں رنگوں میں الجھا رہتا۔

اُن برسوں میں اُس نے کئی چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ کبھی کسی کارخانے میں لوڈر ہوگیا۔ کبھی پیکینگ کرنے لگا۔ کبھی کسی اسٹور پر چوکیدار لگ گیا، تو کبھی کسی پیٹرول پمپ پر کھڑا ہوگیا۔ الغرض اس نے ہر قسم کا کام کیا۔

ملازمتوں سے حاصل ہونے والی آمدنی گو کہ معمولی تھی، لیکن اس کے طفیل وہ ہمیشہ فاقوں سے محفوظ رہا۔ تعلیمی سلسلہ بھی خوش اسلوبی سے آگے بڑھتا رہا۔

''بیٹا، ہمیشہ کفایت شعاری سے کام لینا۔'' یہ نصیحت اُس کی ماں نے کی تھی جسے اُس نے پلّے سے باندھ لیا تھا۔

اپنے دوستوں کی طرح سیر سپاٹوں سے، دعوتوں میں جانے اور غیر ضروری خرید و فروخت سے شاہد نے ہمیشہ اجتناب برتا۔

جب ساتھی اس کا سبب پوچھتے تو وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ زیادہ اصرار کرتے تو جواب میں یہی کہتا.... کہ یہ سب اسے پسند نہیں۔ اور جب وہ اسے کتابوں کے درمیان چھوڑ کر چلے جاتے، وہ خود سے کہتا۔ ''ابھی اِس کا وقت نہیں آیا۔ مجھے تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا!''

☆☆☆

سیاسی موضوعات نے یونیورسٹی کیمپس کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

عرب دنیا میں آنے والی تبدیلیاں موضوع بنی ہوئی تھیں جس پر ایشیائی اور امریکی طلبا کے درمیان گھنٹوں بحث ہوتی۔

کبھی کبھار سوویت یونین کے بڑھتے اثرات پر بھی مکالمہ ہوتا۔ کمیونسٹ نظریات پر دلائل دیے جاتے۔ پھر چین اور ہندوستان کے اختلافات پر بحث چھڑ جاتی۔ پاکستانی طلبا چین کی حمایت کرتے، ہندوستانی اپنا موقف بیان کرتے۔ کبھی کبھار تو اِس بحث میں اتنی شدت آجاتی کہ اساتذہ کو تصادم کا خطرہ ٹالنے کے لیے درمیان میں کودنا پڑتا۔

شاہد اِن معاملات سے دُور ہی رہتا۔ ایک آدھ بار اس نے اس طرح کے مباحثوں میں شرکت کی لیکن پھر وہ اِس سرگرمی سے الگ ہوگیا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ سیاست میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی سیاسی معاملات پر گہری نظر تھی۔ وہ باقاعدگی سے اخبارات پڑھتا۔ جنوبی ایشیا کی بابت تحریر کردہ کتب اُس کے مطالعے میں رہتیں، الغرض وہ معلومات کے ہتھیار سے لیس تھا اور واضح سیاسی فکر رکھتا تھا، ایسے میں سیاسی مباحثوں سے دوری کا سبب اُس کا سادہ سا نظریہ تھا۔ جس کا اظہار ایک شام اُس نے اپنے روم میٹ کے سامنے یوں کیا۔ ''بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے، اس کی بات میں کتنا وزن ہے۔ فقط اس کی حیثیت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کے معاشی اور سماجی رتبے کی بنیاد پر اُس کی دلیل قبول یا رد کی جاتی ہے۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ ''ہاں، میں واضح سیاسی نظریات رکھتا ہوں لیکن میں اُن کا اظہار آج نہیں کروں گا۔ میں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اپنے نظریات کا اظہار میں تب کروں گا، جب پورا مجمع مجھے سُننے کو بے تاب ہوگا جب سیکڑوں سامعین ہمہ تن گوش ہوں گے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا موقع آئے گا؟'' روم میٹ کی آنکھوں میں غیر یقینی تھی۔

''ہاں مجھے یقین ہے۔'' اس کی آواز میں عزم تھا۔ ''ٹھیک اسی طرح، جیسے مجھے اپنے ہونے کا یقین ہے۔''

خیر، ایسا بھی نہیں تھا کہ لوگ اُسے سننا نہیں چاہتے تھے، اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک قابل طالب علم تھا۔ اساتذہ اُس کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔

قدرت نے وجاہت بھی عطا کی تھی۔ یونیورسٹی کی لڑکیاں اس کی سیاہ آنکھوں، گھنگریالے بالوں اور گندمی رنگت کی دیوانی تھیں۔ اُس کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کی آرزومند تھیں۔ اُنہیں اس بات سے قطعی غرض نہیں تھی کہ اس خوبرو نوجوان کی جیب خالی ہے۔ وہ تو بس... سیاہ آنکھوں کے سحر میں تھیں۔

چند حسیناؤں نے اُسے کھلے لفظوں میں پیشکش کی کہ وہ بل کی ادائیگی کے معاملے کو ذہن سے جھٹک کر اُن کے ساتھ ڈنر پر چلے، جس کے بعد کوئی اچھی سی فلم دیکھی جائے گی اور پھر....

لیکن شاہد ایسی پیشکش ہنس کر ٹال دیتا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ حسین لڑکیوں کی دوستی کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ ہر نوجوان کی طرح وہ بھی جنس مخالف میں دلچسپی رکھتا تھا، لیکن اس نوع کی دعوتیں قبول کرتے وقت مشرقی سوچ آڑے آجاتی۔

اُسے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ کسی حسین لڑکی کے ساتھ کھانا کھانے جائے اور بل کی ادائیگی کے وقت سر جھکائے خاموش بیٹھا رہے۔

پھر ایک سبب اس کی بدحالی بھی تھی جو کبھی کبھار اس کے جواں بدن پر ناتوانی طاری کر دیتی۔ اسے مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل دیتی۔ وہ تاریکی سے لڑنے کی کوشش کرتا۔ اور جب ہار جاتا تو خدا کے سامنے جھک جاتا۔ گڑگڑا کر دعا مانگتا... اس یقین کے سہارے کہ اس کی دعاؤں کا جواب ضرور آئے گا!

موسم بدل رہے تھے... شاہد اپنی تعلیم اور ملازمتوں کے غیر مختتم معلوم ہونے والے سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھا... اور ایک بار پھر یونیورسٹی کیمپس سیاسی موضوعات کی لپیٹ میں تھا۔ اِس بار مباحثوں کا موضوع اس کا اپنا وطن تھا۔

وہ جانتا تھا کہ کینٹین اور کیمپس لان میں بیٹھے پاکستانی، ہندوستانی، افغانی، عرب، اطالوی اور امریکی نوجوان مشرقی پاکستان کے بارے میں بحث کر رہے ہیں مگر ہمیشہ کی طرح وہ اِس بحث سے دور رہا۔

اِسی اثناء میں 1971 آن پہنچا، جب یونیورسٹی آف الونائی نے اُسے بیچلر کی ڈگری سے نوازا۔ اور اُسی برس سقوطِ ڈھاکا کا افسوس ناک سانحہ پیش آیا۔

آنے والے برسوں میں وہ ہمیشہ اس بارے میں تذبذب کا شکار رہا کہ 1971 کو کس طرح یاد رکھے۔ سکھ کے احساس کے ساتھ یا دکھ کے جذبات کے ساتھ؟

☆☆☆

اُس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے، جن کا ماخذ دل میں ٹھاٹھیں مارتا مسرت کا سمندر تھا۔

دعاؤں کا جواب آگیا تھا... اور جڑواں شہر میں واقع گاڑیوں کے پُرزے بنانے والی کمپنی فلیکس این گیٹ سے وابستگی شاہد کے لیے ایک ناقابلِ یقین تجربہ ثابت ہونے والی تھی۔

شاہد کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ اسے ڈگری کے حصول سے قبل ہی ملازمت کی پیشکش ہوگئی تھی۔

شاید یہ اس کی شب و روز کی محنت کا صلہ تھا، نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی خداداد صلاحیت کا نتیجہ تھا جس نے اُس کا سپنا سچ کر دکھایا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ اُس کے مستقبل میں روشنی کی قلت نہیں۔

فلیکس این گیٹ میں ایک نئی دنیا اُس کی منتظر تھی۔ وہاں اسے انجینئرنگ ڈائریکٹر جیسا کلیدی عہدہ سونپا گیا۔ یہ ایک بڑی ذمے داری تھی لیکن شاہد کو اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔

جس روز اُسے ملازمت ملی، یقینی طور پر لاہور میں مقیم اُس کے اہلِ خانہ کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے ہوں گے۔ والدین کی آنکھوں میں مسرت ہوگی، ان کے سپوت نے خود کو حقیقی معنوں میں کارآمد ثابت کر دیا تھا۔

جہاں تک شاہد کا تعلق ہے، اُس محنتی نوجوان کے دل میں آگے بڑھنے کا ارادہ تھا جس کے حصول کے لیے وہ نئی مہارتیں سیکھنے کا مصمم ارادہ کیے بیٹھا تھا۔

اُس نے جم کر کام کیا۔ کچھ ہی دنوں میں انتظامیہ کا دل جیت لیا۔ اعلیٰ عہدے داروں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ ''ہمارا انتخاب درست ثابت ہوا!''

اُس وقت کس نے سوچا تھا کہ یہ پاکستانی نوجوان چند برس بعد اِسی کمپنی کا مالک بن جائے گا۔

☆☆☆

وقت کی رفتار تیز تھی۔ اتنی تیز کہ شاہد اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ اُسے فلیکس این گیٹ میں کام کرتے ہوئے لگ بھگ ڈیڑھ برس بیت گیا ہے۔

اُس عرصے میں شاہد نے کمپنی کے مالک چارلس گلیسن کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز بھی اس پر بھروسا کرنے لگے تھے۔

اُن ہی دنوں کمپنی انتظامیہ کو پلاسٹک کے ایک مکمل ٹکڑے پر مشتمل، بے جوڑ بمپر تیار کرنے کا خیال سوجھا۔ ماہرین کا اندازہ تھا کہ اِس طرز کا بمپر آنے والے برسوں میں گاڑیوں کی ضرورت بن جائے گا۔

اس منصوبے کی تکمیل کے لیے چارلس گلیسن کی نظرِ انتخاب باصلاحیت پاکستانی نوجوان شاہد پر ٹھہری۔

اُس دوپہر وہ چند اہم فائلوں میں الجھا تھا کہ میز پر دھرا ٹیلی فون بجا۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی جانب سے بلاوا آیا تھا۔

شاہد نے اپنے بال درست کیے اور مرکزی ہال کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ اُسے کیوں بلایا گیا ہے، لیکن اُسے یہ اندازہ ضرور تھا کہ کمپنی انتظامیہ کسی اہم معاملے میں الجھی ہوئی ہے۔ یہ بازگشت بھی وہ سن چکا تھا کہ علاقائی مارکیٹ میں ایک جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بمپر کی ڈیمانڈ بڑھتی جا رہی ہے۔

''غالب امکان ہے کہ میٹنگ کا تعلق بھی اِسی ڈیمانڈ سے ہو۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''لیکن اُنہوں نے مجھے کیوں بلایا ہے؟'' یہ سوال اس نے خود سے کیا تھا۔

ٹھیک اس لمحے قدرت مسکرائی۔ وہ جواب جانتی تھی... صارفین کے بڑھتے تقاضے پورے کرنے کا کارنامہ ایک پاکستانی انجام دینے والا تھا۔

جب کمپنی کے مالک چارلس نے آگے بڑھ کر اس کا پُرجوش استقبال کیا، اُس نے تھوڑی حیرت محسوس کی۔ بے شک وہ ایک غیر متعصب شخص تھا جو اپنے ملازمین کو سراہتے وقت کنجوسی سے کام نہیں لیا کرتا تھا لیکن اس روز وہ کچھ زیادہ ہی خوش معلوم ہوتا تھا۔

شاہد نے میٹنگ ہال میں موجود دیگر افراد کی جانب دیکھا جن کی آنکھوں میں اُس کے لیے پسندیدگی تھی۔

''ایک بے جوڑ بمپر ہماری ضرورت ہے شاہد۔'' چارلس کا ہاتھ اس کے کاندھے پر تھا۔ ''اور اس کی تیاری کی ذمے داری تمہارے کاندھوں پر ہے۔''

یکدم اسے اپنے کاندھوں پر بوجھ محسوس ہوا، توقعات کا بوجھ۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ پھر تن کر کھڑا تھا۔ عزم اُس کی قوت تھی اور وہ امکانات پر یقین رکھتا تھا۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں جناب کہ آپ نے مجھے اس اہم ترین پروجیکٹ کے لائق سمجھا۔''

''بس ایک بات کا خیال رہے۔'' ایک سینئر رکن نے کہا۔ ''بمپر ایسا ہونا چاہیے جو آٹو موبائل انڈسٹری کو پسند آئے۔ وہ ہلکا، مضبوط اور سستا ہو۔''

''ہلکا، مضبوط اور سستا!'' شاہد نے دھیرے سے کہا۔ ''میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

''تو کام شروع کردو نوجوان۔'' اِس بار ایک ضعیف العمر شخص نے اسے مخاطب کیا۔ وہ کمپنی کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا۔ ''ہماری سپورٹ تمہارے ساتھ ہے۔ اپنی ٹیم بناؤ۔ درکار اشیا کی فہرست مرتب کرو۔ ہمیں تم پر پورا بھروسا ہے۔''

''بھروسا...'' اس نے دل میں کہا۔ ''ہاں، مجھے بھی خود پر پورا بھروسا ہے۔''

☆☆☆

فلیکس این گیٹ کا دفتر سناٹے اور تاریکی میں ڈوبا تھا۔ داخلی حصے میں نصب جہازی سائز گھڑی کی سوئیاں ایک کے ہندسے کی جانب بڑھ رہی تھیں جو اِس جانب اشارہ تھا کہ شہر کی اکثریت نیند کی آغوش میں ہے۔

ایسے میں فلیکس این گیٹ کے دفتر کے ایک خاموش کونے میں زرد روشنی پھیلی تھی۔ یہ ایک کیبن تھا، جہاں گندمی رنگت والا ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں کافی کا مگ تھا اور وہ میز پر بکھرے کاغذات میں الجھا تھا۔

وہ شاہد تھا، جس پر ایک ہی دھن سوار تھی۔ ایک ہلکا، مضبوط اور سستا بمپر تیار کرنے کی دھن۔ جس نے اسے وقت کی تقسیم سے ماورا کر دیا تھا۔ گزشتہ تین روز سے اس کے وقت کا بڑا حصہ دفتر ہی میں گزر رہا تھا۔ ساتھی ازراہِ مذاق یہ کہنے لگے تھے کہ اسے اپنا بستر بھی اپنے کیبن میں لگا لینا چاہیے۔

اُس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔ وہ گرم اور تیز تھی۔ پھر کاغذات پر نظریں ٹکا لیں، جن میں سے چند پر پینسل اسکیچ بنے تھے۔ چند اوراق پر بمپر سازی کے حوالے سے ہونے والی جدید تحقیقات درج تھیں۔ ایک فائل ساتھی انجینئروں کی جانب سے مرتب کردہ تجاویز پر مشتمل تھی۔

اس منصوبے پر کام شروع کرتے ہی شاہد کو اندازہ ہوگیا تھا کہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بمپر تیار کرنا سہل نہیں۔ کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ ایک مسئلہ سلجھتا تو دوسرا سامنے آن کھڑا ہوتا۔ اس سے نکلتا، تو تیسرے سے سامنا ہو جاتا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ وہ چونکا۔ دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

اس نے ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف حامد تھا، اس کا دوست۔

''شیڈ، تم ذرا نہیں بدلے۔ ابھی تک دفتر میں بیٹھے ہو۔'' اس کی آواز میں شوخی تھی۔ حامد واشنگٹن میں واقع پلاسٹک سازی کی ایک بڑی کمپنی سے منسلک تھا۔ بمپر کی تیاری کے سلسلے میں دو روز قبل شاہد نے اسے فون کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ حامد کی صلاحیتیں اس عمل میں معاون ثابت ہوں گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

اُس رات ان دونوں دوستوں کی پُر جوش گفتگو لگ بھگ تیس منٹ جاری رہی۔ پلاسٹک کی تیاری کے اسرار و رموز سے واقف حامد کئی سود مند مشوروں سے لبریز تھا، جو ایک مضبوط اور سستا بمپر تیار کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔

جب شاہد نے فون رکھا، وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اُسے ایک بے جوڑ بمپر کی تیاری کے امکانات روشن نظر آنے لگے تھے۔

فلیکس این گیٹ کا دفتر سناٹے اور تاریکی میں ڈوبا تھا... بس، ایک خاموش کونے میں زرد روشنی پھیلی تھی... وہاں ایک پاکستانی بیٹھا تھا۔

☆☆☆

اُس کے جذبے نے یہ کر دکھایا۔ جڑواں شہر میں واقع آٹو موبائل انڈسٹری کے لیے پُرزے تیار کرنے والی کمپنی کے باصلاحیت انجینئر نے ایک ہلکا، مضبوط اور سستا بمپر تیار کرلیا تھا۔

اس کامیابی پر کمپنی میں جشن منایا گیا۔ چارلس نے اُس تقریب میں تقریر کی، جس میں جی کھول کر شاہد کی صلاحیتوں کو سراہا۔ سامعین نے تالیوں کے معاملے میں کنجوسی سے کام نہیں لیا۔

یہ ستائش اُس کا لہو گرمانے میں معاون ثابت ہوئی۔ تقریب کے اختتام پر سب سے پہلے اُس نے اپنے ان دوستوں کا شکریہ ادا کیا، جن کے مشورے اِس پروجیکٹ میں کارآمد ثابت ہوئے۔ دوستوں کی اس لسٹ میں حامد سرفہرست تھا جو اُس شام تقریب میں موجود تھا۔

وہ فضول خرچی سے اجتناب برتتا تھا، لیکن اُس رات اس نے اپنے دوستوں کو شہر کے ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں دعوت دی۔ وہ واقعی خوش تھا۔

چند روز بعد یہ بمپر مارکیٹ میں آگیا۔ ماہرین کی جانب سے اسے سراہا گیا۔ صارفین کا ردِعمل بھی مثبت رہا۔ اخبارات نے بھی اِسے خصوصی کوریج دی۔

یوں پہلی بار لاہور سے تعلق رکھنے والے 23 سالہ شاہد خان کا نام امریکی اخبارات کی زینت بنا۔

یہی شاہد خان چند برس بعد اخباری خبروں کی ضرورت بننے والا تھا!

☆☆☆

فلیکس این گیٹ میں کام کرتے ہوئے اُسے لگ بھگ آٹھ برس بیت گئے تھے اور اب وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

امریکا میں گزری تیز رفتار زندگی نے اُسے جمود کا مخالف بنا دیا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتا تھا، مگر یکسانیت نہیں۔ اور اب اُسے اپنے کام میں یکسانیت نظر آنے لگی تھی۔

چند برس قبل جب اُس نے جدید طرز کا ایک بے جوڑ بمپر تیار کیا تھا، اس وقت وہ جوش اور ولولے سے بھرپور تھا لیکن بعد کے برسوں میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا جو اُسے تجسس سے بھر سکے۔ شاید اسی وجہ سے وہ اپنی نو سے پانچ کی ملازمت سے اُوب گیا۔

''کیا تم واقعی ذاتی کاروبار شروع کرنے کا سوچ رہے ہو؟'' حامد کے لہجے میں حیرت تھی۔

وہ اتوار کی دوپہر تھی۔ دونوں دوست ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے جہاں وہ یونیورسٹی کے زمانے میں اکثر آیا کرتے تھے۔

شاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں کھڑکی کے باہر پھیلی ستمبر کی نرم دھوپ پر ٹکی تھیں۔

''برادر کہاں کھو گئے؟'' حامد نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

شاہد نے گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد دمک رہا تھا۔ ''تبدیلی... میں تبدیلی کا خواہش مند ہوں۔ اور یہ ملازمت اب جمود کا شکار ہوگئی ہے۔''

''اچھی تنخواہ، بڑا عہدہ، قابل معاون... یہ سب چھوڑنا آسان نہیں ہوگا۔'' حامد کی آنکھوں میں اندیشے تھے۔

''میں فیصلہ کر چکا ہوں۔'' شاہد نے اپنے دوست کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔

''شان دار! مجھے تمہاری یہی ادا پسند ہے۔'' حامد نے گرم کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''آگے بڑھو دوست۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

حامد کے برعکس دیگر ساتھیوں نے نیک تمناؤں کے اظہار میں تذبذب برتا۔

کسی نے کہا۔ ''ذاتی کاروبار؟ بھائی یہ امریکا ہے، یہاں کاروبار جمانا آسان نہیں۔ اور پھر تمہارے پاس کتنا سرمایہ ہے؟''

دوسرے نے کہا۔ ''کیا کہا، قرض لینے کا ارادہ ہے؟ دوست بینک کا مقروض ہونے کے بعد تمہاری پوری زندگی قرض چکاتے نکل جائے گی۔ اس بارے میں تو سوچنا بھی مت۔''

لیکن وہ سوچ چکا تھا۔ گزشتہ آٹھ برسوں میں اس نے پائی پائی جوڑ کر 16000 ڈالر جمع کر لیے تھے لیکن یہ رقم ناکافی تھی۔ ذاتی کاروبار کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت تھی۔ قرض لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

کسی معروف بینک سے رابطہ کرنے کے بجائے اس نے ایک ایسے ادارے سے رجوع کیا جو سود کی کم شرح پر چھوٹے قرضہ دیا کرتا تھا۔ اُس کارپوریشن کی جانب سے شاہد خان کو 50000 ڈالر کا قرضہ جاری ہوگیا۔

جب جاننے والوں کو اطلاع ملی کہ وہ رقم کا انتظام کر چکا ہے تو انہیں تجسس ہوا کہ وہ کیا کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ کمپنی کا نام کیا ہوگا؟

''بمپر ورکس!'' شاہد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور میں پک اپ ٹرکس کے لیے بے جوڑ اور نفیس بمپر بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ایسے بمپر جو سستے اور مضبوط ہوں۔''

''پلانٹ کہاں لگاؤ گے مسٹر؟'' ایک حاسد ساتھی نصرت نے سوال کیا۔

"ایک گیراج میں۔" ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

اُس جواب نے سوال کرنے والے کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ "گیراج میں؟"

"ہاں۔" باہمت پاکستانی نے اپنی مسکراہٹ قائم رکھی۔ "میرے پاس ایک گیراج ہے۔ مارکیٹ سے کم نرخوں پر چند مشینیں خرید لی ہیں۔ کام شروع کرنے کے لیے یہ کافی ہے۔"

"اور تمہاری اِس کمپنی... کیا نام بتایا تھا؟ ہاں بمپر ورکس... تو اس میں ملازم کتنے ہوں گے؟" سوال کرنے والے کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

شاہد اِس کا جواب پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ "میں تنہا کام کروں گا۔"

"تنہا؟" حاسد ساتھی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"ہاں تنہا۔" اُس نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ "دوست، میں ایک پاکستانی ہوں۔ محنت کا جویا، جدوجہد کا عادی۔ گزشتہ چند برس اس انڈسٹری میں گزارنے کے بعد اب میں خاصا تجربہ حاصل کر چکا ہوں۔ جانتا ہوں کہ کس کام کے لیے کون سا شخص موزوں ہے۔ کون سا ادارہ معاون ثابت ہوگا۔ میرا یقین رکھو' میں بہترین بمپر تیار کروں گا۔"

یہی سب اُس نے فلیکس این گیٹ کے مالک چارلس سے کہا، جو اس کا استعفیٰ اپنی میز پر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

پہلے تو چارلس نے اُسے تنخواہ میں پُرکشش اضافے کی پیشکش کی۔ بڑا عہدہ دینے کی بات کی لیکن جب اُس نے دیکھا کہ شاہد نئے تجربات کے لیے مصمم ارادہ کر چکا ہے، ایک اچھے دوست کی طرح مسکراتے ہوئے اُس کا کاندھا تھپتھپایا۔

"جانتے ہو، جس روز میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا، تب ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ تمہاری منزل اچھی ملازمت، بڑا عہدہ نہیں۔ تمہارے ارادے کچھ اور ہیں، جلد یا بدیر تم اِس ادارے کو چھوڑ دو گے۔" اُس نے آنکھ ماری۔ "بس، گزشتہ دو تین برس میں' میں یہی سوچتا رہا کہ آخر تم اتنی دیر کیوں لگا رہے ہو!"

شاہد نے قہقہہ لگایا۔ "مسٹر چارلس، میں نے یہاں بہت کچھ سیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے اعتماد دیا، جس کے طفیل اب میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کر رہا ہوں۔"

"گویا اب ہم حریف ہیں دوست۔" چارلس کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ "ہم بھی بمپر بناتے ہیں اور تم بھی بمپر بنانے کا ارادہ رکھتے ہو لیکن میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو، تو سیدھے چلے آنا۔"

اس نے اپنے سابق مالک سے ہاتھ ملایا۔ مڑا اور دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ تب اُسے اپنے پیچھے چارلس کی پُراعتماد آواز سنائی دی۔ "ہم پھر ملیں گے دوست۔ بہت جلد!"

"ضرور۔" وہ پلٹا۔ "مجھے اس کا یقین ہے۔"

اُس وقت شاہد اور چارلس... دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ چند برس بعد یہ واقعہ حقیقتاً رونما ہونے والا ہے۔

☆☆☆

وہ تنہا نہیں تھا، اُس کے ساتھ ماں باپ کی دعائیں تھیں' اس کا عزم تھا، کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا... اور سب سے بڑھ کر ایک خواب تھا۔

شاہد اپنا کاروبار شروع کر چکا تھا۔ اسے ابتدا ہی سے مشکلات کا اندازہ تھا، سو جب رکاوٹیں حائل ہوئیں، چند کوششیں رائگاں گئیں، تو وہ مایوس نہیں ہوا۔

ایک گیراج میں، مختصر سرمائے اور چند مشینوں کے ساتھ بمپر سازی کی صنعت میں قدم رکھنے والے اس باصلاحیت نوجوان نے خود کو دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر لیا۔ اس کی توجہ کا مرکز اُس کا کاروبار تھا، فقط اس کا کاروبار!

ہاں، اس نے نفیس اور بے جوڑ بمپر بنائے، جو واقعی پائیدار تھے، لیکن پہلے آرڈر کے حصول میں اسے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ وجہ واضح تھی، اس کی کمپنی نئی تھی۔ اور بڑے اداروں کا اعتماد جیتنا آسان نہیں۔

لیکن یہ ناکامیاں اس کی مستقل مزاجی کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں۔ بقول شاعر:

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

شاہد کے دل میں بھی جذبہ تھا، جو ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی قوت رکھتا تھا۔ اور وہ سبک رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ منزل کو تو ہر صورت سامنے آنا تھا۔ بس ضرورت تھی تھوڑے صبر کی۔ انتظار کی۔

اور وہ انتظار کرنے کے لیے تیار تھا، جس کا پھل توقع کے عین مطابق میٹھا تھا۔

جس کمپنی نے اُسے پہلا آرڈر دیا، وہ خاصی گمنام تھی اور مختلف ورک شاپس کو بمپر اور دیگر پرزے فراہم کیا کرتی تھی۔

گو کہ اس آرڈر سے اسے کوئی خاص مالی فائدہ

نہیں ہوا لیکن وہ مطمئن تھا۔ اگلا آرڈر نسبتاً بہتر کمپنی کی جانب سے ملا۔ تیسری بار جس ادارے کے منیجر نے اُسے فون کیا، اُسے گاڑیوں کی تیاری کے حوالے سے ایک مستند نام تصور کیا جاتا تھا۔

یوں دھیرے دھیرے وہ اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگا۔ آرڈرز ملنے لگے تو چار پیسے بھی ہاتھ آنے لگے۔

کاروبار پھیلا، تو اسے سنبھالنے کے لیے شاہد نے دو معاون رکھ لیے۔

اِس دوران اُس کی پہلی ترجیح قرضے کے بوجھ سے جان چھڑانا تھا۔ جلد ہی اس محاذ پر بھی اس نے کامیابی حاصل کر لی۔ قرض کے طور پر لی جانے والی رقم کا وزن گھٹتے گھٹتے ایک روز ختم ہوگیا۔

وہ شاہد کے لیے کتنا پُرمسرت لمحہ تھا، اِس کا الفاظ کی صورت اظہار لگ بھگ ناممکن ہے۔

"جرات مندانہ فیصلوں کے طفیل میں یکسانیت کے عذاب سے نکل آیا تھا۔" اُس نے خود سے کہا۔ "اب میں آزاد ہوں۔ اپنے کاروبار کا مالک ہوں، جو خدا کے فضل سے دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔"

دوست بھی اُس کی قسمت پر رشک کرتے۔ اُسے سراہتے۔ اس کا کاندھا تھپتھپاتے۔ اِس امید کا اظہار کرتے کہ وہ جلد کاروباری دنیا کے افق پر ستارہ بن کر چمکے گا۔

کیا اُن میں سے کسی ایک نے بھی سوچا تھا کہ کل شاہد خان کھرب پتی بن جائے گا؟

نہیں، قطعی نہیں۔ ایسا تو خود شاہد نے بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن قدرت اپنا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

اُس کے شب و روز جدوجہد سے عبارت تھے۔

بمپر ورکس کے کھاتوں پر سرسری سی نظر ڈال کر بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اُس کے پاس کئی آرڈرز ہیں۔ کمپنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ الغرض شاہد کی زندگی اپنی ڈگر پر آتی معلوم ہوتی تھی، لیکن تب... شاہد کے ایک پُرخطر فیصلے نے سب کچھ بدل دیا۔

یہ 1980 کا ذکر ہے۔ ایک صبح شاہد کو یہ خبر ملی کہ فلیکس این گیٹ کو، وہ کمپنی جس سے اس نے اپنا کیریئر شروع کیا تھا، فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔

اخبار میں شائع ہونے والی دو کالمی خبر کے مطابق اگلے چند روز میں فلیکس این گیٹ کے شیئرز مارکیٹ میں اوپن کر دیے جائیں گے۔

خبر پڑھتے ہی وہ ماضی میں چلا گیا۔ اُسے وہ دن یاد آئے، جب وہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا اور اُسے فلیکس این گیٹ کی جانب سے ملازمت کی پیشکش ہوئی تھی۔

کتنا خوش تھا وہ اس روز۔ پھر کمپنی میں پہلا دن۔ اس کے باس چارلس کا حوصلہ افزا رویہ۔ پہلی تنخواہ۔ ایک بے جوڑ بمپر کی تیاری... جدوجہد کی کتنی یادیں اس کمپنی سے وابستہ تھیں۔ اسے وہ دن بھی یاد آیا، جب اُسے ساتھیوں نے الوداعی دعوت دی تھی، تحائف سے نوازا تھا، اس کے بارے میں ستائشی کلمات کہے تھے۔

بس، یہی سب سوچتے سوچتے اچانک اس کے ذہن میں چارلس کے کہے ہوئے الفاظ گونج اٹھے۔ "ہم پھر ملیں گے دوست۔ بہت جلد!"

وہ ایک پُراسرار کیفیت کی لپیٹ میں آگیا جس کی آغوش میں نئے امکانات چمک رہے تھے۔

"کیا وہ لمحہ آن پہنچا ہے؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔

"ہاں!" اُس کے دل سے آواز آئی۔

تب ایک جھماکا ہوا۔ یکدم اسے قدرت کا منصوبہ سمجھ میں آگیا۔

اُس کا استعفیٰ، نئی کمپنی کی شروعات، اسے مستحکم کرنے کے لیے جدوجہد اور پھر... فلیکس این گیٹ کی فروخت کا معاملہ۔

"کیا مجھے اسی لمحے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ کیا گزشتہ دو برس کی جدوجہد کا مقصد اس مقام پر واپسی تھی جہاں میں نے تربیتی مراحل طے کیے۔"

یہ سوال اس نے قدرت سے کیا تھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

قدرت کو جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ جواب تو واضح تھا۔ جڑواں شہر اریانا شیمپین کی جانب لوٹنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

چند روز بعد وہ فلیکس این گیٹ کا مالک بن چکا تھا۔

سابق مالک چارلس گلیسن کے لیے وہ لمحہ حیرت اور مسرت سے بھرپور تھا جب اُسے یہ اطلاع ملی کہ اِس کمپنی کا خریدار اس کا سابق ملازم ہے۔

جس روز نئی انتظامیہ نے کمپنی کا چارج لیا، وہاں ایک شاندار تقریب ہوئی۔

جب چارلس اور شاہد کا سامنا ہوا، چارلس چہکا۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ ہم جلد ملیں گے۔"

"ہاں آپ نے کہا تھا مسٹر چارلس۔ اور آپ درست تھے۔" شاہد مسکرایا۔

اب وہ فلیکس این گیٹ کا اکلوتا مالک تھا۔ بمپر ورکس اُس میں ضم ہوچکی تھی۔

بے سروسامانی کے ساتھ امریکا کا رخ کرنے والا شاہد خان ایک نئے سفر کی جانب گامزن تھا... ایسا سفر جس کی منزل کی بابت وہ خود بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

شاہد نے اِس رفتار سے ترقی کے مراحل طے کیے کہ کاروباری ماہرین انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس کے اچھوتے خیالات، کاروبار کرنے کے جدید طریقوں کے طفیل کمپنی کی حدود پھیلتی گئیں۔ آرڈرز کی تعداد میں یکدم اضافہ ہوگیا۔ نئے پلانٹ لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ درجنوں ملازمین بھرتی کیے گئے۔ نئے میدانوں میں بھی طبع آزمائی کی گئی۔

اسے خوش قسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ شاہد کے بیشتر فیصلوں کے نتائج مثبت رہے۔ ہاں، اس دوران چند مشکلات بھی پیش آئیں، چند اقدامات نتائج سے محروم رہے، لیکن شاہد مایوس نہیں ہوا۔ اس نے تجربات کرنے سے خود کو نہیں روکا۔ اگر کبھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو اسے سر پر سوار نہیں کیا، بلکہ ذہن سے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

بمپر سازی اُس کا میدان تھا اور گاڑیاں تیار کرنے والے اداروں کو اُن کی فراہمی کا وہ حقیقی تجربہ رکھتا تھا۔ اپنی اسی قابلیت کو اُس نے فلیکس این گیٹ کا خاصّہ بنادیا۔

شاہد کے انتظامات سنبھالنے کے فقط چند ماہ بعد یہ حیرت انگیز خبر اخبارات کی زینت بنی کہ ریاست الوناٰئی میں واقع یہ کمپنی آٹو موبائل مینوفیکچرنگ کے تین بڑے اداروں فورڈ، جنرل موٹرز اور کریسلر سے بمپر کی فراہمی کے آرڈرز وصول کرچکی ہے۔

خبر کی سرخی تھی۔ "فلیکس این گیٹ: بگ تھری کو بمپر فراہم کرنے والا واحد ادارہ!"

"بگ تھری" وہ اصطلاح ہے جو آٹو موبائل مینوفیکچرنگ کے تین بااثر امریکی اداروں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ جس روز یہ خبر اخبارات کی زینت بنی، اسے مبارک باد کے ڈھیروں فون آئے۔ کمپنی کے سابق مالک چارلس نے بھی فون کیا۔

"خوب دوست، تم نے تو کمال کردیا۔" اس کی آواز میں جوش تھا۔ "فورڈ، جنرل موٹرز اور کریسلر... اب تینوں بڑے ادارے تمہارے گاہک ہیں۔ حیرت انگیز!"

"تعریف کے لیے شکریہ مسٹر چارلس۔" شاہد مسکرایا۔

"تعریف؟" چارلس چہکا۔ "دوست یہ تعریف نہیں، حسد ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ فلیکس این گیٹ کا مستقبل اتنا شان دار ہے تو کبھی اسے تمہارے ہاتھوں فروخت نہیں کرتا۔ خیر، جو ہوا سو ہوا، لیکن دعوت بنتی ہے۔ تم نے اپنی منزل پالی۔"

"نہیں، ابھی منزل دور ہے۔" شاہد نے دھیرے سے کہا۔

☆☆☆

1984 میں شاہد خان کے کارناموں کی فہرست میں ایک اور اضافہ ہوا۔

اُسے ٹیوٹا جیسے بڑے ادارے کی جانب سے پک اپ ٹرکس کے لیے بمپر تیار کرنے کا آرڈر ملا تھا۔

شاہد جانتا تھا کہ یہ سنہری موقع ہے، جس سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھایا جائے تو اس کی کمپنی بین الاقوامی کاروباری دنیا کا حصہ بن سکتی ہے۔

"اب مجھے مزید محنت کرنی ہوگی۔" اس نے خود سے کہا۔

اگلے چند ماہ وہ اس آرڈر کی تکمیل میں جُتا رہا۔ نتیجہ حوصلہ افزا رہا۔ اس کے تیار کردہ بمپرز کو ٹیوٹا کی انتظامیہ کی جانب سے بہت پسند کیا گیا۔ مزید آرڈرز مل گئے۔

اُس وقت ٹیوٹا امریکی سڑکوں کے لیے تیار ہونے والے پک اپ ٹرکس کے لیے فلیکس این گیٹ کے علاوہ دیگر اداروں سے بھی بمپر خریدا کرتی تھی، لیکن فقط ایک ہی برس میں شاہد کی تخلیقی اپج اور معیار پر سمجھوتا نہ کرنے کی عادت نے اسے ٹیوٹا کا پہلا انتخاب بنادیا۔

1987 میں ریاست الوناٰئی کے مؤقر ترین روزنامے نے یہ خبر شہ سرخیوں میں شائع کی۔ "فلیکس این گیٹ، ٹیوٹا کے پک اپ ٹرکس کو بمپر فراہم کرنے والی اکلوتی کمپنی بن چکی ہے!"

کیا شاہد مطمئن تھا؟ نہیں، قطعی نہیں!

اس کے خواب معروف لبنانی شاعر خلیل جبران کے مانند عجیب وغریب تھے جن کی تکمیل پانے کے لیے ہمالیہ سے بلند ارادوں کی ضرورت تھی۔ اور اس باہمت پاکستانی کے ارادے ہمالیہ سے بلند تھے۔

وہ مزید آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ محنت اُس کا اکلوتا ہتھیار تھا جو جلد رنگ لائی۔ دو برس بعد، 1989 کے وسط میں اُسی روزنامے نے ایک اور خبر لگائی:

"شاباش شاہد!" تفصیلات کچھ یوں تھیں کہ فلیکس این گیٹ ٹیوٹا کی امریکی سپلائی چین کے لیے بمپر تیار کرنے والی اکلوتی کمپنی بن چکی تھی۔

☆☆☆

جس طرح جنگل میں لگی آگ پھیلتی ہے، ٹھیک ویسے ہی شاہد کی شہرت پھیلتی جارہی تھی۔

اب وہ فقط الوناٰئی تک محدود نہیں تھا، امریکا کے دیگر شہروں میں بھی اُس کی کامیابی کا چرچا ہونے لگا تھا، ٹیوٹا سے وابستگی کے طفیل اس کی کمپنی بین الاقوامی شناخت حاصل کرچکی تھی۔

شہرت نے اسے ہر دل عزیز بنادیا۔ سماجی تقریبات میں اسے مدعو کیا جانے لگا۔ لیکچرز کے لیے دعوت نامے ملنے لگے۔ گریجویٹس کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنے کے لیے درس گاہوں کی جانب سے بلاوے آنے لگے... اور پھر ایک روز اسے یونیورسٹی آف الوناٰئی کی جانب سے لیکچر کا دعوت نامہ موصول ہوا۔

وہ ایک پُرمسرت دن تھا۔ اسی درس گاہ کے سیمینار ہال میں کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرنا، جہاں وہ کل تک زیرِ تعلیم تھا، ایک ناقابلِ بیان احساس تھا۔

اُس روز پورا مجمع اُسے سننے کے لیے بے تاب تھا، سیکڑوں افراد ہمہ تن گوش تھے... وہ خواب جو شاہد خان نے چند برس قبل ہوسٹل کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر دیکھا تھا، پورا ہوچکا تھا۔

چند ماہ بعد اس کی تصویر مقامی بزنس میگزین کے سرورق کا بھی حصہ بن گئی۔ ٹی وی شوز میں بھی اسے مدعو کیا گیا۔ ریاست کے اعلیٰ عہدے داروں نے اُسے ڈنر کی دعوت دی۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک سیلیبریٹی بن چکا تھا، تاہم شہرت نے اسے مغرور نہیں کیا۔ وہ اپنی جڑوں کے بارے میں جانتا تھا۔ اسے وہ دن بھی یاد تھے، جب وہ چند ڈالرز کے عوض برتن مانجھا کرتا تھا۔

جب بھی وہ نوجوانوں سے اپنے تجربات بانٹتا تو انہیں اپنی جدوجہد کے دنوں کی کہانی سنانا نہیں بھولتا۔

"وقت کی بھٹی سے گزرے بغیر آپ سونا نہیں بن سکتے۔" وہ اکثر کہتا۔ "آپ کو مشکل ترین حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر آپ آسانیوں کو ترجیح دیں گے تو جمود آپ کا مقدر بن جائے گا۔"

شاہد اپنی ترقی کا سہرا اپنے سر باندھنے سے ہمیشہ گریز کرتا۔ جب ایک تقریب میں میزبان نے اُسے فُسوں گر قرار دیا تو اس نے انکساری سے جواب دیا۔ "میں ایک عام انسان ہوں۔ میری ترقی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ٹیوٹا اور دیگر بڑے اداروں سے وابستگی کے طفیل ہمیں نئے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ نئی مہارتوں کا حصول ہمارے لیے لازمی ہوگیا۔ ساتھ ہی مسابقت کی فضا نے ہمیں پختگی کا راستہ دکھایا اور تکمیلیت پسندی کا احساس پیدا کیا۔ اگر ہمیں چیلنجز کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تو شاید فلیکس این گیٹ کبھی اِس مقام پر نہیں پہنچتی۔"

"آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ چیلنج نے شاہد کو شاہد خان بنادیا!" میزبان کی بیوی نے سوال کیا۔

"آپ کہہ سکتی ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "اور جیسا میں ہمیشہ کہتا ہوں، وقت کی بھٹی سے گزرے بغیر آپ سونا نہیں بن سکتے۔"

☆☆☆

جوں جوں وقت گزرتا گیا، شاہد کی چمک دمک میں اضافہ ہوتا گیا۔ فلیکس این گیٹ نے اپنے اچھوتے ڈیزائن اور معیار کی بدولت بمپر سازی کے میدان میں خود کو منوالیا۔

جب 1980 میں صارفین کے بڑھتے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے شاہد نے پہلا پلانٹ لگایا تھا، اُس وقت کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک روز فلیکس این گیٹ کے پلانٹس کی تعداد 48 تک جا پہنچے گی۔ شاہد کو الوناٰئی سے نکل کر دیگر ریاست کا رخ کرنا پڑے گا۔ انڈیانا اور مشی گن میں نئی صنعتیں لگانی پڑیں گی... لیکن ایسا ہوا۔

کیا شاہد رک گیا۔ نہیں، رُکنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔ آنے والے برسوں میں فلیکس این گیٹ کا بڑھتا اثر امریکا کی سرحدیں عبور کرگیا۔ اگلی بار پلانٹ لگانے کے لیے کینیڈا اور میکسیکو کا چناؤ کیا گیا۔ اس کامیابی کے بعد شاہد، ایک محنت کش پاکستانی... ہزاروں امریکی نوجوانوں کا ہیرو بن گیا۔ اسے ایک قابلِ تقلید مثال کے طور پر دیکھا جانے لگا۔

شاہد بمپر سازی کے میدان میں جھنڈے گاڑ چکا تھا۔

اب وہ کچھ نیا کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ فلیکس این گیٹ کے تحت آٹوموبائل انڈسٹری کے لیے دیگر پرزے بھی تیار کیے جائیں۔

اس خواہش میں بہت خطرہ تھا۔ ماہرین نے اسے رسک قرار دیا۔ فلیکس این گیٹ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز بھی متذبذب نظر آئے، لیکن شاہد جمود توڑنا چاہتا تھا' سو ایک شام، کمپنی کے مرکزی ہال میں ہونے والی پُرہجوم پریس کانفرنس میں اس نے یہ اعلان کردیا کہ اب وہ ٹریلر ہچز اور رننگ بورڈ بھی تیار کرے گا جو پک اپ ٹرک اور فوجی گاڑیوں میں استعمال ہوں گے۔

کیا یہ فیصلہ غلط ثابت ہوا' نہیں۔ اُس کا عزم پھر فاتح رہا۔ اس پُرخطر تجربے کے نتائج مثبت رہے۔ خریداروں نے اس کی مصنوعات کو سراہا۔

اطمینان بخش نتائج کے باوجود اس نے مارکیٹ پر نظر رکھی۔ بدلتے رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے تنوع کی جانب قدم بڑھایا، البتہ کمپنی نے اپنی اصل مہارت یعنی بمپر سازی اور کروم پلیٹنگ کے میدان میں کسی قسم کی غفلت کا مظاہرہ نہ کیا۔

نیا ہزاریہ فلیکس این گیٹ کے لیے نیک شگون ثابت ہوا۔ ترقی کی رفتار میں حیران کن تیزی آئی۔ ادارے کی سالانہ فروخت پانچ سو ملین ڈالر تک جا پہنچی۔ خریداروں کی فہرست میں کریسلر، جنرل موٹرز اور فورڈ کے علاوہ اب ٹیوٹا اور ہونڈا جیسے ادارے بھی شامل تھے۔ البتہ ایک مستحکم ادارہ شاہد کی بھرپور کوششوں کے باوجود تاحال اِس فہرست میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اور یہ تھا نسان!

پھر موسم سرما کے آغاز میں ایک دلچسپ صورت حال نے جنم لیا۔ نسان نے یہ اعلان کردیا کہ وہ اپنی گاڑیوں کے لیے بمپر خود تیار کرے گا۔ یہی نہیں، کمپنی مالکان نے بڑے اعتماد سے یہ بھی کہہ دیا کہ آنے والے برسوں میں نسان آٹوموبائل انڈسٹری کو بمپر فراہم کرنے والی سب سے بڑی کمپنی بن جائے گی۔

جب یہ اطلاع شاہد تک پہنچی وہ مسکرایا۔ بمپر سازی آسان عمل نہیں تھا۔ یہ انتہائی پُرپیچ تھا۔ اِس میدان میں خود کو منوانے کے لیے شاہد نے خاصی جدوجہد کی تھی۔ بڑے پاپڑ بیلے تھے۔

جب اُس کی کمپنی کے ایک عہدے دار نے نسان کی صورت ایک نئے حریف کی آمد پر ایسا اندیشہ ظاہر کیا، تو اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "یہ آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے!"

واقعی یہ آگ کا دریا تھا۔ نسان بھاری سرمایہ کاری اور ماہرین کی معاونت کے باوجود اس میدان میں ناکام ہو گیا۔ دیگر اداروں کو بمپر فراہم کرنا تو دُور کی بات تھی، وہ اپنے لیے بھی نفیس اور بے جوڑ بمپر تیار کرنے میں ناکام رہی نتیجتاً اُنھیں بھی فلیکس این گیٹ سے رجوع کرنا پڑا۔

نسان کی انتظامیہ کی جانب سے شاہد کو فون کال موصول ہوئی۔ "مسٹر شاہد، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے بمپر تیار کریں!"

"ضرور جناب، یہی تو میرا کام ہے!"

اپنے نئے گاہک کو مطمئن کرنے کے لیے فلیکس این گیٹ کو اپنی صلاحیت میں مزید اضافے کی ضرورت پیش آئی۔

اِسی کام سے تو شاہد کو عشق تھا۔ اُس نے یہ پروجیکٹ اپنی نگرانی میں مکمل کروایا۔ خود پلانٹ کا دورہ کیا۔ ڈیزائن کا جائزہ لیا، خام مال کی جانچ کی۔

اس کے تیار کردہ بمپر نسان کے معیار پر پورے اترے۔ وہ ایک بار پھر جیت گیا۔

☆☆☆

"امریکا نئی گاڑیوں کے صارفین کی سب سے بڑی مارکیٹ ہے... جن میں سے بیشتر گاڑیوں کے بمپر پر ایک پاکستانی کے دستخط ثبت ہوتے ہیں!"

یہ آٹوموبائل انڈسٹری پر گہری نظر رکھنے والے ایک ماہر کے الفاظ تھے۔

اس زمانے میں جب کبھی تجزیہ کار بمپرز کے ڈیزائن پر بات کرتے، گفتگو کا اختتام شاہد کی خداداد صلاحیتوں پر ہوتا۔ وہ اس میدان میں یکتا تصور کیا جاتا تھا۔ ماہرین اسے ایک فن کار قرار دیتے تھے، جو ایک ماہر مصور کے مانند بمپر سازی کے عمل میں نئی نئی طرزیں کھوج نکالتا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اُس نے کبھی اپنے ڈیزائن کو "پیٹنٹ" نہیں کروایا۔

جب گریجویٹس کی جانب سے دیے جانے والے ایک عشائیے میں اِس بارے میں سوال ہوا تو اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھیں، بین الاقوامی مارکیٹ میں پروڈکٹس کی ڈیزائننگ اور کوالٹی میں اس تیزی سے تبدیلیاں آتی ہیں کہ آپ کو اپنی مصنوعات پیٹنٹ کرانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اُس نے ایک نظر سامنے بیٹھے طلبا پر ڈالی جن کے چہروں پر اشتیاق تھا۔ وہ ہمہ تن گوش تھے۔

"جتنی دیر میں کوئی پیٹنٹ منظور ہوتا ہے، اتنی دیر میں ہمارا نیا ڈیزائن آجاتا ہے۔"

"کیا وقت سے آگے سوچنے کی یہی قابلیت آپ کی کامیابی کا راز ہے؟" ایک طالب علم نے سوال کیا۔

"آپ کہہ سکتے ہیں۔" شاہد نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "دراصل میری کامیابی کی وجہ ہوشیاری سے سوچ بچار کرنا ہے۔ میں نے بہت چھوٹی سطح سے کام شروع کیا۔ اور کسی بھی چھوٹی کمپنی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اُسے تسلسل کے ساتھ منافع ہوتا رہے۔ چاہے یہ تھوڑا ہی ہو۔ میں نے ہمیشہ اِس کلیے کو یاد رکھا۔"

"ہم نے سنا ہے کہ 1978 سے اب تک، آپ کو کبھی کسی منصوبے میں نقصان نہیں اٹھانا پڑا؟" یہ سوال ایک بوکھلائے ہوئے پروفیسر کی جانب سے کیا گیا تھا۔

"جناب، کہیں آپ کا تعلق انکم ٹیکس کے محکمے سے تو نہیں؟" شاہد چہکا۔ ہال میں قہقہے بلند ہوئے۔

"ہم نے ہمیشہ بنیادی کلیوں کو سامنے رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ 1978 میں ذاتی کاروبار شروع کرنے کے بعد اور 1980 فلیکس این گیٹ خریدنے کے بعد... مجھے بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی پیچیدگیاں سلجھانی پڑیں، کئی جرأت مندانہ فیصلے کرنے پڑے۔ میں ان معنوں میں خوش نصیب رہا کہ بیش تر فیصلوں کے نتائج مثبت رہے۔ ہاں، مجھے کبھی نقصان نہیں ہوا۔ مالی طور پر میں ہمیشہ منافع ہی میں رہا۔" اس کے چہرے پر ایک پُراعتماد مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

یہ 2011 کا سال تھا اور عرب دنیا میں بیداری کی لہر انگڑائی لے رہی تھی۔

ایک جانب جہاں مصر کا التحریر اسکوائر سیاسی مبصرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا وہیں دوسری جانب آٹوموبائل انڈسٹری کے ماہرین کی نظریں فلیکس این گیٹ پر لگی تھیں جس کے ملازمین کی تعداد 12450 تک جا پہنچی تھی۔

شاہد کی کمپنی سو فیصد منافع میں تھی۔ نت نئے ڈیزائن متعارف کروا رہی تھی۔ اس کی مصنوعات کو پائیداری کے حوالے سے معیاری سمجھا جاتا تھا۔ مارکیٹ میں تیار ہونے والے دو تہائی سے زیادہ پک اپ ٹرکس اور فوجی گاڑیوں کے لیے بمپر فلیکس این گیٹ کی جانب ہی سے سپلائی کیے جا رہے تھے۔ بمپرز کی 67 فیصد مارکیٹ پر اس کی اجارہ داری تھی، کروم پلیٹنگ کے میدان میں تو وہ سب سے آگے تھی۔

بہ ظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ شاہد اپنا ہر سپنا پورا کرچکا ہے۔ ہر وہ شے حاصل کرچکا ہے، جس کا اُس نے کبھی خواب دیکھا تھا... لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ تو ستاروں پر کمند ڈالنے والوں میں سے تھا، خواب بُننے والوں کے قبیلے سے تھا۔ اور ابھی کئی خواب تکمیل کے منتظر تھے!!

☆☆☆

امریکا ایک سحر میں مبتلا ہے... اور یہ ہے فٹبال کا سحر!

امریکی نوجوان فٹبال کے رسیا ہیں۔ وہاں اس کھیل کو وہی درجہ، وہی مقام حاصل ہے جو برصغیر میں کرکٹ کو نصیب ہوا۔

امریکی فٹبال اُس کھیل سے بڑی حد تک مختلف ہے جو پیلے اور میراڈونا کھیلا کرتے تھے۔ اس کے ضوابط علیحدہ ہیں جو اِس کھیل میں جذبات اور دیوانگی بھر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے امریکا اِس کھیل سے محبت کرتا ہے۔

امریکی فٹبال کا سب سے بڑا ٹورنامنٹ نیشنل فٹبال لیگ کہلاتا ہے جس میں ریاست کی 32 بہترین ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ یہ ایونٹ فقط کھیل اور کھلاڑیوں تک محدود نہیں رہتا۔ اِس کا اثر اتنا گہرا اور وسیع ہے کہ اداکار، سیاست دان، بزنس مین، سماجی کارکن سب اِس رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

یہ تیز رفتار کھیل شاہد کی دلچسپیوں کا محور تھا، مگر... اِس کا سبب میدان میں ہونے والا سخت مقابلہ نہیں تھا، بلکہ ان ٹیموں سے جُڑا بھاری مالی منافع تھا۔ وہ تو کاروباری آدمی تھا اور ہر معاملے کو کاروباری نقطۂ نگاہ ہی سے دیکھا کرتا تھا۔ بس، یہی سبب تھا کہ اُس نے ایک فٹبال ٹیم خریدنے کا فیصلہ کرلیا۔

یہ ایک ایسا خواب تھا جسے دیکھنے کے لیے وسیع تخیل درکار تھا، بے حد وسیع... کیونکہ یہ خواب بہت بڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے خیر خواہ، اس کے قریبی دوست بھی اِس فیصلے کو قبول نہیں کر پائے۔

وہ قصوروار نہیں تھے۔ عام انسان تھے۔ اور شاہد... اُس سا جذبۂ دل ہر ایک کا نصیب کہاں بنتا ہے۔ جذبۂ دل... جس کی کرنیں قسمت کو چمکا دیتی ہیں۔

اپنوں نے سمجھایا۔ کہا، ٹھیک ہے، تم بمپر سازی کے میدان میں بادشاہ ہو، لیکن فٹبال تمہارا میدان نہیں!

کیا شاہد نے ان کی باتوں پر کان دھرا۔ نہیں۔ وہ تو

مصمم ارادہ کیے بیٹھا تھا۔

ان پُرخطر کوششوں کا باقاعدہ آغاز فروری 2010 میں ہوا، جب اس نے St. Louis Rams نامی معروف فٹبال ٹیم کا مالک بننے کے لیے ٹیم کے اعلیٰ عہدے داروں چپ روزن بلوم اور لوکا روڈریگویز سے رابطہ کیا۔ اُن دونوں صاحبان کے لیے وہ حیرت کا لمحہ تھا۔ ''ایک پاکستانی فٹبال ٹیم کی فرنچائز خریدنا چاہتا ہے؟'' وہ متذبذب تھے۔ ''بے شک وہ دولت مند ہے، مگر فٹبال ٹیم..؟''

شاہد سے ہونے والی پہلی ملاقات کے بعد اُن پر واضح ہوگیا کہ یہ پاکستانی دیوانہ ہے۔

''وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' چپ نے لوکا سے کہا۔

شاہد نے اُنہیں تو راضی کرلیا، مگر دیگر شیئر ہولڈرز کی رضامندی کا حصول عذاب ثابت ہوا۔

''انہیں اس بات پر شدید اعتراض ہے کہ اس سودے کے طفیل ایک پاکستانی St. Louis Rams کا مالک بن جائے گا۔'' چپ روزن بلوم کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''آپ سمجھ سکتے ہیں مسٹر شاہد، یہ پہلا موقع ہے کہ ایک غیر امریکی اِس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔''

''مجھے احساس ہے۔'' شاہد کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''لیکن آپ بھی جانتے ہیں۔ زندگی میں کئی چیزیں پہلی بار ہوتی ہیں۔ اور یہی شے ارتقائی عمل کو ممکن بناتی ہے۔'' اس نے بات جاری رکھی۔ ''امریکا آنے سے پہلے میں کبھی غیر آرام دہ بستر پر نہیں سویا تھا، کبھی برتن نہیں مانجھے تھے، کبھی نہیں سوچا تھا کہ ذاتی کاروبار شروع کروں گا۔ لیکن میں نے ایسا کیا۔''

''آپ کی بات درست ہے۔'' لوکا نے کہا۔ ''اور ہم دونوں آپ سے متفق ہیں۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہوجائے۔''

ان دو امریکیوں نے کھلے دل سے معاملات سلجھانے کی کوشش کی، لیکن دیگر شیئر ہولڈرز نے وسیع القلبی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے اس مدعا پر ہونے والی میٹنگ میں واضح کردیا کہ اُنہیں اس معاملے پر شدید تحفظات ہیں۔

اُنہیں ایک پاکستانی کی سرپرستی قبول نہیں تھی!

شاہد کو جلد احساس ہوگیا کہ امریکیوں کی انا، اُن کی ہٹ دھرمی اس کے خواب کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ ''یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی!'' اُس نے خود سے کہا۔

اس سے پہلے کہ یہ معاملہ اخبارات میں اچھالا جاتا، شاہد پیچھے ہٹ گیا۔ تاہم یہ اس کی ناکامی نہیں، بلکہ حکمت تھی۔

وہ مستقبل قریب میں پھر ایک کوشش کرنے والا تھا... اور اس بار وہ پوری تیاری سے میدان میں اترنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

☆☆☆

2011 کے اواخر میں، جب امریکا صدارتی انتخابات سے ٹھیک ایک برس دور تھا، ری پبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹی کے ووٹرز تیاریوں میں جتے تھے، سیاسی تجزیہ کار گھمسان کا رن پڑنے کی توقع کر رہے تھے... شاہد خان فلوریڈا کی مشہور ٹیم ''جیکسن وائل جیگوارز'' خریدنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

اِس ٹیم کا مالک وائنی ویور نامی ایک خوش اخلاق شخص تھا۔ وائنی کا تعلق جورجیا سے تھا۔ ''جیکسن وائل جیگوارز'' کی ملکیت کے علاوہ وہ جوتے کی ایک چین کا بھی مالک تھا۔

شاہد جانتا تھا کہ ''جیکسن وائل جیگوارز'' کی کارکردگی گزشتہ چند سیزن میں خاصی ناقص رہی تھی، جس کی وجہ سے وائنی خاصا دل برداشتہ تھا۔

''یہ ایک شان دار موقع ہے۔'' اُس نے خود سے کہا۔ ''اسے رام کیا جاسکتا تھا۔''

دور اندیش شاہد نے اپنی حکمتِ عملی سے ایسے حالات پیدا کردیے کہ وائنی خود اُس سے رابطہ کرنے پر مجبور ہوگیا۔

طریقہ سہل تھا۔ بس، ایک بااثر شخص کے ذریعے وائنی کو مطلع کردیا گیا کہ فلیکس این گیٹ کا کھرب پتی مالک آج کل ایک فٹبال ٹیم خریدنے کے منصوبے ترتیب دے رہا ہے۔ اِس حکمتِ عملی کا نتیجہ توقع کے عین مطابق رہا۔

''مسٹر شاہد، میں وائنی ویور بول رہا ہوں۔ کیسے مزاج ہیں۔ کیا آپ میرے ساتھ کل شام کافی پینا پسند کریں گے؟'' یہ وائنی کے الفاظ تھے۔

''ضرور جناب، کیوں نہیں۔'' ریسیور شاہد کے کان سے لگا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

وہ ملاقات بہت ہی خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ شاہد کے اعتماد نے وائنی پر مثبت تاثر چھوڑا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' رخصتی کے وقت اس نے شاہد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''سوچتا ہوں، جلد آپ سے ایک اور ملاقات کی جائے۔''

''میرے اور آپ کے خیالات بہت ملتے ہیں۔'' شاہد کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''ہم جلد ملیں گے اور اس بار کافی میری جانب سے ہوگی۔''

چند ہفتوں بعد نیویارک کے ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں شاہد اور وائنی کی ملاقات ہوئی، جس میں ''جیکسن وائل جیگوارز'' کی فروخت کا موضوع پہلی اور آخری بار زیرِ بحث آیا۔

شاہد کی پیشکش اتنی بڑی تھی کہ وائنی انکار نہیں کرسکا۔

وائنی نے اگلے چند روز میں ٹیم کے دیگر شیئر ہولڈرز کو بھی راضی کرلیا۔ گو کہ چند متعصب افراد کے لیے ایک پاکستانی کو ٹیم فروخت کرنے کا فیصلہ قبول کرنا خاصا مشکل تھا لیکن اُس کھرب پتی شخص کی پیشکش حیران کن تھی۔ انکار کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

وائنی اور شاہد نے معاہدے کا فوری اعلان کرنے سے اجتناب برتا۔ انہوں نے کاغذی کارروائی بھی نہیں کی۔ تمام معاملات زبانی کلامی طے پائے۔

اس اقدام کا سبب شاہد کی احتیاط پسندی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ معاہدہ ہونے سے قبل کوئی خبر اخبارات میں آئے۔

اس پورے معاملے میں فقط ایک رکاوٹ حائل تھی۔ ''جیکسن وائل جیگوارز'' کا مرکز فلوریڈا تھا، جب کہ شاہد کی رہائش الونائی میں تھی۔

جب ایک شیئر ہولڈر نے یہ مسئلہ اٹھایا تو شاہد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مسٹر ٹام، آپ امریکیوں نے ذرائع آمد و رفت کو ترقی کی اُس چوٹی پر پہنچا دیا ہے کہ فاصلے مٹ گئے ہیں۔ ایسے میں میری کسی اور شہر میں رہائش کے مسئلے کی بھلا کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ امریکا میں دوریاں ختم ہوچکی ہیں۔''

اِس حاضر جوابی پر وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

نومبر میں تکنیکی اور قانونی معاملات کے لیے نیشنل فٹبال لیگ کے عہدے داروں سے رابطہ کیا گیا۔ شاہد اور وائنی نے اُن سے طویل ملاقات کی جو خوشگوار انداز میں اختتام پذیر ہوئی۔ انہیں اس معاہدے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شاہد اپنے خواب کے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔

جنوری 2012 میں ''جیکسن وائل جیگوارز'' کی فروخت کے تمام معاملات طے پاگئے۔ اس ٹیم کے 100 فیصد شیئرز کے لیے شاہد نے جو رقم ادا کی تھی، وہ تھی 760 ملین ڈالر!

نیشنل فٹبال لیگ نے اِس معاہدے کا جائزہ لینے کے بعد فوراً ہی منظوری دے دی۔ یوں لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک پاکستانی نے نئی تاریخ رقم کی۔

اِس واقعے کے بعد جیسے شاہد کی شہرت کو پر لگ گئے۔ کل تک وہ اعلیٰ ایوانوں میں زیرِ بحث تھا۔ اب امریکا کی سڑکوں پر، کافی ہاؤسز میں اُس کے بارے میں بات ہونے لگی۔

سب حیران تھے۔ ایک برتن مانجھنے والا، امریکی فٹبال فرنچائز کا مالک بن گیا۔

کافی ہاؤس میں بیٹھے لوگ ایک دوسرے کو بتاتے۔ ''شاہد خان امریکی تاریخ میں نسلی اقلیت کا حامل واحد شخص ہے، جس نے امریکی نیشنل فٹ بال لیگ میں شامل کسی ٹیم کو اپنی ملکیت بنایا۔''

اِس اقدام نے امریکا میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کو اُس کا مداح بنا دیا۔ جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے حلقوں نے بھی اِس کارنامے کو جی کھول کر سراہا۔ وہ سوشل میڈیا پر موضوعِ بحث بن گیا۔ حقیقی معنوں میں نچلا متوسط طبقہ اُسے ایک قابلِ تقلید شخص، ایک ہیرو کی طرح دیکھنے لگے۔

اور وہ ہیرو ہی تو تھا، محنت کشوں کا، خواب دیکھنے والوں کا ہیرو!

شاہد نے ٹیم خریدنے کے بعد اپنے بیان میں کہا۔ ''ہاں، یہ میرا دیرینہ خواب تھا، جس کی تعبیر پاکر میں بہت خوش ہوں۔ یہ میری شدید خواہش تھی۔ میرا خواب پورا ہوگیا ہے!''

☆☆☆

پورے امریکا میں اس کا چرچا تھا۔

اُس کا کاروبار 2.5 بلین ڈالرز سے زیادہ مالیت کا حامل تھا۔ اس کا چہرہ کھرب پتی افراد کی معلومات شائع کرنے والے مشہور رسالے ''فوربس'' کے سرورق کی زینت بن چکا تھا۔

وہ امیر ترین امریکیوں کی فہرست میں 179 ویں نمبر پر تھا۔ دنیا کے امیر ترین افراد میں اُس کا نمبر 491 تھا اور اس کا شمار پانچ امیر ترین پاکستانی نژاد امریکیوں میں ہوتا تھا۔

شاہد کو متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ یونیورسٹی آف الونائی نے اپنے اِس ہونہار طالب علم کو کئی مواقع پر نشانِ سپاس سے نوازا، اُسے طلبا کے لیے مشعلِ راہ قرار دیا۔ دیگر نجی اور سماجی تنظیموں نے بھی اُس کی خدمات کا اعتراف کیا، شیلڈز اور میڈلز سے نوازا۔ اِس سفر میں وہ محبت کے تجربے سے بھی گزرا۔ اور کاروبار کی طرح اِس محاذ پر بھی کامیاب رہا۔

اب وہ دریا کنارے، درختوں سے گھرے ایک عالی شان مکان میں اپنی بیوی اینا خان کے ساتھ خوش و خرم ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ قدرت نے اسے دو ہونہار بچوں سے نوازا، جو ٹھیک اس کے مانند خواب دیکھنے کے

عادی تھے۔

اُن ہی دنوں ایک معروف ٹی وی چینل نے کامیاب امریکیوں کی زندگی پر "جینا اِسی کا نام ہے" کے عنوان سے تیس منٹ پر مبنی پروگرام شروع کیا۔ شاہد خان کے کارناموں کو بھی پروگرام کا موضوع بنایا گیا جس میں عمرانی ماہرین اور نفسیات دانوں سے اُس کی شخصیت کے بارے میں رائے لی گئی۔ وہ سب متفق تھے کہ اِس شخص میں لوگوں کو حیران کرنے کی عجیب وغریب عادت ہے، اِسی عادت نے اُس پر کامیابی کے در وا کیے۔

علمِ نجوم اور دست شناسی کے ماہرین نے بھی اُس پروگرام میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ وہ مستقبل میں بھی امریکیوں کو حیران کرنے کی عادت قائم رکھے گا کیونکہ اُس کے ہاتھ میں ایسی کئی لکیریں ہیں جو نئے واقعات جنم دینے کی تیاری کر چکی ہیں۔

کیا وہ درست تھے؟

☆☆☆

وہ تباہی کے مناظر تھے۔

قاتل لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ طوفانی ہواؤں نے شہروں کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ لاکھوں افراد محصور ہو گئے تھے۔ صاف پانی عنقا ہو گیا تھا۔ غذائی بحران جنم لے چکا تھا۔ بجلی کا نظام درہم برہم ہونے کے بعد زندگی مفلوج ہو چکی تھی۔

پھر منظر بدلا... اب سامنے لاشیں تھیں، ملبے تلے دبی ہوئی لاشیں... اُن میں کئی عورتیں تھیں، کئی بچے، کئی بوڑھے!

شاہد خان ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا جس کے اداس مناظر سینڈی طوفان کی ہیبت ناک کہانی بیان کر رہے تھے۔

اس طوفان نے پورے امریکا کو وحشت کی کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ درجنوں افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ سیکڑوں زخمی تھے۔ بے گھر ہونے والوں کی تعداد ہزاروں میں بتائی جا رہی تھی۔

25 اکتوبر کو فلوریڈا کے ساحل پر دہشت طاری کرنے کے بعد اِس طوفان نے نارتھ کیرولینا، ورجینا، واشنگٹن اور نیوجرسی میں شدید تباہی مچائی۔

امریکا کا سب سے بڑا شہر نیویارک آفت زدہ قرار دیا جا چکا تھا۔ کاروبار تباہ ہو چکا تھا۔ نیویارک اسٹاک ایکسچینج بند کر دی گئی تھی۔ اسکول ویران ہو گئے تھے۔ سماجی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔

شاہد نے چینل بدلا۔ برساتی پہنا ایک رپورٹر اُس کے سامنے کھڑا تھا جس کی پشت پر امریکا کا مشرقی ساحل نظر آ رہا تھا، جہاں موسلا دھار بارشوں، تیز ہواؤں اور سیلاب نے تباہی کے نشانات ثبت کر دیے تھے۔

"... یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے وقت ٹھہر گیا ہو!"

رپورٹر کی آواز میں دکھ تھا۔

اُس نے ریموٹ کا بٹن دبایا۔ اب اسٹوڈیو میں بیٹھا ایک نیوز کاسٹر سامنے تھا۔

"... دو لاکھ افراد بجلی سے محروم ہیں... حالات تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔"

شاہد نے ٹی وی بند کر دیا۔ اپنے وجود کو صوفے پر بکھیر دیا۔ دکھ اُس کے دل میں حرکت کر رہا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ یونہی بیٹھا رہا۔ سسکتے انسانوں کے بارے میں سوچتا رہا۔

اچانک اُسے کھٹکا سنائی دیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی میں ایک پرندہ بیٹھا تھا جس کے جسم پر سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔

شاہد کی نظریں پرندے پر ٹک گئیں۔ ایک خاموش لمحہ اُن کے درمیان در آیا۔

اچانک پرندے نے پر پھیلائے۔ وہ اُڑان کے لیے تیار تھا۔ پھر اُس نے جست لگائی اور ہوا میں تیرنے لگا۔

وہ ایک مراقباتی لمحہ تھا۔

شاہد دھیرے سے اٹھا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ دھوپ اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ ایک بڑا فیصلہ کرنے والا تھا۔

چند پلوں بعد اُس نے گہرا سانس لیا۔ مستقبل کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

شاہد خان... وہ شخص جو اپنی زندگی میں سب کچھ حاصل کر چکا تھا، اب بے سہارا افراد کا سہارا بننے والا تھا۔ ضرورت مندوں کا ہاتھ تھامنے والا تھا۔ دکھیاروں کا درد بانٹنے والا تھا... سماجی خدمت کا میدان اِس کھرب پتی کا مستقبل تھا۔

پرندہ بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا... نئی منزلوں کی جانب بڑھ رہا تھا... اور اس کے پروں پر سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔

☐

اردو کی ایک بڑی قلم کار کا عکسِ زندگی

عکاسِ درد

تنویر ریاض

✪

جدوجہدِ آزادی کے دور میں قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی۔ بڑے بڑے نام ابھرے۔ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ وہ دور پردے کی سخت پابندیوں کا تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کو بھی برا سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس دور میں ڈاکٹر رشیدجہاں، عصمت چغتائی جیسی قلم کار بھی میدان میں نظر آئیں۔ اسی دور میں لکھنؤ کی دو بہنوں نے بھی نام پیدا کیا۔ ان میں سے ایک بہن کا عکس زندگی۔

ہر دور کا ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے اور کامیاب ادیب وہی ہے جو اپنی تحریروں میں اردگرد رونما ہونے والے واقعات، معاشرے کے رویّوں اور بدلتے ہوئے رجحانات نئی تہذیبی اقدار اور طرزِ زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی بھرپور عکاسی کر سکے اسی لیے ادیب کو اپنے عہد کا عکاس سمجھا جاتا ہے۔ ادیب اور قاری کا رشتہ اسی وقت مستحکم ہو سکتا ہے جب پڑھنے والے کو اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کی تصویر نظر آئے اور وہ انہیں

اپنے دل کی آواز سمجھے۔

شاید ترقی پسند تحریک کی پزیرائی اور مقبولیت کی یہی سب سے بڑی وجہ تھی کہ اس سے وابستہ تخلیق کار یدرم سلطان بود کا نعرہ لگانے کے بجائے حال کی حقیقتوں کا عکس اپنی تحریروں میں پیش کررہے تھے۔ ایک ایسے زمانے میں جب غیر منقسم ہندوستان میں انگریزوں سے آزادی کا نعرہ زور پکڑ رہا تھا اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں، ملک راج آنند اور اس قبیل کے دوسرے افراد نے شعروادب کے میدان میں کیسے کیسے چراغ روشن کیے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے آزادی کی طلب اور تڑپ میں کیسا اضافہ کیا لیکن اپنے قاری کو ایک نئی جہت سے ضرور روشناس کرایا۔ انہوں نے برصغیر کے کچلے ہوئے اور مظلوم عوام کو ان کے دکھوں اور عذابوں سے نجات دلانے کے لیے ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا۔ ان کی تحریریں امیدوں کا ایسا چراغ تھیں جس کی روشنی میں آزادی کی رہ گزر صاف نظر آرہی تھی۔ وہ لوگوں کو غلامی، بھوک اور جہالت سے نجات دلانے کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن نہیں جانتے تھے کہ سامراج کے حاشیہ بردار اس تحریک کا رخ ایسی منزل کی جانب موڑ دیں گے جس تک پہنچنے کے لیے لاکھوں انسانوں کو آگ اور خون کا دریا عبور کرنا ہوگا۔ جان، مال اور عزتوں کی قربانی دینا ہوگی اور اس کے نتیجے میں ملنے والی آزادی غلامی سے بھی بدتر ہوگی۔

آزادی کی جدوجہد اور ترقی پسند تحریک کے اسی منظر میں جہاں پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی اپنے شہ پاروں کے ذریعے دھوم مچارہے تھے وہیں لکھنؤ کے نواح میں دو بہنیں پیدا ہوئی جنہوں نے ادب کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ ناقدین انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہ دونوں بہنیں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے نام سے پہچانی جاتی تھیں۔ بڑی بہن خدیجہ مستور 11 ستمبر 1927 کو پیدا ہوئیں اور انہوں نے 54 سال کی عمر میں 25 جولائی کو وفات پائی۔ خدیجہ مستور نے پندرہ سال کی عمر میں ہی لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کے دو ناول اور افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ جس میں ان کے ناول 'آنگن' کو بہت شہرت ملی۔

چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور 17 جنوری 1930ء کو پیدا ہوئیں۔ والد ڈاکٹر صبور احمد خاں برطانوی فوج میں ڈاکٹر تھے۔ جن کا حرکتِ قلب بند ہوجانے سے ... انتقال ہوا۔ یہ پانچ بہنیں اور ایک بھائی پر مشتمل گھرانا تھا۔ اب خاندان کی ذمے داری والدہ کے کندھوں پر آگئی جنہوں نے بڑی بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا اور اپنے چھ بچوں کی تربیت اور پرورش بڑے اچھے انداز میں کی۔ گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا اور ادبی پرچوں کی بھی ریل پیل تھی۔ والد کے انتقال کے بعد وہ پرچے آنا بند ہوگئے لیکن جب ان بہنوں خدیجہ مستور اور عائشہ جمال نے لکھنا شروع کیا تو یہ پرچے دوبارہ آنا شروع ہوگئے۔ دو بہنوں کو چھوڑ کر تمام بہن بھائیوں نے قلم کاری سے ناتا جوڑا۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور عائشہ جمال نے افسانہ نگاری میں رنگ جمایا جبکہ خالد احمد میدانِ شاعری میں جانکلے۔ بیشتر بہنوں کی شادیاں بھی قلم کاروں سے انجام پائیں۔ ہاجرہ مسرور سابق مدیر روزنامہ ڈان احمد علی خاں کی زوجہ تھیں جبکہ خدیجہ مستور ادیب اور صحافی ظہیر بابر کی دلہن بنیں۔ تیسری بہن طاہرہ کی شادی ترقی پسند صحافی حسن عابدی سے ہوئی۔

ہاجرہ مسرور نے بہت کم عمری میں لکھنا شروع کردیا تھا' ایک ادبی جریدے میں جس کا نام انہیں یاد نہیں رہا۔ ان کی پانچ کہانیاں شائع ہوئیں جس کا معاوضہ انہیں پندرہ روپے ملا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ان کی کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ پہلے مجموعے 'چرکے' کی رائلٹی چالیس روپے ملی اور اس کے فوراً بعد شائع ہونے والے مجموعے 'ہائے اللہ' پر انہیں چھ سو روپے رائلٹی ملی جو اس وقت کے حساب سے ایک بڑی رقم تھی۔

قرۃ العین حیدر نے ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان دونوں بہنوں نے زیادہ تر مسلم مڈل کلاس کی عکاسی کی ہے۔ وہ انہیں نیچرل رائٹر کہتی تھیں۔ کارِ جہاں دراز ہے میں انہوں نے لکھا کہ ان کے یہاں آورد کے بجائے آمد ہی آمد تھی اور ان کے افسانے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ثابت ہوئے۔ یہ لکھنؤ شہر کے ایک قدامت پسند گھرانے میں پردہ نشین رہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے بڑی بے خوفی سے افسانے لکھنے شروع کیے جن کی وجہ سے انہیں عصمت چغتائی کا مقلد کہا گیا۔

جب برصغیر کا بٹوارا ہوا تو یہ خاندان لکھنؤ سے بذریعہ ریل بمبئی پھر بذریعہ بحری جہاز کراچی اور پھر ریل کے ذریعے لاہور پہنچا۔ ان دنوں لکھنؤ سے براہِ راست آنا خطرے سے

خالی نہ تھا۔ جب وہ لاہور پہنچے تو انہیں لینے کوئی نہیں آیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ پبلشر کو ان کا پیغام ہی نہیں ملا۔ احمد ندیم قاسمی کو جب ان کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ پشاور سے جہاں وہ کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ بھاگم بھاگ لاہور پہنچے۔ اس خاندان کو کچھ دنوں کے لیے فکر تونسوی کے گھر ٹھہرایا گیا۔ وہ جب لاہور سے ہندوستان جارہے تھے تو انہوں نے قاسمی صاحب کے حوالے گھر کی چابی کردی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ حالات معمول پر آنے کے بعد وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ لاہور واپس آجائیں گے۔

انگریزی کے ممتاز صحافی اور کالم نگار آصف نورانی نے نومبر 2000ء میں ان کا ایک انٹرویو لیا تھا جس میں ہاجرہ مسرور نے کہا تھا کہ وہ اپنی خودنوشت لکھنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ شاید وہ اس بارے میں سوچتی ہی رہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک سیاسی ناول لکھنے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ شادی نے ان کے تخلیقی سفر کی رفتار بہت مدھم کردی تھی اور اب تو کئی برسوں سے انہوں نے بالکل ہی لکھنا چھوڑ دیا تھا۔

لاہور میں قیام کے دوران ہاجرہ مسرور معروف ادیب احمد ندیم قاسمی کے ساتھ مل کر ادبی جریدہ نقوش مرتب کرتی تھیں۔ 1971ء میں انہوں نے معروف صحافی احمد علی سے شادی کرلی۔ اس وقت وہ انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ 1973ء میں وہ روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور کراچی آگئے۔ وہ اٹھائیس برس تک ڈان کے ایڈیٹر رہے۔ ان کا انتقال 27 مارچ 2007ء کو ہوا۔ ہاجرہ اور احمد علی کی دو بیٹیاں نوید احمد طاہر اور نوشین احمد ہیں۔

کئی برس تک لاہور میں سرگرم ادبی زندگی بسر کرنے والی ہاجرہ مسرور نے شادی کے بعد خود کو گھر تک محدود کرلیا۔ ان کی ادبی سرگرمیاں ختم ہوچکی تھیں اور وہ مکمل طور پر خاتونِ خانہ بن کر رہ گئی تھیں۔ کئی دہائیوں کی گوشہ نشینی کے بعد وہ پہلی بار پُرزور اصرار پر لاہور کے گورنمنٹ کالج میں منعقد ہونے والی ایک ادبی تقریب میں شریک ہوئیں جو برصغیر کی معروف ادیبہ قرۃ العین حیدر کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔ مکمل گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے والی روایت شکن ادیبہ کے بارے میں نئی نسل کو شاید کچھ زیادہ علم نہیں۔ اس حوالے سے مرحومہ کی صاحبزادی نے ایک دلچسپ انکشاف کیا ہے۔

ڈان ٹی وی اردو سے گفتگو کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ تقریباً آٹھ سال پہلے معروف ادیبہ اور شاعرہ کشور ناہید ٹی وی کیمرا کے ساتھ ان کے گھر آئی تھیں۔ انہیں امید نہیں تھی کہ وہ انٹرویو دینے سے انکار کردیں گی مگر انہوں نے ایسا کیا اور کشور ناہید کو مایوس لوٹنا پڑا۔ جب آصف نورانی کو ان سے انٹرویو کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تو وہ بہت سٹپٹائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہاجرہ مسرور انٹرویو دینے سے کتراتی ہیں۔ انہوں نے یہ معرکہ کس طرح سر کیا اور انٹرویو کے دوران کیا باتیں ہوئیں اس کا احوال آصف نورانی نے کچھ یوں قلم بند کیا ہے۔

"ہاجرہ مسرور جنہیں سب پیار اور عقیدت سے ہاجرہ آپا کہتے تھے۔ انٹرویو دینے سے کتراتی تھیں۔ اگر ایک آدھ دفعہ کسی کو اجازت بھی دی تو وہ صاحبہ بہت جلد ہمت ہار گئیں کیونکہ انٹرویو دینے سے پہلے انہوں نے یہ شرط لگادی تھی کہ پہلے وہ اسے پڑھیں گی اور جب تک اجازت نہیں دیں گی وہ انٹرویو نہیں چھپے گا۔ دو ایک چکر لگانے کے بعد ان خاتون نے کان پکڑ کر توبہ کرلی۔

خان صاحب جب تک ڈان کے مدیر تھے نہ تو ہاجرہ آپا کے بارے میں کچھ چھپتا تھا اور نہ ہی ان کی قابل بیٹی نوید احمد طاہر کے متعلق جو جامعہ کراچی میں یورپین اسٹڈیز کے شعبے کی سربراہ تھیں۔ جب خان صاحب نے طویل اور شاندار ادارت سے ریٹائرمنٹ لی تو مشہور صحافی اور خان صاحب کی مرید زبیدہ مصطفیٰ نے مجھ پر ہاجرہ آپا کا انٹرویو کرنے کی ذمے داری سونپ دی۔ زبیدہ نے اس سے پہلے ان سے میرا نام لیا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ ہاجرہ آپا نے ہامی بھرلی۔ میں ان خاتون کا حشر دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ اب مجھے جوئے شیر لانا پڑے گا۔

انہوں نے انٹرویو دیا اور کچھ مزے کی باتیں بتائیں مثلاً کہ ساحر لدھیانوی ان سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ جب میں نے ان کو تحریر شدہ انٹرویو دکھایا تو کہنے لگیں کہ یہ میں نے صرف آپ کو بتایا تھا' شائع کرنے کو نہیں کہا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی تبدیلیاں کیں غرضیکہ تین دفعہ انٹرویو میں تبدیلیاں کیں۔ خاں صاحب چپ چاپ کمرے میں بیٹھے یہ سب کچھ سنتے اور دیکھتے رہتے۔ میں نے ایک موقع پر جھنجلا کر کہا "ہاجرہ آپا میں اور بھی بڑی شخصیات کا انٹرویو کرچکا ہوں مثلاً ایک نوبل انعام یافتہ شخصیت، ہندوستان کے وزیراعظم اندر کمال گجرال اور کئی بڑے ادیب و فنکار

لیکن کسی نے میرا یہ حشر نہیں کیا۔"
بیشتر اس کے وہ کچھ کہتیں خان صاحب کو مجھ پر ترس آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ" آپ یہ لکھا ہوا انٹرویو مجھے دے دیں میں اس کی نوک پلک درست کر کے آپ کو بھجوا دوں گا۔ جب وہ انٹرویو ڈان کے مقبول صفحات بکس اینڈ آتھرز میں شائع ہوا تو ہاجرہ آپا کا فون آیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔
" آصف میاں انٹرویو تو آپ نے بہت اچھا لکھا۔ آپ ایسا کیجیے کہ بیگم صاحبہ کے ساتھ ہمارے غریب خانے پر آیئے اور چائے پیجیے۔"

میں نے کہا" چائے اور اس کے لوازمات کے ساتھ تو آپ نے میری پہلی نشست میں خوب خاطر مدارت کی ہے البتہ بیگم کے ساتھ پھر بھی حاضر ہوں گا۔"

انٹرویو کے درمیان میں ہاجرہ آپا سے پوچھا" آپ اور آپ کی بہن خدیجہ مستور نے ایک ہی ماحول میں پرورش پائی لیکن دونوں کی تحریروں اور مزاج میں اتنا فرق کیوں ہے؟"

ہاجرہ آپا کا کہنا تھا" صرف ابتدائی ماحول ایک سا تھا بعد میں۔۔۔ تو ہم نے الگ الگ ماحول میں زندگی گزاری ہے۔ قدرتی طور پر کوئی دو شخص بالکل ایک سے نہیں ہوتے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ ان کی نثر میں بے ساختگی ہے اور میری نثر میں اس لیے نہیں ہے کہ میں ہر چیز شائع ہونے سے پہلے بار بار پڑھتی اور اسے بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہوں۔"

اس سلسلے میں ہاجرہ آپا نے ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا۔" مجھے یاد آ رہا ہے کہ ہمارے ابا کے دوست بابو گنگا دھر ناتھ ساقی نامی ادبی رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ہم دونوں بہنوں کو بلا کر کہا کہ تم لوگوں کو خانہ بدوش لڑکی کے متعلق کہانی لکھنی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم ایک دوسرے سے اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ غرضیکہ ہم دونوں نے کہانیاں لکھیں اور انہیں پسند کیا گیا۔ وہ دونوں کہانیاں ہمارے مجموعے میں بھی چھپیں۔ اگر آپ کو وہ کہانیاں مل جائیں تو ضرور پڑھیے گا۔ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔"

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ" خدیجہ مستور نے افسانوں کے علاوہ دو ناول بھی لکھے۔ آپ نے اس میدان میں کیوں قدم نہیں رکھا اور صرف افسانے ہی لکھے؟"

ان کا کہنا تھا۔۔۔" خدیجہ میں مجھ سے زیادہ مستقل مزاجی ہے اور وہ کوئی بھی کام کرتی ہیں تو اس میں دیر تک ڈوبی رہتی تھیں پھر ان کو نوکر چاکر کی بھی دقت نہیں تھی۔"

ہاجرہ مسرور نے بتایا" ان کے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ چاند کی دوسری طرف، تیسری منزل، اندھیرے اجالے، چوری چھپے، ہائے اللہ اور چرکے۔ 1998ء میں ایک ضخیم جلد شائع ہوئی جس میں سارے افسانے شامل تھے۔ کچھ سال پہلے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ان کی بچوں کے لیے لکھی کہانیوں کے دو مجموعے بھی شائع کیے تھے۔ ان کے مختصر ڈراموں کا مجموعہ ٫وہ لوگ٫ کے نام سے چھپا ہے۔

کچھ فلمی شائقین کو یاد ہوگا کہ ساٹھ کی دہائی میں انہوں نے مشرقی پاکستان میں بننے والی سرور باری بنکوی کی فلم آخری اسٹیشن کی کہانی اور مکالمے بھی لکھے تھے جس پر انہیں نگار ایوارڈ ملا۔ اس فلم کی کہانی حقیقت سے قریب تر تھی اور اداکارہ شبنم نے اس میں پاگل لڑکی کا کردار ادا کیا تھا جو برما کی سرحد کے قریب واقع ایک غیر معروف اسٹیشن پر منڈلاتی رہتی ہے۔ شبنم اسے اپنے کیریئر کی یادگار فلم قرار دیتی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اس فلم کی کہانی اتنی متاثر کن تھی کہ انہیں ایسا لگا کہ وہ خود بہ خود اس لڑکی کے کردار میں ڈھل گئیں۔

ہاجرہ مسرور نے کئی سال پہلے لکھنا بند کر دیا جس کی انہوں نے کوئی وجہ نہیں بتائی البتہ یہ ضرور کہا کہ وہ اپنی یادوں کو قلم بند کرنے والی ہیں لیکن ان کا حافظہ بھی کمزور ہو گیا تھا اور یکسوئی سے بیٹھ کر لکھنا ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا لیکن یہ تو ماننا پڑے گا کہ ان کی تحریریں پڑھ کر آج بھی اتنا لطف آتا ہے جتنا چالیس سال پہلے آتا تھا۔"

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ 1946ء میں مشہور شاعر ساحر لدھیانوی سے ان کی منگنی ہوئی تھی۔ یہ منگنی بھی ایک انوکھی وجہ سے ٹوٹی۔ ہوا یوں کہ ساحر ایک مشاعرے میں شریک ہوئے۔ ہاجرہ مسرور بھی وہاں موجود تھیں۔ نظم سناتے ہوئے ساحر نے ایک لفظ غلط پڑھ ڈالا۔ بعد ازاں ہاجرہ نے انہیں صحیح تلفظ بتایا تو مردانہ انا کا شکار ساحر نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ تب ہاجرہ مسرور نے ان سے کہا کہ آپ ابھی ایک چھوٹی سی غلطی تسلیم نہیں کر رہے تو آگے چل کر کیا ہوگا جب ازدواجی الجھنیں جنم لیں گی۔ یوں ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے یہ تعلق ختم ہو گیا۔

یہ واقعہ اس امر کی دلیل ہے کہ نصف صدی قبل الفاظ

کے تلفظ و ادائیگی پر بہت دھیان دیا جاتا تھا۔ اس واقعے کا مفصل حال اظہر جاوید نے اپنی کتاب ساحر، ناکام محبت میں بیان کیا ہے۔ یاد رہے کہ ساحر لدھیانوی شادی سے دور بھاگتے تھے۔ انہوں نے ایشور کور، امرتا پریتم اور سدھا ملہوترہ وغیرہ سے عشق تو لڑائے مگر کسی سے بیاہ نہیں کیا آخر وہ حملہ قلب کا شکار ہو کر کنوارے ہی چل بسے۔

لاہور میں قیام کے دوران ان کے ساتھ ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ وہ منٹو صاحب سے ملنا چاہتی تھیں لیکن کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ آخر ایک دن پتا چلا کہ سعادت حسن منٹو حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس میں شرکت کریں گے، یہ بھی وہاں پہنچ گئیں۔ ابھی ہال خالی تھا اور چند ہی لوگ آئے تھے۔ ہاجرہ مسرور نے وہاں کرسی پر بیٹھے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ کیا منٹو صاحب آ چکے ہیں تو وہ بولے۔

" ارے وہ تو گھامڑ اور چغد ہے۔ تم اس سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔" ان صاحب نے منٹو کے بارے میں اور بھی منفی قسم کی باتیں کیں جنہیں سن کر ہاجرہ بہت حیران ہوئیں۔ جب اجلاس شروع ہوا تو منٹو صاحب کا نام پکارا گیا۔ ہاجرہ مسرور یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ یہ وہی صاحب تھے جو منٹو کی برائیاں کر رہے تھے۔ حقیقتاً منٹو صاحب اپنے ڈھب کے انوکھے انسان تھے اور اتنے کھرے کہ اپنے لتے لینے سے بھی نہ چوکتے۔

خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور نے اس عمر میں کہانیاں لکھنا شروع کیں جب لڑکیاں گڑیوں کو بیاہتی اور دوپٹے رنگتی تھیں۔ یہ کہانیاں اس وقت کے ادبی پرچوں میں شائع ہوئیں۔ ان کی کہانیوں کو ادبی حلقوں میں ابتدا سے ہی پذیرائی حاصل رہی تھی۔ ان کی تحریریں معاشرے کی منافقتوں کی کھل کر عکاسی کرتی ہیں جس پر انہیں بھی منٹو اور عصمت چغتائی کی طرح سماج کے قدامت پسند حلقوں کی طرف سے بدترین تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اردو ادب میں ان کی شناخت روایت شکن [illegible] جو تیروں اور خنجر کی مانند معاشرے پر پڑے وہ پردے چاک کر دیتی تھیں جس کی آڑ میں صنف نازک کا استحصال ہوتا ہے۔

ہاجرہ مسرور نے اپنے افسانوں میں جنس اور بھوک کو موضوع بنایا۔ دراصل ہندوانہ رسم و رواج کے زیر اثر ہندوستانی مسلم مردوں نے بھی عورت کو پاؤں کی جوتی بنا لیا تھا حالانکہ اسلام میں عورت کو خاص مقام و اہمیت حاصل ہے

چنانچہ ہاجرہ نے اپنے افسانوں میں اسی فرسودہ مردانہ نظام کو نشانہ بنایا۔ بھوک ہمیشہ سے ہی اس خطے کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے لہٰذا انہوں نے مختلف پہلوؤں سے اسے اجاگر کیا۔ ہاجرہ صاحبہ کے افسانوں کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ معاشرتی برائیاں عیاں کرتے ہوئے انہوں نے دیگر ترقی پسند خواتین کہانی کاروں مثلاً عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کی طرح برہنہ قلمی انداز نہیں اپنایا۔ اس کے باوجود وہ قدامت پسند حلقوں کی تنقید کا نشانہ بنیں۔ اردو ادب کے ثقہ قارئین کے لیے ڈاکٹر رشیدہ جہاں اور عصمت چغتائی ہی کافی تھیں جنہوں نے زندگی کے ڈھکے چھپے گوشوں کو عریاں کر دیا۔ ہاجرہ اور خدیجہ نے بھی وہی روش اپنائی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انہوں نے متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی لڑکیوں کے نفسیاتی مسائل اور جنسی گھٹن کے علاوہ بھی ان کی زندگیوں کے کئی پہلو اجاگر کیے جس نے پڑھنے والوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

جہاں ڈاکٹر رشیدہ جہاں اور عصمت چغتائی کا طوطی بول رہا ہو اور قرۃ العین کی کہانیاں اردو افسانے کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کر رہی ہوں ایسے میں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لینا ایک اہم بات تھی۔ دراصل 1940ء کی دہائی اتنی زرخیز تھی کہ اردو ادب کے سارے ہی پڑھنے لکھنے والوں نے اسی زمانہ میں لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ سیاسی اور سماجی بیداری کی دہائی تھی جب ترقی پسند تحریک اردو ادب میں ایک نیا شعور اجاگر کر رہی تھی اور یہ اعزاز بھی ترقی پسند تحریک کو ہی حاصل ہے کہ پہلی بار خاتون لکھنے والیوں نے نہایت بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ عورتوں کے ان مسائل پر توجہ دی جن کی طرف مرد لکھنے والے بھی دیکھنے سے ڈرتے تھے۔ یہ نڈر، بے باک اور صاف گو لکھنے والیاں تھیں جو مردوں سے مقابلہ کر رہی تھیں۔

ہاجرہ مسرور نے اپنی تحریروں میں ایک طرف تو خواتین کے سماجی استحصال کو انتہائی بے خوفی سے اجاگر کیا تو دوسری جانب وہ اپنے عہد میں رونما ہونے والے واقعات سے بھی غافل نہ رہیں۔ یہ وہ دور تھا جب تقسیم دلوں کو بانٹ اور رشتوں کو کاٹ رہی تھی۔ جس کے نتیجے میں تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت دیکھنے میں آئی۔ صرف ملک ہی تقسیم نہیں ہوا بلکہ سیکڑوں ہزاروں خاندان تقسیم ہو گئے جو 65 سال گزر جانے کے بعد بھی اپنوں سے جدائی کا دکھ نہیں

بھلا سکے۔ ہاجرہ مسرور نے تقسیم کے زمانے اور اس کے بعد سماج میں ہونے والی تبدیلیوں، بااثر طبقات کی لوٹ کھسوٹ اور نچلے متوسط طبقے کی زندگیوں میں ہونے والی اتھل پتھل کی عکاسی اپنے افسانوں کے مجموعے 'تیسری منزل' میں بڑی مہارت سے کی۔

پہلے خدیجہ اور قرۃ العین حیدر گئیں اور اب ہاجرہ بھی چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی افسانہ نگار اور شعر کہنے والی خواتین کا وہ دور ختم ہوگیا جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ خدیجہ نے تو اس وقت تک لکھا جب تک وہ بہت زیادہ بیمار نہیں ہوگئیں لیکن ہاجرہ نے بہت پہلے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں بتاتی تھیں جب بھی ان سے پوچھا جاتا تو جواب ملتا۔ ''ہاں لکھوں گی۔''

پاکستان آنے کے بعد ہاجرہ مسرور نے لاہور میں بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ وہ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ مشہور ادبی جریدے نقوش کی ادارت کرتی تھیں۔ لاہور میں انہیں احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی اور وہ باقاعدگی کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ ارباب ذوق کے جلسوں میں شرکت کیا کرتی تھیں لیکن کراچی آجانے کے بعد ان کی سرگرمیوں کا دائرہ محدود ہوگیا اور وہ عملاً سب سے کٹ کر رہ گئیں۔

ہاجرہ مسرور کے یادگار افسانوں میں ''بھاگ بھری، صندوقچہ اور ایک بچی'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے آخری افسانوں میں ''ایک اور نعرہ'' ہے جو انہوں نے جنرل ضیاء الحق کے زمانے کی وحشت اور بربریت کے بارے میں لکھا جس میں ٹکٹکی پر چڑھے ہوئے ایک نوجوان کو کوڑے لگائے جارہے ہیں اور اس منظر کو دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا ہے۔ میلے کا عالم ہے آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کے ابتدائی دنوں کو انہوں نے بہت ہنرمندی سے لکھا لیکن پھر لفظوں سے کھیلنے والی انگلیاں ساکت ہوگئیں۔ لگتا یہی ہے کہ کراچی کا ماحول انہیں راس نہیں آیا۔ اگر وہ لاہور میں ہی رہتیں تو ان کا تخلیقی سفر اتنی جلدی تمام نہ ہوتا۔ انہوں نے تو ادبی محفلوں میں شرکت کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

ہاجرہ مسرور کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ حکومتِ پاکستان نے ادب کے شعبے میں ان کی نمایاں خدمات پر 1995ء میں تمغۂ حسن کارکردگی دیا۔ 1962ء میں انہیں مجلس ترقی ادب کی جانب سے ان کے ڈراموں کے مجموعے ''وہ لوگ'' پر رائٹرز آف دی ایئر کا ایوارڈ دیا گیا۔ اس مجموعے کا دیباچہ فیض احمد فیض اور امتیاز علی تاج نے لکھا تھا۔ اس کے علاوہ عالمی فروغ اردو ادب کی جانب سے انہیں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ بھی دیا گیا۔ انہیں آخری اسٹیشن کی کہانی اور مکالمے لکھنے پر نگار ایوارڈ بھی دیا گیا۔

ہاجرہ مسرور کا انتقال 15 ستمبر 2012ء کو ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی بہن خدیجہ مستور کی وفات کے بعد وہ تقریباً گوشہ نشین ہوکر رہ گئی تھیں۔ 2007ء میں ان کے شوہر احمد علی خاں بھی اس جہانی فانی سے کوچ کرگئے۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی تھیں۔ ہاجرہ مسرور کے انتقال کو ادبی حلقوں نے اردو ادب کا ایک بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ ان کے انتقال سے اردو ادب کا ایک اور دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ یہ وہ دور تھا جو رشیدہ جہاں سے شروع ہوا اور عصمت چغتائی تک آکر اپنے عروج کو پہنچا پھر اس قافلے میں خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور قرۃ العین بھی شامل ہوگئیں۔ ان خواتین کی تحریروں نے برصغیر کی عورتوں میں سماجی بیداری کی لہر دوڑا دی اور مردوں کے معاشرہ میں کچلی ہوئی عورت کو پہلی بار اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا احساس ہوا۔

قرۃ العین، خدیجہ اور ہاجرہ مسرور کا انتقال ایک بڑا دھچکا ہے۔ ان نامور خواتین کے دنیا سے رخصت ہوجانے سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ شاید ہی کبھی پورا ہوسکے کیونکہ موجودہ دور کی لکھنے والیوں میں کوئی ایسا نام نظر نہیں آتا جو ہاجرہ مسرور کے کام کو آگے بڑھا سکے جبکہ مشہور افسانہ نگار اور شاعرہ مسرت افزا روحی کا کہنا ہے کہ ہاجرہ مسرور نے ہمیشہ نئی لکھنے والیوں کی حوصلہ افزائی کی اور لاہور کے علاوہ کراچی میں بھی ایسی ادبی نشستوں میں شرکت کرتی رہیں جن میں نئی لکھنے والیاں اپنی تخلیقات پیش کرتی تھیں۔ مسرت افزا روحی کا کہنا ہے کہ انہوں نے خود بھی ہاجرہ مسرور کی تحریریں پڑھ کر لکھنا شروع کیا اور ان کی تقلید کئی دوسری لڑکیوں نے بھی کی جنہوں نے ہاجرہ مسرور کو رول ماڈل سمجھ کر اسی طرز کی کہانیاں لکھنے کی کوشش کی۔ ایسی کہانیاں ادبی پرچوں میں شائع ہوئی ہیں جو عام قاری کی پہنچ سے دور ہیں۔

* *

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درداستاں سرگزشت

قسط: 210

سفیر اللہ صدیقی المعروف لہری بھی تقریباً 25 سال مختلف بیماریوں سے جنگ کرتے ہوئے 13 ستمبر 2012 کو زندگی کی بازی ہار گئے۔ انتقال سے پہلے ان کی حالت اتنی نازک ہوگئی تھی کہ انہیں مسلسل وینٹی لیٹرز پر رکھا جارہا تھا لیکن جب ڈاکٹروں نے ناامیدی ظاہر کردی تو مصنوعی طور پر زندہ رہنے کا یہ طریقہ ختم کردیا گیا اور لہری خاموشی سے اللہ کا نام لیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔

لہری نے ایک مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے پاکستان

کی فلمی صنعت میں ایک علیحدہ اور منفرد شناخت بنائی تھی۔ انہوں نے چہرے کو بگاڑ کر اور گرتے پڑتے ہنسانے کی بجائے مکالموں کی ادائیگی کا ایک انوکھا انداز اپنایا جو رفتہ رفتہ ان کی شناخت بن گیا۔ مکالمے ادا کرتے وقت وہ کبھی مسکراتے بھی نہ تھے۔ انتہائی سنجیدگی سے مکالمے ادا کرتے تھے لیکن سننے اور دیکھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ فلموں کے علاوہ حقیقی زندگی میں بھی ان کا یہی انداز تھا۔ وہ ہر ایک سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے لیکن بے تکلف دوستوں کی محفل میں ان کی فقرہ بازی زندگی کی لہر دوڑا دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بہ ذاتِ خود بہت سنجیدہ رہتے تھے۔ ان کے دوستوں نے انہیں ''پوکر فیس'' کا لقب دیا تھا۔ مطلب یہ کہ ایسا چہرہ جس پر تاثر کا کوئی شائبہ تک نظر نہ آئے۔ دیکھنے میں وہ بہت لیے دیے اور سنجیدہ نظر آتے تھے لیکن الفاظ کی پھلجھڑیاں چھوڑے بغیر نہیں رہتے تھے، لہری نے مکالمے بولنے کا یہ انداز کسی سے نہیں سیکھا تھا۔ یہ خود ان کی اپنی کلا تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی کئی مزاحیہ اداکاروں نے ان کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ دراصل لہری کی حسِ مزاح کے علاوہ انہیں یہ صلاحیت بھی حاصل تھی کہ وہ مکالموں کی روح کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فقرے میں کن الفاظ پر زور دینا ہے اور کس انداز میں ادا کرنا ہے۔ اس لیے وہ بہت ناپ تول کر مکالمے بولتے تھے۔ ان کا ہر مکالمہ ادائیگی اور الفاظ کے اعتبار سے نپا تلا ہوتا تھا اور ان کے منہ سے نکلتے ہی دل میں پیوست ہو جاتا تھا۔ یوں تو لہری نے ولن اور کیرکٹر ایکٹر کی حیثیت سے بھی مختلف کرداروں کے ساتھ انصاف کیا لیکن ان کا اصل میدان مزاح تھا جس میں ان جیسا دوسرا کوئی برصغیر میں بھی نظر نہیں آتا۔ برصغیر کی فلمی دنیا نے بہت اچھے اچھے اور صاحبِ طرز، مزاحیہ اداکار پیدا کیے ہیں لیکن ہر ایک کا انداز جداگانہ تھا۔ لہری ان سب سے یکسر مختلف تھے۔ ان کی وفات سے مزاحیہ اداکاری کا ایک منفرد عہد ختم ہو گیا ہے۔

38 سال تک فلم بینوں کو ہنسانے اور خوشیاں تقسیم کرنے والا یہ اداکار 25 سال تک مسلسل بسترِ علالت پر رہا۔ ان طویل اور تکلیف دہ بیماریوں کے زمانے میں لہری صاحب کا ایک اور جرات انگیز پہلو سامنے آیا۔ انہوں نے طویل بیماری کے یہ 25 سال نہایت صبر و شکر کے ساتھ گزارے۔ ان کی داڑھی اور سر کے بال سفید ہو گئے تھے مگر چہرے کی شگفتگی اور تازگی میں کوئی فرق دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ ان سے ملنے والوں نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے کو دیکھ کر اور باتوں کو سن کر یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس قدر اذیت میں مبتلا ہیں۔

اس بیماری کے دوران میں انہوں نے نہ کوئی شکوہ کیا نہ شکایت۔ وہ اپنی بیماریوں کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اگر کوئی یہ ذکر چھیڑ بھی دیتا تو وہ مختصر جواب دے کر اس بات کو باتوں باتوں میں رفع دفع کر دیتے تھے۔

لہری 1929 میں پیدا ہوئے تھے اور ستمبر 2012 میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ زندگی کا آخری ڈیڑھ ماہ انہوں نے بہت تکلیف میں گزار لیکن شکایت کا ایک لفظ بھی ان کے لب پر نہ آیا۔ ذرا تصور کیجیے کہ وہ کتنی شدید اور تکلیف دہ بیماریوں میں مبتلا تھے۔ وہ ذیابطیس (شوگر) کے علاوہ ہائی بلڈ پریشر اور سانس کے عارضے میں بھی مبتلا تھے، بنکاک میں ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور اس کے بعد بیماریوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا یہاں تک کہ شوگر بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی ایک ٹانگ بھی کاٹ دی گئی تھی۔ انہوں نے اڑتیس سال فلمی دنیا میں شہرت کماتے ہوئے گزار دیے اور زندگی کے آخری پچیس سال بسترِ علالت پر کاٹے۔ اللہ کی مرضی اور مصلحت کے آگے کون بول سکتا ہے لیکن ایک انسان ہونے کی حیثیت سے خیال آتا ہے کہ لہری جیسے بے ضرر، خوش اخلاق، خوش باش، خوش گفتار آدمی کا یہ انجام کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آخری دنوں میں ان کے پھیپھڑوں میں پانی بھرا ہو گیا تھا۔ وہ شخص جسے زندگی بھر ہم نے تو بخار اور نزلے میں بھی مبتلا نہ دیکھا اس نے اپنی تمام تکالیف اور بیماریاں زندگی کے آخری حصے کے لیے سنبھال کر رکھی تھیں۔ لہری صاحب واقعی عجب آدمی تھے۔ ایک قابلِ رشک زندگی کا یہ انجام؟ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین! ان کی یہ نیکی اور انسانی خدمت کیا کم ہے کہ وہ جب تک فلمی دنیا سے وابستہ رہے لاکھوں کروڑوں عوام میں خوشیاں، مسکراہٹیں بانٹتے رہے۔

لہری کی پہلی فلم ''انوکھی'' 21 جنوری 1956 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ ''دھنک'' ان کی آخری فلم تھی جو 1986 میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بعد فلمی صنعت خاص طور پر قومی زبان اردو کی فلموں کا جب زوال شروع ہوا اور تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور ذہین لوگوں کی جگہ بدمعاش

پہلوان اور قمار بازوں نے فلمی دنیا میں ڈیرا جمایا تو لہری کا بھی اس ماحول میں دم گھٹنے لگا اور انہوں نے آنے والے حالات کا اندازہ لگا لیا۔ لہٰذا وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اپنے مسکن یعنی واپس کراچی چلے گئے۔ فلمی دنیا اور اداکاری سے ان کا دل اچاٹ سا گیا تھا۔ اس کے بعد پردۂ سیمیں نے لہری کی جھلک تک نہیں دیکھی۔ بے کاری، زندگی کے بہترین سال ضائع ہو جانے کا صدمہ کیا کم تھا کہ وہ پے در پے مختلف بیماریوں کا شکار ہونے لگے۔ ستم پر ستم یہ کہ ایک سال قبل ان کی چھوٹی لاڈلی بیٹی کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ یہ غم بھی انہوں نے بڑے صبر اور سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کبھی کسی نے ان کی زبان سے ''آہ'' سنی اور نہ زمانے کی بے رخی کی شکایت۔ نہ حالات اور زمانے کا شکوہ، نہ فلمی دنیا کے لوگوں کی سرد مہری اور بے تعلقی۔ ان حالات میں بھی ملنے والوں سے بہت پُرسکون اور اطمینان بھرے لہجے میں بات کرتے تھے۔ سفید داڑھی اور برف کی طرح سفید بالوں نے ان کے چہرے کو ایسا پُرنور کر دیا تھا کہ اس سے پہلے وہ کبھی اتنے دلکش نظر نہیں آئے تھے۔ آخری دنوں میں ان کے ملنے والوں میں ان کے دوست، مداح، شاگرد اور پرستار معین اختر کی صاحب زادی اور مہدی حسن کے صاحب زادے کے علاوہ ان کے ملاقاتیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ معین اختر کی اچانک وفات کا صدمہ بہت گہرا تھا لیکن لہری اس کو بھی پامردی سے جھیل گئے۔ معین اختر جب تک زندہ رہے لہری کی خبر گیری کرتے رہے اور ہر طرح سے مالی مدد، اخلاقی امداد فراہم کرتے رہے۔ معین اختر خود اعتراف کرتے تھے کہ انہوں نے مکالموں کی ادائیگی لہری صاحب سے سیکھی تھی لیکن کچھ وقت کے بعد ہی یہ پتھر چوم کر چھوڑ دیا کیونکہ بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود وہ لہری صاحب کا انداز نہ اپنا سکے۔

لہری صاحب کی اکثر فلمیں کامیابی سے ہم کنار ہوئیں۔ اگر فلم کامیاب نہ بھی ہوتی تو بھی دیکھنے والے لہری صاحب کی تعریف کرتے ہوئے سینما گھروں سے باہر نکلتے تھے۔ لہری نے جس وقت فلمی دنیا میں مزاحیہ اداکاری کا آغاز کیا اس وقت پاکستانی فلمی صنعت میں ایک سے بڑھ کر ایک مزاحیہ اداکار موجود تھا، اندازہ لگائے۔ نذر، ظریف، منور ظریف، ننھا، آصف جاہ، نرالا اور رنگیلا جیسے مزاحیہ اداکار اپنی جگہ بنا چکے تھے جب لہری صاحب فلموں میں نمودار ہوئے۔ پاکستان کے مزاحیہ اداکاروں کی یہ خوبی قابلِ تعریف ہے کہ ہر ایک کا انداز مختلف اور مکالمے بولنے کا طریقہ منفرد تھا۔ اس لیے کوئی بھی نہ تو کسی سے حسد کرتا تھا اور نہ ہی اس کی صلاحیتوں سے انکار کرتا تھا۔

سفیر اللہ صدیقی المعروف لہری

38 سالہ فلمی سفر میں لہری نے لگ بھگ 225 فلموں میں اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سوائے ایک کے سب اردو فلمیں تھیں۔ ان کی صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1963 سے 1986 تک انہوں نے مسلسل بارہ نگار ایوارڈ حاصل کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ ان کی سوا دو سو کے قریب فلموں کی طویل فہرست ہے۔ چند فلموں کے نام پیش کیے جا رہے ہیں۔ ذرا یاد کیجیے۔ آپ نے بھی یہ فلمیں دیکھی ہوں گی۔

ان فلموں میں نوکر، بہاریں پھر بھی آئیں گی، تم ملے پیار ملا، چھوٹی بہن، افشاں، رم جھم، میں وہ نہیں، کنیز، دامن، آنچل، ننھا فرشتہ، تہذیب، دیور بھابی، داغ، دل لگی، ضمیر، آگ کا دریا، دلہن رانی، ہمراز، میرے ہم سفر، بالم، پھول میرے گلشن کا، نئی لیلیٰ نیا مجنوں، بندھن کے نام اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ ہماری فلم ''آبرو'' میں بھی انہوں نے ایک بھرپور مزاحیہ کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں وہ جس سے پیار کرتے ہیں اس کو حاصل کرنے کے لاکھ جتن کرتے

ہیں۔ ایک بار ان کی کمر میں چک آجاتی ہے اور وہ سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جھک کر چلتے ہیں۔ فلم میں ان کی اداکاری اس حصے میں بہت حقیقی اور مزاح سے بھرپور تھی۔ 1993 میں فلمی صنعت کی طرف سے 38 سالہ فنی خدمات سرانجام دینے پر انہیں خصوصی لائف ٹائم ایوارڈ دیا گیا تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ ان اعزازات اور تعریفوں سے ماوراء تھے۔

لہری کے مزاح کا راز ان کے مکالموں کی ادائیگی میں تھا۔ وہ خود بھی ادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور کئی فلموں کے مکالمے بھی انہوں نے خود لکھے تھے۔ لیکن یہ تصور درست نہیں ہے کہ اپنی تمام فلموں میں اپنے مکالمے وہ خود لکھتے تھے۔ ہم نے بھی لکھا تھا اور خود ان سے بھی کہا تھا کہ اچھے مکالموں کے بغیر ان کی اداکاری اتنی موثر نہیں ہو سکتی۔ ہماری فلموں میں اور ہماری لکھی ہوئی فلموں میں انہوں نے ہمیشہ ہمارے لکھے ہوئے مکالمے بولے اور کبھی ان میں تبدیلی کرانے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ تمام معروف ہدایت کاروں اور لکھنے والوں کی فلموں میں ان کا یہی طرز عمل تھا۔ البتہ وہ کسی منظر میں موقع محل کے لحاظ سے کسی برجستہ فقرے کا اضافہ کرکے اس منظر کو مزید دلکش اور بہتر بنا دیتے تھے۔ مثلاً ایک فلم میں جب لڑکی یہ کہہ کر رخصت ہوتی ہے کہ اب میں جاتی ہوں تو اس کے جاتے جاتے لہری نے فقرہ چست کیا تھا۔ ''اب آتی جاتی رہنا۔'' اس فقرے نے اس منظر کو جگمگا دیا تھا۔

ہماری فلموں میں ہر مزاحیہ اداکار کے ساتھ ہم پہلے ہی یہ شرط منوا لیتے تھے کہ انہیں اگر کسی منظر میں کسی مکالمے کا اضافہ کرنا ہے تو ریہرسل میں بول کر سنا دیں۔ اگر مکالمہ برجستہ ہوتا تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا لیکن اگر وہ برمحل نہ ہوتا تو ہم کہتے ''لہری بھائی، بات نہیں بنی۔''

وہ کہتے ''بن جائے گی، کبھی نہ کبھی تو بنے گی۔''

پاکستانی مزاحیہ اداکاروں میں سوائے چند کے، یہ خوبی تھی کہ وہ بہت ذہین اور حاضر جواب تھے۔ ایسے ایسے فقرے مکالموں میں جڑ دیتے تھے کہ منظر کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا۔ ظریف، منور ظریف، ننھا، رنگیلا، لہری میں یہ خوبی بہت زیادہ تھی۔ جن فلموں کے مصنف اچھا مزاح نہیں لکھتے تھے ان فلموں میں ان...... اداکاروں کو بہت موقع مل پاتا تھا۔ یہ ایسے ذہین اور حاضر دماغ اداکار تھے کہ پورے منظر میں بلا تکان مکالمے اور فقرے خود ہی بول کر منظر کو سجا دیتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ہدایت کار سلیمان کی ایک فلم کی شوٹنگ میں ننھا اور منور ظریف آمنے سامنے تھے۔ انہوں نے لکھے ہوئے مکالمے تو ایک طرف کر دیے اور خود ہی فی البدیہہ بے تکان مکالمے بولنے لگے۔ سین ختم ہو گیا۔ لیکن مکالمے اتنے دلچسپ تھے کہ ہدایت کار اور سیٹ پر موجود لوگوں کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ جب چند منٹ گزرنے کے بعد بھی مکالموں کی یہ فائرنگ ختم نہ ہوئی تو بالآخر ہدایت کار نے ہنستے ہنستے سین کٹ کرا دیا اور سارا سیٹ ہنسی اور قہقہوں سے گونج اٹھا۔

ہم نے اس طریقے کو کبھی پسند کیا اور نہ ہی اس کی اجازت دی۔ وجہ یہ ہے کہ اگر مکالمہ سین کی ضرورت کے مطابق ناپ تول کر لکھا جائے اور اس میں ترمیم و اضافہ کر دیا جائے تو سین کا اصل مقصد سے تعلق کم ہو جاتا ہے۔ لہری صاحب اور دوسرے مزاحیہ اداکار ان فلموں میں اپنے مکالمے بولتے تھے جن میں وہ مزاح کی کمی پاتے تھے۔ لیکن ہر سین اور ہر مکالمے کا ایک مقصد اور فلم کے مجموعی تاثر سے ایک تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس معاملے میں بہت حساس تھے۔ منور ظریف، ننھا اور لہری صاحب کے ساتھ ہم نے کام کیا لیکن کسی ایک سین میں برمحل مکالمہ ریہرسل میں بولنے کی اجازت تو ضرور دی لیکن کسی سیاق وسباق کے بغیر مکالموں کی گولہ باری کی کبھی اجازت نہیں دی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اداکاروں کو مکالموں میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ اسکرپٹ کے مطابق مکالمے بولنے کو ترجیح دیتے تھے۔

لہری صاحب نے اپنی زندگی میں بہت کم انٹرویو دیے۔ لیکن ستمبر 2008 میں انہوں نے عینی فہیم کو اپنی زندگی کا آخری انٹرویو دیا جو اپنی نوعیت، اہمیت اور معلومات کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شدید ترین بیماریوں میں مبتلا رہنے کے بعد زندگی اور فلم کے بارے میں لہری صاحب کا رویہ کیا تھا۔ یہ ایک یادگار انٹرویو ہے جو انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ عینی فہیم نے لکھا ہے کہ مجھے اردو فلموں کے بے تاج بادشاہ اور لیجنڈ سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا جس کا نام آج بھی کشش انگیز ہے اور جس سے مل کر ہماری فلمی صنعت کا شاندار ماضی یاد آ جاتا ہے۔

عینی کے الفاظ میں اس انٹرویو کو پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ ایک غیر فلمی شخصیت، فلم بین اور فلمی نقاد نے لکھا ہے۔

جس میں انہوں نے اپنے تاثرات اور جذبات کا موثر لفظوں میں اظہار کیا ہے۔ لکھتی ہیں۔

''دنیا میں آپ کو کبھی ایسی آنکھیں نظر نہیں آئیں گی۔ یہ وہ آنکھیں ہیں جنہوں نے دنیا کے نشیب و فراز، خوشیاں اور تلخیاں دیکھی ہیں۔ ان آنکھوں نے بہت سے اداکاروں کو فرش سے اٹھا کر عرش تک اور پھر گمنامی کی دھول میں گم ہوتے دیکھا ہے۔ یہ آنکھیں محض ایک نظر میں ایک ایسے شخص کی زندگی کے سفر کی داستان سنا دیتی ہیں جو کسی وقت شہرت کے آسمان پر ستارے کی طرح جگمگاتا تھا اور دنیا کو خود اس کی حماقتوں پر ہنسانے کی قدرت رکھتا تھا۔ ان آنکھوں کے مالک نے بہت سے غم زدہ دلوں کو خوشیوں سے مالا مال کر دیا۔ اور کئی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ کر مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہیں مشکلات سے مقابلہ کرنا سکھایا اور ان کی پریشانیوں کو ہنسی میں اڑا دیا۔

یہ صاف، شفاف آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں انسانی ہمدردی محبت اور ایسا گداز تھا جسے دیکھ کر مجھے ان لوگوں کی یاد تازہ ہو گئی جنہیں اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو ہنسنے اور مسکرانے کی صلاحیت بخشی ہے۔ وہ دوسروں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ انسان کتنی ہی مشکل اور غم میں مبتلا ہو ان کو خوش کرنے اور ان کا دل بہلانے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے لی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حاضر جوابی اور مزاح غالباً واحد ذریعہ ہیں جو زندگی کو قابل برداشت بناتے ہیں اور لہری صاحب میں یہ دونوں خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ ان کی برجستگی، حاضر دماغی اور ناقابل یقین حد تک شائستہ مزاح ان کی سب سے بڑی خوبی رہی ہے۔ جنہیں قدرت نے زندگی کے اذیت ترین لمحات میں بھی ہنسانے اور خوش کرنے کی قوت بخشی ہے۔

جب میں ان سے ملاقات کے لیے گئی تو میں نے انہیں سفید براق کرتہ پاجامہ زیب تن کیے بستر پر نیم دراز دیکھا۔ ان کی سفید داڑھی چمک رہی تھی۔ وہ باوقار اور مرعوب کر دینے والے انداز سے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ اس حالت میں بھی وہ ایک باوقار اور شائستہ انسان لگ رہے تھے جن کی مرعوب کن شخصیت سے متاثر نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ انہیں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص شدید جسمانی اذیت سے گزر رہا ہے اور پھر بھی تازہ دم لگتا ہے۔

لہری صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی جو کسی زمانے میں نوجوان لڑکیوں کے دلوں میں گدگدی پیدا کر دیتی تھی۔ ان کی دل آویز مسکراہٹ نے مجھے بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

ان کی دلکش اور مہربان شخصیت کو دیکھ کر میں وہ تمام سوالات بھول گئی جو میں ان سے کرنا چاہتی تھی۔ مگر کچھ تو کہنا تھا۔

میں نے ان سے کہا۔ ''سر، مجھے کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔''

انہوں نے مجھے کچھ دیر خاموشی سے دیکھا پھر ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی۔ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ ''شاید یہ تمہارا پہلا انٹرویو ہے۔''

میں اس سوال پر ہنس پڑی اور میں نے اقرار کیا کہ ان جیسی شخصیت کے ساتھ واقعی یہ پہلا انٹرویو ہے۔

وہ بولے ''اچھا، تو پھر تمہیں انٹرویو کرنے کے لیے سوالات پوچھنے میں مدد کرتا ہوں۔''

انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی اور کیریئر کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان کا اصلی نام سفیر اللہ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے تھے۔ کراچی میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ایک ٹائپسٹ کی ملازمت سے کیا۔ اس کے بعد میں نے سیلز مین کے طور پر بھی کچھ عرصے کام کیا۔ میری تنخواہ بہت کم تھی۔ جس

اداکار محمد علی اور اداکارہ شمیم آرا

کی وجہ سے میں فکر مند رہتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اللہ میری مدد کرے گا۔ شام کو میں تعلیم مکمل کرنے کے لیے اسلامیہ کالج جایا کرتا تھا۔

ایک دن میں کالج گیا تو معلوم ہوا کہ کالج میں ایک ڈراما ہونے والا ہے جس کے لیے ایک ایکٹر کی ضرورت ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں اداکاری کر سکوں گا یا نہیں مگر مجھے اس کردار کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ اسٹیج پر جب میں نے مکالمے بولنے شروع کیے تو حاضرین نے ہوٹنگ شروع کردی لیکن میں بولتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ یہ وہ وقت تھا جب میں نے اپنی صلاحیتوں کو دریافت کیا اور فیصلہ کرلیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک موقع دیا ہے کہ میں ایکٹنگ کے شعبے سے منسلک ہوجاؤں۔ اسی زمانے میں میں نے ''مریض عشق'' کے نام سے ایک ڈراما بھی لکھا۔

انٹرویو کے دوران میں مجھے احساس ہوا کہ یہ ایک ایسا انٹرویو تھا جس میں انٹرویو دینے والا خود مجھے سوالات بتا رہا تھا۔

انہوں نے کہا۔ ''تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے داڑھی کیوں رکھی ہے؟''

اب میرے اندر کچھ اعتماد پیدا ہوچکا تھا۔ میں نے پوچھا؟ ''تو بتایئے کہ آپ نے داڑھی کیوں رکھی ہے؟''

وہ بولے ''جب میں جوان تھا تو مجھے فخر تھا کہ میں اٹلی اور انگلینڈ کے بنے ہوئے جوتے پہنتا ہوں۔ میں میچنگ ٹائی کے ساتھ خوبصورت سوٹ پہنا کرتا تھا، مجھے اپنی خوش لباسی پر فخر کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن اب میں جوتے نہیں پہن سکتا اس لیے میچنگ ٹائی اور خوبصورت سوٹ کا زمانہ بھی نہ رہا۔''

یہ بات وہ شخص کہہ رہا تھا جو کچھ عرصہ قبل اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہوگیا تھا، یہ سوچ کر میں لرز گئی لیکن ان کے چہرے پر بالکل نارمل تاثرات تھے جیسے وہ کسی اور کے بارے میں بتا رہے ہوں، کسی غم یا تکلیف کے آثار ان کے چہرے پر نہیں تھے۔

پھر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں انہوں نے کہا ''اب اگر میں سوٹ نہیں پہنتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے لباس کے بارے میں بے پروا ہوگیا ہوں۔ اب میں کرتہ پاجامہ پہنتا ہوں۔ سفید لباس کے ساتھ میری سفید داڑھی میچ کرتی ہے۔ میری اب بھی یہ خواہش ہے کہ کوئی مجھے دیکھے۔''

میں نے ان سے ان کی صحت کے بارے میں مزید پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میرا ایک بائی پاس ہوچکا ہے۔ فالج بھی ہوگیا ہے اور شوگر کی وجہ سے میں اپنی ایک ٹانگ سے بھی محروم ہوچکا ہوں۔ یہ داستان سن کر میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''ہر فیصلہ اللہ کرتا ہے اور وہ ہمیں ہر دکھ اور تکلیف برداشت کرنے کی ہمت بھی دیتا ہے۔ اس طرح دراصل وہ ہمارا امتحان لیتا ہے کہ جن سے وہ محبت کرتا ہے۔''

میں نے جذبات پر قابو پاکر دریافت کیا کہ حکومت نے ان کی کیا مدد کی ہے کیونکہ ایک اداکار کی زندگی دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ انہیں پنشن وغیرہ ملتی ہے جس سے وہ اپنا علاج کراسکتے ہیں۔

وہ بولے ''نہیں، حکومت نے میری زیادہ مدد نہیں کی لیکن معین اختر جیسے دوست میری مدد کرتے رہتے ہیں۔ معین اختر میرا بہت پیارا دوست ہے۔ (یہ انٹرویو ستمبر 2008 میں لیا گیا تھا جب معین اختر بقید حیات تھے) وہ مجھے اپنے ساتھ تقریبات اور پروگراموں میں لے جاتے ہیں۔ میں بہترا کہتا ہوں کہ میں اب کام نہیں کرسکتا مگر وہ زبردستی گھسیٹ کر مجھے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے دوستوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اللہ کسی نہ کسی کے ذریعے امداد پہنچا دیتا ہے، معین اختر کے ذریعے مجھے کام ملتا رہتا ہے۔

میں نے ان سے ان کی فیملی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا ماشاءاللہ، اللہ نے انہیں بہت ہمدرد فیملی عطا کی ہے۔ خصوصاً میری بیوی نے ہر حال میں میرا ساتھ دیا۔ غربت کے زمانے میں بھی وہ میری مددگار تھیں۔ انہوں نے ایک مشکلات سے بھری ہوئی زندگی گزاری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ سے بدرجہا بہتر ہیں۔''

''اچھا یہ بتایئے، زندگی کے بارے میں آپ کا کیا فلسفہ ہے؟''

وہ سنجیدگی سے بولے۔ ''ہم اس دنیا کے لیے نہیں بنے۔ ہم اس دنیا میں ہاہا کرنے نہیں آئے۔ اللہ نے ہمیں ایک مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہمیں ایک دن لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔''

''آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ خوشی کا لمحہ کیا تھا؟''

''وہ جب تبلیغ اسلام کرنے والے لوگ میرے گھر

سدھیر، نذر، آشا پوسلے، الیاس کشمیری فلم ''حاتم طائی'' میں

آ کر مجھ سے ملے کیونکہ میں تو ان کے پاس چل کر نہیں جا سکتا تھا۔ اللہ نے گھر بیٹھے انہیں میرے پاس بھیج دیا۔ اس وقت مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور مجھے احساس ہوا کہ اللہ نے مجھے کتنا نوازا ہے۔''

میں نے دیکھا کہ لہری صاحب بہت منکسر المزاج انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی کامیابیوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ 1955 میں شیخ لطیف عرف چھوسیٹھ نے فلم ''انوکھی'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم میں سفیر اللہ کو ایک مزاحیہ کردار سونپا گیا۔ ''انوکھی'' 21 جنوری 1956 کو نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس فلم کے بعد سفیر اللہ ''لہری'' بن گئے۔ اس کے بعد ہی ان کی کامیابیوں کا سفر شروع ہوا جو 38 سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں انہوں نے 225 فلموں میں کام کیا اور بہت نام پایا، ان کا فلمی سفر کامرانیوں کی ایک طویل داستان ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عظیم ترین مزاحیہ اداکاروں میں شامل ہیں۔ پاکستانی فلموں کو ایسے کامیڈین بہت کم نصیب ہوئے ہیں۔ وہ طنزیہ اور مزاحیہ مکالموں کو اپنے مخصوص انداز میں ادا کرکے روزمرہ کی گفتگو میں ڈھالنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں، اس کو فلمی دنیا میں لہری اسٹائل کہا جاتا تھا۔ ان کی ہر فلم میں ان کے پرستار انہیں پسند کرتے تھے۔ وہ فلم بینوں کو ہنسانے کے ماہر تھے، ایک زمانے میں وہ فلم سازوں کی ضرورت بن گئے تھے۔

فلم بین اور فلمی صنعت کے لوگوں نے ان کے شائستہ مزاح کو ہمیشہ سراہا۔ انہوں نے بھی اپنے پیشے کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا اور اپنے مداحوں کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ ان کی اداکاری کی ایک خوبی یہ تھی کہ انہوں نے کبھی ''اوورایکٹنگ'' نہیں کی۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر مکالمہ ہیرے کی طرح چمکتا تھا۔ ایک دنیا ان کے مکالموں کی ادائیگی سے متاثر تھی۔ ایثار، آنچل، دامن، پیغام، کنیز، دوبہنیں اس کی مثالیں ہیں۔ ہر فلم کے ساتھ ان کی مقبولیت اور مانگ میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ وہ عوام کو سنیما گھروں میں کھینچ لانے کی کشش کے مالک تھے۔ انہوں نے بارہ مرتبہ نگار ایوارڈ حاصل کیا جو اس زمانے میں بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ کوئی دوسرا پاکستانی مزاحیہ اداکار ان کا یہ ریکارڈ نہ توڑ سکا۔ 1993 میں فلمی صنعت کی طرف سے ان کے 38 سال کے کارناموں پر خصوصی ایوارڈ دیا گیا۔ لہری صاحب کی فلموں کے مکالمے سننے کے لیے فلم بین ترستے رہتے تھے۔ وہ کئی بار موقع محل کے لحاظ سے مکالموں میں تبدیلی یا اضافہ بھی کردیتے تھے۔

لہری صاحب ہمارے ملک کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ وہ ایک نامور اور بہت بڑی شخصیت ہیں۔ ان دنوں وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے ہمیں 38 سال تک ہنسایا ہے اب ہمارا فرض ہے کہ ان کی صحت اور خوشیوں،

کے لیے دعا کر کے یہ قرض اتاریں۔

انٹرویو کے بعد جب میں ان کے کمرے سے باہر نکلی تو میری آنکھیں نم تھیں لیکن میرا دل خوشیوں سے بھرپور تھا۔ میں ہمیشہ اپنی اس دوست کی شکرگزار رہوں گی جس نے مجھے لہری صاحب سے ملنے کا اہتمام کیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں لافانی شخصیت سے ملی ہوں جو فلموں کا بادشاہ ہی نہیں تھا وہ دلوں پر راج کرنے والا بادشاہ بھی ہے۔

(نوٹ: یہ انٹرویو 14 ستمبر 2008 کے انگریزی اخبار ''دی نیشن'' میں شائع ہوا تھا جسے انٹرویو کی دلچسپی اور انفرادیت کے پیشِ نظر پیش کیا گیا ہے)

جب کوئی عزیز دوست یا رشتہ دار ساتھ چھوڑ جاتا ہے وہ اپنے پیچھے اپنی تصویروں کا ایک البم چھوڑ جاتا ہے۔ لہری صاحب بھی اپنی تصویروں کا ایک البم چھوڑ گئے ہیں بلکہ ایک ویڈیو چھوڑ گئے ہیں جس میں وہ چلتے پھرتے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آیئے آپ بھی یہ چلتی پھرتی باتیں کرتی ہوئی تصویریں دیکھیے۔

فلم ''انوکھی'' کی نمائش ہوئی تو لہری صاحب کی پہلی تصویر نظر آئی۔ اس فلم میں ان کا ایک مختصر کردار تھا لیکن جب فلم دیکھ کر سینما گھر سے باہر نکلے تو صرف ایک چھریرے بدن اور چمکتی ہوئی شریر آنکھوں والا اداکار یاد رہ گیا۔ لہری صاحب نے مکالموں کا وہی انداز اپنایا تھا جو بعد میں ان کا ٹریڈ مارک بن گیا۔ فلم دیکھنے والوں کو مکالموں کی ادائیگی کا یہ انداز کچھ عجیب سا لگا۔ وہ الفاظ کو توڑتے نہیں تھے لیکن ان میں وقفہ ڈال کر انہوں نے مکالموں کو ایک نیا رنگ اور نیا انداز دے دیا تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس فلم نے ایک منفرد مزاحیہ اداکار کو جنم دیا تھا جو 38 سال تک پاکستانی فلمی صنعت میں ایک انوکھے اداکار اور شائستہ انسان کی حیثیت سے بہت مقبول رہا۔ ''انوکھی'' وہ فلم تھی جس نے ایک انوکھے مزاحیہ اداکار کو جنم دیا تھا۔

لہری صاحب کو لاہور کے ایورنیو اسٹوڈیو میں بنفسِ نفیس، جیتے جاگتے باتیں کرتے ہوئے انسان کی حیثیت سے دیکھا، جب وہ کراچی سے لاہور منتقل ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ایورنیو کے خوبصورت لان میں چھوٹے چھوٹے فوارے چل رہے تھے، فضا میں ایک خوشگوار تازگی سی محسوس ہوتی تھی۔

درمیان میں بڑے فوارے کے اردگرد کچھ لڑکوں کا ایک جمگھٹا دیکھ کر ہم نے بھی اسی طرف کا رخ کیا۔ اس وقت تک ہم صحافی تھے۔ آفاق کا فلمی صفحہ مرتب کیا کرتے تھے اور ''نگار'' ویکلی میں علی بابا کے نام سے لاہور کی فلمی شخصیات اور سرگرمیوں کے بارے میں کالم لکھتے تھے۔ یہ کالم فلم والے بہت ذوق اور اشتیاق سے پڑھا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسٹوڈیوز کے دلچسپ واقعات کے علاوہ اس میں ہلکی پھلکی پھلجھڑیاں بھی ہوتی تھیں۔ کچھ فن کاروں پر فقرے بازی ہوتی تھی، کچھ پر تنقید۔ فلم والے اپنے حریفوں کے بارے میں لطیفے اور طنزیہ فقرے پڑھ کر خوش ہوتے تھے۔ جن پر فقرے کسے جاتے تھے وہ ناراض بھی ہوتے تھے مگر ہمارے سامنے کبھی کسی نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ ایک بار اداکار حبیب نے ہمارے اور ایڈیٹر ''نگار'' کے خلاف ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہم نے ان کے بارے میں کچھ سچی باتیں لطیفوں کے انداز میں لکھ دی تھیں۔ پاکستان میں ہتکِ عزت کا دعویٰ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آ بیل، مجھے مار۔ اس مقدمے کی سماعت کے دوران میں مقدمہ دائر کرنے والے کی عزت مزید خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس کے حق میں ایسے گواہ، گواہی دینے کے لیے آتے ہیں کہ مدعا علیہ اس شخص کی بہت عزت کیا کرتا ہو مگر پیش ہوتے ہی مدعا علیہ کی نظروں میں اس کی عزت نہیں رہتی۔ مقدمے میں سب سے پہلے یہ گواہ ہی پیش کیے جاتے تھے تاکہ مقدمہ دائر کرنے والے کے معزز ہونے کا ثبوت فراہم ہو سکے۔ لیکن سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شامت ان گواہوں کی آتی تھی اور دوسرے کی عزت بچاتے بچاتے خود ان کی عزت خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ انہی واقعات کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ مختصر یہ کہ پہلے گواہ کے ساتھ ہمارے وکیل نے جو جرح کی تھی اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

اس گواہ کا یہ حشر دیکھ کر دوسرے گواہ جو کہ فلم ساز ثقلین رضوی تھے باغی ہو گئے اور انہوں حبیب سے کہا کہ بھائی، آپ برا مانیں یا بھلا، میں تو اپنی پگڑی اچھلوانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ہتکِ عزت کا دعویٰ آپ واپس لے لیں ورنہ رہی سہی عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ حبیب کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور انہوں نے صلح کی گفتگو شروع کر دی جس کے بعد ہمیں اور مدیرِ ''نگار'' کو حبیب نے دعوت کھلائی اور صلح صفائی ہو گئی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اس کالم کی مقبولیت اور فلمی حلقوں میں اس کی پذیرائی کا اندازہ ہو سکے۔ فلم سے وابستہ قریب قریب بھی لوگ اس کالم کو پڑھتے تھے، کبھی خوش ہوتے تھے اور کبھی ناخوش۔ قارئین بہت مزہ لیتے تھے کیونکہ انہیں فن کاروں کی اندرخانہ کہانیاں، دلچسپ واقعات پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ دیکھیے، ایورنیو اسٹوڈیو کے فوارے سے شروع ہو کر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

ہم جب چند سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو کئی لوگوں نے ہمیں مطلع کیا کہ کراچی سے ''انوکھی'' والے لہری آئے ہیں اور ہمیں ان سے ملانے کے لیے ساتھ ہو لیے۔

اس مجمع میں ہم نے لہری صاحب کو بلکہ جیتے جاگتے لہری صاحب کو پہلی بار دیکھا۔ ایک نئے ماحول اور نئے لوگوں کے نرغے میں بھی وہ مطمئن نظر آ رہے تھے۔ جب ہمارا ان سے تعارف کرایا گیا تو وہ بولے ''اچھا، علی بابا والے آفاقی صاحب۔''

ہم نے کہا۔ ''یہ آپ کو کس نے بتایا؟''

بولے ''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے
باغ تو سارا جانے ہے

ہم نے بھی کہیں سے پتا کر لیا۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

ہم نے کہا ''اور ہمیں بھی۔''

ہم نے سر سے پیر تک ان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بہت نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سفید قمیض پر ایک خوبصورت ٹائی جگمگا رہی تھی جس پر وہ کئی بار ہاتھ پھیر چکے تھے۔ جوتے، موزے، سوٹ، ٹائی سب میچ کر رہے تھے۔ یوں لگا جیسے کوئی ماڈل لباس کی نمائش کر رہا ہے۔

ہم نے پوچھا۔ ''آپ لاہور کب آئے؟''

''کل ہی حاضر ہوا ہوں لیکن لاہور کے فلم اسٹوڈیو میں داخلے کا یہ پہلا دن ہے۔''

ان کا لب و لہجہ بالکل وہی تھا جیسا کہ فلم میں سنا تھا اور آئندہ 38 سالوں تک سنتے رہے۔ یہ آواز اور لہجہ ہمیں ہی نہیں تمام فلم بینوں کو یاد رہا اور آج تک یاد ہے۔ جب بھی لہری صاحب کا ذکر آئے گا کانوں میں ان کی آواز اور لوچ دار طرزِ گفتگو گونجتا رہے گا۔

ان کا رنگ سانولا تھا۔ ناک نقشہ مناسب، چوڑی پیشانی، سر پر گھنے سیاہ بال، داڑھی مونچھیں صفاچٹ، انہوں نے کوئی ہلکی سی خوشبو لگا رکھی تھی۔

اداکار حبیب اور اداکارہ شمیم آرا

ایسا لگا جیسے یہ خوشبو بھی ان کے لباس سے میچ کر رہی ہے۔

انہیں دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ خوش لباس اور ہنس مکھ لوگوں کو دیکھ کر ہمیں ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔

اچانک ان کی آواز سنائی دی ''آپ تو یوں دیکھ رہے ہیں جیسے فلم ساز اداکاری کے امیدوار کو اور قسائی بکرے کو دیکھتا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''فلمی دنیا میں ایک اور خوش لباس اداکار کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔''

بولے۔ ''دوسرا خوش نصیب کون ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''اسلم پرویز۔''

''جی ہاں، میں نے بھی ان کی خوش لباسی اور خوش مزاجی کی بہت تعریف سنی ہے۔''

پھر انہوں نے سر سے پیر تک ہمیں دیکھا اور ستائشی انداز میں بولے۔ ''آپ بھی اس کلب کے ممبر نظر آتے ہیں؟''

''کون سا کلب؟''

''اچھا لباس پہننے والوں کا کلب۔''

ہم نے کہا۔ ''ابھی تک تو کسی کو یہ کلب بنانے کا خیال نہیں آیا۔ اب آپ آ گئے ہیں شاید کلب بھی بن جائے گا۔''

اور یہ صحیح بھی تھا۔ اسلم پرویز تو پہلے ہی موجود تھے۔ فلم ساز اور ساؤنڈ ریکارڈر افضل حسین بھی خوش لباس، رضا میر صاحب بھی لباس کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ اقبال یوسف خود تو بہت زیادہ اہتمام سے لباس نہیں پہنتے تھے مگر وہ ہر ایک کا لباس چیک کر کے ریمارکس اور مارکس دیا کرتے تھے۔ مثلاً ہم کوئی سوٹ یا کمبی نیشن پہن کر اسٹوڈیو گئے ہیں۔ جوتے اور ٹائی کو بھی میچ کیا ہے۔ اقبال یوسف آ کر

جائزہ لیتے اور کہتے۔ ''کمال ہے ۔ آج تو بہت زور لگایا ہے اپنے کپڑوں پر۔''

ہم خاموش رہتے۔

''اچھا، ذرا موزے دکھائیں۔''

ہم پتلون کے پائنچے چڑھا کر موزے دکھاتے تو وہ منہ بنا کر کہتے۔ ''بس کام خراب کردیا، موزے میچ نہیں کرتے، نہ ٹائی سے نہ رومال سے۔''

''تو پھر کیا ہم فیل ہوگئے؟''

''نہیں، پاس مارکس تو آہی جائیں گے مگر کافی نمبر کٹ جائیں گے۔''

اسلم پرویز تو لباس کے مقابلے میں ذرا سی بھی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک بار ہم ان کی کوٹھی پر گئے اور ان کے ملبوسات کی الماریاں دیکھیں تو حیران رہ گئے۔ سیکڑوں سوٹ اور دوسرے ملبوسات بڑے سلیقے سے سجا کر الماریوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ ہر سوٹ کے نیچے پالش کیا ہوا جوتا اور موزے اور سوٹ کے ساتھ میچنگ ٹائیاں لٹکی ہوئی تھیں، کوٹ میں ہم رنگ رومال، انہوں نے لباس کو ایک آرٹ بنادیا تھا۔ گرمی کا موسم ہو یا سردی کا۔ ان کا لباس ہمیشہ بے عیب ہوا کرتا تھا۔ گرمیوں میں کرتہ پاجامہ اور ـــ یا ملکیشن جوتا۔ کبھی سینڈل اور چپل بھی پہن لیتے تھے۔ اس معاملے میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ ہم تو جلدی جلدی تیار ہوتے، ملازم پہلے ہی لباس نکال کر اور استری کر کے لٹکا دیتا تھا۔ موزے ہم خود پسند کرتے تھے مگر جلدی میں رنگ کی پہچان نہیں ہوتی تھی۔ ٹائی کے بارے میں بھی کافی دیر تک انتخاب کرتے تھے۔ غرضیکہ لہری بھائی کی آمد نے فلم والوں کو خوش لباسی اختیار کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کا لباس ٹائی اور رومال سے لے کر موزے اور جوتا تک بے عیب ہوتا تھا، یوں سمجھیے کہ ان کے لاہور آتے ہی لباس کے معاملے میں ایک مقابلے کی فضا پیدا ہوگئی تھی حالانکہ لہری بھائی کی خوش لباسی دیکھنے والوں کو متوجہ یا مرعوب کرنے کے لیے نہیں تھی۔ وہ اپنی خوشی کے لیے اچھا لباس پہنتے تھے۔ دوسروں کی خوش لباسی کی تعریف میں وہ ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

''واہ آفاقی بھائی، یہ ٹائی تو آپ نے خوب نکالی ہے، باہر کی معلوم ہوتی ہے۔''

ہم کہتے۔ ''ہاں، یہ لندن سے ہمارے ماموں نے بھیجی ہے۔''

وہ ہنس پڑتے۔ دراصل اس زمانے میں درآمدی اشیا پاکستان میں بہت کم آیا کرتی تھیں۔ لباس کے دلدادہ لوگ چھپ چھپا کر لنڈے بازار کا رخ کرتے تھے اور اپنی پسند کے سوٹ، ٹائی وغیرہ لا کر ڈرائی کلین کرا لیتے تھے۔ جب کوئی تعریف کرتا تو جواب ملتا۔ ''یہ میرے ماموں نے لندن سے بھیجی ہے۔''

اس طرح یہ ایک معنی خیز فقرہ بن گیا تھا۔ اس زمانے میں شوقین لوگ ایک ٹائی کی تلاش میں سارا دن گزار دیا کرتے تھے، اس کے بعد جب فلم کی شوٹنگ کے لیے یورپ امریکا، کینیڈا جانے کا رواج ہوا تو جی بھر کر خریداری کرتے تھے اور بڑی خوبصورت اور نادر چیزیں انتخاب کر کے لاتے تھے۔

بات سے بات نکل آتی ہے۔ دراصل ذکر لہری صاحب کے بولتے البم کا ہو رہا تھا۔

ایک تصویر دیکھ کر ہمیں پیرس میں فلم کی شوٹنگ کا زمانہ یاد آگیا۔

ہم لوگ فلم ساز راشد مختار اور ہدایت کار پرویز ملک کی فلم ''میرے ہم سفر'' کی شوٹنگ کے لیے یورپ گئے تھے۔ وہاں ہم پر جو بیتی وہ پہلے بیان کرچکے ہیں۔ ہالینڈ میں شوٹنگ کرنے کے بعد فلم کا یونٹ پیرس گیا۔ یہاں مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ اس دوران میں ہم لوگ لوکیشنز دیکھتے رہے اور گھومتے پھرتے رہے۔

ہمیں روبن گھوش نے یہ بتایا تھا کہ آفاقی صاحب آپ اگر یہاں وائین پئیں گے تو صحت بہت اچھی ہوجائے گی۔''

''مگر وہ تو شراب ہوتی ہے۔''

''ارے نہیں، وہ شراب نہیں ہوتی۔ ٹانک ہوتا ہے۔ اگر ایک گلاس بھی کھانے سے پہلے پی لیں تو بہت توانائی آجاتی ہے۔''

ہم نے سوچا اگر یہ بات ہے تو کیوں نہ جان بنائیں، محمد علی نے اس روز ایک ہندوستانی ریستوران انا پورنا میں ڈنر پر سب کو مدعو کیا تھا۔ ایسی حرکتیں وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ کھانے سے پہلے ویٹر نے سب سے نوشی کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے ریڈ وائین کی فرمائش کی۔ سب نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ زیبا بولیں ''آفاقی پیرس آکر اب تم شرابی بھی ہوگئے ہو۔''

محمد علی صاحب نے کہا ''ارے وہ شراب کہاں ہوتی

ہے۔ وائین ہوتی ہے۔ آفاقی تمہارے لیے یہ بہت مفید ثابت ہوگی۔''

گنتی کے لوگ شراب سے شوق فرمانے والے تھے، باقی نے دودھ اور جوس طلب کیا۔ ہمارے لیے ایک وائین کا گلاس آگیا۔ ویٹر چھوٹی سی بالٹی میں برف کے ٹکڑے لایا تھا اور ہر ایک کے گلاس میں ڈالتا جا رہا تھا۔ لہری بھائی نے بڑی سنجیدگی سے سرگوشی کی۔ ''آفاقی بھائی، آپ بھی اپنے گلاس میں برف ڈلوا لیجیے گا ورنہ گرم وائین ناگوار گزرے گی۔''

جب ویٹر ہمارے پاس آیا تو ہم نے اشارے سے کہا کہ ہمارے گلاس میں بھی برف ڈال دو۔ وائین میں برف ڈالنا سخت بدتہذیبی کہی جاتی ہے۔ ویٹر نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا اور پوچھا۔ ''ڈال دوں؟ سر یہ وائین ہے۔''

''ڈونٹ مائنڈ'' ہم نے کہا۔ ''ہمیں ٹھنڈی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔''

ویٹر فرانس کا تھا۔ اس بدذوقی پر حیران ہوا مگر ہمارے کہنے کے مطابق اس نے برف کی ڈلی نکالی اور ڈالنے سے پہلے ایک بار پھر پوچھا۔

''آر یو شیور سر!''

ہم نے کہا ''بالکل۔''

اس نے برف تو ڈال دی مگر جاتے وقت پلٹ پلٹ کر ہمیں دیکھتا رہا۔

اس کے جاتے ہی سب ہنسنے لگے۔ محمد علی نے کہا۔ ''آفاقی، وائین میں تم نے برف ڈلوالی؟ اگر ویٹر کا بس چلتا تو تمہیں گولی ماردیتا۔''

ہم نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا۔ اس سے پہلے دل ہی دل میں اللہ سے کہا ''اللہ میاں یہ شراب نہیں ہوتی۔ پھر بھی معاف کردیجیے گا۔''

وائین سخت بدمزہ تھی۔ ہم رک گئے۔ سب لوگ ہمیں دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ زیبا نے کہا ''تم نے تو ہمیں شرمندہ کردیا۔ اب یہ ویٹر سارے شہر کو بتادے گا کہ پاکستان سے ایک عجیب مخلوق آئی ہے جو وائین میں برف ڈال کر پیتی ہے، روبن گھوش نے ہمیں آنکھ سے اشارہ کیا کہ پروا نہ کرو۔ پی جاؤ۔''

ہم نے دوا سمجھ کر بڑی مشکل سے وہ گلاس خالی کیا اور پھر محسوس کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے اندر کچھ طاقت آتی ہے یا نہیں مگر کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

سکندر صنم جنہوں نے مذاح کی نئی دنیا تخلیق کی تھی۔ کامیاب فلموں کی کامیڈی بنانے کی طرح ڈالی تھی۔ 6 نومبر 2012ء کو طویل علالت کے بعد کامیڈی کنگ کا خطاب جیتنے والے سکندر صنم ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔

لہری صاحب نے کہا ''آفاقی بھائی۔ یہ آب حیات نہیں ہے کہ ایک گلاس پیتے ہی آپ گاما پہلوان بن جائیں۔ دیر آید درست آید۔''

دو تین بار پینے کے بعد ہم نے اس گناہ بے لذت سے توبہ کرلی۔

پیرس میں ''پیگال'' کا علاقہ سیاحوں کا مرکز ہے۔ دنیا بھر کے سیاح عورت مرد، بوڑھے جوان سب یہاں ضرور آتے ہیں۔ اس علاقے میں تھیٹر، سینما گھر، ریستوران اور شراب خانے بھی ہیں۔ بہت پُررونق جگہ ہے۔ نائٹ کلبوں کے سامنے باوردی چوکیدار کھڑے ہوتے ہیں جن کا لباس شاہانہ ہوتا ہے۔ وہ فٹ پاتھ پر چلنے والوں کو بڑے اصرار سے اندر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

ڈورمین فرفر فرانسیسی بول رہا تھا جو ہم میں سے کسی کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔

لہری صاحب اس کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ''بھائی میاں، آپ کیا کہہ رہے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اردو یا پنجابی میں بات کرو۔''

اس نے پھر فرنچ میں کچھ کہا۔ لہری صاحب بڑے اطمینان سے بولے ''ارے بھئی ہم تمہاری زبان نہیں جانتے۔ تم اپنی زبان بولو۔ ہم تو اپنی زبان ہی میں بات

کریں گے۔"

کافی دیر تک یہ مکالمے ہوتے رہے۔ ہم سب کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ کچھ دیر بعد اتنا سمجھ میں آیا کہ داخلے کی فیس صرف دو پونڈ ہے۔ ہم سب نے سوچا کہ چلو، دو پونڈ میں پیرس کا نائٹ کلب دیکھ لیتے ہیں۔ لہری صاحب نے دو پونڈ نکال کر اس کے حوالے کیے "لو بادشاہو عیش کرو۔"

ہم سب نے اپنے اپنے پیسے ادا کیے اور اندر داخل ہوئے۔ پورا ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نیم عریاں لباس پہنے کچھ لڑکیاں ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"ارے بھئی، یہ کیا مصیبت ہے؟"

لہری صاحب بولے "یہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہیں۔"

لڑکیوں کا اصرار تھا کہ شراب منگائی جائے۔ دراصل دو پونڈ کا لالچ دے کر لوگوں کو اندر بلایا جاتا ہے اور یہ لڑکیاں کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ جاتی ہیں اور قیمتی شراب منگانے کی فرمائش کرتی ہیں۔

ہم لوگوں نے انکار کر دیا تو انہوں نے شاہی لباس میں ملبوس ایک چوبدار کو بلا کر کچھ کہا۔ اس نے ہم سے فرانسیسی زبان میں کچھ کہا۔

لہری صاحب بولے "نہیں پیتے۔ بس ہماری مرضی۔"

اس نے بڑے ادب سے ہم سب کو کہا کہ اس طرف تشریف لائیے۔ ہم سمجھے شاید کوئی نیا تماشا دکھائیں گے اور اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے ایک رنگین روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جب ہم باہر نکلے تو سامنے ایک گلی تھی۔ اس نے ہمیں چکما دیا تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

لہری صاحب بولے "غالب نے ایسے ہی موقعے کے لیے کہا ہے کہ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔"

لہری صاحب کے مکالموں کی منفرد خصوصیت کا راز یہ تھا کہ ادب اور شاعری کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ وہ مکالمے کو اس کے معنی و مطلب کے حساب سے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بولتے تھے۔

یہ واقعہ ہم اپنے سفرنامے میں بھی بیان کر چکے ہیں۔

اٹلی اور فرانس کے لوگوں خصوصاً ٹیکسی ڈرائیوروں کی ایک خوبی یہ ہے کہ مسلسل بولتے رہتے ہیں۔ چاہے آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ لہری بھائی نے اس کا بہت دلچسپ علاج دریافت کیا تھا۔ وہ بولتے رہتے اور پھر ہم لوگوں کی طرف دیکھتے۔ لہری صاحب سے کہتے "اچھے جا رہے ہو، بولتے رہو۔"

وہ پھر ایک طویل تقریر کر دیتا تھا اور لہری صاحب اردو اور پنجابی میں جواب دیتے رہتے تھے۔ سننے والوں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو جاتا تھا۔ آئیے ایک اور تصویر دیکھیے۔ پیرس کی مشہور شاہراہ شانزے لیزے پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ لوگ دور کھڑے ہو کر خاموشی سے شوٹنگ دیکھتے رہتے تھے۔ ایک منظر میں لہری صاحب نے میز پر رکھی ہوئی لمبی سی فرنچ بریڈ اٹھائی اور اسے تلوار کی طرح لہرانے لگے۔ فرنچ بریڈ کا یہ استعمال کبھی فرانس کے لوگوں نے بھی نہ سوچا ہوگا۔ دور کھڑے لوگ بے اختیار مسکراتے رہے۔

اس فلم میں ایک مکالمہ تھا جس میں شبنم کہتی ہیں کہ انکل میں اپنے کھوئے ہوئے ابو کو دنیا کے کونے کونے میں تلاش کروں گی۔

جواب میں لہری صاحب نے بڑے رسان سے کہا۔ "دنیا کے کونے نہیں ہوتے۔ تمہیں کسی نے اب تک نہیں بتایا کہ دنیا گول ہے۔ گیند کی طرح۔"

مکالمہ اسکرپٹ کے مطابق تھا مگر لہری صاحب کی ادائیگی نے اس میں چار چاند لگا دیے۔

ہالینڈ کے شہر ڈین ہاگ میں ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کبھی سڑک پر کوئی بچہ نظر نہیں آیا۔

پرویز صاحب نے کہا "کیا اس شہر میں بچے نہیں ہوتے؟"

لہری صاحب بول پڑے "شاید یہاں کا محکمۂ بہبود آبادی بہت زبردست ہے۔ بچے پیدا ہوں گے تو سڑکوں پر نظر آئیں گے نا؟"

دراصل دن میں کام کاج کے سلسلے میں لوگ باہر نکلتے ہیں تو بچے گھر پر چھوڑ آتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ باہر نکلنے کا والدین نے وقت مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ ایک دن جب ایک ماں کے ساتھ دو ہنستے بولتے خوبصورت بچے نظر آئے تو لہری صاحب خاموش نہ رہ سکے۔ "اب دیکھ لیا آپ نے، بچے دو ہی اچھے۔"

اس زمانے میں ہمارے ملک میں اشتہاروں میں یہ مفید مشورہ بہت کثرت سے نظر آتا تھا۔

لہری صاحب کی تصویروں کا البم ہمارے دل میں

محفوظ ہے۔ واقعات بے شمار ہیں جن کو بیان کرنے کے لیے ایک کتاب درکار ہے۔ وہی معاملہ ہے کہ

کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں استدعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

اب ایسے لوگ آنکھ کا سرمہ ہو گئے ہیں۔ ایک جاتا ہے تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے والا نظر نہیں آتا۔ باصلاحیت اور وضع دار انسانوں کا قحط پڑ گیا ہے اسی کو کہتے ہیں "قحط الرجال"۔

اداکار ساقی بلوچ بھی خوب آدمی تھے۔ ساقی کو ایکٹنگ کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ بلکہ میں نے انہیں تمام زندگی فلم اور اداکاری کے سوا کسی اور شوق اور مشغلے میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان سے میری شناسائی بھی 30، 35 سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ ان سے ابتدائی ملاقاتیں اس وقت ہوئی تھیں جب وہ اداکار نہیں تھے اور میں صرف صحافی تھا۔ یہ 1950ء کی دہائی کے آخر کی بات ہے۔ مال روڈ پر شاہ دین بلڈنگ میں "نوائے وقت" کا دفتر تھا۔ اس کے برابر میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کا دفتر تھا جس کے کرتا دھرتا شیخ رحمان تھے۔ شیخ رحمان صاحب کو بھی فلم اور اداکاری سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ مگر ان کا پہلا شوق ہدایت کاری تھا اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار یہ شوق ضرور پورا کر لیا ورنہ ہزاروں لوگ اس آرزو کی تکمیل میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ شیخ صاحب نے پہلی فلم "آبرو" بنائی تھی جو بدقسمتی سے کامیاب نہیں ہوئی اور جب کسی کی پہلی فلم ناکام ہو جائے تو فلمی صنعت میں اس کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ شیخ رحمان کا ذریعہ آمدنی دوسرا تھا اس لیے فلم کی ناکامی کے بعد بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور دوسری فلم بنانے کے چکر میں رہے یہاں تک کہ یہی آرزو دل میں لیے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ بہت بااخلاق، مہمان نواز، ہنس مکھ اور شائستہ انسان تھے۔ انگریزی اور اردو کی کوئی اچھی اور مشہور فلم ایسی نہیں تھی جو انہوں نے نہ دیکھ رکھی ہو اور جس کی کہانی تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ انہیں یاد نہ ہو۔ پھر ساتھ ساتھ وہ اس فلم کی کہانی، ہدایت کاری اور موسیقی سے متعلق قابلِ ذکر پہلو بھی بیان کرتے جاتے تھے اور سننے والے ان کی باتوں میں کھو جایا کرتے تھے۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے نیو تھیٹرز اور بمبئی ٹاکیز کی بنائی ہوئی فلموں اور کلاسیکی پرانی

عمر شریف

انگریزی فلموں کے بارے میں بھی سنایا کرتے تھے اور ان میں سے بیشتر فلمیں بہت سے حاضرین محفل کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ صرف ان کے بارے میں کتابوں، رسالوں میں پڑھا تھا یا سن رکھا تھا۔ اس لیے شیخ صاحب کی داستان گوئی سے سبھی مرعوب اور متاثر ہوا کرتے تھے۔ کہانی اور فلم کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے شیخ صاحب چہرے کے اتار چڑھاؤ اور آواز کے زیر و بم کی مدد سے بھی ایک مسحور کن ماحول پیدا کر دیا کرتے تھے۔ میں انہیں اکثر مشورہ دیا کرتا تھا کہ وہ اداکار بن جائیں مگر ان کا پہلا اور آخری شوق ہدایت کاری تھا۔ شیخ رحمان عمر کا بیشتر حصہ کنوارے رہے، کافی عمر میں شادی کی مگر زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ظاہر ہے کہ شیخ رحمان کے دفتر میں ایسے لوگوں کا جمگھٹا رہا کرتا تھا جو کسی نہ کسی طرح فلموں کا شوق رکھتے تھے۔ دفتر کے پچھلے کمرے میں، جو خاصا بڑا تھا سب لوگ جمع ہو جاتے۔ لطیفے بازی ہوتی، فلموں، کہانیوں اور کتابوں پر تبصرے ہوتے اور پھر پاکستانی فلموں کے معیار کے بارے میں گفتگو شروع ہو جاتی۔ دلجیت مرزا اور ساقی صاحب سے میری اسی جگہ ملاقات ہوئی تھی۔ دلجیت مرزا آگے چل کر مزاحیہ اداکار اور پھر فلم ساز و ہدایت کار بنے اور کافی شہرت حاصل کی۔ ساقی صاحب سے بھی اسی کمرے میں ملاقات ہوئی تھی جو بعد میں دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

ساقی صاحب اس زمانے میں بھی مزاحیہ خاکے بنا کر سنایا کرتے تھے اور اس معاملے میں ان کا اور دلجیت مرزا کا

برابر کا جوڑ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وجیت مرزا نے بعد میں محفلوں میں بھی مزاحیہ اداکاری کا نمونہ پیش کیا اور اس راستے سے فلمی صنعت میں پہنچ گئے۔ ساقی صاحب نے کبھی محفلوں یا اسٹیج شو میں اپنی ہنر مندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں فلموں کے لیے سنبھال کر رکھ لی تھیں۔ ساقی صاحب نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز بالی وڈ کی فلم ''بھوانی جنکشن'' سے کیا تھا جو لاہور میں بنائی گئی تھی۔ اداکارہ نیلو اور ہدایت کار قدیر غوری کے علاوہ اور بھی کئی فن کاروں نے اس فلم میں پہلی بار مختلف حیثیتوں میں حصہ لیا اور آگے چل کر اپنے اپنے شعبوں میں نام پیدا کیا۔ ساقی صاحب اس وقت تک پاکستان کی فلمی صنعت سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ مگر ''بھوانی جنکشن'' میں انہیں کام ملنے کی بڑی وجہ ان کی شخصیت، بے تکلفی اور بول چال کا ڈھنگ تھا۔ وہ نہ صرف انگریزی بلکہ اٹھارہ دوسری زبانیں بھی روانی سے بول لیتے تھے جن میں پاکستان کی علاقائی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی بھی شامل ہیں۔ پھر ہر زبان کو مخصوص لب و لہجے کے ساتھ بولتے تھے۔ امریکی لہجے میں انگریزی بڑی روانی سے بولتے اور اسی انداز میں شانے اور ہاتھ ہلاتے جس طرح امریکی کرتے ہیں۔ ان کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی اور پھر قدرت نے نقالی کی صلاحیت بھی عطا کی تھی۔ وہ جب انٹرویو کے لیے ''بھوانی جنکشن'' کے مشہورِ زمانہ ہدایت کار جارج کوئیکر کے پاس گئے تو وہ ان کی گونا گوں خوبیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے بھلا امریکا میں ایسا شخص کہاں دیکھا تھا جو ہر زبان پر پوری دسترس رکھتا ہو۔ اس فلم میں انہوں نے معاون ہدایت کار کے طور پر بھی کام کیا اور ایک انقلابی ہندو لیڈر کا مختصر کردار بھی کیا تھا۔ ساقی صاحب اس فلم میں کام کرنے کی لگن میں کوٹری (سندھ) سے بطور خاص لاہور آئے تھے فلم کی تکمیل کے بعد واپس چلے گئے مگر اداکاری کے جراثیم ان کے جسم میں سرایت کر چکے تھے۔ لاہور آتے رہے اور فلمی لوگوں سے ملاقاتیں بھی کرتے رہے۔ انہیں پاکستانی فلموں میں متعارف کرانے کا سہرا ایس گل صاحب کے سر ہے جن کا اصلی نام سید فضل علی شاہ جاموٹ تھا۔ فنِ موسیقی سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ اداکاری اور فلم سازی سے بھی دلچسپی تھی۔ سندھ کے ممتاز زمیندار تھے۔ انہوں نے نذیر اجمیری صاحب کی فلم ''بے قرار'' میں راگنی کے بالمقابل ہیرو کا کردار کیا اور پھر فلمی صنعت سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔ فضل شاہ جاموٹ نے ایس گل کے نام سے فلموں کا رخ کیا تھا۔ بطور فلم ساز ان کی پہلی فلم بے قرار اور دوسری التجا تھی۔ اسی زمانے میں ایس گل صاحب سے بھی میری ملاقات ہوئی جو بعد میں شناسائی اور پھر دوستی میں بدل گئی۔ ایس گل صاحب انتہائی شائستہ اور بااخلاق انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی فلم ''التجا'' کی موسیقی گل حیدر کے نام سے خود ہی مرتب کی تھی۔ موسیقی کے فن میں وہ غلام حیدر مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس فلم کی ہیروئین بھی راگنی تھیں۔ بعد میں ان کا اور راگنی کا مستقل ساتھ ہو گیا۔ جن دنوں محمد خان جونیجو پاکستان کے وزیراعظم تھے ایس گل صاحب کے صاحب زادے سے ان کی صاحب زادی کی شادی ہوئی تھی اور اب وہ ان کے سمدھی ہیں۔

عبداللطیف بلوچ کو ساقی کے نام سے فلم میں پیش کرنے کا اعزاز ایس گل صاحب ہی کو حاصل ہے۔ ''التجا'' میں ساقی صاحب کو ایک مزاحیہ کردار سونپا گیا تھا جو انہوں نے کامیابی سے ادا کیا۔ اس کے بعد ان پر مزاحیہ اداکار کا ٹھپا لگ گیا۔ مگر جب انہوں نے کریکٹر ایکٹر کے طور پر کام کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بہت باصلاحیت کریکٹر ایکٹر تھے۔ ساقی صاحب فلموں سے کیا وابستہ ہوئے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لاہور کے ہو کر رہ گئے۔ وہ صرف رشتے داروں کی خوشی اور غمی میں شرکت کے لیے کوٹری اور حیدرآباد جایا کرتے تھے ورنہ لاہور ہی ان کا ٹھکانا رہا۔ بہت وضع دار اور باغیرت انسان تھے اس لیے انہوں نے کبھی محض فلمی اداکاری پر انحصار نہیں کیا۔ دوسرے کاروبار بھی کرتے رہے مگر ان کا پہلا پیار اداکاری ہی تھا۔ ساقی نے لاہور میں سالہا سال قیام کیا اور لگ بھگ پانچ سو فلموں میں کام کیا مگر فلم حقیقی معنوں میں کبھی ان کی کفالت نہ کر سکی۔ حالانکہ وہ اردو، پنجابی، پشتو سبھی زبانوں کی فلموں میں کام کر لیتے تھے اور ہر زبان مخصوص لب و لہجے کے ساتھ بولتے تھے۔ زندگی کے آخری سالوں میں وہ اچانک دل برداشتہ ہو کر لاہور سے کوٹری چلے گئے اس کا سبب بھی ان کی زود حسی تھی۔ ہوا یہ کہ اداکار علاؤالدین جو اپنے زمانہ عروج میں فلم والوں کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے تھے آخری دنوں میں ان کی سرد مہری اور غفلت کا شکار ہونے لگے۔ ایک محفل میں ساقی نے علاؤالدین کے ساتھ حاضرینِ محفل کی بے پروائی اور سرد مہری کا نظارہ کیا تو اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ فلمی صنعت سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کسی مرحلے پر

خود اپنے ساتھ اس بے اعتنائی کا مظاہرہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے عزت و احترام کے ساتھ فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا لیکن فلم اور اداکاری عمر بھر ان کے ذہن سے نہ نکل سکی۔ ان کی چند فلموں کے نام یہ ہیں ''رات کے راہی، لاکھوں میں ایک، آگ کا دریا، بجی، بارہ بجے، ناگن، ہمراہی، شہید، مٹھی بھر چاول، دوستی، میرا گھر میری جنت، نغمۂ صحرا، چوڑیاں، پیغام، بادل، نصیب اپنا اپنا، فرنگی، آسرا، راز، ہم لوگ، جاگیر، ندیا کے پار، ہزار داستان، شب بخیر، ہیبت خان، دل دیوانہ، محبت زندگی ہے، سنگم وغیرہ۔ زندگی کے آخری چند سالوں میں فلم سے دل برداشتہ ہو کر چند ٹیلی ویژن ڈراموں میں بھی کام کیا اور اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا۔ ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں ان کی سیریز ''دیواریں''، ''جنگل'' اور ''گردش'' شامل ہیں۔

آغاز میں تو ساقی کی اداکاری میں بے ساختہ پن نہیں تھا اور ان کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہو گیا تھا کہ کیمرے سے ہٹ کر وہ جتنے اچھے اداکار ہیں کیمرے کے سامنے نہیں ہیں۔ مگر پھر رفتہ رفتہ ساقی نے کیمرے سے متاثر ہونا چھوڑ دیا اور ان میں خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مختلف قسم کے بہت اچھے کردار کیے اور ان کے ساتھ انصاف بھی کیا۔ انہیں ایک آسانی یہ بھی تھی کہ وہ پاکستان کی بیشتر علاقائی زبانیں نہ صرف جانتے تھے بلکہ بالکل صحیح لب و لہجے میں بول سکتے تھے۔ اردو بھی وہ کسی اہلِ زبان کے انداز میں بولتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے مختلف قسم کے کردار مخصوص کیے جاتے تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جب ساقی نے اداکاری پر عبور حاصل کر لیا اور بہت منجھے ہوئے اداکار بن گئے تو ہماری فلمی صنعت کے دستور کے مطابق انہیں نظر انداز کیا جانے لگا۔ وہ بے حد حساس آدمی اور نازک مزاج فنکار تھے۔ یہ صورتِ حال بھانپ گئے اور خود ہی کنارہ کش ہو گئے۔

ساقی انتہائی شریف النفس، بااخلاق اور بامروت انسان تھے۔ معاوضہ وصول کرتے ہوئے بھی جھجکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے فلم ساز ان کی اس ''اخلاقی کمزوری'' سے فائدہ اٹھا کر انہیں برائے نام معاوضہ دیا کرتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو معاوضے کی ساری رقم ہضم کر جاتے تھے۔ مگر کیا مجال جو ساقی صاحب حرفِ شکایت زبان پر لائیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ ان کی اگلی فلم میں بھی کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اداکاری ان کا شوق تھا، ذریعۂ روزگار نہیں تھا۔ وہ معاش کے لیے دوسرے ذرائع استعمال کرتے تھے جن میں ایک موٹر کاروں کی خرید و فروخت کا بزنس بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اچھی سے اچھی کاروں میں نظر آتے تھے۔

ساقی کو میں نے ہمیشہ کار سوار ہی دیکھا حالانکہ اس زمانے میں ہمارے بہت سے ہیرو اور ہیروئنیں بھی کاروں سے محروم تھے۔

1957-58ء میں ان کے پاس ایک گہرے سرخ رنگ کی کھلی چھت والی اسپورٹس کار تھی جو آئینے کی طرح چمکتی تھی۔ کار کے ایریل میں انہوں نے ایک رنگین فیتہ لگایا ہوا تھا جو ہوا میں لہراتا ہوا بہت خوبصورت لگتا تھا۔ وہ خود بھی خوش پوش اور خوش اطوار تھے۔ جب وہ اس کار میں سوار ہو کر مال روڈ اور میکلوڈ روڈ پر سے گزرتے تو راہ گیر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ ساقی صاحب اور اسلم پرویز دو ایسی ہستیاں ہیں جو فلموں میں اداکار بننے سے پہلے بھی شاندار کاروں میں سواری کرتے تھے اور ان کے بڑے ٹھاٹ باٹ تھے۔

ساقی خود بہت زندہ دل آدمی تھے اور بہت شائستہ مذاق کرتے تھے۔ ایک بار غالباً 60 کی دہائی میں، اداکارہ شمیم آرا یورپ سے تنہا واپس پاکستان آرہی تھیں۔ روم کے ائیرپورٹ پر انہیں ساقی صاحب نظر آ گئے۔ اس زمانے میں بیرونی ملکوں میں پاکستانی خال خال ہی نظر آتے تھے۔ ساقی کو دیکھ کر شمیم آرا کی خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ لپک کر ان کے پاس گئیں اور کہا ''ارے ساقی صاحب آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

ساقی صاحب انہیں دیکھ کر بالکل ناآشنا بن گئے۔ ٹھیٹ انگریزی لہجے میں بولے۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' شمیم آرا نے غور سے ان کا جائزہ لیا۔ ہو بہو ساقی تھے۔ سر پر ہیٹ، تھری پیس سوٹ، آنکھوں پر رنگین چشمہ، شمیم آرا نے جتنا اصرار کیا ان کی انگریزی اور بے تعلقی اتنی ہی بڑھتی گئی۔ آخر کار شمیم آرا نے صبر کر لیا اور پلٹ کر جانے لگیں تو پیچھے سے ساقی نے انہیں پکارا اور پنجابی بولنی شروع کر دی۔ شمیم آرا کہتی ہیں کہ خوشی، غصے اور شدتِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ساقی صاحب نے اس عملی مذاق کی تلافی کے طور پر انہیں کافی پلائی اور ایک تحفہ بھی خرید کر دیا۔

ساقی صاحب یوں تو سراپا وجیہہ اور خوبصورت انسان تھے مگر ان کے دانت خاص طور پر ہموار، سفید اور

موتیوں کی طرح چمک دار تھے۔ ہم نے یہ مشہور کردیا کہ ساقی صاحب کی بتیسی مصنوعی ہے۔ جو انہوں نے یورپ میں بنوائی ہے۔ پہلے تو کسی کو یقین نہیں آیا مگر جب ساقی صاحب نے بھی اس کی تصدیق کردی تو سب بہت حیران اور متاثر ہوئے۔ ایک ہیروئن بولیں۔ ”حیرت ہے۔ مجھے تو آج تک شبہ تک نہیں ہوا کہ ان کے دانت مصنوعی ہیں۔ کتنی مہارت اور صفائی سے بنائے گئے ہیں۔“ ایک اور نے کہا۔ ”مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ اتنے خوبصورت دانت اصلی نہیں ہوسکتے۔“

مشکل اس وقت پیش آئی جب ایک نامور ہیرو ملک سے باہر جانے سے پہلے ساقی صاحب کو ایک طرف لے گئے اور پوچھنے لگے کہ انہوں نے اپنی بتیسی کس جگہ سے اور کس سے بنوائی ہے۔ ساقی صاحب نے تردید کی تو انہیں یقین نہیں آیا۔ بمشکل اپنا منہ کھول کر انہیں یقین دہانی کرائی۔

ہم دونوں کے نام صوتی اعتبار سے مشابہ تھے اس لیے ٹیلی فون پر اکثر غلط فہمی پیدا ہوجاتی تھی۔ ہمارے لیے فون ہوتا تو اسٹوڈیو کا عملہ ساقی صاحب کو بلا دیتا۔ اسی طرح ان کے فون مجھے بات کرنے کا موقع مل جاتا۔ یہ ابتدائی سالوں کا ذکر ہے۔ ساقی صاحب نے حسب عادت عملی مذاق شروع کردیا اور میرے نام سے فون پر ایسے وعدے کرنے لگے جن کے پورے نہ ہونے پر مجھے پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ ایک بار شاہ نور اسٹوڈیو میں ان کے لیے ایک غیر ملکی خاتون کا ٹیلی فون آیا تو اسٹاف نے مجھے بلا دیا۔ وہ ساقی صاحب سے ناراض تھیں کہ وہ وقت مقرر کرکے کیوں نہیں آئے اور انہوں نے کوئی چیز لاکر دینے کا وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔ ہم نے ساقی صاحب کی جانب سے دوبارہ وعدے کرلیے بلکہ کچھ اور بھی یقین دہانیاں کرائیں۔ ساقی صاحب سے ملاقات ہوئی تو ہم نے انہیں بڑھا چڑھا کر یہ بات سنائی، وہ منت کرنے لگے کہ بھائی، میں شریف آدمی ہوں یہ بات کسی کو نہ بتانا ورنہ خوانخواہ بدنام ہوجاؤں گا۔“

بعد میں کئی سال تک ساقی صاحب بلیک میل ہوتے رہے اور ہمارا منہ بند رکھنے کے لیے چائے اور کافی پلاتے رہے۔

ابتدائی زمانے میں ہم صحافی تھے اور اسٹوڈیو جانے کے لیے بس کے سوا کوئی اور سواری دستیاب نہیں تھی یا ہماری استطاعت سے باہر تھی۔ ساقی صاحب اپنی کار چمکاتے ہوئے مال روڈ یا لکشمی چوک پر نظر آتے تو ہم ان سے درخواست کرتے کہ اگر اسٹوڈیو جارہے ہیں تو ہمیں بھی لے جائیں۔ وہ ہمیں اپنے ہمراہ لے جاتے تھے حالانکہ اسٹوڈیو میں انہیں اکثر کوئی کام نہیں ہوا کرتا تھا۔ ایک بار انہوں نے راستے میں کار ایک پیٹرول پمپ پر کھڑی کردی اور اس میں ایک گیلن پیٹرول ڈلوایا۔ اتفاق سے ان کی جیب میں پیسے نہیں تھے۔ کہنے لگے ”ذرا بل بھی دے دیں۔“ ہم نے بل ادا کردیا۔ غالباً اس زمانے میں پونے تین روپے گیلن پیٹرول تھا مگر یہ رقم بھی ہمیں بھاری لگی۔ ہم نے پیسے تو دے دیے مگر اسٹوڈیو جاکر یہ مشہور کردیا کہ کوئی ساقی صاحب کی کار میں نہ بیٹھے۔ وہ اپنی کار میں ہر ایک سے ایک گیلن پیٹرول ڈلوا لیتے ہیں۔ ساقی صاحب وضع دار آدمی تھے۔ بہت شرمندہ ہوئے اور اس کے بعد ہمارا منہ بند رکھنے کے لیے نہ صرف تلاش کرکے اسٹوڈیو لے جاتے تھے بلکہ چائے بھی پلاتے تھے۔

ساقی صاحب کی ابتدائی فلمی زندگی کا ایک واقعہ ہمیں آج تک یاد ہے۔ ہوا یہ کہ انہیں فلم ”لکھ پتی“ میں ہیرو کا کردار مل گیا۔ ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ فلم ساز اور ہدایت کار کے علاوہ یونٹ کے دوسرے لوگ بھی ان کی مہمان نواز فطرت سے فائدہ اٹھا کر خوب خاطر مدارات کرایا کرتے تھے۔ یہ فلم رتن سنیما میں نمائش کے لیے پیش ہوئی تو ساقی صاحب اپنی سرخ اسپورٹس کار میں سیاہ سوٹ اور بوٹائی لگا کر سنیما کے سامنے پہنچ گئے اور شو ختم ہونے کے انتظار میں کار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے۔ فلم بالکل فلاپ تھی۔ شو ختم ہونے پر تماشائی لاہور کے فلم بینوں کی روایت کے مطابق باآواز بلند تبصرے کرتے ہوئے باہر نکلے۔ یکایک ایک شخص کی نظر ساقی صاحب پر پڑی تو وہ پکار کر بولا۔ ”اوئے ساقی... وہ رہا ساقی“ سارا ہجوم ان کی جانب دوڑ پڑا۔ پہلے تو وہ سمجھے شاید پرستار داد دینے کے لیے آرہے ہیں مگر پھر لوگوں کا موڈ دیکھا تو جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک قریبی فلم کے دفتر میں پناہ لی۔ ہم اتفاق سے اس وقت وہاں موجود تھے۔ ساقی صاحب کو غسل خانے میں چھپا دیا گیا۔ کچھ جوشیلے اوپر بھی آگئے مگر ساقی صاحب کو نہ پاکر چلے گئے۔ شکر ہے کہ انہوں نے کار کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اس وقت تک لوگوں میں توڑ پھوڑ کا رجحان پیدا نہیں ہوا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا، پھر ایک وقت ایسا آیا جب ساقی صاحب کی اداکاری پر راستہ چلتے لوگ رک کر انہیں داد پیش کیا کرتے تھے اور وہ انتہائی انکساری سے

مسکراتے رہتے تھے۔

ساقی صاحب کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔ نسلاً وہ بلوچ تھے اور رند قبیلے کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا آبائی وطن بلوچستان کے ضلع کچھی کا ایک گاؤں شوران تھا۔ ان کے دادا وادیٔ مہران میں آکر مقیم ہوئے اور ضلع دادو میں کوٹری کے قریب قیام کیا۔ یہ جگہ بعد میں ساقی صاحب کے پردادا کے نام پر گوٹھ یوسف بلوچ کے نام سے مشہور ہوئی۔

عبداللطیف بلوچ ان کا اصل نام تھا۔ ان کے تین اور بھائی مختلف شعبوں میں نمایاں ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی عبدالکریم بلوچ ٹیلی ویژن میں جنرل منیجر تھے۔ ساقی صاحب نے جب سے فلموں میں باقاعدہ اداکاری شروع کی وہ عرصہ 31 سال پر محیط ہے۔ اداکاری کے وہ بچپن ہی سے رسیا تھے۔ اسٹیج ڈرامے اور فلمیں باقاعدگی سے دیکھا کرتے تھے اور مکالمے انہیں ازبر ہوجاتے تھے۔ اپنے دوستوں کو وہ مکالمے سنایا کرتے اور مختلف کرداروں کی اداکاری کا نمونہ بھی دکھاتے۔ ساقی ایک مخلص آدمی تھے اور باتوں کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے کہ محفل زعفران ہوجاتی تھی۔ پھر وہ مختلف زبانوں میں باتیں کرکے سب کو پریشان کردیا کرتے تھے۔ وہ اداکاروں کی اس قسم سے تعلق رکھتے تھے جو کہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جارہی ہے۔

مزاحیہ اداکاروں کے اعتبار سے پاکستان بہت خوش قسمت ہے۔ یہاں فلمی صنعت میں ہر دور میں بہت اچھے مزاحیہ اداکار فلم بینوں کا دل بہلاتے رہے ہیں اور ہر زمانے میں وقت کے ساتھ ساتھ مزاحیہ اداکاروں کے رجحان بھی بدلتے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں نذر کا طوطی بولتا تھا۔ وہ اکیلے ہی ساری فلم کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتے تھے، ان کی اداکاری کا انداز اس زمانے کے اعتبار سے پسند کیا جاتا تھا اور فلم بین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے۔ ان کے بعد آصف جاہ آئے۔ پھر ننھا اور رنگیلا آئے، نرالا فلموں میں جلوہ گر ہوئے۔ لہری صاحب ایک نئے انداز سے نمودار ہوئے۔ فلموں میں اور دوسرے اداکار بھی بہت نمایاں ہوئے، ظریف کا انداز جدا تھا۔ منور ظریف نے ان کی جانشینی کا حق ادا کردیا بلکہ ان کی اداکاری میں تنوع زیادہ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ظریف کے زمانے میں فلمیں بہت کم بنتی تھیں۔ منور ظریف کا دور فلموں کا عروج کا دور تھا۔ اس لیے انہیں مختلف قسم کے کردار بھی میسر آئے۔

سلطان کھوسٹ اپنے زمانے میں مزاحیہ اداکاری کے بادشاہ تسلیم کیے جاتے تھے، ان کے علاوہ اور بھی کئی مزاحیہ اداکار تھے لیکن اچھی اداکاری کا مظاہرہ کرنے کے باوجود برگد جیسے قدآور مزاحیہ اداکاروں کے سائے میں پنپ نہیں سکے مگر ان کی اداکاری کا معیار مجموعی طور پر بہت اچھا تھا۔ بھارتی کامیڈین ہمارے مزاحیہ اداکاروں کے مقابلے میں بہت کمتر تھے۔

فلموں کے علاوہ تھیٹر سے بھی مزاحیہ اداکار سامنے آتے رہے۔ معین اختر کی کامیڈی کا تو بھارتی فلم والے بھی اعتراف کرتے تھے۔ اسی زمانے میں اسٹیج سے ایک اور مزاحیہ اداکار نکل کر سامنے آیا اور چھا گیا۔ یہ عمر شریف تھے۔ عمر شریف کی اداکاری کا بھی ایک زمانہ معترف ہے۔ اگر کسی بڑے ملک میں ہوتے تو کروڑوں کماتے، پھر بھی پاکستان کی محدود مارکیٹ میں انہوں نے بہت دھومیں مچائیں۔ ہم نے کئی بار عمر شریف کے بارے میں سوچا کہ ان کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہیے مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آتی رہی۔ آج سوچا کہ آپ کو عمر شریف سے بھی متعارف کرائیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ وہ کسی تعارف کے محتاج ہیں لیکن نظر اپنی اپنی ہوتی ہے، پر سچ پوچھیے تو ہم بھی عمر شریف کے فین ہیں اور ان کی ذہانت، حاضر جوابی، اچانک غیر متوقع بات بہت خوبصورتی سے کہہ دینے کا انداز ہر ایک کو متاثر کرتا ہے۔ ہم نے کبھی کسی کی زبان سے عمر شریف کے بارے میں خراب رائے نہیں سنی۔

عمر شریف کو اسٹیج کی دنیا کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا ہے اور یہ کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ وہ اسٹیج پر ہوں، ٹی وی ڈرامے میں اداکاری کررہے ہوں، کسی پروگرام کی میزبانی کررہے ہوں یا فلموں میں اداکاری کا مظاہرہ کریں۔ ہر روپ میں وہ سننے اور دیکھنے والوں پر ایک سحر سا طاری کردیتے ہیں۔ کتنا ہی بڑا مجمع کیوں نہ ہو عمر شریف اپنے برجستہ جملوں اور نپی تلی اداکاری سے کسی کو حرکت کرنے کی بھی مہلت نہیں دیتے۔

آئیے ذرا عمر شریف کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ ذات شریف اچانک کہاں سے وارد ہوئے اور دیکھنے سننے والے کو اپنا اسیر کرلیا۔ میر تقی میر کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

عمر شریف کی زلفیں نہیں ہیں، لیکن تماشائی ان کے

بال بال کے اسیر ہیں۔ عمر شریف خالص پاکستانی اور ''کراچی'' والے ہیں۔ وہ 1958ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ ان پر نوعمری ہی میں دکھوں کا سایہ پڑا جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ عمر شریف کی عمر اس وقت پانچ کے لگ بھگ تھی۔ ان کی والدہ کے حوصلے اور قابلیت کی داد دینی چاہیے جنہوں نے عمر شریف اور ان کے بہن بھائیوں کی پرورش اور تربیت کی۔ وہ بیک وقت والد اور والدہ دونوں کے فرائض ادا کرتی ہیں۔ ایسی مائیں باعث تکریم ہیں جو بچوں پر سب کچھ نچھاور کردیں۔ کچھ عرصہ قبل ان کی والدہ بھی وفات پاگئیں۔ اس وقت بچے بڑے ہوچکے تھے مگر اولاد کے لیے تو ماں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ انہوں نے یہ دونوں صدمے بہت صبر اور برداشت کے ساتھ جھیلے اور بیماری کے زمانے میں والدہ کی تیمارداری اور خدمت گزاری کا حق ادا کردیا، ماں ایک ایسی بے مثال چیز ہے جس کے مقابلے میں دوسرے رشتے کمزور نظر آتے ہیں۔ ہر ایک کو ماں کی دعاؤں کی حاجت رہتی ہے۔ یہی دعائیں اس کے پھلنے پھولنے کے ساتھ ایک محبت بھرا سایہ ہوتی ہیں۔

ماں کی کیا حیثیت ہے اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف بخشا گیا تھا اور وہ اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ دل کی بات بھی کرلیا کرتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے انتقال کے بعد جب وہ کوہ طور پر گئے تو اللہ تبارک تعالیٰ نے انہیں انتباہ کیا ''موسیٰ، ذرا سوچ اور سنبھل کر بولنا۔ تمہیں اپنی دعاؤں کے سائے میں پروان چڑھانے والی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔''

اس غمگین پس منظر کے باوجود وہ بچپن ہی سے شوخ و طرار تھے۔ اسی نوعمری میں ان کی حاضر جوابی سن کر سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ یہ ایک خداداد عطیہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بخشا ہے۔ انہیں بچپن ہی سے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا، حالانکہ گھر والے اس بات کے حق میں نہ تھے اور اگر پتا چل جاتا تو عمر شریف کی مرمت بھی ہوتی تھی مگر فلم بینی کا شوق انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا اور جب بھی موقع ملتا وہ فلم دیکھنے پہنچ جاتے تھے۔

اداکاری کے جراثیم نوعمری سے ہی ان میں تھے۔ اسکول میں ہونے والے ایک ڈرامے میں انہیں اداکاری کا موقع ملا۔ اس ڈرامے میں انہوں نے ایک جن کا کردار ادا کیا تھا۔ ان کی اداکاری کو بہت پسند کیا گیا اور سب نے یہاں تک کہ اساتذہ نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس پہلی کامیاب کوشش سے ان کے ارادے اور زیادہ مضبوط ہوگئے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ عمر شریف ایک ایسا جن ہیں جو ایک بار بوتل سے باہر آنے کے بعد دنیا کی دلچسپی اور ہنسی خوشی کا سبب بن گیا۔

عمر شریف نے اپنی باقاعدہ اداکاری کا آغاز بالکل مختلف انداز میں کیا جو کہ ان کی ذہانت اور ذہن کی رسائی کا ایک ثبوت ہے۔ اس زمانے میں ویڈیو اور سی ڈی نہیں تھے۔ صرف آڈیو کیسٹ تھے۔ عمر شریف نے کیسٹ کے ذریعے اداکاری کا آغاز کیا۔ یہ کیسٹ طنز و مزاح سے بھرپور تھے۔ اس سستے ذریعے کو اپنا کر انہوں نے بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کرلی۔ کیسٹ ایک سستا ذریعۂ تفریح ہے۔ ہر شخص کیسٹ خریدنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ جو کوئی ان کا کیسٹ سنتا تھا وہ ان کی فقرہ بازی اور برجستہ جملوں سے لطف اندوز ہوکر دوسروں کو بھی بتاتا تھا۔ اس طرح اسٹیج فلم یا ٹی وی کے سہارے کے بغیر عمر شریف نہ صرف پاکستان میں بلکہ پاکستان سے باہر بھی مقبول ہوگئے۔ ان تمام ملکوں میں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں عمر شریف پسند کیے جاتے ہیں۔

عمر شریف نے جب اسٹیج پر ڈرامے پیش کرنے شروع کیے تو یہ تازہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح تھا۔ ان سے پہلے عام لوگوں کے لیے شائستہ اور بامقصد ڈرامے پیش کرنے کا اعزاز اطہر شاہ خان کو حاصل ہے، انہوں نے لاہور میں عام لوگوں کی تفریح کے لیے پھکو بازی اور عامیانہ پن ترک کرکے صحت مند تفریح پیش کرنے کا آغاز کیا۔

تھیٹر اور اسٹیج کسی زمانے میں پاکستان میں بہت اعلیٰ معیار کا ہوتا تھا۔ لیکن ان کے موضوعات عموماً انگریزی ڈراموں سے اخذ کیے جاتے تھے جو عام لوگوں کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عالمی معیار کے ڈرامے تھے۔ ان میں کام کرنے والے اور انہیں تحریر کرنے والے بھی بہت اچھے تخلیق کار اور فن کار تھے۔ اسی اسٹیج اور تھیٹر نے بعد میں پاکستان کی فلمی صنعت اور ٹیلی ویژن کو تجربہ کار اور اعلیٰ پائے کے فن کار فراہم کیے۔ عمر شریف بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ عمر شریف اپنے ڈراموں کے اسکرپٹ خود لکھتے رہے ہیں۔ جب انہوں نے فلم سازی شروع کی

تو اپنی فلموں کے اسکرپٹ بھی خود ہی لکھتے رہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو موضوع کوئی تخلیق کار سوچتا ہے اس کے اسکرپٹ کے ساتھ بھی وہی انصاف کرسکتا ہے۔

عمر شریف نے اس سے پہلے ٹیلی ویژن کے دروازے بھی کھٹکھٹائے مگر ان کا کہنا ہے کہ ٹی وی کے کسی ڈائریکٹر یا پروڈیوسر نے ان کی صلاحیتوں کو بہتر انداز میں پیش نہیں کیا۔ ٹیلی ویژن سے بددل ہوکر ہی انہوں نے مزاحیہ ڈراموں اور پروگراموں کے آڈیو کیسٹ بنانے شروع کردیے۔ انہوں نے پچاس کے قریب ڈرامے لکھے جن میں سے بیس سے زیادہ ڈراموں کو کیسٹ کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ اس طرح شوبزنس میں اپنا تعارف انہوں نے خود ہی کرایا اور اپنی صلاحیتوں سے دنیا کو آگاہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے ہر ڈرامے میں لوگوں میں شعور اور خود اپنا احتساب کرنے کے تصور کو پھیلایا۔ اس اعتبار سے ان کے ڈرامے بامقصد اور سبق آموز بھی ہوتے ہیں اور وہ مزاحیہ انداز میں نہ صرف لوگوں کو ہنساتے ہیں بلکہ انہیں خود اپنی اصلاح کرنے کا شعور بھی پیدا کرتے ہیں۔

عمر شریف نے جو ڈرامے پیش کیے وہ دنیا بھر میں بے حد پسند کیے گئے۔ ان کا ایک ڈراما ''بکرا قسطوں پر'' تو ان کی شناخت بن گیا۔ ان کے دوسرے ڈراموں میں سے چند کے نام پیش کیے جارہے ہیں۔

اب گھر جانے دو، بہروپیا، میں دلہن لے کر جاؤں گا، بیگم میری ... بی بی سی، ہم ساہو تو سامنے آئے، لیس سر عید ونو سر عید، اب گھر جانے دو، عید عاشقوں کی، مسٹر چارسوبیس ان کراچی، یہ ہے فلمی چکر، پردہ نہ اٹھاؤ، منا بھائی ایم بی بی ایس، میک اپ روم، لوٹ سیل، پیار کا ورلڈ کپ، آ دیچ بولیں، چاند برائے فروخت، ہاؤس فل ہوگیا، ولیمہ تیار ہے، ہنی مون، عمر شریف ان جنگل، مجھے طلاق دو، لوٹا اور لفافہ، یہ ان کے چند ڈراموں کے عنوانات ہیں۔ ان عنوانات میں سے آپ عمر شریف کے دماغ کی زرخیزی اور تخلیقی قوت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ انہیں اللہ نے یہ صلاحیتیں دی ہیں کہ وہ ایسے موضوعات تلاش کرکے دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں جن پر دوسروں کی نظر ہی نہیں پڑتی اور نہ ہی وہ انہیں اہمیت دیتے ہیں۔ ہر قسم کے موضوعات پر دلچسپ، برجستہ اور طنزیہ انداز میں وہ ایسے ڈرامے تخلیق کرتے ہیں جن سے تفریح کے ساتھ ساتھ دیکھنے والے سبق بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ ایک مصلح بھی ہیں۔ یعنی معاشرے کی اصلاح کرنے والے۔ ابلاغ بھی ایک فن ہے جس کے ذریعے اپنے خیالات اور نظریات دوسروں تک پہنچائے جاتے ہیں۔ اگر ذریعۂ ابلاغ کو تفریح اور دلچسپی کی مٹھاس میں لپیٹ کر پیش کیا جائے تو یہ زیادہ موثر طریقہ ہے جس کے ذریعہ آپ جو کہنا چاہتے ہیں سننے اور پڑھنے والے اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور سنتے ہیں اور بہت سی کارآمد باتیں ان کے دل میں اتر جاتی ہیں۔

مصحف علی میر

پاک فضائیہ کے چیف آف اسٹاف۔ وہ 1947ء لاہور میں پیدا ہوئے، یہیں اپنی تعلیم مکمل اور 1965ء میں پی اے ایف میں شمولیت اختیار کی۔ 1967ء کو انہیں پی اے ایف میں کمیشن ملا اور مختلف عہدوں پر فائز ہوئے جن میں کمانڈنگ آفیسر جنوبی ائر کمانڈ، چیئرمین ائروناٹیکل کمپلیکس بورڈ کامرہ (اٹک) ڈائریکٹر آپریشنز ائر ہیڈکوارٹرز وائس چیف آف ایئر اسٹاف پلاننگ اور ایف 16 جنگی طیاروں کے پروجیکٹ ڈائریکٹر کے عہدے شامل تھے۔ پی اے ایف میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر انہیں 2000ء میں بطور چیف آف ائر اسٹاف مقرر کیا گیا۔ 2003ء میں وہ اس وقت بدترین فضائی حادثے کا شکار ہوئے جب ان کا فوکر طیارہ اسلام آباد سے کوہاٹ ائر فورس بیس کے سالانہ معائنے کے لیے روانہ ہوا۔ کوہاٹ سے 70 کلو میٹر دور بجانب مغرب گمبٹ کے 2000 فٹ بلند پہاڑی سلسلے میں حادثے کا شکار ہوا جس کے نتیجے میں 16 اعلیٰ افسر شہید ہوگئے۔ ان میں ان کی اہلیہ بھی شامل تھیں۔ پی اے ایف میں ان کی کارکردگی بے مثال رہی اور انہیں اعلیٰ خدمات کے اعتراف کے طور پر نشانِ امتیاز، ہلالِ امتیاز، ستارۂ امتیاز اور ستارۂ بصالت جیسے اعزازات سے نوازا گیا۔

مرسلہ: ناہید اختر، کراچی

مزاح کی اداکاری میں اپنا نام پیدا کرنے کے بعد فلم انڈسٹری اور ٹی وی کو بھی ان کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ہدایت کار جاوید فاضل نے اپنی فلم ''حساب'' میں عمر شریف کو بھی کاسٹ میں شامل کرلیا، ''حساب'' عمر شریف کی پہلی فلم تھی جو 1986ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ یہ فلم کامیاب ثابت ہوئی اور عمر شریف کی اداکاری کو بہت پسند کیا گیا جس کے بعد جاوید فاضل (مرحوم) نے انہیں اپنی متعدد فلموں میں کاسٹ کیا ''حساب'' میں ندیم اور روزینہ نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ لیلیٰ، منور سعید، اور افضال بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ ''حساب'' کے بعد جاوید فاضل کی جن فلموں میں عمر شریف نے اداکاری کی ان میں ''آگ ہی آگ'' آوارگی اور کندن شامل ہیں۔

عمر شریف کی اداکاری سے دوسرے ہدایت کار بھی متاثر ہوئے اور انہیں اپنی فلموں میں کاسٹ کیا۔ ہدایت کار الطاف حسین نے انہیں اپنی ... فلموں میں پیش کیا جن میں لاٹ صاحب، چھپے رستم، جھوٹے رئیس اور کھوٹے سکے، شامل ہیں۔ ہدایت کار نذر الاسلام نے اپنی فلم ''بارود'' میں ایک اہم مزاحیہ کردار سونپا جو کہ انہوں نے بہت خوبی سے ادا کیا۔ انہوں نے ہدایت کار اقبال اختر کی فلم ''مسکراہٹ'' سنگیتا کی فلم بہروپیا، داؤد بٹ کی فلم ''ہتھکڑی'' اکرم خان کی فلم ''ایکٹر'' پرویز کلیم کی فلم ''بت شکن''، فیصل اعجاز کی فلم ''محلے دار'' ہدایت کار حسنین کی فلمیں ''اکو دس نمبری'' اور ''نہلے پر دہلا'' ہدایت کار ظہور گیلانی کی ''دنیا میری جیب میں'' اور ''ڈنڈا پیر'' امتیاز قریشی کی ''نوسرباز'' الطاف حسین کی فلم رانی بیٹی راج کرے گی اور سنگیتا کی فلم صاحب بی بی اور طوائف، جاوید فاضل کی دشمنوں کے دشمن، شامل ہیں۔ دشمنوں کے دشمن میں عمر شریف کے ساتھ معین اختر بھی تھے۔ یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ کندن کے لیے عمر شریف کو نگار ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ ان فلموں میں انہوں نے مختلف قسم کے کردار ادا کئے تھے اور سب کے ساتھ انصاف کیا تھا۔

فلموں میں اداکاری کرتے ہوئے انہوں نے اپنے پہلے پیار اسٹیج کو فراموش نہیں کیا۔ انہوں نے لاہور کے ایک سنیما شمع کو کرائے پر حاصل کرکے تھیٹر میں تبدیل کردیا۔ اس تھیٹر میں بہت اچھے اور معیاری ڈرامے پیش کئے گئے۔ عمر شریف کی تقلید میں تھیٹر اسٹیج کرنے والے دوسرے لوگوں نے بھی سنیما گھروں کو تھیٹر میں تبدیل کیا اس طرح وہ ایک نئے رواج کے بانی کہے جاسکتے ہیں۔ عمر شریف نت نئے قسم کے کام کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ انہوں نے پہلی مرتبہ ویڈیو کے ذریعے ڈراما پیش کرنے کا طریقہ متعارف کرایا۔ عمر شریف کو بھارتی فلم سازوں کی طرف سے فلموں میں اداکاری اور ہدایت کاری کرنے کی پیشکش کی گئی مگر ان کے جذبۂ حب الوطنی نے یہ گوارا نہیں کیا۔

فلم کا چسکا لگ جانے کے بعد عمر شریف نے اپنی فلمیں بنانے کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ ان فلموں کے مصنف ہدایت کار اور مرکزی کردار وہ خود ادا کرتے تھے۔ ان کی پہلی فلم ''مسٹر چار سو بیس'' تھی اس فلم کے مصنف نغمہ نگار ہدایت کار وہ خود تھے۔ ان کے اس اقدام پر فلمی دنیا میں کافی بحث ہوتی رہی۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ عمر شریف غلط فہمی کا... شکار ہو کر فلم سازی اور ہدایت کاری کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ اسٹیج پر اور دوسرے ہدایت کاروں اور مصنفین کی فلموں میں کام کرنا اور بات ہے لیکن بذاتِ خود یہ تمام بوجھ اٹھالینا عمر شریف کے بس کی بات نہیں ہے لیکن عمر شریف اپنی دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے اپنی فلم ''مسٹر چار سو بیس'' ملک کے بہترین سنیما گھروں میں نمائش کے لیے پیش کی۔ فلم نے نمایاں کامیابی حاصل کی جس کی وجہ سے ان پر نکتہ چینی کرنے والوں کے منہ بند ہوگئے۔ اس زمانے میں ایکشن، مار دھاڑ اور قتل و غارت گری کی فلموں کا بہت زور تھا لیکن عمر شریف نے اس ماحول میں ایک دلچسپ مزاحیہ فلم بنا کر ثابت کردیا کہ اگر فلم اچھی ہو تو ہر صورت میں فلم بین اسے دیکھتے ہیں۔ مسٹر چار سو بیس کی کامیابی نے اردو فلموں کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے پنجابی فلموں کا بہت زور شور تھا۔ بعض فلم ساز اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں فلم بناتے تھے جن میں معیار قائم نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

فلم ''مسٹر چار سو بیس'' میں عمر شریف نے نئے اداکاروں کو آزمایا تھا اور یہ تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اس فلم کی ہیروئن شکیلہ قریشی تھیں۔ روبی نیازی اور مدیحہ قریشی بھی دو ہیروئن تھیں۔ فلم میں عمر شریف نے بیک وقت تین مختلف کردار ادا کیے تھے اور ہر ہیروئن کے بالمقابل وہی ہیرو تھے۔ اس فلم میں عمر شریف نے کہانی میں نیا تجربہ کیا تھا اور تین مختلف کرداروں کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔ مسٹر چار سو بیس، دوسری فلموں سے مختلف اور بہت دلچسپ کامیڈی فلم تھی۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد فلم سازوں میں عمر شریف کی مانگ میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ ان کی جن فلموں کا تذکرہ کیا جاچکا ہے ان میں سے بیشتر فلموں میں کام کرنے کا موقع ان کو مسٹر چار سو بیس کی نمائش کے بعد ہی ملا تھا۔

مسٹر چار سو بیس کی کامیابی سے متاثر ہو کر انہوں نے ''مسٹر چارلی'' بنائی۔ اس فلم میں مزاح کے ساتھ موسیقی کو بھی اہمیت دی گئی تھی۔ اس فلم کے مصنف، ہدایت کار، فلم ساز، کہانی نویس اور نغمہ نگار عمر شریف ہی تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس فلم میں انہوں نے گلوکاری بھی کی تھی۔ یہ فلم بھی کامیاب فلموں میں شمار ہوتی ہے جس کی وجہ سے عمر شریف میں بطور فلم ساز و ہدایت کار بھی اعتماد پیدا ہوا۔ انہوں نے ''مس فتنہ'' اور ''چاند بابو'' کی ہدایت کاری کے فرائض بھی ادا کئے۔ فلمی صنعت کا یہ رواج ہے کہ جب کوئی کسی خاص شعبے میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو سب اس کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔

عمر شریف کی اداکاری میں بے ساختگی اور سادگی ہے۔ وہ فی البدیہہ بے دھڑک ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو شاید کوئی اور نہیں کرسکتا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ کبھی کسی نے ان کی کسی بات اور طنز کا برا نہیں مانا بلکہ اس سے لطف اندوز ہوئے۔ یہ بھی ان کی خوش قسمتی ہے کہ وہ کسی پر تنقید بھی کریں تو ایسے دلکش انداز میں کرتے ہیں کہ وہ ناراض ہونے کی بجائے لطف اندوز ہوتا ہے۔

عمر شریف کے مداحوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن بذاتِ خود وہ دو اداکاروں کے بہت مداح ہیں۔ ایک محمد علی جن کی فلمیں وہ بچپن ہی سے گھر سے چھپ چھپ کر دیکھتے تھے اور بزرگوں سے مار بھی کھاتے تھے دوسرے منور ظریف، شکر ہے کہ منور ظریف کی فلموں کے زمانے میں وہ سمجھدار ہوگئے تھے اور فلم دیکھنے پر ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی جاتی تھی۔ عمر شریف فلاحی کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ اپنی مرحوم والدہ سے انہیں بے حد پیار تھا۔ ماں کی یاد میں وہ ''ماں'' کے نام سے کراچی میں ایک اسپتال بنا رہے ہیں۔ اس کا آغاز عمران خان نے کیا تھا جب انہوں نے اپنی والدہ کی یاد میں کینسر کے علاج کے لیے بہترین اسپتال بنایا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اب دوسرے فن کار بھی اس قسم کے فلاحی کاموں میں مصروف ہیں۔ گلوکار ابرار الحق، حدیقہ کیانی اور جواد احمد کے علاوہ دوسرے فن کار اور کھلاڑی بھی اب فلاحی کاموں کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔

پشاور سے شوکت رحمٰن خٹک نے صوبے کے پرانے فنکاروں کو یاد کیا ہے انہوں نے پشاور کے ایک بہت پرانے اور نامور فنکار کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے ملاحظہ کیجیے۔

خاموش فلموں کے دور کے نامور اداکار وزیر محمد خان کا بنیادی تعلق افغان نسل سے تھا۔ وہ 20 فروری 1906ء کو پشاور کے قریب آزاد قبائلی علاقے جمرود میں پیدا ہوئے۔ ایڈورڈز ہائی اسکول پشاور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مزاج کی تیزی اور گرمی پٹھان قوم کی خاصیت ہے۔ 16 برس کی عمر میں وزیر خان اپنے والدین سے کسی بات پر لڑ جھگڑ کر فوج میں بھرتی ہوگئے اور اپنی پلٹن کے ساتھ غیر ممالک چلے گئے۔ ان دنوں سپاہیوں میں جوش پیدا کرنے کے لیے ان کو پُرجوش فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ وزیر خان نے بھی پہلی بار فلم دیکھی تو ان کے دل میں بھی فلموں میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے بعد وزیر خان نے مزید فلمیں دیکھیں۔ کئی سالوں کے بعد وزیر خان اپنی پلٹن کے ساتھ ہندوستان واپس آئے تو انہیں دوبارہ وزیرستان کی لڑائی پر جانا پڑ گیا لیکن اب وزیر خان کا دل لڑائی سے اچاٹ ہوگیا تھا چنانچہ وہ فوج کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر فلم نگر بمبئی چلے گئے۔ وزیر خان بڑے یکم شحیم، تنومند اور قد آور نوجوان تھے۔ اردو، فارسی، پشتو، پنجابی، مرہٹی، گجراتی اور انگریزی زبان روانی سے بول سکتے تھے اس لیے انہیں آسانی سے بمبئی کے ایک فلمی ادارے ایکسلسیئر فلم کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ 1926ء میں وزیر خان نے اس ادارے کی ایک خاموش فلم کشمیرا میں زبیدہ اور ایم وکیل کے ساتھ بطور ولن کام کیا۔ اس کے بعد وزیر خان نے ایکسلسیئر کی چند خاموش فلموں مانو وجے، دل فروش، لیلیٰ مجنوں، نندنا بھوجل، پارسا ابلیس، شریمتی قلتی، دی لورز، ساوَل آرسلیو، چترکانتا، ڈیٹیکٹو کمار، ہیملٹ، اور کمسن لیلاوتی میں مختلف نوعیت کے کردار ادا کیے۔ 1929ء میں وزیر خان امپیریل فلم کمپنی میں آگئے۔ اس ادارے کی ایک خاموش فلم ''خواب ہستی'' میں سلوچنا اور ڈی بلیموریا کے ساتھ بطور ولن کام کیا۔ اس فلم کے ہدایت کار ایم بھوناتی تھے۔

اس کے بعد وزیر خان نے امپیریل کی چند خاموش فلموں ''فلائنگ پرنس''، چیلنج، گلشنِ عرب اور رحیم اور سوہنی مہینوال وغیرہ میں مختلف نوعیت کے کردار ادا کیے۔ 1931ء میں وزیر خان نے امپیریل کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' کے پہلے منظر میں اپنی پائیدار آواز میں یہ گیت گا کر

شہرت اور ناموری حاصل کرلی۔

"دے دے خدا کے نام پر پیارے طاقت ہے
گر دینے کی دے دے
کچھ چاہیے اگر تو مانگ لے اس سے طاقت ہے
گر لینے کی تو لے......"

اس فلم کے ہدایتکار شیر ایم ایرانی اور موسیقار فیروز شاہ مستری تھے۔ اداکاروں میں زبیدہ، ماسٹر وٹھل، جلو بائی، پرتھوی راج اور ڈبلیو ایم خان (وزیر محمد خان) نمایاں تھے۔ اس فلم میں پشاور سے تعلق رکھنے والے دو فنکاروں ڈبلیو ایم خان اور پرتھوی راج نے کام کیا تھا۔ ڈبلیو ایم خان نے فلم میں ایک بوڑھے فقیر اور پرتھوی راج نے سپہ سالار کا کردار ادا کیا تھا اس طرح سرزمینِ پشاور کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس کے ایک فرزند نے ہندوستان کی پہلی بولتی فلم میں اپنی آواز کا جادو جگا کر ریکارڈ قائم کرلیا۔ اس فلم میں کل چھ گیت تھے جو زبیدہ، جلو بائی اور ڈبلیو ایم خان نے گائے تھے۔ بدقسمتی سے یہ سب گیت ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے اور آج ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اس وقت گیتوں کو ریکارڈ کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ یہ گیت براہِ راست فلم میں ریکارڈ کئے گئے تھے۔ اس فلم کی بے مثال کامیابی کے بعد وزیر محمد خان نے امپیریل کی چند مزید فلموں میجک فلوٹ میں سلوچنا اور ڈی بلیموریا، دھوان میں رتن بائی اور جمشید جی، دلہن میں رتن بائی اور غلام محمد، میرے لال میں پرمیلا اور رفیق غزنوی اور "اس نے کیا سوچا" میں رتن بائی اور رفیق غزنوی کے ساتھ مختلف نوعیت کے کردار ادا کیے۔

1933ء میں وزیر خان اجنتا سنے ٹون سے وابستہ ہوگئے اور اس ادارے کی ایک فلم رنگیلا راجپوت میں ببو اور ماسٹر نثار کے ساتھ بطور ولن کام کیا۔ اس فلم کے ہدایت کار ایم بھونانی اور موسیقار بی ایس ہوگن تھے۔ اس کے بعد وزیر خان نے اجنتا کی چند فلموں نوجیون میں نرگس کے ساتھ بطور ہیرو اور شیر دل عورت خاتون اور جیراج، دردِ دل میں املتیا دیوی اور جیراج، دخترِ ہند میں تائی بائی اور جیراج اور واسودا تا میں ببو اور جیراج کے ساتھ مختلف نوعیت کے کردار ادا کئے۔

1938ء میں وزیر خان نے انڈین پکچرز کی ایک فلم "مدر انڈیا" میں پرمیلا اور عاشق حسین کے ساتھ بطور ولن کام کیا۔ اس فلم کے ہدایت کار گنجال اور موسیقار رام گوپال تھے۔

1939ء میں وزیر خان نے فیڈرل فلم ایکسچینج کی فلم "ایکٹریس کیوں بنی" میں پدما دیوی اور رفیق غزنوی اور سپریم پکچرز کی فلم "غازی صلاح الدین" میں رتن بائی اور ایشور لال کے ساتھ اہم کردار ادا کیے۔

1940ء میں وزیر خان نے ایکس پکچرز کی فلم "دیش بھگت" میں آشا لتا اور ہریش چندر راؤ، من سکھ پکچرز کی فلم کلیانی میں رتن بائی اور جمشید جی اور ہریش چندر پکچرز کی فلم رنگیلا جوان میں مہر سلطانہ اور ہریش چندر راؤ کے ساتھ مختلف نوعیت کے کردار ادا کیے۔

1941ء میں وزیر خان نے اشوک پکچرز کی فلم چندن میں مایا دیوی اور عاشق حسین، ایمپائر پکچرز کی فلم میرے ساجن، میں راج کماری اور جنیت اور ہریش چندر پکچرز کی فلم "ہری جیون" میں حسن بانو اور ہریش چندر راؤ کے ساتھ مختلف نوعیت کے کردار ادا کیے۔

1942ء میں وزیر خان نے آرٹسٹ کمبائن پروڈکشنز کی فلم "جوانی کی پکار" میں کلیانی اور ڈی بلیموریا، سہاگیہ کی فلم دنیا ایک تماشا، میں سردار اختر اور شیام، موہن پکچرز کی فلم "فرمان" میں سروجنی اور انیل کمار، گنیش مووی ٹون کی فلم "لاجونتی" میں رتن بائی اور عاشق حسین اور وشنو ہریش پکچرز کی فلم سکھی جیون میں آشا لتا اور ہریش چندر راؤ کے ساتھ مختلف قسم کے کردار ادا کیے۔

1945ء میں وزیر خان نے سن رائز پکچرز کی فلم "گھر" میں جمنا اور نواب اور واڈیا مووی ٹون کی فلم "پیا ملن" میں نرملا اور موتی لال کے ساتھ کریکٹر رول کیے۔

1946ء میں وزیر خان نے ہند پکچرز کی فلم "وامق عذرا" میں سورن لتا اور نذیر کے ساتھ بطور ولن کام کیا۔ اس فلم کے ہدایت کار نذیر اور موسیقار اے آر قریشی تھے۔ اسی سال وزیر خان نے فضلی برادرز کی فلم "راستہ" میں مایا دیوی اور امر محبوب پروڈکشنز کی فلم "اعلان" میں منور سلطانہ اور سریندر کے ساتھ کریکٹر رول کیے۔ یہ فلمیں 1947ء میں ریلیز ہوئیں۔

تقسیم کے بعد وزیر خان متعدد فلموں میرا منا، پرائی آگ، پیار، گماشتہ، زرک خان، دیار حبیب، کابلی خان، لیلیٰ مجنوں، محبوبہ، نور محل، لیلیٰ، ڈاکو، سخی حاتم میں اداکاری کا مظاہرہ کیا لیکن بدقسمتی سے نئی نسل اس عظیم اداکار اور اس کے کارناموں سے واقف نہیں ہے۔

جاری ہے

شاید ہی ایسا کوئی ملک ہوگا جہاں اس کی فلمیں مقبول نہ ہوئی ہوں

جیمز بانڈ کا خالق

شکیل ادریس

اس کے قلم میں جادو تھا۔ وہ جو کچھ لکھتا اسے پڑھنے کے لیے لوگ انتظار کرتے۔ اس کے ناول ہاتھوں ہاتھ بکتے پھر جب اس کی کہانیوں پر فلمیں بننے لگیں تو اس نے عالمی شہرت حاصل کرلی۔

جیمز بانڈ کی پہلی فلم "ڈاکٹر نو" تھی۔ اسے لوگوں نے پسند کیا اور وہ 007 کے نام سے متعارف ہوئے۔ کچھ وقفے سے اس کی دوسری فلم "فرام رشیا ود لو" پردۂ سیمیں پر کیا آئی کہ ساری دنیا میں دھوم مچ گئی۔ اخبارات نے اس فلم پر یوں تبصرہ کیا کہ یہ فلم ہر انسان کے لیے اس طرح سے ضروری ہے جیسے شام کی چائے کی پیالی۔ جیمز بانڈ کا کردار شون کونری نے ادا کیا تھا جو اس سے پہلے ہرگز ہرگز مقبول و معروف نہیں تھا۔ اسے فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول تو ملتے تھے لیکن اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا۔ فلم کی ریلیز کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ دنیا میں ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھ دی گئی ہو۔ شہرت کی بنیادیں بے حد وسیع و عریض ہوگئیں۔ مارکیٹ میں جیمز بانڈ 007 کے انڈرویئر، بنیان، موزے، جوتے، بیلٹ، قمیص، پتلون، ٹوائلٹ صابن اور کاپیاں پنسلیں تک ملنے لگیں۔ کون سی ایسی چیز تھی جس پر 007 کی چھاپ نہ ہو۔ امریکی صدر جان ایف۔ کینیڈی نے اسے اپنا پسندیدہ ناول قرار دیا اور کہا وہ اسے اپنے سرہانے رکھتے ہیں۔ جب بھی وقت ملتا ہے اسے اٹھا کر ایک بار پھر پڑھ لیتے ہیں۔ ان کا یہ بیان رسالہ 'لائف' میں شائع ہوا تھا۔ ان کے اس بیان نے گویا جیمز بانڈ کے کردار کی بلندی پر تصدیق کی مہر لگادی۔

جیمز بانڈ 007 جاسوس کا خالق آئن فلیمنگ جس کا مکمل نام آئن لنکاسٹر فلیمنگ تھا۔ 28 مئی 1908ء کو لندن برطانیہ میں پیدا ہوا۔ اس کے دادا اسکاٹ لینڈ سے پرتھشائر آئے تھے۔ اس کے بعد وہ ڈنڈی چلے گئے۔ ڈنڈی انیسویں صدی میں صنعت و حرفت کا بڑا مرکز تھا۔ اس کے دادا نے وہاں جوٹ کا کام شروع کیا تو قسمت نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور وہ امرا میں شامل ہوئے۔ پھر ان کا خاندان لندن چلا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اوکسفرڈ شائر میں ایک مکان خرید لیا۔

آئن فلیمنگ کا باپ ویلنٹائن اور ماں ایولائن تھے۔ اس کا باپ بیرسٹر تھا اور پارلیمنٹ کا ممبر بھی مگر اس کے رجحانات اور خیالات پرانے زمانے کے لوگوں جیسے تھے۔ انہوں نے فوج میں ملازمت بھی کی اور جنگ میں حصہ لیتے ہوئے 1917ء میں ہلاک ہوئے۔ وہ ایک مخلص اور محبِ وطن شخص تھے۔ چنانچہ ونسٹن چرچل نے ان کے لیے 'دی ٹائمز' میں ایک تعزیتی پیغام لکھا۔ مسٹر ویلنٹائن کے چار بچے تھے جن میں آئن فلیمنگ دوسرے نمبر پر تھا۔

فلیمنگ چونکہ بچپن ہی سے شرارتی اور ایک مختلف قسم کا بچہ تھا، اس لیے سب اس سے تنگ رہتے تھے۔ مثال کے طور پر اسے گھوڑوں اور کتوں سے بہت محبت تھی، جب کہ خاندان کے دوسرے افراد ان سے دور رہتے تھے۔

جب اس کے والد کا انتقال ہوا، اس وقت آئن فلیمنگ کی عمر نو برس تھی اور وہ ایک بورڈنگ اسکول ڈیورن فورڈ میں پڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو خط لکھا کہ اس کا دل اس اسکول میں نہیں لگ رہا ہے۔ اسے گھر بلا لیا

جائے۔ اس کی ماں ایک مضبوط کردار کی عورت تھی اور بچوں پر اس کی حاکمیت تھی۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد اسے بھاری اثاثہ ملا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ شوہر کی موت کے بعد دوسری شادی نہیں کرے گی، لہٰذا اس نے آئن فلیمنگ اور اس کے بھائی پیٹر کو 1921ء میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایٹون بھیجا جہاں صرف امرا خاندان کے بچے پڑھا کرتے تھے۔ پیٹر کے علاوہ آئن فلیمنگ کے دو بھائی مائیکل اور رچرڈ بھی تھے۔

آئن فلیمنگ کو ایٹون کا ماحول بھی پسند نہیں آیا، کیونکہ اسس کا ماحول تبدیل ہوگیا تھا۔ اس کی شرارتیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ بے پروائی اس کے مزاج میں شامل تھی، لہٰذا وہ ناشتے کی میز پر تاخیر سے آتا۔ کلاس میں اس کی پریزنٹیشن اچھی نہیں ہوتی تھی۔ اپنی عادت وخصلت کی بنا پر اس نے پڑھائی سے زیادہ کھیلوں میں دلچسپی لی اور دوسروں کے مقابلے میں اچھی پرفارمنس دی، لہٰذا اسے "چیمپئن آف دی گیمز" کہا جانے لگا۔ ایک بار فٹ بال کھیلتے ہوئے اتفاق سے بال اس کی ناک پر لگی تو اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ بہت سا خون بہا۔ بہرحال خون بہنا بند ہوگیا اور زخم تھوڑے دنوں بعد مندمل ہوگیا لیکن اس کا چہرہ کچھ عجیب سا ہوگیا۔ لڑکے اسے باگڑ بلا کہنے لگے۔ ٹیچر بھی اسے دیکھ کر منہ بناتی تھیں۔ اس کا نتیجہ اس کے رزلٹ پر پڑا اور امتحان میں اس کے اچھے نمبر نہیں آسکے۔ اس کی ماں کو بہت ناگوار گزرا۔ اس نے آئن فلیمنگ کو ایٹون سے نکلوالیا اور رائل کالج آف سینڈ ہرسٹ میں داخل کرا دیا۔ یہ کالج طالب علموں کی تربیت کرتا ہے اور انہیں افواج کے لیے کارآمد بناتا ہے۔ فلیمنگ کو جب اس کالج میں داخلے کے لیے بھیجا گیا تو اس نے امتحان میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور سارے ملک میں اس کا نمبر آٹھواں آیا۔ جب کہ اس کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ اسے لازمی تربیت کے لیے چن لیا گیا۔ تربیت کے دوران گرمیوں میں اسے آسٹریا بھیجا گیا جہاں اس نے پیرا کی، کوہ پیمائی اور برف پر پھسلنا سیکھا۔

اس نے رائل کالج میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور 1952ء میں اس کا نام کنگز رائلز رائفل کور میں لکھ لیا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک برس بعد کالج چھوڑ دیا اور فوج میں کمیشن نہیں لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ 'سینڈ ہرسٹ' کسی گھوڑے کی طرح ہے، جس کے دونوں سرے خطرناک ہوتے ہیں اور وہ درمیان سے ہیجان خیز ہوتا ہے۔

اس کی ماں چاہتی تھی کہ وہ فارن آفس میں کام کرے لہٰذا اس نے آئن فلیمنگ کو آسٹریا کے ایک پرائیویٹ اسکول میں بھیج دیا جسے ایک ریٹائرڈ برطانوی جاسوس آلڈرین اور اس کی امریکی بیوی فائلز بوٹوم چلا رہی تھی۔ وہاں اس کی تربیت اچھے طریقے پر ہوئی۔ اس کا خاندان مال دار تھا اور روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی، لہٰذا اس کی ماں نے فلیمنگ کو مزید تعلیم کے لیے یورپ بھیج دیا۔ وہ انگلستان، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے گیا۔ وہاں اس نے فرانسیسی، جرمنی اور روسی زبان بولنا سیکھی۔ دورانِ تعلیم اس کے باپ کی تربیت اس کے ذہن پر سوار رہی۔ وہ جب اپنی ماں کے ساتھ چرچ جاتا تھا تو وہ اسے تلقین کرتی تھی کہ وہ دعا مانگے کہ خدا اسے اپنے باپ جیسا بنادے مگر جینوا یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اسے ایک عورت سے عشق ہوگیا اور باپ جیسا بننے کا معاملہ سردخانے میں چلا گیا۔ جب اس کی ماں کو اس فرانسیسی عورت مانیکون پنچاؤ کے بارے میں معلوم ہوا تو بہت آزردہ ہوئی۔ اس نے فلیمنگ کو لکھا کہ وہ اس عورت سے تعلقات ختم کرے اور واپس گھر آجائے۔ فلیمنگ کو اپنی ماں سے بھی محبت تھی چنانچہ وہ اس عورت کو روتا سسکتا چھوڑ کر گھر واپس آگیا۔

یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے فارن آفس میں درخواست دی۔ اس کا ٹیسٹ ہوا لیکن وہ امتحان پاس کرنے میں ناکام رہا۔ اس کا بھائی روٹر نامی نیوز ایجنسی میں ملازم تھا اور اچھی رپورٹنگ کرتا تھا۔ چنانچہ فلیمنگ نے بھی صحافی بننے کو ترجیح دی اور روٹر میں ملازمت کرلی۔ روٹر میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ اس جاسوس کی کہانی تھی جو روسیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا اور وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کے بعد وہ اخبار کی طرف سے نمائندہ بنا کر ماسکو بھیج دیا گیا جہاں وہ چار برس متعین رہا۔ اس دوران میں اس نے ان آٹھ انجینئروں کا دفاع کیا جن پر روس میں رہتے ہوئے جاسوسی کا الزام تھا۔ فلیمنگ کے دلائل سے وہ بری کردیے گئے۔ وہاں قیام کے دوران اس نے روسی ثقافت سے مکمل آشنائی حاصل کرلی۔ اس لیے کہ اس نے کاکیشیا، سمرقند اور تاشقند کا اپنے اخبار کی طرف سے دورہ کرلیا تھا۔ وہ جوزف اسٹالن کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا، لیکن اسٹالن نے اسے وقت نہیں دیا۔

روس سے وہ چین اور پھر انڈیا گیا۔ اس طرح اسے وہاں کے کلچر سے بھی واقفیت ہوگئی۔ وطن واپس آکر اس نے ایک بینک میں ملازمت کرلی اور اسٹاک بروکر کی حیثیت سے چار سال تک اپنا شغل جاری رکھا۔ اسی اثنا میں اس کے بھائی کا انتقال ہوگیا اور اس نے اپنے لواحقین کے لیے ورثے میں کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ فلیمنگ نے اندازہ لگالیا کہ صحافت میں معمولی تنخواہ کے سوا کچھ نہیں رکھا۔ جب وہ اس دنیا سے جائے گا تو اس کے دونوں ہاتھ اور بینک اکاؤنٹ خالی ہوں گے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ "کچھ اور" کرنا ہی مناسب رہے گا۔

43 برس کی عمر میں جب بینک کی ملازمت سے کچھ رقم پس انداز ہونے لگی تو اس نے اپنا فلیٹ خریدلیا اور دوستوں کی پارٹیاں کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے ایک نائٹ کلب 'دی سرکل' بھی جانا شروع کردیا۔ شوق میں جوا کھیلنا شروع کیا تھا مگر بعد میں لت پڑگئی اور اس نے خود کو قلاش کرلیا۔ وہاں اس نے بہت سی خواتین سے آشنائی حاصل کرلی جو اس کے بستر کی زینت بنیں۔ انہی میں ایک شادی شدہ خاتون این روتھر میئر تھی۔ اس کا معاشقہ 1930ء سے چل رہا تھا۔ پھر روتھر کی شادی ایک فوجی سے ہوگئی جو اٹلی کے محاذ پر ہلاک ہوگیا۔ این نے جب بھی فلیمنگ سے شادی کے بارے میں کہا، اس نے ٹال دیا۔ وہ لمبے عرصے کے لیے کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ پہلے شوہر کی موت کے بعد روتھر میئر نے دوسری شادی کرلی لیکن اس کے شوہر نے بھانپ لیا کہ اس کے تعلقات فلیمنگ سے ہیں۔ چنانچہ اس نے 1951ء میں اسے طلاق دے دی۔ فلیمنگ سے عشق کے نتیجے میں (یا بے احتیاطی میں) روتھر میئر کا پاؤں بھاری ہوگیا تو فلیمنگ نے ناچار اس سے شادی کرلی۔ اس وقت اس کی عمر 43 برس اور روتھر 39 برس کی تھی۔ اس شادی کے نتیجے میں اس نے ایک بچے کو جنم دیا جس کا نام انہوں نے کیسپر رکھا۔ فلیمنگ چونکہ پلے بوائے تھا، چنانچہ اس کے مشاغل میں شادی کے بعد بھی کوئی فرق نہ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ناچاقی شروع ہوگئی اور انہوں نے علیحدگی اختیار کرلی۔ کوئی بڑا کام کرنے کا جنون اس کے سر پر سوار تھا، اس لیے اس نے ناول لکھنے کا خاکہ بنایا، صرف خاکہ اس لیے کہ ابھی اسے اچھی طرح سے لکھنا نہیں آتا تھا۔ وہ کوئی ایسی چیز لکھنا چاہتا تھا جو ساری دنیا میں مقبول ومعروف ہو۔ لوگ اس کے آٹوگراف لینے کے لیے پیچھے دوڑیں۔

دوسری جنگِ عظیم میں فلیمنگ برطانوی بحریہ کی سیکرٹ سروس میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہوگیا۔ اس نے دل لگا کر کام کیا تو اس کے عہدے میں ترقی ہوگئی اور وہ ڈائرکٹر کا نائب بن گیا۔ اس کے بعد وہ لیفٹیننٹ اور بعد میں کمانڈر ہوگیا۔ برطانوی بحریہ کی سیکرٹ سروس میں وہ ریئر ایڈمرل جان گاڈفرے کا ماتحت تھا جو برطانیہ کے ٹاپ سیکرٹ ایجنٹ سمجھے جاتے تھے۔ جب اس نے ناول لکھنا شروع کیے تو اس میں جیمز بانڈ کے باس کی حیثیت سے 'مسٹر ایم' کو متعارف کرایا۔ پڑھنے والوں کو اس کردار میں حقیقی جان گاڈفرے کی جھلکیاں نظر آئیں۔ گویا اس نے اب تک جو مشاہدات کیے تھے انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے لگا تھا۔ لکھنے کی عادت اسے سیکرٹ سروس میں ہی پڑگئی تھی، اس لیے کہ وہ جب بھی کسی مہم پر جاتا تھا تو واپسی پر رپورٹ لکھتا تھا۔ اس کی رپورٹیں پسند کی جاتی تھیں۔ اس کے ایڈمرل نے اسے ایک پستول تحفے میں دیا، جو اس نے کافی دنوں تک اپنے ذاتی میوزیم میں سجا کر رکھا تاکہ ان دنوں کی یاد تازہ ہوتی رہے۔

سیکرٹ سروس میں اسے 30 کمانڈو اسالٹ یونٹ کا انچارج بنادیا گیا، جو جرمن افواج کے پیچھے جاکر یہ جائزہ لیتی تھی کہ جرمن کا آئندہ منصوبہ کیا ہے۔ اس یونٹ نے کئی مشن میں کامیابیاں حاصل کیں۔ اٹلی اور سسلی کے کئی محاذوں پر اس یونٹ نے کارنامے انجام دیے۔ اس یونٹ کو بحیرۂ روم کا علاقہ دیا گیا تھا، جس کو یونٹ نے نہایت توجہ سے سنبھالا اور گردوپیش پر گہری نظر ڈالے رکھی۔ گاڈفرے نے اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے مختلف عہدوں پر رکھا، جس سے اس کے تجربات میں اضافہ ہوا۔ اس نے جرمنوں کو شکست دینے کے لیے ایک مفصل رپورٹ گاڈفرے کو دی تھی جس میں ان کی آبدوزوں اور پلاٹون کو تباہ کرنے کے طریقے درج تھے۔ اس کے علاوہ فلیمنگ نے اوکسفرڈ یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر سے ملاقات کرکے ان ملکوں کے تفصیلی نقشے بھی تیار کیے جو جزائر برطانیہ کے اطراف میں تھے، تاکہ فوج کے جوانوں کو اپنا دفاع کرنے میں سہولت ہو۔ جب ان نقشوں کی کتاب شائع ہوئی تو گاڈفرے نے اسے بہت سراہا۔ اس نے امریکا اور برطانیہ کے افسرِ رابطہ کی حیثیت سے بھی کام کیا اور امریکی صدر روزویلٹ سے خط وکتابت بھی کی۔ کافی دنوں تک وہ اسپین میں انٹیلی جنس فریم ورک کا انچارج بھی رہا۔ جرمن نے

اسپین پر قبضہ کر لیا تھا اور برطانیہ وہاں جرمن کو شکست دینے کے لیے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ فلیمنگ کی ذمے داری تھی کہ وہ اسپین میں جرمن افواج کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرے۔ اس کا نام آپریشن جبرالٹر رکھا گیا۔ 6 جون 1944ء کو فلیمنگ کو اس یونٹ سے ہٹا کر مشرقِ وسطیٰ میں جاسوسی کے لیے تعینات کر دیا گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو اسے اپنے خوابوں میں رنگ آمیزی کرنے کا موقع مل گیا۔

دورانِ جنگ ایک بار فلیمنگ کو اینگلو امریکن کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے جمیکا کے جزیرے پر جانا پڑا۔ وہ اس جزیرے کی خوب صورتی سے بہت متاثر ہوا۔ وہاں بم بارود نہیں تھا۔ فضا مسموم نہیں تھی۔ کہیں سے گولیاں چلنے کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ پھل اور کھانے پینے کی اشیا کی فراوانی تھی۔ اس کے علاوہ بیئر بھی وافر مقدار میں دستیاب تھی۔ اس نے سوچا اگر وہ اس جنت نظیر جزیرے پر اپنا مکان بنوا لے تو باقی ماندہ زندگی سکون سے کٹ جائے گی اور وہ اپنے اس منصوبے پر سہولت سے عمل کر سکے گا کہ اسے آئندہ زندگی میں ایک بڑا مصنف بننا ہے۔ اس نے جنگ کے فوراً بعد اپنا مکان بنوا لیا۔ اس مکان کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ائر کنڈیشن نہیں تھا اور نہ گرم پانی کی علیحدہ سے کوئی لائن۔ اس کے باوجود جب اس نے مصنف کی حیثیت سے شہرت پائی تو اس کا مکان 'گولڈن آئی' خاص و عام کی نظروں میں اہمیت اختیار کر گیا۔ فلیمنگ جب بھی وہاں چھٹیاں گزارتا تو گھنٹوں گولف کھیلتا۔ اس کے خوابوں میں امریکا بھی بسا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے امریکا کے بھی سفر کیے۔ کھاؤ، پیو اور رقص کرو اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔

اسے کتابیں پڑھنے اور انہیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ اس نے ایک کتاب فروش کی مدد سے ہزاروں کتابیں جمع کیں جن کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کتابوں نے زندگی کا دھارا تبدیل کر دیا ہے۔ ان میں زیادہ تر سائنسی اور ٹیکنیکل کتابیں تھیں کہ کون سی چیز کیسے ایجاد ہوئی۔ ان میں ڈارون کی مشہورِ زمانہ کتاب کا پہلا ایڈیشن بھی شامل تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کی کتابیں ایک لائبریری نے آٹھ لاکھ امریکی ڈالر میں خرید لیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران اس نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ وہ اپنے جنگی تجربات و مشاہدات اور سیکرٹ سروس کی ریشہ دوانیوں کو ناول کی شکل میں قلمبند کرے گا، لیکن اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے میں وقت لگا اور 17 فروری 1952ء کو اس نے اپنا پہلا ناول 'کاسینو رائل' لکھنا شروع کیا جو اس نے دو ماہ میں مکمل کر ڈالا۔ یہ ناول اس نے اپنے مکان 'گولڈن آئی' میں لکھا تھا۔

ناول کا مسودہ ایک پبلشر جوناتھن کیپ کو دیا گیا، وہ اس کی اشاعت سے ہچکچا رہا تھا، مگر جب فلیمنگ کے بھائی نے اس پر زور ڈالا اور بتایا کہ انگریزی میں اس سے پہلے بہت کم جاسوسی ناول تحریر کیے گئے ہیں، اس لیے یہ ناول ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگا تو اس نے ناول 13 اپریل 1953ء کو شائع کر دیا۔ کاسینو رائل کے مجلد ایڈیشن کی قیمت ۱۰ شلنگ تھی اور وہ 4728 کی تعداد میں شائع ہوا اور اسی مہینے فروخت ہو گیا۔ چنانچہ پبلشر کو ہمت ہوئی اور اس نے ناول کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جو پہلے کی طرح ایک ماہ میں فروخت ہو گیا۔ 1954ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن 8000 کی تعداد میں شائع کیا گیا۔ اس وقت تک جیمز بانڈ کا کردار مشہور ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب یہ ناول پیپر بیک پر شائع ہوا تو بیسٹ سیلر بن گیا، جس سے بعد میں آنے والے ناولوں کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔

فلیمنگ اس زمانے میں کمسلے نیوز پیپرز کا فارن منیجر تھا جو سنڈے ٹائمز بھی شائع کرتی تھی۔ سنڈے ٹائمز میں اس نے 1959ء تک ملازمت کی۔ وہ 1961ء تک ان کی آفس میٹنگوں میں شریک ہوتا رہا اور سنڈے ٹائمز کے لیے مضامین بھی لکھتا رہا۔ ان کے ہاں ملازمت کرنے سے پیشتر فلیمنگ نے یہ درخواست کی تھی کہ سال میں تین ماہ کے لیے اسے چھٹی دی جائے، تاکہ وہ یکسوئی سے ناول لکھ سکے۔ مالکان نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اس طرح سے وہ ہر سال سردیوں میں جمیکا جایا کرتا تھا۔ وہاں حسین عورتیں، شراب اور نرم دھوپ تھی۔ ہر نظارہ جنت نگاہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ تخلیقی صلاحیتیں عود کر آتی تھیں۔ (یقیناً اگر وہ فلیٹ میں رہ رہا ہوتا اور سامنے سے ٹریفک شور مچاتا ہوا گزرتا اور تھوڑی دیر کے بعد سبزی والا آ کر اپنی بھیانک آواز میں آلو لے لو، ٹنڈے لے لو، پیاز لے لو چیختا تو وہ ناول لکھنا درکنار چوتھی کلاس کے طالب علموں کے لیے ایک مضمون بھی نہ لکھ پاتا)

اس کے ناولوں کا مرکزی ہیرو جیمز بانڈ تھا جو سیکرٹ انٹیلی جنس کے ڈبل زیرو سیکشن میں انٹیلی جنس آفیسر تھا۔ اسے عام طور پر M-16 کہا جاتا ہے۔ اس کا کوڈ نمبر 007 تھا۔ فلیمنگ کا کہنا تھا کہ جیمز بانڈ ان سارے سیکرٹ ایجنٹوں کا

مرکب ہے جن سے وہ جنگ کے زمانے میں ملا تھا۔ جیمز بانڈ کے ناولوں میں بین الاقوامی سازشیں، حسین اور بے باک عورتیں، ہنت نئی شرابوں کے جام، جاسوسوں کے استعمال کرنے والے خفیہ ہتھیار اور آلات، نئی چمک دار کاریں ہوتی تھیں، جو قارئین اور ناظرین کے دل میں سنسنی خیزی پیدا کر دیتی تھیں۔ جیمز بانڈ جاسوس کم اور پلے بوائے زیادہ معلوم ہوتا تھا، اسی لیے وہ فلم دیکھنے والوں کے لیے باعثِ کشش رہا۔

جب اس کے ناولوں کی اشاعت بڑھی تو وہ امریکا اور اس کے بعد ساری دنیا میں فروخت ہونے لگے۔ جیمز بانڈ اتنا مشہور ہوا جیسے کوئی نیا مذہب!

جہاں ایک طرف جیمز بانڈ کا کردار ساری دنیا کو پسند آیا وہاں ناقدین نے ناگواری کا اظہار کیا۔ پال جونسن نے کہا۔ ''آئن فلیمنگ کوئی بہت بڑا مصنف نہیں ہے، اس لیے کہ اس نے اپنے کردار کو مشہور کروانے کے لیے جنس کا سہارا لیا ہے۔ اس کے ناولوں میں سوائے حسین لڑکیوں کے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جاسوس ہے، لیکن تشدد پسند۔ جہاں کام سیدھی انگلی سے نہیں نکلتا، وہ اپنا پستول نکال کر گولیاں برسانا شروع کر دیتا ہے۔ 007 کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے، جسے چاہے ہلاک کر سکتا ہے۔ وہ ایک مشن کے دوران سات افراد کو ہلاک کر سکتا ہے۔

مشہور مصنف جان لی کارنے کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیمز بانڈ ایک لائسنس یافتہ مجرم ہے۔ جسے قتل و غارت گری اور تباہی کا لائسنس عطا کیا گیا ہے۔ نام نہاد حب الوطنی کے نام پر وہ خود جرم کرتا ہے۔ معاف کیجیے گا تہذیب یافتہ زندگی میں کہیں اس قسم کا کردار اور قانون کا رکھوالا نہیں ملے گا جو لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے ریوالور سے گولیاں برساتا پھرے۔ کیا برائی کو ختم کرنے کے لیے قانون کے رکھوالوں کو خود برائی اختیار کرنا چاہیے؟ نہ معلوم یہ کس دنیا کا کردار ہے جہاں قانون پستول کی نال سے لکھا گیا ہے۔ جہاں حالات قابو سے باہر ہو رہے ہوں وہاں گولیاں برسانا شروع کر دو۔ واہ صاحب واہ! ہم تو باز آئے جیمز بانڈ سے۔''

دلچسپ بات یہ کہ لوگوں نے اس تنقید کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور نہ صرف یہ کہ اس کے ناول پڑھتے رہے، بلکہ اس کی فلمیں بھی دیکھتے رہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اکیسویں صدی میں اس کی فلموں نے دس کروڑ ڈالر کا بزنس کیا۔

فلیمنگ کو جب..... اپنے اشاعتی ادارے سے چھٹی ملی تو اس نے جمیکا والے مکان میں بیٹھ کر دوسرا ناول لکھا۔ اس نے ۱۹۵۳ء میں ناول نگاری شروع کی تھی جو اس کی موت تک جاری رہی اور اس نے 8 برس میں کل 12 ناول لکھے۔ جنگ کے زمانے میں وہ سیکرٹ سروس میں تھا، اس لیے جاسوسی (اسپائی) ناول لکھنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، تاہم وہ جب بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا، اس کے بارے میں کتابیں پڑھ کر مکمل معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ جب وہ جیمز بانڈ کا پانچواں ناول 'فرام رشیا ود لو' لکھ رہا تھا تو اس نے استنبول کا دورہ کیا اور ساری جگہوں کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد استنبول کی یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر ناظم کلکاواں سے ملاقات کی اور انہیں اپنے ناول کا پلاٹ بتایا تو انہوں نے مفید مشورے دیے اور چند ایسے مقامات کی سیر بھی کرائی جو ناول میں آنا چاہیے تھے۔ اس کے علاوہ استنبول کے نقشے بھی فراہم کیے۔ جب ناول شائع ہوا تو اس نے فلیمنگ کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

اسی طرح سے جب وہ اپنا آٹھواں ناول 'گولڈ فنگر' لکھ رہا تھا تو اس نے اپنے دوست برنارڈ سے ملاقات کی جو روٹر نیوز ایجنسی سے نکل کر ایک بینک میں ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی مدد سے اس نے سونے کی اسمگلنگ پر معلومات حاصل کیں۔ اسی طرح سے جب وہ 'یو اونلی لیو ٹوائس' لکھ رہا تھا تو اس نے ٹوکیو کی سیر کی اور وہاں کے ماحول کو بغور دیکھا، تاکہ پڑھنے والوں کو کوئی تشنگی نہ محسوس ہو۔

جب وہ لکھنے سے اکتا گیا تو اس نے ناولوں پر فلمبندی کا اعلان کیا۔ اسی اثنا میں ہیری سالزمین اور البرٹ آر بروکولی نے اس کے سارے ناولوں کو فلمبند کرنے کے حقوق خرید لیے۔ فلیمنگ نے یہ سودا ایک لاکھ ڈالر میں کیا اور فلموں کی آمدنی سے ۵ فی صد علیحدہ۔ فلموں میں رنگ جمانے کے لیے ہدایت کار اور فلم ساز نے فلیمنگ کے ناولوں کے پلاٹ میں متعدد تبدیلیاں کرنا چاہئیں، جس کی فلیمنگ نے خوشی سے اجازت دے دی۔ شون کونری نے نہایت چابکدستی اور مہارت سے جیمز بانڈ کا کردار پردۂ سیمیں پر پیش کیا اور اسے جیتا جاگتا بنا دیا۔ ابتدا میں اس سے پانچ فلموں کا معاہدہ کیا گیا تھا۔ جب ان پانچوں ناولوں کی فلمبندی کے بعد وہ جیمز بانڈ بننے سے اکتا گیا تو اس نے دوبارہ معاہدہ نہیں کیا۔

اس کے بارے میں وہ کہتا ہے۔ ''ایک بار کسی فلم کے لیے اداکاروں کا چناؤ ہو رہا تھا، میں بھی وہاں چلا گیا۔ فلم ساز نے میری طرف دیکھ کر ناگواری سے کہا کہ تم کس ٹائپ

کے اداکار ہو اور کیا کر سکتے ہو؟ پستول جیب سے نکالا اور فائرنگ شروع کردی۔" یہ سن کر مجھے از حد مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا اگر مجھے واقعی اداکار بننا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ میں جیمز بانڈ کا لبادہ اتار پھینکوں۔ دراصل لوگوں نے میرے اوپر ایک مخصوص لیبل لگا دیا تھا۔ میں جدھر بھی جاتا لوگ کہتے۔ "ہیلو مسٹر بانڈ۔"

وہ کردار میری شخصیت پر چھا گیا تھا۔ لوگ مجھے اداکار کی حیثیت سے نہیں پکارتے تھے، بلکہ کردار کا نام لے کر مخاطب کرتے تھے۔ مجھے اس وقت خوشی نہیں ہوتی تھی بلکہ غصہ آجاتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔"

شون کونری کے بعد راجر مور کو یہ کردار دیا گیا۔ وہ منفرد کردار سینٹ کی سیریز میں سینٹ کا کردار ادا کرکے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکا تھا۔ لوگ اس کی اسمارٹنس سے متاثر تھے۔ اس کے بعد ٹموتھی ڈالٹن اور دوسرے چار اداکاروں نے اس کردار کو پردۂ سیمیں پر پیش کیا۔ (مجموعی طور پر سات اداکاروں نے یہ کردار ادا کیا)۔

'ڈاکٹر نو' اور 'فرام رشیا ود لو' پر بننے والی فلموں نے باکس آفس پر کروڑوں ڈالر کا بزنس کیا اور ہالی ووڈ کا ہر اداکار یہ تمنا کرنے لگا کہ وہ اس کے ناولوں پر بننے والی فلم میں کام کرے۔ 1964ء میں جب 'گولڈ فنگر' کی فلمبندی کی جانے لگی تو آئن فلیمنگ اس کے سیٹ پر گیا تھا۔ وہ اس سے لاعلم تھا کہ اس کے بعد نہ تو وہ کچھ لکھ سکے گا اور نہ اپنی فلموں کے سیٹ پر جاکر بانڈ کو متحرک دیکھ سکے گا۔ اس کی بیماریاں بڑھ چکی تھیں۔ وہ شراب زیادہ پینے لگا تھا اور ہاتھ سے بنے ہوئے پچاس سگریٹ دن میں پھونک دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے کھانے بہت روغنی ہوتے تھے، جنہوں نے اس کے دل پر اثر ڈالا۔ اس کی طبیعت 1950ء کے ابتدائی دنوں میں خراب ہونا شروع ہوگئی تھی۔ جب وہ شہرت کی بلندیوں پر کھڑا تھا اور مہمان اس کے دروازے پر دستک دے رہے تھے تو وہ اپنی علالت کے سبب ان پر اپنے گھر کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹروں سے علاج کرایا اور ان سے مشورہ کیا، لیکن ان مشوروں پر عمل کبھی نہیں کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر مجھے شراب پینے سے منع کرتے ہیں، جب کہ دنیا کی بہترین شرابیں پینے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

اپنی بیوی سے علیحدگی کی بنا پر وہ ذہنی پسماندگی (ڈپریشن) میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں کی جانے والی شراب نوشی بالکل ایسی ہی تھی جیسے آگ پر پٹرول ڈال دیا جائے۔ 1964ء کے ابتدائی دنوں میں اس کے سینے میں درد رہنے لگا۔ معائنہ کرانے کے بعد معلوم ہوا کہ نمونیے کا اثر ہے۔ اس نے علاج شروع کیا، مگر صحت مندی کی رفتار بے حد سست تھی۔ اسی دوران اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ فلیمنگ پر اس کا بھی اثر پڑا۔ وہ بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ اپنی کامیابیوں پر اسے خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ دل گرفتہ اور یاسیت زدہ تھا۔ اگست میں وہ گولف کمیٹی کے ایک اجلاس میں شریک ہونے گیا۔ وہاں اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ 11 اگست کی رات کو اس کے سینے سے منہ کے راستے خون آنے لگا۔ دوسری صبح اس پر بھاری تھی۔ اس نے 12 اگست 1964ء کو کینٹربری میں 56 برس کی عمر میں اس دنیائے رنگ و بو سے رخصت لے لی۔ اسے ویلز کی سرحد کے قریب سیون ہیمپٹن قبرستان میں دفن کیا گیا۔ شومیٔ قسمت اس روز اس کے بیٹے کی بارہویں سالگرہ تھی۔ اس کی بیوی نے 1981ء میں انتقال کیا۔ جب کہ بیٹے کیسپر نے 1975ء میں خواب آور دوائیں کھا کر خودکشی کرلی تھی۔ اس لیے کہ باپ اس کی بارھویں سالگرہ پر مرا تھا، جس سے وہ ذہنی پسماندگی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ بیوی اور بیٹے کو اس کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

کہانیوں کا ایک مجموعہ اور دو ناول اس کی موت کے بعد شائع ہوئے۔ اس کے انتقال کے 25 برس بعد جب کاپی رائٹ ایکٹ کی پابندی ختم ہوگئی تو چار مصنفین نے اس کے کردار پر طبع آزمائی کی اور بانڈ کے ناول لکھے، مگر ان میں سے کوئی بھی مقبولیت کی اوپری سطح کو نہ چھو سکا۔ فلیمنگ کا خاندان معزز اور بارتبہ تھا۔ اس لیے کہ جب اس کے باپ انتقال ہوگیا تو ونسٹن چرچل نے آئن فلیمنگ کو تعزیت کا خط لکھا تھا۔ اسی طرح سے جب آئن فلیمنگ کا انتقال ہوا تو بہت سے مصنفین نے اس کی سوانح حیات لکھیں۔

2008ء میں جب 'دی ٹائمز' نے 1954ء سے لے کر اب تک برطانیہ کے 50 بڑے مصنفین کی فہرست شائع کی تو اس کا نمبر14واں تھا۔ اسی برس اس کی ایک سویں سالگرہ منائی گئی۔ کرائم رائٹرز ایسوسی ایشن نے طبع زاد قلم کاروں کو ہر سال اس کے نام پر ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے نام پر جمیکا کے ائرپورٹ کا نام فلیمنگ انٹرنیشنل ائرپورٹ رکھا گیا ہے، جس کا افتتاح وزیراعظم بروس گولڈنگ نے 12 جنوری 2011ء کو کیا۔

ایف سولہ کے پائلٹ کرنل اسٹرکلن پر یہ خوف ناک حقیقت عیاں تھی کہ اس کے جہاز کی نوک زمین کی طرف ہوگئی ہے اور وہ 2500 میٹر فی منٹ کی رفتار سے زمین کی طرف جا رہا ہے۔

"مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔" وہ بڑبڑایا۔ وہ جو بھی اگلا فیصلہ کرتا اس کی قیمت اس کی زندگی تھی۔ آج کے دن... امریکی ائرفورس کے اس تھنڈر برڈ پائلٹ کے پروگرام میں دل کی حرکت روکنے والے فضائی داؤ پیچ اور بہت تیزی سے غوطے لگانے والے کرتب شامل تھے جن میں غلطی کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں ہوتی لیکن اب ان میں ایک حرکت غلط ہوگئی تھی اور اسٹرکلن کو فوراً دو میں سے ایک مشکل فیصلہ کرنا تھا یعنی آیا وہ جہاز میں بیٹھا رہے اور جہاز سنبھالنے کی کوشش میں اپنی زندگی داؤ پر لگائے یا پھر جہاز کی اخراج والی سیٹ کا بٹن دبا کر جہاز سے باہر نکلنے کی کوشش میں اپنی زندگی کا رسک لے۔ دونوں صورتوں میں اس کی زندگی داؤ پر تھی۔

اگرچہ جہاز کی اخراجی سیٹ نے سیکڑوں پائلٹوں کی جان بچائی ہے مگر ایک کریش ہوتے ہوئے جہاز سے نکلنا اتنا آسان بھی نہیں۔ اخراجی سیٹ کے ہینڈل کھینچنے کا ردِعمل اتنا خطرناک ہوتا ہے کہ پائلٹ اخراجی سیٹ کا ہینڈل اسی وقت کھینچتے ہیں جب انہیں پورا یقین ہوجاتا ہے کہ اب صورتِ حال اخراجی سیٹ کے ردِعمل سے بھی بدتر ہونے والی ہے اور اسٹرکلن کے لیے وہ لمحہ آگیا تھا۔

اڈاہو میں واقع امریکی ائرفورس کے اڈے کے ائرشو 2003ء کا افتتاح البانہ کا 31 سالہ فضائیہ کا کیپٹن اسٹرکلن کرنے والا تھا۔ اس کے جہاز کا نام تھنڈر برڈ 6 تھا۔ اس نے دم بخود رہ جانے والے فضائی کرتب اکیلے ہی دکھانے کی منصوبہ بندی کی ہوئی تھی۔ انتہائی تیز رفتاری سے زمین سے بلند ہونے کے بعد اس نے اپنے کرتبوں کا آغاز کیا۔ پہلے یکدم سیدھا اوپر اٹھنے، جہاز کو پلٹانے اور اوپر نیچے جاتے ہوئے یکدم اوپر اٹھتے ہوئے ایک چکر مکمل کیا۔ اس کے بعد دوسرے تھنڈر برڈ کو اڑنا تھا اور اپنے فضائی کرتب دکھانا تھے لیکن اب اسٹرکلن کو احساس ہو رہا تھا کہ اس کے حساب کتاب میں گڑبڑ ہوگئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اتنی تیزی سے زمین کی طرف جا رہا ہے کہ اب اس کے پاس جہاز سنبھالنے اور واپس فضا میں بلند کرنے کا چانس نہیں ہے۔

"میں ابھی جہاز سے نہیں نکل سکتا۔" اس نے خود کلامی کی مگر ایک دو سیکنڈ بعد ہی اس کا ہاتھ خودکار اخراجی سیٹ کے ہینڈل تک پہنچ گیا۔

"نہیں...... ابھی نہیں۔" اس نے پھر خود کلامی کی۔ "ایک بار پھر جہاز کو سنبھالنے کی کوشش کر دیکھوں۔" اسٹرکلن جانتا تھا رن وے نزدیک ہے اور وہ وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔

"سب سے پہلے تو مجھے جہاز کی بلندی کم ہونے کی رفتار کو روکنا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ "ورنہ میری موت یقینی ہے۔" اسے نظر آرہا تھا کہ جہاز اور زمین گولی کی رفتار سے بھی تیز ایک دوسرے کے نزدیک آرہے ہیں۔ ہر اخراجی سیٹ میں لگا ہوا انجن صرف سیٹ کو باہر نکال سکتا تھا، زمین کی طرف جانے کی رفتار کو کم نہیں کرسکتا تھا اور جہاز جس تیز رفتاری سے نیچے جا رہا تھا وہ صرف اسٹرکلن ہی جانتا تھا۔ اس کے لیے اسے کسی آلے کو دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ اسے

ایک عجیب حادثہ کہ اس کا قد کئی سنٹی میٹر کم ہوگیا

وہ ہوا بازی کا کرتب دکھانے جہاز لے کر فضا میں پہنچا ہی تھا کہ اسے احساس ہوا کچھ نہ کچھ غلط ہوا ہے۔ نیچے تماشائیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ شہر بھر کے لوگ ہوا بازی کا کرتب دیکھنے آئے تھے۔ اگر وہ ہوائی جہاز سے کودتا تو وہ جہاز تماشبین پر گرتا اور اگر اندر رہتا تو اس کی موت یقینی تھی۔ اس کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف 32 سکنڈ تھے۔

32 سکنڈ

اختر شہاب

یہ کوئی [illegible] کرسکتا تھا پھر بھی ہجوم کو جہاز کی ٹکر سے
بچانے کے لیے وہ جہاز میں کچھ اور وقت ٹھہرنے پر مجبور تھا۔ زمین اس کی طرف آتی جارہی تھی۔

تھرٹل کو طاقت سے کھینچتے ہوئے اسٹرکلن کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح جہاز کو اس پوزیشن میں لے آئے کہ اخراجی سیٹ سے باہر نکلنے کی صورت میں وہ نہ صرف محفوظ رہے بلکہ جہاز ہجوم پر گرنے سے بھی بچ جائے۔ تھنڈر برڈ کے پائلٹ کو علم تھا کہ اخراجی سیٹ سے باہر نہ نکلنے کا سب سے بڑا سبب پائلٹ کی ہچکچاہٹ ہوتی ہے کیونکہ پائلٹ باہر نکلنے کی صورت میں زخمی ہونے کے اندیشے سے خوفزدہ ہوتا ہے یا پھر وہ لاکھوں ڈالر مالیت کے قیمتی جہاز کو بچانے کی کوششیں ترک نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے علاوہ اسے زمین پر موجود لوگوں کی قیمتی جانوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس خطرناک صورتِ حال میں اسٹرکلن جانتا تھا کہ اگر موزوں وقت سے پہلے جہاز سے نکلا تو جہاز سے ٹکرا کر گرسکتا ہے اور اس کے علاوہ اس نے اگر ضرورت سے زیادہ بھی انتظار کیا تو اس کی موت یقینی ہے۔ اس کے لیے جان بچانے کا موقع صرف آدھ سیکنڈ کا تھا۔

''اس موزوں وقت سے پہلے اخراجی سیٹ کے مخالف کام کرنے والی قوتیں اس کے کام آسکتی تھیں لیکن اگر اس موزوں اور فیصلہ کن وقت پر میں یہ کام نہ کرسکا تو اخراجی سیٹ کے مخالف کام کرنے والی قوتیں حاوی ہوجائیں گی اور اگر فیصلہ کن وقت گزر گیا تو میرا وجود جہاز کے زمین سے ٹکرانے کے بعد شعلوں کی نذر ہوجائے گا۔'' اس نے سوچا۔

اسٹرکلن کی اس دن کی تمام پرواز کا دورانیہ جو زمین سے فضا میں بلند ہونے، ہوا میں کرتب دکھانے اور جہاز کے واپس زمین پر ٹکرانے تک صرف بائیس سیکنڈ کا تھا۔ جب اس نے اس حقیقت کو محسوس کرلیا کہ اب اسے جہاز چھوڑ دینا چاہیے تو آخرکار اس نے سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اخراجی سیٹ کا ہینڈل کھینچ لیا۔ اب مزید خوفزدہ ہونے کا وقت نہیں تھا۔

جب اسٹرکلن نے ہینڈل کھینچا تو اس کا جہاز زمین سے صرف چالیس میٹر اونچائی پر تھا۔ اور 420 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے زمین کی طرف جارہا تھا۔ اسٹرکلن کے جہاز سے نکلتے نکلتے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جہاز نے 30 میٹر کا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ اسٹرکلن کے جہاز سے نکلنے کے 0.8 سیکنڈ کے بعد جہاز زمین سے ٹکرا کر شعلوں کی نذر ہوگیا تھا۔

اخراجی سیٹ کے [illegible] ہینڈل چھپا ہوا ہے۔ ہینڈل کھینچنے سے سیٹ کے نیچے لگے ہوئے ایک ڈبے سے گیس نکلنا شروع ہوجاتی ہے جو تیزی سے سیٹ کو پھلا دیتی ہے۔ جس کے نیچے.... ایک انتہائی طاقتور اسپرنگ کھلتا ہے جو پائلٹ کے اوپر اور ٹانگوں کی بیلٹ ٹائٹ کرتے ہوئے پائلٹ کو ایک طاقتور جھٹکے سے باہر اچھال دیتا ہے۔

جونہی اخراجی سیٹ کے عمل سے اسٹرکلن اپنی پوزیشن میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی جہاز سے باہر نکلنے کا راستہ دینے کے لیے کینوپی کھل کر جہاز سے علیحدہ ہوگئی اور ایک میکنیکی نظام نے سیٹ کو ایک میٹر اوپر اٹھا دیا تاکہ پائلٹ اور سیٹ سے جہاز کے تمام نظام علیحدہ ہوجائیں۔ اس کے علاوہ آکسیجن مہیا کرنے کا سسٹم جو سیٹ سے منسلک تھا وہ آن ہوگیا۔ جونہی سیٹ اپنے آخری سرے تک پہنچی ایک خانہ کھلا اور گیس نے راکٹ کا شعلہ جلا دیا۔ جس نے دھماکے سے سیٹ کو باہر پھینک دیا۔ ہینڈل کھینچنے اور سیٹ کے باہر نکلنے میں صرف 0.1 سیکنڈ کا وقت لگا۔

کاک پٹ سے باہر نکلنے کے عمل میں جسم پر ردِعمل کرنے والی قوتیں اس قدر ہولناک ہوتی ہیں کہ ٹریننگ میں اس قوت کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا۔ پائلٹ کو صرف مصنوعی طور پر اخراج کی مشق کرائی جاتی ہے جس میں اس قوت کا جو راکٹ سے باہر نکلنے کے ردِعمل کے طور پر جسم پر اثرانداز ہوتی ہے صرف ایک چھوٹا حصہ ہی ہوتا ہے۔

اسٹرکلن F-16 کے جلتے ہوئے ملبے کی بائیں طرف گرا تھا۔ وہ اس قدر شاک کی حالت میں تھا کہ اسے قطعاً اندازہ نہیں ہوا کہ وہ زمین پر ہے۔

آہستہ آہستہ اسٹرکلن کو احساس ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ اسے سب سے پہلا جو خیال آیا... وہ یہ تھا کہ اسے لوگوں کو دیکھنا چاہیے کہ وہ سب بچ گئے ہیں اور کوئی بھی اس کے جہاز کا نشانہ نہیں بنا ہے۔

''وہ ٹھیک ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''وہ لوگ اتنی زیادہ دور نہیں تھے لہٰذا میرے لیے سب سے آسان بات یہی ہے کہ میں چلتا ہوا ان کی طرف جاؤں لیکن اہم بات یہ ہے کہ میرا جہاز کہاں ہے۔'' اس کے خیال میں اسے جہاز کے تباہ شدہ ڈھانچے کے نزدیک ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ اخراج تو صحیح طور پر کرگئے پھر جہاز کے شعلوں سے جل جائیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر اسے جہاز نظر نہیں آیا کیونکہ شعلے یا گاڑھا سیاہ دھواں لہر در لہر اس کے چاروں طرف موجود تھا۔

درحقیقت اسٹرکلن F-16 تباہ شدہ ڈھانچے کے خطرناک حد تک قریب تھا۔ وہ اس لیے نہیں جلا کیونکہ ایک رسّی سے بندھی ایک جان بچانے والی کٹ اس سے پہلے زمین سے ٹکرائی تھی جس نے مٹی کا ایک بادل بنادیا جس کی وجہ سے اس کے چاروں طرف 3 میٹر تک آگ بجھ گئی تھی پر وہ شعلوں میں گھرا ہوا تھا اور اسے احساس تھا کہ کچھ غلط ضرور ہے۔

اخراجی سیٹ اسٹرکلن کو کشش ثقل سے 10 تا 15 گنا مخالف سمت میں کھینچ کر لے جارہی تھی اور اسے محسوس ہورہا تھا کہ اس کا وزن بڑھ کر ایک ٹن ہوگیا ہے۔ اسٹرکلن صرف 0.17 سیکنڈ تک ہی اس عمل سے گزرا کیونکہ اس کے بعد راکٹ سیٹ سے علیٰحدہ ہوگیا۔ یہ بات محسوس کرنے کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ جب راکٹ تیزی سے نکلتا ہے تو انسان کا جسم بھی تیزی سے اوپر جاتا ہے اور اس کا خون اس تیزی میں اس کا ساتھ نہیں دیتا پھر بجائے جسم کے ساتھ حرکت کرنے کے جسم کے نچلے حصے کی طرف جمع ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان لمحاتی طور پر ہوش وحواس سے بے گانہ ہوجاتا ہے۔

اسٹرکلن حواس سے بے گانہ نہ ہوا جبکہ عام طور پر اکثر پائلٹوں کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ جسم میں موجود ہر لچکدار دب جانے والی چیز نچلے طرف دبتی ہے چاہے وہ جسم میں موجود کسی قسم کا مائع ہو یا نرم ٹشو ہو یا کوئی عضو۔ وہ اخراجی سیٹ کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے پاتے۔

جونہی راکٹ جل کر علیٰحدہ ہوا اسٹرکلن کی سیٹ میں موجود نظام نے حساب کتاب سے معلوم کیا کہ یہ اخراج انتہائی کم بلندی اور کم رفتار پر ہوا ہے لہٰذا اس نے سیٹ کے عقب میں ہی موجود ایک راکٹ کو چلادیا۔ یہ اضافی دھماکا اسٹرکلن کے لیے بہت ضروری تھا کیونکہ جب وہ جہاز سے نکلا تو جہاز زمین سے محض 12 فٹ دور تھا۔ اس اضافی دھکے کی وجہ سے وہ تیزی سے 30 میٹر تک آگے چلا گیا۔

اخراجی سیٹ کے باہر نکلنے کے صرف 0.2 سیکنڈ کے بعد مرکزی پیراشوٹ کھل گیا۔ اسٹرکلن کے پاس پیراشوٹ کھلنے سے لگنے والے جھٹکے سے سنبھلنے کا وقت بھی نہیں تھا کیونکہ کاک پٹ میں ایک چھوٹا پیراشوٹ ہی بمشکل آتا ہے اور یہ چونکہ باہر نکلنے کے بعد پائلٹ اپنے وزن سے تیزی سے گرتا ہے تو اس کے پاس پیراشوٹ کو صحیح طرح سنبھالنے اور آرام سے زمین پر اترنے کا وقت نہیں ہوتا۔ لیفٹیننٹ کمانڈر ہیکی بیٹس جو امریکی نیوی اور میرین پائلٹوں کو اخراجی سیٹ پر تربیت دینے کا ماہر ہے کا کہنا ہے "یہ کوئی بچوں کے ایکس گیم کی طرح کی چیز نہیں ہے جس میں لوگ بڑی سہولت اور آرام سے پیراشوٹ سے زمین پر اترتے ہیں اور پھر کھینچے ہوئے پیراشوٹ سنبھالتے ہیں۔ یہ حقیقتاً خطرناک لینڈنگ ہے۔" وہ اس 3 میٹر محفوظ جگہ پر لیٹا انتظار کرتا رہا۔ اسٹرکلن کو اپنے حواس پوری طرح بحال کرنے میں 45 منٹ لگے یعنی اسے شعلوں سے اٹھا کر اسپتال پہنچانے کے 45 منٹ بعد ہی وہ صحیح طرح بات کرنے کے قابل ہوا اور جب وہ ہوش میں آیا تو اسے یہ احساس کے اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اتنا شدید تھا کہ نرسوں کو اس کے جسم سے لگے ہوئے آلات کے الارم بند کرنے ٹھہر اسے دیکھنے کے لیے بھاگ کر آنا پڑا۔

باقی زخموں کے علاوہ اس کی کمر...... کے زخم سب سے زیادہ خطرناک تھے کہ انہیں مندمل ہونے میں مہینوں لگ گئے۔ اس کے علاوہ ایک سائیڈ ایفکٹ جو کسی کو معلوم نہیں تھا وہ اس وقت معلوم ہوا جب اس کی بیوی اس کے ایکسیڈنٹ کے دو دن بعد اس سے ملنے آئی۔ وہ اٹھا اس سے گلے ملا اور پھر یکدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کچھ پریشان سا تھا کیونکہ کوئی چیز اس کے دماغ میں چبھ رہی تھی۔

"ہماری شادی کو دس سال ہوگئے ہیں اور وہ ہمیشہ مجھ سے قد میں چھوٹی تھی۔ آج اس کا قد میرے برابر کیسے ہوگیا؟" اس نے سوچا۔ اصل میں اخراج میں ہونے والا دباؤ پڑنے سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے دب گئے تھے اور اس کا قد چھ سینٹی میٹر چھوٹا ہوگیا تھا۔ اب اس کا قد آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے اور اب اس کے نارمل قد یعنی 178 سینٹی میٹر سے ایک سینٹی میٹر کم ہے۔

اسٹرکلن کا کہنا ہے "میں نے سنا ہے ائرفورس والے صرف دو بار ہی اخراج کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ آپ پر اس کا اثر انتہائی شدید ہوتا ہے۔ اگر ایسی چیز دوبارہ ہوتی ہے تو انہیں یہ بات مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ بھگت چکا ہوں۔ میں بہترین ٹریننگ کا شکر گزار ہوں جس کی وجہ سے میری جان بچی لیکن یہ ایک ایسا تجربہ ہے جسے میں کبھی دوبارہ دہرانے کی خواہش نہیں رکھتا۔"

سب سے اہم بات یہ کہ اگر وہ بروقت فیصلہ نہ کرتا تو فائٹر ہجوم پر گرجاتا اور سیکڑوں لوگ لپیٹ میں آجاتے۔

زورآور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

سندھ کے اس نامور ملا کھڑا پہلوان نے محبت کی مگر یہ محبت حادثاتی تھی۔ کسی نے دشمنی نبھانے کی خاطر محبت نامہ اس کے دشمن کے گھر پھینکا جو محبت کی بنیاد بنا۔ دشمن کی بیٹی سے عشق سندھ کے معاشرے میں ایک نہایت خطرناک بات تھی مگر وہ تو خطروں سے کھیلنا ہی زندگی سمجھتا تھا۔ تبھی تو اس بے مثال کہانی نے جنم لیا۔

سندھ کے ایک نامور پہلوان کا دلچسپ زندگی نامہ

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ اخیر راتوں کا پھیکا چاند، دور کہیں جھکا ہوا تھا اور اس کی مدھم چاندنی بے ترتیب پھیلے، مقدور بھر آبادی والے گوٹھ کے گارے مٹی کی دیواروں اور چھپر نما مکانوں پر عجیب سا طلسم بکھیر رہی تھی۔

جانے کیوں اس چھوٹے سے گوٹھ کی فضا نظلی ہوئی معلوم ہوتی تھی جیسے سب لوگ کسی خوفناک طوفان کے ڈر سے دبکے ہوئے ہوں یا پھر جیسے کچھ ہونے والا ہو، ماحول پر کچھ ایسی ہی اسرار بھری ویرانی اور خاموشی مسلط تھی۔

پرانے قبرستان اور کیکر کے جنگل کی طرف سے گوٹھ کا جو چھوٹا کچا، بل کھاتا راستہ جاتا تھا، وہاں تین گھڑ سوار نمودار ہوئے جن کے چہروں پر اجرکوں کے ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں سے خونیں چمک مترشح تھی۔ ان تینوں کی پشت پر روسی ساختہ کلاشنکوفوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ ان تینوں نے سیاہ رنگ کی کھلے گھیر والی قمیصیں پہن رکھی تھیں۔

گھوڑوں کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ ایسا شاید دانستہ کیا گیا تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی دھمک زیادہ بلند نہ ہونے پائے۔

''اڑے سوڈھل! تو اپنا گھوڑا آگے لے آ...... اور ماسٹر پیرل کے گھر تک پہنچ۔ ہمارے پاس وقت نہیں اس کا گھر ڈھونڈنے کے لیے۔'' ان تینوں میں سے ایک نے جو نسبتاً زیادہ ڈیل ڈول کا مالک تھا، تحکمانہ انداز میں کہا۔

سوڈھل نامی اس کا وہ ساتھی اس کے دائیں طرف تھا۔ اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی تھی۔ اب وہ تینوں آبادی میں داخل ہو چکے تھے۔

سوڈھل نے اپنا گھوڑا ان دونوں سے آگے بڑھالیا تھا۔ وہ اب ان کی راہنمائی کرتا ہوا، ذرا دیر بعد ہی ماسٹر پیرل کے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ باقی دونوں اس کے ساتھی بھی قریب پہنچ گئے اور پھر یہ تینوں گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔

تینوں نے پہلے گردوپیش پر ایک نگاہ ڈالی، اس کے بعد نسبتاً بھاری جسامت والے نے سوڈھل سے سرگوشی میں پوچھا۔

''اڑے تجھے پورا یقین ہے کہ ماسٹر پیرل کا یہی گھر ہے؟''

''ہاؤ سائیں! یہی ماسٹر پیرل کا گھر ہے۔'' سوڈھل نے جواباً کہا۔

''ہوں......!'' بھاری جسامت والے ڈھاٹا پوش نے ایک غراہٹ سے مشابہ ہنکارا ابھرا تھا۔ اس کے بعد اس نے ان دونوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اس کے دونوں ساتھی فوراً حرکت میں آئے اور اپنے کاندھوں کی بیک وقت زوردار ٹکر سے ناپختہ چوکھٹ والے لکڑی کے سالخوردہ دروازے کو توڑ ڈالا۔

بھاری جسامت والے ڈھاٹا پوش نے جو بلاشبہ ان کا سرغنہ تھا، سوڈھل کو باہر ہی چوکسی پر کھڑے رہنے کا حکم دیا اور خود اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ اندر گھس گیا۔

گھر کے مختصر سے کچے صحن میں دو رلی بچھی چارپائیوں پر دراز مرد و عورت یکدم ہڑبڑا کر جاگ اٹھے۔ سرغنہ کے دوسرے ساتھی گہرام نے عورت پر گن تان لی، عورت کی مارے خوف کے گھگھی بندھ گئی۔ مرد جو اس کا شوہر تھا، وہ بھی پریشان اور تشویش زدہ نظر آنے لگا جس پر سرغنہ نے اپنی کلاشنکوف تان رکھی تھی۔ پھر اس نے اسے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے ساتھی سے اس کی تصدیق کرتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا ''یہی ماسٹر پیرل ہے؟''

''ہاؤ سائیں۔'' گہرام نے تصدیق کی۔

سرغنہ نے اپنی گن ماسٹر پیرل کے سینے پر چبھوئی اور اپنی اجرک کے ڈھاٹے کے عقب سے جھانکتی خونخوار چمکتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے غرا کے بولا۔ ''کیوں ڑے ماسٹر! ہمارے سردار سائیں کی مخبری کر کے تجھے سرکار نے کتنا بڑا انعام دے دیا؟''

دہشت زدہ عورت جو یقیناً ماسٹر پیرل کی بیوی تھی، اس نے ہی نہیں بلکہ اس کے شوہر نے بھی سمجھ لیا کہ معاملہ صرف گھر میں ڈاکو یا چور گھس آنے کا نہیں تھا بلکہ اس سے زیادہ سنگین تر تھا۔

ماسٹر پیرل نے کچھ کہنا چاہا مگر سرغنہ نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور پھر اسے دھکا دے کر چارپائی سے زمین پر گرا دیا۔ اس کے بعد دوبارہ اس کے سینے پر اپنی رائفل کی نال رکھ دی اور بڑے نفرت آمیز لہجے میں بولا ''پر...... سرکار نے تو تجھے بہت چھوٹا انعام دیا ہوگا، اصل انعام تو میں تجھے دوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے ذرا پرے ہٹ کر اس کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ رات کے پُرہول سناٹے میں اس کی رائفل نے آتشیں قہقہے بلند کیے اور ماسٹر پیرل کا وجود گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔

ماسٹر کی بیوی اپنے شوہر کو خون میں غلطاں دیکھ غش کھا کے چارپائی پر گر پڑی۔ دونوں ڈھاٹا پوش فوراً گھر سے باہر نکل گئے۔

کوٹھری نما کمرے سے دو سہمے ہوئے نوعمر لڑکے برآمد ہوئے اور پھر اپنے باپ کی خون میں لت پت لاش کو دیکھ کر رونے لگے۔ وہ دونوں اب یتیم ہو چکے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن پورے گوٹھ میں کہرام بپا تھا۔ گوٹھ کے لوگوں کو بہت پہلے سے اس سانحے کی توقع تھی کیونکہ اس سے پہلے بھی کچھ عرصہ ہوا دو ایسے ہی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ یہ تیسرا واقعہ تھا۔

ماسٹر پیرل کا بھی یہی قصور تھا کہ اس نے ایک صوبائی شہرت یافتہ بدنام دھاڑیل (ڈاکو) محبت شیدی کی مخبری کی تھی۔

مخبری کیا تھی، بلکہ اس نے محبت شیدی ڈاکو کو اپنے ہی گوٹھ کے ایک زمیندار اللہ ورایو کی اوطاق میں آتے جاتے دیکھ لیا تھا۔

اس کی اطلاع پر پولیس نے زمیندار اللہ ورایو کی اوطاق کی نگرانی شروع کر دی اور جیسے ہی وہاں ڈاکو محبت شیدی نظر آیا، پولیس نے چھاپا مار کر اسے گرفتار کر لیا۔

اگرچہ ماسٹر پیرل کا راز اس کے تحفظ کی وجہ سے صیغۂ راز میں ہی رکھا تھا مگر مخبری کرنے والے کی بھی ''مخبری'' ہو گئی، دو لاکھ کا انعام اس کے لیے موت ثابت ہوا۔

گڑھی خیر محمد، دریائے سندھ کے قریب واقع تھا۔ یہ ضلع خیرپور کا ایک مختصر آبادی رکھنے والا غیر معروف گاؤں تھا۔ یہاں کے لوگ کھیت مزدوری کیا کرتے تھے۔ پڑھے لکھے لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ ان میں ماسٹر پیرل بھی تھا۔

اس کے دو ہی بیٹے تھے جو نوعمر تھے۔ ماسٹر پیرل ایک پرائمری ٹیچر تھا اور اپنے ہی گوٹھ کے بچوں کو پرائمری تعلیم دیتا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے بھی اسی اسکول میں پڑھتے تھے۔ دونوں کی عمروں میں صرف ایک سال کا ہی فرق تھا۔ بڑا خیر بخش تھا جو تیسری جماعت میں تھا اور اس کا چھوٹا بھائی دھنی بخش دوسری جماعت میں تھا۔

گوٹھ کے چند دیگر بچوں کی طرح یہ دونوں بھائی بھی اپنے گلے میں دو چار کتابوں کا بوسیدہ سا کپڑے کا تھیلا نما بستہ جھلائے باپ کے ساتھ سائیکل پر اسکول جایا کرتے تھے۔

خیرپور کے اس چھوٹے سے نواحی گوٹھ میں ایک ہی اسکول تھا جو پرائمری سطح کا تھا۔ اس کے علاوہ ایک گورنمنٹ ڈسپنسری تھی۔ کچھ دوری پر واقع احمد پور میں ایک مڈل سیکنڈری اسکول تھا۔ مزید پڑھنے کے لیے خیرپور کے کالج میں داخلہ لینا پڑتا تھا جہاں ہوسٹل بھی تھا۔

پڑھائی کا رجحان آج کے مقابلے میں کم ہی تھا۔ وہاں کے لوگ باگ اپنے بچوں کو بھی جن کی ذرا مسیں بھیگنے لگتیں، کام کاج یا کھیت مزدوری میں لگا دیا کرتے تھے، تاہم بچوں کو ابتدائی پانچ جماعتوں کی تعلیم دلوانا لوگ ضروری سمجھتے تھے کہ تھوڑا بہت حساب کتاب ہی جان لیں تاکہ منشی گیری کر سکیں۔ عموماً یہ بھی اپنے بڑوں کے ساتھ کھیت مزدوری کیا کرتے یا پھر اینٹوں کے بھٹے پر پسینا بہاتے۔

بدنصیب مقتول پیر محمد المعروف ماسٹر پیرل ایک غریب ہاری کی اکلوتی اولاد تھی۔

اس کا باپ رحیم بخش ایک وڈیرے کا منشی تھا اور اس کی زمینوں کا حساب کتاب سنبھالتا تھا۔ سادہ طبیعت اور نیک نفس انسان تھا۔ لوگ بھی اس سے خوش تھے، رحیم بخش نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ پیر محمد اس کی پہلی بیوی مائی سکینہ کے بطن سے تھا جبکہ دوسری بیوی حاجراں خاتون بے اولاد تھی مگر رحیم بخش نے کبھی بھی دونوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کی تھی۔ نہ ہی دوسری بیوی کو بے اولادی کا طعنہ دیا تھا۔ وہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتا تھا، نماز پنجگانہ کا پابند تھا۔

گوٹھ کے دیگر چند گنے چنے لوگوں کی طرح اس کی بھی یہ خواہش تھی کہ اس کا بیٹا پیر محمد تھوڑا پڑھنا لکھنا سیکھ جائے۔

پیر محمد نے پوری بارہ جماعتیں پڑھ ڈالیں اور پھر بی اے کر لیا۔ اس زمانے میں بی اے بہت بڑی ڈگری تصور کی جاتی تھی بلکہ بعض لوگ تو فخر سے اپنے نام کے ساتھ بی اے لکھا کرتے تھے۔ بہرطور پیر محمد کو اپنے ہی گوٹھ کے اسکول میں پرائمری ٹیچری مل گئی اور ''ماسٹر'' کا لاحقہ اس کے نام پیرل کے ساتھ چسپاں ہو گیا۔

ماسٹر پیرل ایک سیدھا سادا نوجوان تھا۔ اپنے ہی خاندان کی لڑکی اور بچپن کی منگیتر نوراں سے اس کی شادی کر دی گئی۔ اس کے دو بچے ہوئے، ماسٹر پیرل ان کی تعلیم پر پوری توجہ دیا کرتا تھا۔ خطرناک دھاڑیل محبت شیدی والے معاملے میں اس کی بدنصیبی کے دن شروع ہوئے اور وہ انتقاماً مارا گیا۔

زمیندار اللہ ورایو کو بھی ماسٹر پیرل پر اس طرح کا غصہ تھا کہ اس نے اس کی مخبری کی تھی اور یوں اس کی ذات کے لوگ بھی ماسٹر پیرل اور اس کے خاندان سے نفرت کرنے لگے تھے۔ ان کے درمیان سرد جنگ چلی آ رہی تھی۔ بدنصیب ماسٹر پیرل کی بیوہ جانتی تھی کہ وہ بے بس و مجبور ہے مگر وہ کم ہمت نہ تھی، نہ ہی بے حوصلہ۔

شوہر کے بہیمانہ قتل کے بعد نوراں مائی کو اس کے بہی خواہوں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اب اس گوٹھ کو چھوڑ دے مگر نوراں نہ مانی تھی۔

اس نے اب اپنی ساری توجہ اپنے دونوں نوعمر بیٹوں پر لگا دی تھی۔

خیر بخش اور دھنی بخش اب بھی بستے گلے میں لٹکائے اسکول جاتے تھے مگر اب اسکول جاتے ہوئے ان دونوں

معصوم بھائیوں کی آنکھوں میں اداسی ہوتی تھی کیونکہ اب انہیں سائیکل پہ لانے لے جانے والا بابا نہ تھا۔

بچوں کے اداس چہرے دیکھ کر نوراں مائی کے دل پر کیا گزرتی تھی، یہ وہی جانتی تھی۔ وہ آج بھی اٹھتے بیٹھتے اپنے شوہر کے سفاک قاتلوں کو بددعائیں دیتی رہتی تھی۔

قریب کے ایک دوسرے گوٹھ میں اس کا ایک بڑا بھائی جاڑو خان رہتا تھا۔ ایک دن وہ بہن اور بھانجوں سے ملنے آیا۔

''ادی نوراں! میرا خیال ہے تو میرے ساتھ چل گوٹھ چلی چل۔ میں تجھے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔'' اس روز اس نے بہن سے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا۔

''نہیں ادا! میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔'' نوراں نے دکھ کے غبار کو سینے میں دباتے ہوئے کہا۔

''ادی...... یہ ضد اچھی نہیں ہوتی، اللہ ورایو کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اسے پیرل کی جان لینے کے باوجود بھی چین نہ ہوگا۔''

مائی نوراں اپنے بھائی جاڑو خان کے ساتھ ضرور جاتی مگر وہ اپنی نک چڑھی بھابی کو بھی جانتی تھی اور بھائی کو بھی، اس نے کہا۔

''ادا! اب بھلا دشمنوں کو ہم سے کیا بیر ہو سکتا ہے؟ میرا شیر جیسا مڑس (شوہر) جان سے مار ڈالا، انہیں اب مجھ سے کیا ملے گا؟''

بہن کی بات پر جاڑو خان نے ایک گہری سانس لی اور اپنے کاندھوں پر دھری اجرک جھاڑتے ہوئے سر پر رکھی شیشوں کے کام والی سندھی سرخ ٹوپی کو درست کرتے ہوئے کھڑے ہو کر کہا۔ ''تیری مرضی ادی نوراں! میں کیا کہہ سکتا ہوں، پر میں آتا رہوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے۔ ''یہ رکھ لے۔''

''یہ کیا...... ادا! ابھی میں اتنی کمزور نہیں ہوئی ہوں۔''

''اللہ سائیں نہ کرے، تو کمزور پڑے...... پر بہن کا بھائیوں پر حق ہوتا ہے۔ یہ رکھ لے۔'' اس نے یہ کہہ کر زبردستی بہن کے ہاتھ میں روپے پکڑا دیے۔

☆☆☆

نوراں مائی کو ٹوپیاں سینے کا فن آتا تھا۔ یہی نہیں وہ خوبصورت پراندے اور سندھی، بلوچی کی دلکش کڑھائی بھی بناتی تھی۔ اس نے یہ کام شروع کر دیا۔ ایک بڑھیا اس سے یہ ثقافتی شاہکار لے کر شہر جاتی، مہنگے داموں فروخت کرتی پھر آدھے سے زیادہ پیسے خود رکھ کر باقی نوراں مائی کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھی۔

نوراں کے لیے یہ بھی کافی تھے۔ اس کا ایک خواب تو بلکہ یہ اس کے شوہر ماسٹر پیرل کا خواب تھا کہ اس کے دونوں بیٹے پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جائیں۔

گوٹھ کے دیگر غریب، معصوم اور سادہ لوح لوگوں کی طرح نوراں مائی بھی اپنی چھوٹی آنکھوں میں بڑے خواب بنا کرتی تھی۔

خیر بخش اور دھنی بخش دونوں بھائی اسکول تو باقاعدگی سے جاتے تھے مگر اب پڑھائی سے ان کی دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی۔ اسکول جانا ان کے لیے اب صرف کھیل بن چکا تھا۔

آدھی چھٹی (ہاف ٹائم) کی جب گھنٹی بجتی تو دونوں بھائی اسکول کی بوسیدہ پیلی عمارت کے عقب میں بنے میدان میں آ جاتے تھے جدھر سارے بچے مختلف ٹولیاں بنا کر کھیلا کرتے تھے۔ ان کی ایک لڑکے رب ڈنو کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی۔ بڑا سا رب ڈنو ایک ملھ پہلوان کا بیٹا تھا۔ وہ اسکول کے بچوں سے میدان میں کشتیاں لڑا کرتا تھا۔ خیر بخش اور دھنی بخش کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتا تھا۔

تینوں ابھی بچے تھے، انہیں ابھی ملھ پہلوانی کے داؤ پیچ یا قواعد کا علم نہ تھا مگر نتیجہ یہ نکلتا کہ ان کے چنگل میں زبردستی پھنسنے والا شکار بری طرح زدوکوب ہوتا۔

کسی نہ کسی بچے کی ان تینوں کے ہاتھوں روز پٹائی ہوتی تنگ آ کر ہیڈ ماسٹر نے رب ڈنو کے باپ روشن خان کو بلا لیا اور اس سے اس کی شکایت کر ڈالی۔ روشن خان المعروف روشو پہلوان ایک لمبا تڑنگا معروف ملھ پہلوان تھا، اس نے اپنے بیٹے کی شکایت سنی پھر مونچھوں پر تاؤ دے کر فخر سے سینہ پھلا کر بولا۔ ''ماشٹر صاحب! رب ڈنو ایک ملھ پہلوان کا بیٹا ہے...... اگر وہ تھوڑا بہت ہاتھ دکھا دیتا ہے تو کون سا قہر ٹوٹ جاتا ہے؟''

اس کی ڈھٹائی پر ہیڈ ماسٹر کو بڑا غصہ آیا، وہ بولا۔ ''تو ٹھیک ہے پھر...... اپنے بیٹے کو اسکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے، اسے کہو کہ ملھ کے میدان میں جا کر ہاتھ دکھائے۔''

اور پھر اس دن کے بعد رب ڈنو نے واقعی اسکول آنا چھوڑ دیا۔

ہیڈ ماسٹر جانتا تھا کہ خیر بخش اور دھنی بخش کو رب ڈنو نے ہی خراب کیا تھا، اب وہ دونوں خود ہی سدھر جائیں گے۔ مگر دونوں بھائیوں کو رب ڈنو کے بغیر اسکول میں اب ذرا بھی مزہ نہ آتا تھا۔ رب ڈنو نے ان کی رگ

میں جوشِ پہلوانی کی جو لہریں منتقل کر دی تھیں، یہ اس کے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اب یہ دونوں بھائی کسی نہ کسی کو تختۂ مشق بناتے رہتے۔

ایک روز ان دونوں کے ہاتھوں ایک لڑکے کی پٹائی ہوئی جو دشمن برادری سے تعلق رکھتا تھا اور اس مضروب لڑکے کا باپ زمیندار اللہ ورایو کا قریبی رشتے دار بھی تھا۔ لڑکے نے روتے ہوئے اپنے باپ سے ان دونوں کی شکایت کر دی۔ باپ کو یہ پتا چلا تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور اسکول جا پہنچا۔

مضروب لڑکے کے باپ صیفل مراد نے دونوں بھائیوں خیر بخش اور دھنی بخش کو بلوا کر اپنے آدمیوں سے ان کی خوب ٹھکائی کروا دی۔ ہیڈ ماسٹر بے چارہ دیکھتا رہ گیا۔ اسے کچھ بولنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

''ماشٹر، میں آئندہ ان دونوں کو اسکول میں نہ دیکھوں...... ورنہ ادھر تو نظر نہیں آئے گا۔''

صیفل مراد یہ دھمکی دے کے چلا گیا۔

دونوں معصوم بچے اپنے سے کئی گنا بڑی عمر کے ہٹے کٹے آدمیوں سے بری طرح مار کھاتے، روتے بلکتے گھر کو دوڑے اور اپنے بستے بھی اسکول سے نہیں اٹھائے۔

ماں نے اپنے دونوں معصوم جگر کے ٹکڑوں کو اس حالت میں دیکھا تو اپنا سینہ پیٹ ڈالا اور اجرک اوڑھ کر وہ اسکول جا پہنچی۔ ''ماسٹر صاحب، کیا اب اسکول کے اندر بدمعاشی بھی ہونے لگی ہے؟''

پچاس سالہ ہیڈ ماسٹر محمد ملوک نے مائی نوراں کے چہرے پر اپنی گھورتی نظریں مرکوز کیں اور اس کی بات کا مطلب سمجھ کے بولا۔ ''بدمعاش تو تیرے یہ دونوں لاڈلے ہیں مائی جو روز کسی نہ کسی کو یہاں مارتے پیٹتے رہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، یہ اسکول کے بچے ہیں، آپس میں کھیلتے بھی ہیں اور لڑتے بھی ہیں، آپ کو انہیں سزا دینے کا حق ہے مگر باہر کے آدمی یہاں آ کر بچوں کی پٹائی لگانا شروع کر دیں، یہ تو کھلی بدمعاشی ہے۔'' مائی نوراں نے بھی اسی برہمی کے ساتھ کہا۔

''ارے مائی، شکر کر کہ میں نے ان دونوں شیطانوں کو اسکول سے نہیں خارج کیا۔ مجھے ماسٹر پیرل کا خیال آتا ہے ورنہ......''

اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو مائی نوراں نے بھی تڑسے جواب دیا، آخر کو وہ بھی اسکول ٹیچر کی بیوہ ہی تھی۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے شہر جا کر بڑے صاحب (ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر) سے اس کی شکایت کرنی پڑے گی۔''

ہیڈ ماسٹر محمد ملوک کی دھمکی کے مقابلے میں مائی نوراں کی دھمکی زیادہ قابلِ غور اور اثر پذیر ثابت ہوئی، جبھی وہ فوراً نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ مائی، شکر کرو...... اتنے میں ہی گلوخلاصی ہو گئی۔ تو نہیں جانتی کہ تیرے ان دونوں لاڈلوں نے کس بری طرح بچے کی پٹائی لگائی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے مائی نوراں کو ساری حقیقت بتا دی۔ یہ سن کر مائی نوراں پریشان ہو گئی۔

ہیڈ ماسٹر محمد ملوک نے اسے سمجھایا ''دیکھ، انہیں گھر لے جا کر سمجھا دے کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کریں۔ تو ماسٹر پیرل کی بیوہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو دوبارہ کسی بڑی مصیبت میں پڑے۔''

مائی نوراں سمجھ دار خاتون تھی۔ وہ ہیڈ ماسٹر محمد ملوک کا اشارہ سمجھ گئی اور اپنے دونوں بچوں کو لے کر خاموشی سے لوٹ آئی۔

☆☆☆

دوسرے دن خیر بخش اور دھنی بخش اسکول نہیں گئے۔ انہیں بخار ہو گیا تھا۔ مائی نوراں ان کے لیے حکیم سے دوائی لے آئی۔

جس دشمن برادری کے بچے کی انہوں نے مار لگائی تھی، اس کا نام ور محمد تھا۔

''ادا! ہم کل اسکول جا کے وریل کی پھر مار لگائیں گے۔ اپنا بدلہ ضرور لیں گے۔'' چھوٹے بھائی دھنی بخش نے بڑے غصے کے ساتھ اپنے بڑے بھائی خیر بخش سے کہا۔

خیر بخش شاید بڑے ہونے کے ناتے کچھ سمجھ دار تھا۔ تاہم غصہ اسے بھی تھا، بولا۔ ''نہیں ادا! ہم اب اس سے بدلہ نہیں لے سکتے۔''

''کیوں ادا! تو اس وریل سے ڈرتا ہے؟'' دھنی بخش نے آنکھیں پٹپٹا کر کہا۔

''بات ڈرنے کی نہیں ہے دھنی! مجھے ڈر ہے کہیں ہیڈ ماسٹر ہمارا نام ہی اسکول سے نہ کاٹ دے۔''

''تو کاٹ دے پھر...... مجھے اس کی پروا نہیں، میں وریل سے ضرور انتقام لوں گا۔'' چھوٹا بھائی اڑ گیا۔

''دل تو میرا بھی کرتا ہے......'' خیر بخش کچھ سوچتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ ''اچھا ایسا کرتے ہیں کل بھی اسکول نہیں جائیں گے...... اور راستے میں وریل کی خوب

ٹھکائی کرڈالیں گے۔"

دونوں بھائیوں نے منصوبہ بنالیا۔

اگلے دن دونوں اسکول کے لیے گھر سے روانہ ہوئے۔ وہ دن انہوں نے اسکول میں دریل کو صرف غصے سے گھورتے ہوئے گزارہ۔ جب اسکول کی گھنٹی بجی تو دونوں نے دریل کا واپسی میں تعاقب کیا اور ایک نسبتاً ویران راستے میں اسے پکڑلیا اور پھر اس کی خوب ٹھکائی لگادی اور اسے روتے ہوئے چھوڑ کر دونوں اپنے گھر بھاگ لیے۔

اگلے دن دریل کا باپ آگ بگولا ہو کے اپنے قریبی رشتے دار اللہ ورایو کو لیے اسکول پہنچا اور ہیڈ ماسٹر پر دباؤ ڈال کر خیر بخش اور دھنی بخش کا نام اسکول سے خارج کروا کے ہی چھوڑا۔

جب دونوں بھائی اگلے دن اسکول پہنچے تو ہیڈ ماسٹر نے انہیں ایک پرچہ تھما کر واپس گھر بھیج دیا۔

"ادا! کیا ماسٹر صاحب نے ہمیں اسکول سے نکال دیا ہے؟" دھنی بخش نے بڑے بھائی سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے...... ہم بھی اسکول نہیں جائیں گے۔ رب ڈنو نے بھی تو اس گندے اسکول میں آنا چھوڑ دیا تھا۔" دھنی بخش منہ بسور کر بولا۔ "مگر گھر جائیں گے...... تو ماں مارے گی ہمیں۔"

"ماں کو بتائیں گے ہی نہیں۔"

"تو پھر یہ سارا دن کہاں گزاریں؟"

"آؤ میرے ساتھ......" خیر بخش نے کہا اور پھر دونوں رب ڈنو کے پاس پہنچے۔ اسکول سے نکلنے کے بعد وہ اپنے باپ کے ساتھ بھینسوں کا باڑا سنبھالتا تھا اور دودھ فروخت کرتا تھا۔

اس وقت وہ تنہا ہی تھا۔ رب ڈنو نے اپنے دو دوستوں کو دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ تینوں دوست گھنٹوں باڑے میں چھپّر تلے کھیلتے رہے۔ آپس میں ملھ کشتی میں لڑتے رہے۔ ملھ کشتی سے تو بچہ بچہ واقف تھا مگر رب ڈنو کا معاملہ اور تھا کیونکہ وہ تو تھا ہی ایک ملھ پہلوان کا بیٹا۔

جب کافی وقت گزرا اور دونوں بھائیوں نے اسکول کا وقت ختم ہونے کا اندازہ کیا تو انہیں واپس گھر جانے کا ہوش آیا۔ دونوں بھائیوں نے جلدی جلدی قمیصیں پہنیں اور بستے سنبھالے اور اگلے دن پھر آنے کا وعدہ کر کے گھر کی طرف ہو لیے۔

دونوں بھائی گھر پہنچے تو ماں یہ سمجھی کہ اسکول سے پڑھ کر لوٹے ہیں۔ انہوں نے بھی ماں کو نہیں بتایا کہ ہیڈ ماسٹر نے ان دونوں کے نام اسکول سے خارج کردیے ہیں۔ نہ ہی یہ کہ انہوں نے آج کا سارا دن اسکول کی بجائے رب ڈنو کے باڑے میں گزارہ تھا۔

اگلے دن بھی اسی طرح وہ اسکول جانے کی بجائے سیدھے رب ڈنو کے پاس پہنچے۔ اس وقت رب ڈنو کا باپ بھی موجود تھا... دونوں بھائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ رب ڈنو اپنے باپ کے ساتھ ملھ کشتی لڑ رہا تھا۔ رب ڈنو نے ان دونوں بھائیوں کو بھی شامل کرلیا۔

اب ان دونوں بھائیوں کا یہ روز کا معمول بن چکا تھا۔ وہ دونوں بہ ظاہر اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلتے اور اسکول کی بجائے سیدھے رب ڈنو کے باڑے میں جا پہنچتے۔

لیکن آخر کب تک......؟

ایک روز جب دونوں بھائی حسبِ معمول بستے لٹکائے گھر پہنچے تو ماں پہلے ہی سے ان پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے دونوں بیٹوں کے نام تو کب کے اسکول سے خارج کیے جاچکے تھے۔ نیز یہ بھی کہ دونوں لاڈلے اتنے دن اسکول کا یہ وقت کہاں اور کیسے گزارتے تھے۔ دونوں اچھلتے کودتے گھر پہنچے تو ماں نے ان دونوں پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ ماں مارتی بھی جاتی اور آنسو بھی بہاتی جاتی۔

"بدبختو! باپ کیا مرا ہے، تم نے اپنے راستے ہی بدل لیے۔ اپنے رنگ ڈھنگ ہی اور کرلیے...... بولو، مجھ سے کیوں جھوٹ بولا؟ ماسٹر صاحب نے تمہارے نام اسکول سے کیوں خارج کیے؟"

دونوں کیا جواب دیتے، مار کھاتے ہوئے روتے رہے۔

چھوٹا زیادہ چالاک ثابت ہوا اور روتے ہوئے ماں سے بڑے بھائی کی شکایت کرنے لگا۔

"مجھے...... ادا خیرو نے منع کیا تھا کہ میں یہ بات تمہیں نہ بتاؤں اور اسی کے کہنے پر میں اسکول کی بجائے رب ڈنو کے باڑے میں وقت گزارنے لگا۔" چھوٹے بھائی کے اس سفید جھوٹ پر بھی خیر بخش کچھ نہ بولا۔ اسے غصہ بہت آیا تھا مگر خاموش رہا۔

ماں کو ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے دونوں لاڈلوں کے دماغ میں ملھ پہلوانی کا سودا سما گیا ہے۔

اگلے روز صبح اس نے اجرک سنبھالی، دونوں بچوں کو نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور اسکول لے جا کر سیدھی ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں پہنچی۔ "ماسٹر صاحب! یہ مجھے بتا رہے تھے کہ آپ نے ان کے نام اسکول سے خارج کردیے ہیں؟"

ہیڈ ماسٹر محمد ملوک نے سفید عدسوں والی عینک کے عقب سے پہلے... دونوں بھائیوں کو گھورا جو ماں کے دائیں بائیں گلے سے کتابوں کے بوسیدہ بستے لٹکائے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ پھر عینک اتار کر نوراں مائی سے بولے۔ "ان شیطانوں نے یہ نہیں بتایا کہ...... ان کے نام اسکول سے کیوں خارج کیے گئے ہیں؟"

جواباً مائی نوراں نے نفی میں سر ہلادیا۔

"مائی! تیرے ان دونوں لاڈلوں نے دوبارہ صیقل مراد کے بیٹے در محمد کی پٹائی کی تھی۔"

یہ سن کر مائی نوراں نے اپنا کلیجا تھام لیا۔ بات تشویش ناک تھی، وہ پریشان ہوگئی۔ پھر ہیڈ ماسٹر محمد ملوک کی منت سماجت کی اور التجائیہ انداز میں بولی۔ "ماسٹر صاحب! اس بار آپ انہیں داخل کرلیں، اب یہ ایسا نہیں کریں گے، میں نے انہیں خوب مارا ہے۔"

"نہیں، یہ اب ممکن نہیں رہا۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "مجھے ماسٹر بیرل کا خیال آگیا تھا اس لیے میں نے ان کا بیڈ کریکٹر سرٹیفکیٹ جاری نہیں کیا...... اب اور میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"نہیں نہیں، ماسٹر صاحب! یہ ظلم نہ کرنا۔ میرے بچوں کا مستقبل تباہ ہوجائے گا۔" نوراں مائی ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ "روزِ محشر میں ان کے پیو (باپ) کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ آپ اس بار...... بلکہ آخری بار معاف کردیں، یہ پھر ایسا کبھی نہیں کریں گے، کسی کے ساتھ نہیں کریں گے۔"

اسے داد فریاد کرتے دیکھ کر ماسٹر صاحب چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی میں مستغرق ہوگئے، اس کے بعد دھیمے لہجے میں بولے۔

"ایک صورت ہوسکتی ہے... اگر در محمد کا باپ معاف کردے اور ان دونوں کی سفارش کردے تو......"

ماسٹر محمد ملوک کی بات سن کر مائی نوراں سوچ میں پڑ گئی۔ بالآخر یہی ایک صورت جان کر وہ واپس ہوگئی۔

وہ عجیب پریشانی کا شکار تھی، جانتی تھی کہ در محمد کون ہے اور ان کے ساتھ کیسی دشمنی چلی آرہی ہے۔ وہ ان سب کو اپنے شوہر کا قاتل سمجھتی تھی اور ان کی صورتوں سے بھی اسے نفرت تھی۔ چہ جائیکہ اب وہ انہی کے پاس رحم کی بھیک مانگنے جاتی۔

گھر آ کر اس نے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے دوبارہ بچوں کو پیٹنا شروع کردیا۔ پٹائی کے دوران اس کی زبان سے وہ الفاظ بھی نکل گئے جو وہ کم از کم اپنے دونوں بچوں کو سنانا نہیں چاہتی تھی۔

"کم بختو! اب مجھے تمہاری خاطر تمہارے باپ کے قاتلوں کے آگے جھکنا پڑے گا۔ ننگے سر اُن کے آگے ہاتھ جوڑنا پڑیں گے، جن کی صورتوں سے بھی مجھے نفرت ہے۔"

بچوں کو مارتے مارتے تھک گئی تو خود بھی پلو میں منہ چھپا کر رونا شروع کردیا۔ چھوٹا دھنی بخش ہولے ہولے سسک سسک کر رو رہا تھا جبکہ بڑے بھائی خیر بخش کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

غم زدہ ماں کے لبوں سے باپ کے قاتلوں کا تذکرہ سن کر اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اس سیاہ رات کا خونی منظر گھوم گیا۔ جب اس نے اپنے باپ کی لاش کو خون میں ڈوبا پڑے پایا تھا۔

نوراں مائی نے اپنے آنسو پونچھے، اس کے بعد اس نے اپنا منہ دھویا، اجرک...... کو سنبھالا۔ دونوں کو گھر پر رہنے کی سخت تنبیہ کرنے کے بعد دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ... بڑے بیٹے خیر بخش نے عجیب سے لہجے میں پکارا۔

"ماں......!"

مائی نوراں رک گئی پھر پلٹ کر اسے گھورتے ہوئے بولی "کیا ہے؟"

"ہم بھی تیرے ساتھ چلیں گے، تجھے اکیلا نہیں جانے دیں گے۔"

"تم دونوں میں اتنی غیرت اور شرم ہوتی تو آج مجھے دشمنوں کی چوکھٹ پر فریاد کرنے جانا نہ پڑتا۔" نوراں نے تڑپ کر کہا اور دروازے سے باہر چلی گئی۔

خیر بخش کھلے صحن میں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

در محمد کا باپ صیقل مراد ایک چھوٹی سطح کا زمیندار تھا۔ وہ اس وقت اپنی اوطاق میں، جو مکان کے ساتھ ہی ملحقہ تھی، بیٹھا اپنے منشی اور چند ہاریوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا کہ نوراں مائی اندر داخل ہوئی۔

اسے دیکھ کر صیقل مراد کے چہرے پر نفرت کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ اسے خشمگیں نظروں سے گھور کر کرخت

لہجے میں بولا "اے مائی، یہاں کیا کرنے آئی ہے؟"

نوراں کو اس کے لہجے سے ٹپکتی تحقیر صاف محسوس ہوئی۔ وہ خون کا گھونٹ بھرتی ہوئی ملتجیانہ لہجے میں اس سے بولی۔ "سائیں! مجھے ماسٹر صاحب نے سب بتا دیا ہے کہ میرے بچوں نے کیا حرکت کی تھی۔ میں نے اپنے دونوں لڑکوں کو خوب مارا ہے، آیندہ وہ ایسا نہیں کریں گے، مہربانی کرکے آپ ماسٹر ملوک سے کہہ دیں کہ...... وہ میرے دونوں بچوں کو اسکول میں داخل کر دے۔"

اس کی بات سن کر صیقل مراد اپنی گھنی بھویں اچکا کر تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ "ہرگز نہیں، تیرے چھوکروں کو چربی چڑھ گئی ہے۔ وہ تو شکر کر کہ میں نے صرف نام کٹوایا ہے...... ورنہ تو میں نے ان دونوں پلّوں کو یہاں لا کر ان کی چمڑیاں ادھیڑ ڈالنی تھیں۔"

اس کا اہانت آمیز رویہ مائی نوراں کے سینے پر جیسے رندا چلا گیا۔ مگر وہ مجبور تھی اور بے بس بھی۔ لاچار لہجے میں بولی۔ "سائیں! آخری بار ان دونوں کو معاف کر دو، آپ کو اللہ سائیں کا واسطہ، میرے بچے اسکول سے نکل جائیں گے تو رل جائیں گے۔"

"ہاں تو رل جانے دے۔ وہ پڑھ لکھ کر کون سا تیر مار لیں گے۔" صیقل مراد استہزائیہ لہجے میں بولا "یا پھر مخبری کریں گے اور اپنے باپ کی طرح کتے کی موت مارے جائیں گے۔"

"صیقل مراد......!" اپنے شوہر مرحوم کے ذکر پر نوراں مائی یکا یک ناگن کی طرح پھنکاری مگر پھر دونوں بچوں کا خیال آتے ہی ضبط سے کام لے کر بولی "میں تیرے پاس بڑی امید......"

"بس مائی بس......!" صیقل مراد نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا "یہاں سے دفع ہو جا...... تو عورت ذات ہے اس لیے تجھے باعزت یہاں سے جانے دیا جا رہا ہے ورنہ تو یہاں سے اپنے پیروں پر واپس نہ جاتی۔ چل جا یہاں سے۔ دیکھتا ہوں ماسٹر کیسے تیرے بچوں کو اسکول میں داخل کرتا ہے۔"

نوراں مائی اپنی غم زدہ آنکھوں میں اشک سمیٹے لوٹ آئی۔ اب بچوں کو مار مار کر بھی تھک گئی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ بچوں کو کون سے اسکول میں داخل کرائے؟ گوٹھ میں ایک ہی پرائمری اسکول تھا یا پھر قریب کے گوٹھ میں ایک پرائمری اور مڈل اسکول۔

کیا وہ اپنے بچوں کو احمد پور کے اسکول میں داخل کروا دے...... مگر وہ دور پڑتا تھا، پھر اس نے سوچا دوسرے بچے بھی تو چھٹی ساتویں پڑھنے کے لیے احمد پور پیدل جایا کرتے ہیں۔

خیر بخش اور دھنی بخش کو احمد پور کے پرائمری اسکول میں داخلہ مل گیا۔

گوٹھ احمد پور، گڑھی خیر محمد سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ نوراں مائی کو اس کے لیے صبح منہ اندھیرے جاگنا پڑتا مگر کڑکڑاتی سردیوں میں یہ کام مزید دشوار ہو گیا۔ نتیجتاً دونوں بچے جلد ہی اسکول جانے کی "مشقت" سے گھبرا گئے۔

اسکول سے لوٹتے تو تھک کر نڈھال ہوتے اور شام تک پڑے سوتے رہتے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ دونوں کا دل پڑھائی سے اکتانے لگا۔

چند دن تو یہ سب اسی طرح چلتا رہا مگر پھر وہی ہوا، دونوں بھائیوں نے اسکول جانے کی بجائے رب ڈنو کے باڑے میں جانا شروع کر دیا اور اسکول سے غیر حاضر رہنے لگے۔

روشو پہلوان بھی ان دونوں بھائیوں سے اس لیے خوش تھا کہ یہ دونوں اس کے بیٹے کے دوست تھے بلکہ بسا اوقات تو رب ڈنو خیر بخش اور دھنی بخش کو اپنا بھائی بھی کہا کرتا تھا۔ چنانچہ رب ڈنو کے ساتھ دوستی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دونوں بھائی روز بروز قابلِ رشک صحت اختیار کرنے لگے اور ملھ پہلوانی کے گر بھی سیکھنے لگے۔

ایک دن رب ڈنو نے دونوں بھائیوں سے کہا۔ "دیکھو، اگر تم نے اسکول جانا بالکل ترک کر دیا تو یہ بہتر نہ ہوگا۔ تمہارا نام اسکول سے دوبارہ کاٹ دیا جائے گا۔"

"کاٹ دیا جائے، پر ہمیں اس کی پروا نہیں۔ ہم تو ملاکھڑا پہلوان بنیں گے۔ تم نے بھی تو اسکول جانا چھوڑ دیا۔ کوئی آسمان تو نہیں ٹوٹ پڑا۔"

دونوں بھائیوں نے اسے منہ بسور کر جواب دیا تھا۔

"وہ تو صحیح ہے...... مگر تمہاری ماں...... وہ بہت پکی ہے تمہیں اسکول بھیج کر ہی چھوڑے گی۔" رب ڈنو بولا۔

دونوں بھائی خاموش رہے بالآخر طے یہ پایا کہ اسکول سے نام کٹوانے سے بہرحال بچنا چاہیے ورنہ ماں پیچھے پڑ سکتی ہے اور ایک بار پھر ان کا یہاں آنا بند ہو سکتا ہے۔

لہٰذا اب روز نہیں تو دو دو، تین تین دن بعد اسکول جانا ضروری سمجھا گیا تاکہ ماں بھی مطمئن رہے اور ان کا کام بھی چلتا رہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، ماں کو ایک بات پر حیرت تھی کہ روکھی سوکھی کھانے والے خیر بخش اور دھنی بخش کی صحت قابلِ رشک ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے چہروں پر خاص قسم کی سرخی عود کر آئی، جسم میں پھرتیلا پن آ گیا اور قد کاٹھ نکالنے لگے تھے۔ یہی نہیں، دونوں بھائیوں کو اس نے اکثر گھر کے ناپختہ صحن میں ملھ لڑتے بھی دیکھا تھا اور ملھ لڑنے کے انداز میں کہیں سے بھی بچکانا پن نہیں جھلکتا تھا، یوں لگتا تھا جیسے تربیت یافتہ ملاکھڑا پہلوان بڑی چابکدستی کے ساتھ معیاری داؤ پیچ آزما رہے ہوں۔

ماں کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اتنا تو اسے معلوم تھا کہ ان دونوں بھائیوں کی دوستی گوٹھ کے ایک معروف ملاکھڑا پہلوان روشن خان المعروف روشو پہلوان کے بیٹے رب ڈنو سے ہے۔ چنانچہ ایک روز نوراں مائی نے ان کے اسکول احمد پور جانے کا ارادہ کیا کہ جا کر ماسٹر سے مل کر ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے کہ یہ پڑھائی میں کیسے ہیں۔ کہ اسی دوران وہ عورت جو کہ دستی شاہکاروں کے نمونے شہر لے جا کر فروخت کیا کرتی تھی، اس نے آنا چھوڑ دیا۔

اب کیا ہوگا؟ وہ انہی سوچوں میں حیران و پریشان بیٹھی تھی اور دونوں لڑکے صحن میں ایک دوسرے کے ساتھ ملھ کشتی میں مصروف تھے۔ وہ دونوں ماں کی پریشانی سے یکسر بے نیاز اپنے کھیل میں مگن تھے۔ دونوں اگلی کلاسوں تک پہنچ گئے تھے اور مطمئن تھے کہ ماں ان کی تعلیم سے متعلق چالاکی سے آگاہ نہیں ہے کیونکہ خیر بخش ساتویں کلاس میں پہنچ گیا تھا اور چھوٹا چھٹی میں۔

مائی نوراں اپنی الجھنوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ بچوں کے لیے نئی کلاسوں کی کتابیں بھی خریدنا تھیں اور کپڑے جوتوں کا بھی بندوبست کرنا تھا مگر یہاں تو کھانے کے لالے پڑے ہوئے تھے، پڑھائیاں کہاں سے ہوتیں۔

چند دنوں بعد واقعی کھانے کے لالے پڑ گئے۔ نوراں مائی بے چاری پریشان ہو گئی۔ اسکول کی سالانہ فیس تک جمع نہ کروا سکی تھی، نتیجتاً دونوں کا نام اسکول سے خارج کر دیا گیا۔ ویسے بھی کون سا دونوں بھائی اسکول جاتے تھے۔ دونوں خوش تھے۔

وہ ماں کی پریشانیوں اور مصیبتوں سے بے نیاز اپنے دوست رب ڈنو کے ساتھ سارا دن ملاکھڑا کرتے رہتے تھے۔ اسکول سے نام خارج ہو جانے کے بعد تو جیسے انہیں مزید کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔

مائی نوراں نے اگلے دن صبح سویرے بوسیدہ کپڑوں کی پوٹلی باندھی اور سر پر اینڈوا رکھا، پوٹلی اس پر ٹکائی اور شہر روانہ ہو گئی۔

پرانے ماڈل کی ایک ڈاٹسن گاڑی... خیر پور کے اندرون، اریب قریب کے گوٹھوں میں مسافروں کو لایا لے جایا کرتی تھی۔ نوراں مائی بھی اس میں سوار ہو کر خیر پور پہنچی اور بازار جا کر دکان دکان پر اس نے اپنے دستی نمونے بہ مشکل فروخت کیے، کچھ پیسے ملے جس کا اس نے روزمرہ کا گھریلو راشن پانی خریدا اور سہ پہر لوٹنے والی اس ڈاٹسن گاڑی میں واپس اپنے گوٹھ پہنچی۔

گھر پہنچی تو دونوں بیٹے غائب تھے۔ وہ پہلے ہی پریشان اور آزردہ تھی پھر بچے بھی اسکول سے خارج کر دیے گئے تھے۔ وہ ان کی آوارہ گردی سے سخت عاجز تھی۔ تھکی ہاری اور پریشان تھی، اسے غصہ آ گیا۔ راشن گھر میں پھینک کر وہ الٹے پاؤں رب ڈنو کے باڑے میں پہنچی...... وہاں کوئی نہ تھا۔ کسی نے بتایا کہ اکھاڑے میں جا کر دیکھے۔ وہ وہاں پہنچی تو اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو نیم برہنہ ملھ لڑتے دیکھا۔ اس نے دونوں کو کانوں سے دبوچا اور تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے انہیں گھر لے آئی۔

"بے غیرتو، تم دونوں کو شرم نہیں آتی، سارا دن آوارہ گردی کرتے رہتے ہو۔ اپنی ماں کی پریشانیوں کا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں...... تمہاری پڑھائی چھوٹ گئی۔ گھر کا چولہا سرد پڑ گیا۔ دشمنوں نے الگ پریشان کر رکھا ہے۔ میں تمہارے پیٹ کا جہنم بھروں یا دشمنوں کی سازشوں کو دیکھوں...... اور تم ہو کہ تمہیں ماں کی پریشانیوں اور دکھوں کا ذرا بھی احساس نہیں، نہ جانے کہاں سے تمہیں اتنا کھانے کو مل جاتا ہے جو تم نے اتنی چربی چڑھا رکھی ہے۔"

وہ ہلکان ہو کر ہانپنے لگی۔

چھوٹا دھنی بخش خاموش تھا۔ بڑا خیر بخش ماں سے بولا۔ "اماں، تو نے تو کبھی اپنی پریشانی کے بارے میں ہمیں بتایا ہی نہیں۔"

"بتا دیتی تو کون سا تیر مار لیتے؟" ماں نے غصے سے کہا۔ "کیا تم اس گھر میں نہیں رہتے؟ نظر نہیں آتا...... کچھ۔"

''ٹھیک ہے ماں! اگر یہ بات ہے تو ہم کمانا بھی جانتے ہیں۔ تو کل سے شہر نہیں جائے گی، رہی بات دشمنوں کی تو ان سے بھی ہم نمٹ لیں گے۔''

خیر بخش نے پورے جوش سے کہا۔ نوراں مائی نے اپنے بڑے بیٹے کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھا۔

پندرہ سال کی عمر میں اس کا قد جھنگر کے درخت کی طرح لمبا ہو گیا تھا، آنکھوں میں معصومیت کی جگہ ایک شہ زور قسم کی سرخی نے لے لی تھی۔ نوراں مائی کو یوں لگا جیسے خیر بخش ایک پل میں جوان ہو گیا ہو۔

''تو کیا کمائے گا؟ آتا کیا ہے تجھے؟'' اس نے خیر بخش کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر کے پوچھا تو چھوٹے بیٹے نے بھی جوش پکڑا اور خیر بخش کے بولنے کی بجائے وہ ماں سے بول پڑا۔

''اماں! ادا خیر بخش نے ایک بڑے ملھ مقابلے میں حصہ لیا ہے جو دو روز بعد خیر پور میں ہونے والا ہے۔ پہلے اور دوسرے نمبر پر آنے والے ملھ پہلوان کو..... ایک ہزار انعام ملے گا...... اور مجھے پورا یقین ہے کہ ادا خیر بخش کا پہلا نہیں تو دوسرا نمبر ضرور آئے گا۔''

مگر نوراں مائی نے ان دونوں کی باتوں کو بچوں کی بڑ پر محمول کیا مگر حقیقت یہی تھی کہ خیر بخش واقعی ایک دیہی سطح کی جونیئر ملھ پہلوانوں کی ٹیم میں شمولیت حاصل کر چکا تھا اور اگلے برس چھوٹا بھائی دھنی بخش بھی اسی ٹیم میں باقاعدہ ایک جونیئر ملھ پہلوان کی حیثیت سے شامل ہونے والا تھا۔

دوسرے دن خیر بخش پوری تیاری کے ساتھ صبح تڑکے روشو پہلوان کے اکھاڑے میں پہنچا۔ دھنی بخش بھی ساتھ تھا۔ وہ یہ ملھ مقابلہ دیکھنے کی غرض سے جا رہا تھا۔ البتہ روشو پہلوان کا بیٹا اور ان دونوں بھائیوں کا جگری دوست رب ڈنو بھی اس مقابلے میں شامل تھا۔ تیسرا پہلوان لڑکا بھی اسی گوٹھ کا تھا۔ اس کا نام نادر پنہور تھا۔

روشو پہلوان کی سربراہی میں یہ تینوں جونیئر ملھ پہلوان خیر پور کے اکھاڑے میں اترے۔

دیہی سطح کے ان چھوٹے پہلوانوں کا ملھ مقابلہ ایسا ہی تھا جیسے محلے اور گلیوں کی سڑکوں میں کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ مگر بہرحال ملھ دیکھنے کے شائقین نے اُدھر کا بھی رخ کیا تھا۔

مقابلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے روشو پہلوان کا بیٹا، رب ڈنو میدان میں اترا۔ اس نے مخالف گوٹھ کے دو لڑکوں کو ملھ مات دی مگر تیسری اور چوتھی ملھ مات اسے مل گئی۔

اس کے بعد نادر اترا، وہ پہلے ہی مقابلے میں ہار گیا۔

خیر بخش کو آخر میں اتارا گیا تو اس نے ایک ہی بلّے میں چار پہلوان لڑکوں کو ملھ مات دے ڈالی اور پہلے انعام کا مستحق ٹھہرا جبکہ رب ڈنو کو دوسرا انعام ملا۔

چھوٹا بھائی دھنی بخش اپنے بڑے بھائی کی فتح پر خوشی سے نعرے بلند کرنے لگا۔

جب خیر بخش سو سو کے دس نوٹ لے کر گھر پہنچا، اس نے یہ نوٹ اپنی ماں کی ہتھیلی پر رکھے تو نوراں مائی کبھی خیر بخش کا چہرہ دیکھتی تو کبھی اپنی ہتھیلی پر رکھے سو سو کے نوٹوں کو۔ اتنی آمدنی تو کبھی اس کے شوہر نے بھی ہاتھ پر نہیں رکھی تھی اور نہ ہی اس نے خود کبھی کمائے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔

روشو پہلوان نے خیر بخش کو اس کی فتح پر واجبی سی مبارک باد دی تھی۔ درحقیقت وہ اندر سے ملول تھا کہ اس کا اپنا بیٹا رب ڈنو پہلے نمبر پر کیوں نہیں آیا تھا؟ اس نے اس بات پر سبکی محسوس کی تھی کہ ایک پہلوان کا بیٹا دوسرے نمبر پر آیا تھا جبکہ ماسٹر پیرل کا بیٹا، جس کا ملھ پہلوانی میں کوئی بیک گراؤنڈ نہ تھا، وہ پہلے نمبر پر آیا تھا۔ مگر باپ کے برعکس اس کے بیٹے رب ڈنو نے بڑی فراخ دلانہ خوشی و مسرت کے ساتھ اپنے دوست خیر بخش کو مبارک باد دی تھی اور اسے گلے سے لگایا تھا۔

تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات خیر بخش نے بھی محسوس کی تھی کہ اب روشو پہلوان اس پر تھوڑی کیا، بالکل بھی توجہ نہیں دیا کرتا تھا۔

خیر بخش بے چارہ خود ہی اپنی عقل اور فہم و فراست کے مطابق کسرت کیا کرتا تھا، اس کے بعد اس نے اپنے چھوٹے بھائی دھنی بخش کو بھی باقاعدہ گوٹھ کی سطح کی ملھ ٹیم میں شامل کرا دیا۔ اگرچہ دھنی بخش کسرت میں پہلے بھی مصروف رہتا تھا۔

یہ بات نہ صرف نادر اور خیر بخش نے بلکہ رب ڈنو نے بھی محسوس کی تھی کہ اس کا باپ دونوں بھائیوں پر زیادہ توجہ نہیں دیا کرتا تھا، یہی نہیں اب تو روشو پہلوان کے بغض کی انتہا اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ وہ بلاوجہ ہی اکثر و بیشتر دونوں بھائیوں میں نقص نکالا کرتا تھا، اگرچہ نادر بھی تھا مگر روشو اس سے مطمئن تھا۔

درحقیقت وہ صرف اپنے بیٹے رب ڈنو کو ایک معروف

اور زور آور پہلوان کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

ایک روز تو اس نے دونوں بھائیوں سے باقاعدہ فیس کے نام پر بھتا لینے کا بھی تقاضا کر دیا کیونکہ وہ ان دونوں بھائیوں کی غیر مستحکم مالی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ دونوں اس کے بیٹے رب ڈنو کے جگری دوست بھی تھے اس لیے اس نے ان دونوں کو اپنے اکھاڑے سے خارج کرنے کا یہ طریقہ نکالا تھا۔

اس روز کے بعد دونوں بھائیوں نے روشو پہلوان کے اکھاڑے میں جانا موقوف کر دیا۔ رب ڈنو بھی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا مگر باپ کے سامنے وہ بھی خود کو مجبور سمجھتا تھا۔

دونوں بھائیوں نے اب گھر میں ہی کسرت شروع کر دی تھی مگر یہ کسرت بھی خوراک مانگتی ہے، یہاں تو ایک وقت کی روٹی ملتی تو دوسرے وقت فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ ماں الگ بیمار رہنے لگی تھی۔ اسے پرانی کھانسی تھی اور اکثر وہ بیمار رہتی تھی۔ روشو پہلوان کا اکھاڑا چھوڑنے یا بہ الفاظ دیگر نکالے جانے پر انہیں کسی ملھ مقابلے میں بھی نہیں شریک کیا جاتا تھا۔

ایک روز دھنی بخش نے پریشان ہو کر بڑے بھائی سے کہا ''ادا خیر بخش، مقابلہ ہماری ضرورت ہے، ہمارا امتحان بھی۔ اگر ہم مقابلے میں شریک نہیں ہوں گے تو ہمارے فن اور زور آوری کا کس طرح پتا چلے گا؟'' چھوٹے بھائی کی بات معقول تھی۔

خیر بخش بولا ''تو پھر کیا کریں؟ روشو استاد نے ہمیں بڑی چالاکی کے ساتھ اکھاڑے سے بے دخل کر دیا ہے۔ ہمارے گوٹھ میں کون سرپرستی کرنے والا ہے؟ ہمارے ماضی (خاندان) میں بھی کوئی ملاکھڑے کا پہلوان نہیں گزرا، ہم نے اب تک اس عمر میں جو کچھ سیکھا، اپنی کوششوں اور اپنے بل بوتے پر سیکھا ہے۔ اس میں بھی ہمارے دوست رب ڈنو کی مہربانی تھی کہ اس نے یہاں تک بھی ہماری مدد کی مگر اس کے باپ روشو نے ہمارے ساتھ جانبداری برتی اور بڑی چالاکی سے ہمارے لیے اپنے اکھاڑے کا راستہ بند کر لیا۔''

یہ سب کہتے ہوئے خیر بخش کی آواز بھرا گئی۔ اندر کا بک نما کوٹھری سے ماں کے کھانسنے کی آواز ابھری۔ دونوں بھائی چونک کر اندر گئے۔ ماں چارپائی سے نصف نیچے فرش پر جھکی بلغمی خون تھوک رہی تھی اور کھانستے کھانستے بے حال ہو رہی تھی۔

دونوں بھائیوں نے اسے سنبھالا مگر ماں کا کھانستے کھانستے اور خون تھوکتے برا حال ہو گیا تھا۔ نوراں مائی کو دق (T.B) ہو گئی تھی۔ اس وقت اس موذی اور متعدی مرض کی تشخیص کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا، وہ اسی طرح خون تھوکتے تھوکتے مر گئی۔

خیر بخش اور دھنی بخش بھری دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ ان بے چاروں کی ابھی عمریں ہی کتنی تھیں۔ خیر بخش سولہ برس کا تھا جبکہ دھنی بخش پندرہویں میں لگا تھا۔ مگر حالات ان دونوں بھائیوں کے لیے بہترین استاد ثابت ہوئے تھے۔ ان دونوں کو اتنی سی عمر میں ہی جینے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔

دونوں بھائی صبح تڑکے کھیتوں میں نکل جاتے۔ کڑکڑاتی سردی ہو یا کڑکتی دھوپ، یہ دونوں سارا دن مشقت کیا کرتے تھے۔

دونوں کی زندگی بن ماں باپ کے لشتم پشتم گزر رہی تھی۔

خیر بخش اور دھنی بخش نے غیرت کے ساتھ قد کاٹھ نکالا تھا۔ خیر بخش کو ذرا ترقی ملی تھی، اس نے وڈیرے کے کھیتوں میں ٹریکٹر چلانا شروع کر دیا جبکہ دھنی بخش نے فارم سنبھال لیا۔

گوٹھ میں بھی ملھ مقابلے ہوتے تھے۔ یہ ان میں شریک تو نہیں ہو سکتے تھے مگر ملھ مقابلہ دیکھنے ضرور جایا کرتے تھے۔ ان کی نظروں میں اشتیاق بھی ہوتا اور حسرت بھی، چھوٹا دھنی بخش کچھ زیادہ ہی کڑھا کرتا تھا۔

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ملھ کے دوران دو پہلوانوں کے درمیان جا کودے۔ اس کی رگوں میں دوڑتا خون ایسا ہی جوش مارا کرتا تھا۔

گوٹھ کا یہ ملھ مقابلہ دیکھنے کے بعد دونوں اترے ہوئے چہروں کے ساتھ واپس آتے تھے۔ رب ڈنو کی شہرت آس پاس کے گوٹھوں میں پھیلنے لگی۔

وہ خیر بخش کا ہم عمر تھا۔ دونوں اٹھارہویں سال میں داخل ہو چکے تھے مگر رب ڈنو باقاعدہ اکھاڑے کا زور آور پہلوان بن چکا تھا اور آس پاس کے گوٹھوں اور دیہاتوں میں ہونے والے ملھ مقابلوں میں شریک ہوتا رہتا ہے۔

اس کے باپ روشو پہلوان کی خواہش تھی کہ اب اپنے بیٹے کو علاقائی اور بین الصوبائی سطح پر ابھارے۔ اس مقصد

کے لیے وہ اسے زیادہ ملھ مقابلوں میں شامل رکھنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتا تھا۔

اِدھر یہ دونوں بھائی تھے، جو عام نوعیت کے ملھ مقابلے تو کھیلتے تھے مگر کبھی انہیں باقاعدہ ملھ مقابلوں میں نہیں شریک کیا جاتا تھا۔ اس میں روشو پہلوان کا زیادہ دخل تھا۔

ایک روز خیر پور کی ملھ ایسوسی ایشن کے صدر کی جانب سے ٹرائل بیس پر مقابلے منعقد کیے گئے۔

اس مقابلے میں ہر گوٹھ کے جونیئر ملھ پہلوانوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ روشو پہلوان بھلا کب پیچھے ہٹنے والا تھا۔ اس نے فوراً اس مقابلے میں اپنے بیٹے رب ڈنو کا نام بھی شامل کرادیا۔ یوں بھی رب ڈنو کی شہرت دیہی سطح پر خاصی معروف ہوچکی تھی۔

''ہم بھی اس مقابلے میں شرکت کریں گے، ادا خیر بخش!'' دھنی بخش نے بھائی سے کہا۔

''جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے دھنی بخش!'' خیر بخش نے حسرت سے کہا ''مگر ہمیں کون جانتا ہے؟ کون ہمارا تعارف کرائے گا۔'' دھنی بخش اپنی بات پر اڑا رہا۔

''یہ ایک کھلا مقابلہ ہے ادا! جو ملھ ایسوسی ایشن کے صدر کی جانب سے کروایا جارہا ہے۔ اگر اس میں ہم دونوں میں سے کوئی ایک بھی کامیاب ہوگیا تو وارے نیارے۔ ضرور اس مقابلے میں علاقائی اور صوبائی سطح کے ملھ مقابلوں میں شامل ہونے کے لیے یہ مقابلہ کروایا جارہا ہے۔ ادا! خیر پور چلوگے ناں؟ ہم دونوں خود ملھ ایسوسی ایشن کے صدر سے ملاقات کریں گے۔''

چھوٹے بھائی کے ہمت دلانے پر خیر بخش نے کمر کسی اور اگلے دن صبح سویرے یہ دونوں بھائی ڈاٹسن گاڑی میں شہر (خیر پور) جانے کے لیے سوار ہوئے۔

شہر پہنچ کر دونوں پوچھتے پاچھتے وتارو خان کی اوطاق پر پہنچے۔

ملھ ایسوسی ایشن کے صدر کا نام سائیں محبوب شاہ تھا۔ وہ خود بھی اپنے دور کا نامی گرامی ملاکھڑا پہلوان رہ چکا تھا۔ وہ ایک بڑا زمیندار بھی تھا، خیر پور اور رانی پور میں زمینیں تھیں۔

خیر پور میں اس کا بڑا سا سرخ پتھروں والا حویلی نما مکان تھا۔ اس نے دو اکھاڑے بھی قائم کر رکھے تھے۔ ایک خیر پور میں اور دوسرا رانی پور میں۔

سائیں محبوب شاہ خود بھی ایک بااثر زمیندار تھا، تاہم اس کے لیے ملھ پہلوانوں کی زبانی یہ بات زدِ عام تھی کہ اگر وہ کسی سوکھے سڑے آدمی پر بھی اپنا ہاتھ رکھ دے (یعنی اسے اپنی سرپرستی میں لے لے) تو ملاکھڑے کا زورآور پہلوان بن کر ہی ابھرتا ہے۔

وتارو خان اس کا نائب تھا اور منتظم بھی۔ دونوں بھائی اس کے پاس پہنچے۔ وتارو خان ایک پختہ العمر شخص تھا۔

''سائیں! ہماری شاہ صاحب سے ملاقات کرادو، آپ کی وڈی مہربانی ہوگی۔''

خیر بخش نے اس سے ملاقات کا عندیہ دیا۔ اس وقت اوطاق میں دیگر ملھ پہلوان بھی موجود تھے اور اپنے سرپرستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

ان دونوں چھڑے چھانٹ چھوکروں کو دیکھ کر ان کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ ابھری۔

بہرطور وتارو خان نے سر سے پاؤں تک ان دونوں بھائیوں کو دیکھا اور مسکرا کر پوچھا ''تم دونوں کس کے ساتھ آئے ہو؟''

خیر بخش اور دھنی بخش اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ پائے۔ خیر بخش نے کہا ''ہمارے ساتھ تو کوئی بھی نہیں ہے، ہم دونوں اکیلے آئے ہیں۔''

اوطاق میں کہیں ہلکی سی استہزائیہ ہنسی کی آواز بھی ابھری۔ کسی نے کہا تھا ''گلی کے چھوکروں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''اکھاڑے کا میدان صاف کرنے کے لیے تو ٹھیک لگتے ہیں۔''

''کون سے گوٹھ سے آئے ہو؟'' وتارو خان نے دونوں بھائیوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

''گوٹھ خیر محمد سے آئے ہیں۔'' خیر بخش نے جواب دیا۔

اس دوران دو لمبے تڑنگے افراد اندر داخل ہوئے۔ وتارو خان ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ دونوں بھائی ایک طرف کھڑے ہوگئے اور منتظر رہے کہ کب وتارو خان ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

کافی دیر ہوگئی، اس دوران چائے وغیرہ کا دور چلا۔ دو چار کرنائپ کے آدمی اوطاق میں موجود لوگوں کو چائے اور پانی دینے میں مصروف تھے مگر ان دونوں بھائیوں کو کسی نے نہیں پوچھا۔

دھنی بخش نے اپنے بڑے بھائی کے کان میں سرگوشی

کی۔ ''ادا! چلو یہاں سے۔''

''ٹھہرو ذرا میں بات کرتا ہوں۔'' خیر بخش نے کہا اور وتارو خان کی طرف بڑھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ بولتا، اس نے ایک بیزار کن نگاہ اس پر ڈالی اور جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔

''بابا ابھی جاؤ، کل آجانا۔ میں آج مہمانوں کے ساتھ مصروف ہوں۔''

دونوں بھائی منہ لٹکائے واپس اپنے گوٹھ آگئے۔ اگلے روز وہ پھر خیر پور پہنچے اور وتارو خان کی اوطاق کا رخ کیا مگر وہاں وتارو خان سے ملاقات نہ ہوسکی، وہ موجود نہیں تھا۔

انہوں نے اس کا انتظار کرنا چاہا مگر چاکروں نے انہیں چلتا کردیا۔

''اب کیا کریں ادا! یہ تو ہمیں کوئی جواب ہی نہیں دے رہے؟'' دھنی بخش نے کہا تو خیر بخش بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں خود ہی سائیں محبوب شاہ کا پتا کرنا چاہیے۔''

دونوں نے اریب قریب کے لوگوں سے سائیں محبوب شاہ کا پتا پوچھا۔ کسی نے انہیں ایک ہوٹل کا پتا بتاتے ہوئے کہا کہ وہ وہاں اپنے چند دوستوں کے ساتھ موجود ہے۔

یہ لوگ مذکورہ ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ سائیں محبوب شاہ ابھی ابھی اپنے دوستوں کے ساتھ رخصت ہوکر اپنے گھر گیا ہے۔

اس کے گھر کا پتا پوچھ کر وہ اس کے مکان پر پہنچے۔ اس کا مکان بیچ شہر میں ہی تھا۔ وہاں وہ اپنی اوطاق میں موجود تھا۔ چند ایک دوست بھی تھے۔ وہاں پہنچ کر انہیں ایک جھٹکا لگا۔ سائیں محبوب شاہ کی اوطاق میں روشو پہلوان اور اس کا بیٹا رب ڈنو بھی موجود تھے۔

انہیں دیکھ کر روشو کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر استہزائیہ تاثرات ابھرے جبکہ رب ڈنو اپنے دونوں دوستوں کو دیکھ کر خوش ہوگیا اور ان سے تپاک سے ملا۔ روشو پہلوان اب کچھ بے چین سا نظر آتا تھا۔

سامنے ایک سرکنڈوں کے اونچے پشتے والے موڑھے (مونڈھے) پر ایک بھاری بھرکم اور سانولا شخص بوسکی شلوار قمیص اور سر پر شیشے کے کام والی سرخ سندھی ٹوپی پہنے براجمان تھا۔

یہی سائیں محبوب شاہ تھا۔ اپنے دور کا معروف ملاکھڑا پہلوان۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی گھنڈی ہوئی تھی۔ روشو نے تو نہیں البتہ اس کے بیٹے رب ڈنو نے ان دونوں بھائیوں کا تعارف سائیں محبوب شاہ سے کروایا ''سائیں شاہ صاحب! یہ دونوں بھائی ہمارے ہی گوٹھ سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت اچھی ملھ لڑتے ہیں۔''

دونوں بھائی نے باری باری سائیں محبوب شاہ سے ہاتھ ملایا۔

''بیٹھو بابا بیٹھو۔'' سائیں محبوب شاہ نے ان دونوں سے ہاتھ ملانے کے بعد انہیں بیٹھنے کو کہا۔ ان دونوں بھائیوں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ رب ڈنو سے اس کا باپ

کیفی اعظمی

(1920-2002) بھارت کے نامور اردو شاعر، وہ اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے قصبے اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ والدین نے اختر حسین رضوی نام رکھا۔ مشہور دینی مدرسے سلطان المدارس میں داخلہ لیا۔ جہاں انہوں نے طالب علم یونین بنائی اور مدرسے میں ہڑتال کرادی جو ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ 1943ء میں ممبئی آگئے اور ایک اردو اخبار میں کام کرنے لگے، تاہم اسی سال وہ فلموں کے لیے گانے اور اسکرین پلے لکھنے لگے اور ہزاروں کی تعداد میں گانے لکھے۔ پہلی غزل 11 سال کی عمر میں لکھی تھی، جس کا پہلا مصرع تھا۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے

بعد میں اس غزل کو بیگم اختر کی سوز و گداز سے بھرپور آواز نے لافانی بنادیا۔ انہوں نے فلم ہیر رانجھا کا گیت ''یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں'' لکھ کر فلمی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ انہوں نے کاغذ کے پھول، حقیقت، ہیر رانجھا، آخری خطا اور شعلہ اور شبنم جیسی فلموں کے نغمے لکھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتب شامل ہیں۔ (۱) جھنکار (۲) آخری شب (۳) آواز تودے (۴) ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ بھارتی حکومت نے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کئی اعلیٰ ایوارڈ دیے۔

مرسلہ: نواب علی، کراچی

روشو خان خاصی برہمی سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔

"بابا کیسے آنا ہوا؟" سائیں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

خیر بخش بلا جھجک بولا "سائیں، ہم نے سنا تھا کہ آپ خیر پور کے اکھاڑے میں آس پاس کے گوٹھوں کے ملھ پہلوانوں کا ملاکھڑا کروانا چاہتے ہیں۔ ہم بھی اس میں قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں۔"

"ملھ کس سے سیکھی تم دونوں نے؟" سائیں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

خیر بخش نے روشو پہلوان کی طرف دیکھ کر کہا "روشو پہلوان سے۔"

"اچھا!...... پھر تو یقیناً تم بہت اچھے ملھ پہلوان ہو گے۔" سائیں کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ روشو پہلوان جیسے بلبلا کر بولا۔

"ارے سائیں شاہ صاحب! ملھ تو میرے بیٹے رب ڈنو نے سیکھی ہے کیونکہ وہ تو ہے ہی ایک ملاکھڑا پہلوان کا بیٹا۔ یہ دونوں میرے اکھاڑے میں وقت گزاری کے لیے آتے تھے۔ میرے بیٹے رب ڈنو کے دوست جو تھے، پھر جلد ہی دونوں نے گھبرا کر یہ اکھاڑا چھوڑ دیا تھا، بھلا یہ ملھ کیا جانیں گے۔"

روشو پہلوان کے اس سفید جھوٹ پر خیر بخش کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا مگر چھوٹا دھنی بخش منہ پھٹ تھا، اس نے فوراً کہا۔

"شاہ صاحب! ہم نے تو اپنا گھر ہی استاد روشو خان کے اکھاڑے کو بنالیا تھا اور اگر اکھاڑے سے گھبرا کر بھاگ جاتے تو آج پانچ دن سے ہم محض آپ سے ملاقات کے لیے خوار نہیں ہو رہے ہوتے۔ چار روز تو ہم آپ کے نائب وتارو خان کی اوطاق کے چکر لگاتے رہے تھے۔ رہی بات یہ کہ ہم نے استاد روشو پہلوان کے اکھاڑے میں جانا کیوں چھوڑا تھا تو اس کی ایک وجہ تھی، میں نہیں چاہتا کہ اپنے دوست کے باپ اور اپنے استاد کو شرمندہ کریں۔"

سائیں محبوب شاہ کی زمانہ شناس اور کھاگ نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ دونوں بھائیوں کی رگوں میں کس قسم کا خون جوش مار رہا تھا۔

"بیٹھو...... بیٹھو...... بابا، بیٹھو۔" اس نے ان دونوں کو ایک نقشیں پایوں والی رلی بچھی چارپائی پر بیٹھنے کا کہا۔ دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے۔

روشو پہلوان نے سائیں محبوب شاہ سے کچھ کہا تھا مگر اس نے اس کی بات پر کچھ خاص توجہ نہ دی۔

ایک چاکر (نوکر) کو آواز دے کر انہیں پانی اور چائے وغیرہ پلانے کا حکم دیا پھر بولا "تم دونوں پرسوں یہاں آجانا مگر پوری تیاری کے ساتھ۔ عنقریب کشمور کے اکھاڑے میں ایک بڑا دنگل ہونے والا ہے۔ ہمیں پانچ پہلوانوں کی ضرورت ہے۔ اگر تم نے پرسوں یہاں میرے اکھاڑے میں کامیابی حاصل کرلی تو سمجھو کشمور کے عظیم الشان دنگل میں شامل کر لیے جاؤ گے۔"

دونوں بھائی خوشی سے نہال ہو گئے۔ انہوں نے اس کا دل سے شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔

"نہیں، لنگر پاڑیں کرتے جانا۔" (کھانا وغیرہ کھا کے جانا) سائیں محبوب شاہ نے بردبار... آواز میں کہا۔ دونوں احترام میں بیٹھ رہے۔

☆☆☆

جس روز ان دونوں بھائیوں کو خیر پور روانہ ہونا تھا، اس سے ایک دن پہلے شام کو رب ڈنو ان کے گھر آیا۔

"یار! میں اپنے پیو (باپ) کے رویے پر تم سے معافی مانگتا ہوں۔" وہ شرمساری سے بولا تو خیر بخش نے مسکرا کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ارے یار! تو تو سنجیدہ ہوگیا۔ معافی تو مجھے اپنے چھوٹے بھائی دھنی بخش کی طرف سے مانگنا تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا تھا کہ استاد کے بارے میں ایسا نہیں کہتے، استاد روشن خان بہرحال ہماری نگاہوں میں ایک محترم شخص ہے۔"

"یار! میری سمجھ میں نہیں آتا، آخر میرے پیو کو تم سے کیوں خار چڑھتی ہے۔ اکھاڑے کا میدان تو ہر کسی کے لیے کھلا ہے۔ یہ خوشی ہے کہ سائیں محبوب شاہ نے اس مقابلے میں تم دونوں کو بھی نامزد کر دیا ہے۔" رب ڈنو نے کہا تو قریب کھڑے دھنی بخش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے؟ تیرا پیو نہیں چاہتا کہ ہم ملاکھڑے کے میدان میں اس کے بیٹے کے مقابلے پر آئیں۔"

رب ڈنو نے اس کی بات کا برا منائے بغیر مسکرا کر کہا۔

"لگتا ہے تیرا غصہ ابھی نہیں اترا۔"

خیر بخش نے اپنے چھوٹے بھائی کو گھور کر ذرا برہمی سے کہا "دھنی بخش! تو بہت زیادہ بولنے لگ گیا ہے۔ رب ڈنو

ہمارا دوست ہے اور اس کا پیو ہمارا استاد۔ شرم کر...... ذرا......"

بڑے بھائی کی ڈانٹ پر دھنی بخش ذرا شرمسار سا ہوا۔

اگلے روز صبح تڑکے دونوں بھائی گوٹھ کی اکلوتی مسافر ڈاٹسن میں سوار ہو کے خیر پور پہنچے تو محبوب شاہ کے اکھاڑے پر اریب قریب کے کئی گوٹھوں کے ملھ پہلوانوں کو کدکڑے مارتے دیکھا۔

اکھاڑے کی چوتھی سمت میں نشستوں کا بندوبست کیا گیا تھا جہاں ملھ ایسوسی ایشن کا صدر سائیں محبوب شاہ ایک خاص نشست پر تمکنت سے براجمان تھا۔

وتارو خان کے علاوہ چند دیگر منجھے ہوئے پہلوان بھی موجود تھے۔

مختلف پہلوانوں کے درمیان مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ مقابلے میں شریک پہلوانوں کی تعداد سولہ کے قریب تھی۔ جن میں روشو پہلوان کے بیٹے رب ڈنو کے علاوہ دونوں بھائی خیر بخش اور دھنی بخش بھی شامل تھے۔

سوئے اتفاق رب ڈنو اور خیر بخش کو میدان میں اتارا گیا۔

دونوں پرانے دوست تھے مگر اس وقت اکھاڑے میں ایک دوسرے کے حریف بن کر اترے تھے۔

دونوں کے درمیان مقابلے کی ابتدا ہوئی اور دونوں دوست ایک دوسرے کے سخت حریف بن کر نبرد آزما ہو گئے۔

چھاتیاں مل چکی تھیں۔ سوتروں پر ہاتھ ڈالے جا چکے تھے۔ میدان میں شور بپا تھا اور رب ڈنو کا باپ روشو پہلوان اپنے بیٹے کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

بیس برسوں کے بعد دونوں نوجوانوں نے زور آزمائی شروع کر دی۔

رب ڈنو نے خیر بخش سے چھاتی ملاتے ہی اسے اوپر اٹھا کر پٹخنے کی کوشش کی... تو خیر بخش نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر گھٹنے سکیڑ کے اس کی چھاتی سے لگا دیے۔

"میرے شیر! جلد بازی مت کر...... لاماٹی دے...... لاماٹی (چکر پھیری) دے، خیر بخش کو۔" روشو پہلوان حلق کے بل چلایا۔

رب ڈنو نے خیر بخش کے وجود کو چکر دینا شروع کر دیے تو خیر بخش نے فوراً اپنے دونوں پاؤں بھربھری مٹی والی زمین پر "کیل" کر دیے اور پل کے پل دائیں اڑنگا لگایا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ داؤ رب ڈنو کے لیے معمولی اور روایتی سہی مگر

خیر بخش نے وقت کے اس لمحاتی تقاضے کو بھانپ لیا تھا کہ رب ڈنو نے اسے چک پھیریاں دی تھیں۔ اس وقت اس کی دونوں ٹانگیں بھکی ہوئی تھیں۔ نتیجتاً وہ خیر بخش کے اس روایتی داؤ میں آ گیا اور اڑنگا کامیاب جاتے ہی وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھال نہ پایا اور چاروں شانے چت ہو گیا۔

خیر بخش بے شک رب ڈنو کی طرح بھاری بھرکم ڈیل ڈول نہیں رکھتا تھا مگر اس کے اندر پھرتیلا پن ضرور موجود تھا مگر یہ بات بھی ملھ پہلوانوں میں مسلمہ تھی کہ اس میں پھرتیلے پن سے زیادہ جسم کے ڈیل ڈول میں "پہاڑی پن" ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے مگر ملھ کشتی کے دوران ایک موقع ایسا آتا ہے جب پھرتیلے پن اور داؤ پیچ کی حد شروع ہوتی ہے۔ خیر بخش نے اس موقعے اور داؤ سے فائدہ اٹھایا تھا۔

اپنے بیٹے کو خیر بخش سے ہارتے دیکھ کر روشو پہلوان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

اُدھر دھنی بخش نے بھی اپنے ہم پلہ پانچ پہلوانوں کو ملھ مات دے ڈالی تھی۔

سوئے اتفاق روشو پہلوان کا بیٹا رب ڈنو، صرف دو ہی پہلوانوں کو چت کر سکا تھا اور خیر بخش سمیت وہ سات پہلوانوں سے ملھ مات کھا چکا تھا۔

سائیں محبوب شاہ کو کشمور میں ہونے والے دنگل کے لیے پانچ ملھ پہلوان درکار تھے مگر اس مقابلے کے بعد وہ صرف تین ملھ پہلوانوں کا ہی انتخاب کر سکا۔ ایک تو احمد پور کا قادر خان عرف کادو پہلوان تھا جبکہ باقی دو خیر بخش اور دھنی بخش تھے۔ رب ڈنو اپنے باپ کی توقع کے برخلاف خارج کیا جا چکا تھا۔

دونوں بھائی، خوشی سے نہال تھے۔ انہوں نے جیسے اپنے خوابوں کی تعبیر پالی تھی جبکہ روشو پہلوان کو اپنی نیت کی مراد مل گئی تھی۔

روشو پہلوان کی تو حالت ہی دگرگوں تھی۔ اس کے لیے تو یقین کرنا دوبھر ہو رہا تھا کہ آخر اس کا بیٹا کس طرح اس مقابلے سے خارج ہو گیا۔ اس کے برعکس ان دونوں یتیم دلیر بھائیوں کی کامیابی پر وہ مارے حسد کے جل بھن کر رہ گیا۔

اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ سائیں محبوب شاہ اس کے بیٹے رب ڈنو کو کشمور کے عظیم الشان دنگل کے لیے نامزد کر دے۔ اسے ایک امید تھی کہ محبوب شاہ کو پانچ ملھ پہلوانوں کی ضرورت تھی جبکہ اسے ابھی صرف تین ہی میسر آئے تھے۔ ابھی دو کی گنجائش باقی تھی۔

اس نے موقع پاتے ہی تنہائی میں خوش آمدانہ لہجے میں محبوب شاہ سے کہا ”سائیں! مقابلے میں ہار جیت تو ہوتی ہے، آپ بھی ایک منجھے ہوئے تجربہ کار ملاکھڑا پہلوان کی نظر رکھتے ہیں۔ بے شک میرا بیٹا ہار گیا ہے مگر آپ نے اس کے داؤ پیچ اور ملھ لڑنے کا ماہرانہ انداز تو دیکھا ہوگا۔“

محبوب شاہ نے جواب دیا ”روشو! میں نے جو مقابلہ کروایا تھا، وہ عام لوگوں کے درمیان تو نہیں تھا ناں...... ملھ پہلوانوں کے درمیان ہی تھا۔ ظاہر ہے ملھ کشتی سے تو یہ سارے ہی واقف ہیں مگر مجھے گھی سے مکھن نکالنا تھا جو میں نکال چکا ہوں۔“

روشو بولا ”سائیں! آپ کو پانچ دانے (پہلوان) چاہیے تھے، ابھی تو دو دانوں کی گنجائش ہے، میرے بیٹے رب ڈنو کو بھی شامل کرلیں، آپ کی وڈی مہربانی ہوگی۔“

محبوب شاہ نے مسکرا کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا ”میں نے جو تین دانے چنے ہیں، وہ بھی کافی ہیں۔ کیونکہ انہیں کوئی چک نہیں سکتا، تیرے بیٹے رب ڈنو کو ابھی مزید کسرت کی ضرورت ہے۔“

محبوب شاہ کے اس سخت جواب پر روشو اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

محبوب شاہ کے چنے ہوئے ان تینوں ملاکھڑا پہلوانوں کی اس کی اوطاق میں خوب آؤ بھگت ہونے لگی۔ محبوب شاہ نے ان تینوں کو کئی گھنٹے تک سودمند ہدایتیں دیں اور کشمور کے دنگل کی اہمیت کے بارے میں انہیں بتایا کہ اگر وہ ان میں کامیاب ہوگئے تو کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کی حیثیت خیرپور کے ہیرو کی سی ہوجائے گی اور ان پر انعامات اور دیگر مراعات کی بارش ہوجائے گی کیونکہ صوبے (سندھ) میں ملاکھڑا کو بڑی اہم ثقافتی حیثیت حاصل ہے۔

مگر ان دونوں بھائیوں کو انعام واکرام کا لالچ نہ تھا اور نہ ہی پروا۔ وہ تو بس شہ زوری کے میدان میں نام کمانا چاہتے تھے۔ یہ ان کا شوق بھی تھا، جنون اور آرزو بھی۔

انسان کے ہر عمل اور کردار کا تعلق اس کی نفسیات سے ضرور ہوتا ہے اور یہ نفسیاتی گرہ... اکثر وبیشتر انسان کے لاشعور میں ایک نامعلوم سی کسک جگائے رکھتی ہے اور اسے مزید پختہ کرنے میں انسانی رویوں اور بعض سماجی وطبقاتی تفاوت کا بھی دخل ہوتا ہے۔ درحقیقت ان دونوں بھائیوں کو ماضی میں کم مائیگی وبے حیثیتی کا سامنا رہا تھا اب وہ کچھ کر دکھانا چاہتے تھے۔ وہ اس بے حس اور کم کمتر کو برداشت نہ کرنے والے اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے والے سماج میں خود کو منوانا چاہتے تھے۔

رب ڈنو بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا اور انہیں مقابلے میں شامل ہونے پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دی تھی مگر خیر بخش اور دھنی بخش نے اس کی آنکھوں سے اداسی اور دکھ کی جھلک بھانپ لی تھی۔

”رب ڈنو! تو واقعی دوستوں کا دوست ہے......مگر ہم تجھے اپنا دوست ہی نہیں، محسن بھی سمجھتے ہیں۔“ خیر بخش نے اس کے کاندھے کو دوستانہ انداز میں چھو کر کہا۔ ”تو بھول گیا جب ہم اسکول میں اکٹھے پڑھتے تھے......ملھ بھی لڑتے تھے۔ پھر تیرے باڑے میں تجھ سے ملنے آتے، ملھ کشتی سیکھا کرتے۔ تو ہمیں اپنے باڑے کا خالص دودھ پینے کو دیا کرتا تھا۔ ہم تیری یاری فراموش کرسکتے ہیں بھلا۔ مجھے خود بھی تیرے مقابلے میں شامل نہ ہونے کا دکھ ہے۔“

”یہ تمہاری بڑائی ہے خیر بخش! ورنہ میں نے تم پر بھلا کیا احسان کیا ہے؟ ہم تو دوست تھے، ساتھ کھیلتے تھے۔ ساتھ رہتے تھے پر میں سمجھتا ہوں مجھے اپنے باپ کی نیت کا پھل ملا ہے۔ اس نے اس ڈر سے تمہیں اپنے اکھاڑے سے بے دخل کردیا تھا کہ شاید تم دونوں بھائیوں کے اندر چھپی ہوئی شہ زوری دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوگیا تھا حالانکہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

رب ڈنو کے لہجے میں صاف گوئی اور اعتراف تھا۔

”ارے یار! چھوڑ اب ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔ آج نہیں تو کل تو بھی مقابلے میں شامل ہوجائے گا۔“

اس بار دھنی بخش نے بھی رب ڈنو کا کاندھا تھپتھپا کر کہا۔

”میری دعا تم دونوں بھائیوں کے ساتھ ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔“

”ارے نہیں یار! بیٹھ، تجھے دودھ پتی کی چائے پلاتے ہیں۔“ خیر بخش نے اسے روکنا چاہا۔

”نہیں یار، باڑے میں کوئی نہیں ہے، ایک بھینس بیمار ہوگئی ہے، اسے ڈنگر ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ میں پھر آؤں گا۔“ رب ڈنو نے کہا اور چلا گیا۔

☆☆☆

ادھر روشو پہلوان کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا یا غیرت کا مسئلہ بنالینا روایتی بات تھی۔ روشو پہلوان بہت شدید تنگی محسوس کررہا تھا۔ ان میں لوگوں کے رویوں کا بھی دخل تھا۔

”اڑے روشو! تیرا بیٹا ملھ مقابلے میں ہار گیا؟ ایک پہلوان کا بیٹا بھلا کس طرح ہار سکتا ہے؟ یار روشو! سچ پوچھو تو ہمیں یقین نہیں آرہا۔“

ایک دل جلے کے طنزیہ جملے نے تو روشو پہلوان کو اندر سے بری طرح چیر ڈالا تھا۔

”یار روشو! ایک بات تو سچ سچ بتانا...... کیا تو واقعی ماضی کا نامی گرامی ملھ پہلوان رہ چکا ہے؟“

یہ وہ باتیں تھیں جو خوامخواہ ہی ایک انسان کو جلاپے کی آگ میں سلگانے اور انا کا قیدی بنانے کا باعث بنتی تھیں۔

روشو نے اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی تھی کہ کسی طرح ملھ ایسوسی ایشن کے صدر محبوب شاہ کو اس بات پر رضامند کرلے کہ اس کے بیٹے رب ڈنو کو کشمور میں ہونے والے عظیم الشان دنگل کے لیے نامزد کرلے مگر اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اسے اب ان دونوں بھائیوں پر سخت طیش آرہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ خیر بخش اور دھنی بخش نے ملھ پہلوانی کی ابتدا اس کے اکھاڑے سے کی تھی مگر بہت جلد روشو پہلوان نے انہیں بے دخل کردیا تھا۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں نے اپنے جذبے اور لگن سے کسرت جاری رکھی اور اریب قریب کے گوٹھوں میں ہونے والے ملاکھڑا مقابلوں کو دیکھتے رہنے کے باعث تجربہ حاصل کیا تھا۔ روشو پہلوان کو تو گویا اب ان دونوں بھائیوں سے خارسی ہوگئی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ اگر یہ دونوں بھائی کشمور میں ہونے والے عظیم ملاکھڑا دنگل میں بھی کامیاب ہوگئے تو ان کی حیثیت کیا سے کیا ہوجائے گی۔

اپنے بیٹے رب ڈنو کو اس مقابلے میں شرکت کی ساری کوششیں ناکام جاتے دیکھ کر اس نے اب اپنی ساری توجہ اس بات پر مرکوز کردی تھی کہ کسی طرح ایسا ہوجائے کہ یہ دونوں بھائی کشمور کے عظیم دنگل میں شرکت ہی نہ کرسکیں۔

تین دن بعد دونوں بھائیوں کو محبوب شاہ کے ساتھ کشمور روانہ ہونا تھا۔ وہ اس سے پہلے ان کا راستہ کاٹنے کے لیے سازشوں کے تار وپود بُننے میں مصروف ہوگیا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً سب سے پہلے صیقل مراد کی اوطاق کا رخ کیا۔ روشو پہلوان جانتا تھا کہ صیقل مراد سے لے کر زمیندار اللہ ورایو تک گوٹھ گڑھی خیر محمد کی نصف سے زیادہ برادری کے لوگ ان دونوں بھائیوں کے دشمن تھے۔

وہ فوراً سب سے پہلے صیقل مراد کے پاس پہنچا اور اس کے کان بھرنے لگا کہ اس کے دشمن کی اولاد ترقی کرتی ہوئی کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے اور اگر ان دونوں بھائیوں نے کشمور کا میدان مارلیا تو پھر کیا باقی رہ جائے گا؟ کیا وہ اور زمیندار اللہ ورایو دشمن کی اولاد کو یوں پھلتا پھولتا دیکھ سکتے ہیں؟ جس کے باپ (ماسٹر پیرل) نے ان کی اوطاقوں کی مخبری کی، ان کے ”معزز“ مہمان (ڈاکو محب شیدی) کو اوطاق میں پولیس کا چھاپا لگوا کر گرفتار کروایا، ایسے دشمن کا تو سارا خاندان ہی ختم کردینا چاہیے۔

زمیندار اللہ ورایو کی بہ نسبت روشو پہلوان کے صیقل مراد سے زیادہ قریبی اور پرانے مراسم تھے۔ اس لیے اس نے اپنی سازش کی ابتدا اسی سے کی تھی۔

اس کی بات سن کر صیقل مراد کے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔ پھر بولا ”روشو! تو نے ہم کو اتنا ہی نامرد سمجھ لیا ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔ تم ماسٹر پیرل کا انجام بھول گئے؟ اس کے بعد کون بچا تھا؟ ماسٹر پیرل کے قتل کی آگ تازہ ہے۔ دو بچوں اور بیوہ عورت کا قصہ پاک کرتے تو لوگ ہم پر ہائے ہائے کرتے۔ اب سنپولیے بڑے ہوگئے ہیں، آگ بھی پرانی ہوگئی ہے، اب دیکھتا جا۔“

روشو کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں ہوگئی، وہ بولا ”تین دن کے اندر یہ کام نمٹا لو...... یہ دونوں سنپولیے کشمور کے اکھاڑے میں عنقریب نام کمانے والے ہیں۔ ناموری کے بعد ان پر ہزاروں آنکھیں ہوں گی۔ ابھی ان پر کسی کی آنکھ نہیں۔“

اس کی بات پر صیقل مراد نے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔

زمیندار اللہ ورایو اور صیقل مراد جیسے لوگ ”دھیند و“ کہلاتے تھے۔ ”دھیند و“ ان افراد کو کہا جاتا تھا جو بہ ظاہر عام لوگوں میں گھل مل کر رہتے ہیں مگر درپردہ یہ لوگ ایسے لوگوں پر نگاہ رکھتے ہیں جو اچھی خاصی مالیت رکھتے ہوں۔ پھر ان کے معمولات وغیرہ کی کڑی نگرانی کے بعد گیو اینڈ ٹیک کی بنیاد پر واقف کار ڈاکوؤں کے سرغنہ کو اس کے بارے میں بعض ضروری تفصیلات سے آگاہ کردیتے ہیں۔ یوں تاوان کے سلسلے میں حاصل ہونے والی رقم میں ان ”دھیند و“ افراد کا بھی ”حصہ“ ہوتا ہے۔

ماسٹر پیرل کا قتل خیر پور کے بڑے ہندو بیوپاری کے اغوا برائے تاوان کے سلسلے میں ہونے والے منصوبے کے سلسلے کی کڑی تھی جس کی منصوبہ بندی اللہ ورایو کی اوطاق میں کی جاتی رہی تھی اور یوں دھاڑیل محبّ شیدی ماسٹر پیرل کی نظروں میں آ گیا تھا۔

انگریزوں کے دور میں لا اینڈ آرڈر کی صورتِ حال یہ ہوتی تھی کہ جب کسی جگہ قتل، چوری یا اغوا کی واردات ہوتی تھی، پولیس اس علاقے کی بااثر شخصیات سے پوچھ گچھ شروع کر دیتی تھی اور سنگین سے سنگین واردات کا خطرناک مجرم تک بے نقاب ہو جایا کرتا تھا۔

اگر آج کے اندرون سندھ کے حالات کو اس تناظر میں دیکھیں تو چوری، اغوا اور قتل تک کی وارداتوں میں کسی نہ کسی بڑی یا بااثر شخصیت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کوئی پیر کے روپ میں ہوتا ہے، کوئی وڈیرے کے روپ میں تو کوئی مرشد یا زمیندار۔ پھر ظالم و مظلوم کی دردناک داستانوں کے سلسلے چلتے رہتے ہیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ علاقے .... کی پولیس کو بھی پورا علم ہوتا ہے کہ واردات کرنے والا کون ہے۔ یہ ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جو کبھی بھی منظرِ عام پر نہیں آ سکی ہیں کیونکہ ایسی تلخ اور کریہہ حقیقتوں کا علم صرف انہی لوگوں کو ہوتا ہے جس نے ایک طویل عرصہ شہر سے دور گاؤں گوٹھوں میں گزارہ ہو۔

☆☆☆

دونوں بھائی اپنے خوابوں کی حاصل ہونے والی متوقع حسین تعبیروں میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس خطرے سے بے نیاز کہ ان کے باپ کے بہیمانہ قتل سے پہلے دشمنی کی جو چنگاری بھڑکی تھی، وہ مصلحتاً دب ضرور گئی تھی مگر بجھی نہیں تھی۔

ان کا ماموں جاڑو خان اکثر و بیشتر اپنے ان دونوں بھانجوں سے ملنے، ان کی خیر خیریت معلوم کرنے آتا جاتا رہتا تھا اور انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ وہ اس گوٹھ کو اب ہمیشہ کے لیے خیر باد کر دیں۔

جاڑو خان ایک جہاندیدہ انسان تھا اور جانتا تھا کہ ایک بار دشمنی کی ابتدا ہوتی ہے تو وہ نسل در نسل چلتی رہتی ہے۔ جب تک طرفین کے پورے خاندان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

بعض صلح جُو اور امن پسند گوٹھ سے ہی کیا علاقے سے ہی کوچ کو ترجیح دیا کرتے تھے اور اپنی زمینیں تک اونے پونے فروخت کر دیتے تھے۔ زیادہ تر ایسے تھے جو ہجرت، غیرت کے منافی سمجھتے تھے اور اس کبھی نہ ختم ہونے والی دشمنی کو ہجرت کے بجائے جنگ پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

جاڑو خان شروع کے چند دن تو ان کے پاس آتا رہا مگر پھر اس نے بھی آنا جانا موقوف کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے اب کشمور کے دنگل میں شامل ہونے کے لیے دن رات کسرت شروع کر دی تھی۔

ادھر صیفل مراد سے ملاقات کے بعد بھی روشو پہلوان کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسے اس حد تک تسلی تو ہوئی تھی کہ صیفل مراد اور زمیندار اللہ ورایو کے سینے میں سلگتی آتشِ انتقام کم نہ ہوئی تھی مگر روشو کچھ اور بھی چاہتا تھا۔ اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ تین روز بعد کشمور میں ہونے والے ملھ اکھاڑے میں کسی طرح یہ دونوں بھائی شریک نہ ہو سکیں۔ اسے ان دونوں بھائیوں سے اس لیے بھی زیادہ خار ہونے لگی تھی کہ انہوں نے خیر پور کے آزمائشی ملھ اکھاڑے میں اس کے بیٹے رب ڈنو کو شکست دی تھی جس کے باعث وہ کشمور میں ہونے والے عظیم مقابلے میں شریک ہونے سے رہ گیا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن نے ایک خطرناک اور گھناؤنی سازش نے فساد بپا کرنے کی راہ ڈھونڈ ہی نکالی۔ بلکہ ڈھونڈ کیا نکالی اس کے ہاتھ یہ ترکیب از خود لگ گئی تھی۔

ہوا دراصل یہ تھا کہ اس کے بیٹے رب ڈنو کا لکھا ہوا ایک مڑا تڑا رقعہ اس کے ہاتھ لگا۔ وہ رقعہ ایک ماچس کی ڈبیا میں مروڑ لپیٹ کر بند کیا گیا تھا اور اس پر پرانے اخبار کا کاغذ لگا کر ربر بینڈ چڑھا دیا گیا تھا۔

روشو پہلوان نے یہ رقعہ ماچس کی ڈبیا سے نکال کر پڑھا تو وہ ''محبت نامہ'' نکلا۔

اس پر یہ عقدہ کھلا کہ اس کا لاڈلا بیٹا زمیندار اللہ ورایو کی بیٹی ماروی سے محبت کرتا تھا اور یہ رقعہ اس نے اس کے ہی نام لکھا تھا۔

خط کے متن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ماروی کو پہنچایا جانے والا پہلا رقعہ تھا۔ چند سطری اس محبت نامے کے نیچے رب ڈنو لکھا تھا۔

روشو پہلوان پہلے تو مسکرایا تھا پھر اچانک ہی اس کے ذہن رسا میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال اٹدا۔ اس نے فوراً اس محبت نامے میں اپنے بیٹے رب ڈنو کا نام کاٹ کر خیر بخش لکھ دیا۔ یہی نہیں، اس کی ولدیت ماسٹر پیرل بھی لکھ ڈالی۔

جاری ہے

جادوئی خزانہ

عفان آزاد

وہ ایک ایسا خزانہ تھا جو صدیوں سے زمین میں دفن تھا مگر اس میں نہ ہیرے جواہرات تھے اور نہ سیم وزر پھر بھی وہ کروڑوں پاؤنڈ سے زیادہ قیمتی تھے۔ اس قدیم خزانے کی دریافت نے اس کھیت کی اہمیت بھی بڑھادی جہاں سے دریافت ہوا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے پورا یورپ بے چین ہواٹھا تھا۔ آخر اس خزانے میں ایسی کیا بات تھی؟

تحقیق کے نئے در کھولنے والی ایک پراثر تحریر

یہ ساتویں صدی کے آخری سالوں کا ذکر ہے۔ ایک دن یا شاید کسی ایک رات میں، کچھ گمنام لوگوں کا ایک گروہ گھنے جنگل کے قریب سے گزر رہا تھا۔ جنگل کے ساتھ ساتھ چلنے والا یہ راستہ متروک ہو چکا تھا۔ سرحدی علاقے سے گزرنے والی یہ سڑک کبھی رومن روڈ کہلاتی تھی جو اینگلو سیکسن ریاست مرسیا سے گزرتے تھے کبھی یہ راستہ بہت پُر رونق ہوا کرتا تھا۔ یہاں سے فوج، تاجر، مبلغین اور عام مسافروں کے قافلے گزرا کرتے تھے مگر اب لوگوں نے اس

پر چلنا چھوڑ دیا تھا لیکن راستے کے واضح آثار موجود تھے۔ یہ راستہ عام آبادی سے ہٹ کر تھا۔ شاید اسی ویرانے پن کے باعث اُن لوگوں نے یہ رہ گزر چُنی تھی۔ وہ لوگ آبادی سے دُور واقع اس رہ گزر پر نہایت خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی حرکات وسکنات سے لگتا تھا کہ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر رازداری سے اپنی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

وہ کون لوگ تھے، یہ تو وہی بہتر بتا سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ فوجی ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ چور لٹیرے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ عام سے لوگ ہوں...... وہ کچھ بھی ہوسکتے تھے۔ ویسے بظاہر وہ بہت بہادر لوگ لگ رہے تھے۔ وہ سبھی مرد تھے۔ ان کے ساتھ کوئی عورت یا بچہ نہیں تھا۔ سب جوان اور مضبوط ہاتھ پاؤں والے تھے۔ اُن کی دلیری کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ جس راستے پر چل رہے تھے، وہ کئی صدیوں سے خطرناک رہزنوں کی لرزہ خیز وارداتوں کی وجہ سے بدنام رہا تھا۔ اس راستے کی یہی بدنامی قافلوں کو یہاں سے دوسرے متبادل راستے اختیار کرنے پر مجبور کر چکی تھی۔ بستیاں اس سے دور جا بسی تھیں مگر اب بھی اس کی بدنامی کم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ لوگ یہاں سے گزر رہے تھے۔ کچھ خاص بات تو ہوگی اُن میں۔ انہیں خود پر دوسروں کی نسبت زیادہ بھروسا ہوگا۔ شاید وہ اپنے مضبوط ہاتھ پاؤں اور تیز تلواروں کے آگے دشمن کو خاطر میں نہیں لاتے ہوں گے، تبھی تو آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ چور تھے، سپاہی یا عام لوگ، وہ جو بھی ہوں، ایک بات طے تھی کہ وہ کوئی عام مسافر ہرگز نہ تھے۔ عام لوگوں نے تو رومن روڈ پر سفر کرنا تو بہت پہلے ہی ترک کر دیا تھا۔

وہ چند پُراسرار لوگ قدیم رومن روڈ پر کافی دور تک چلنے کے بعد رکے۔ کچھ دیر تک اطراف کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیتے رہے اور پھر سڑک سے نیچے اُترے اور سامنے واقع جنگل کی طرف بڑھنے لگے۔ سناٹا اور جنگل، انہیں آگے بڑھتا دیکھ کر یہ بات ذہن میں آنا قطعی بے محل نہیں تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے، نہایت سوچ سمجھ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ انہیں کہاں پہنچنا ہے۔ اس لیے وہ اطمینان سے جنگل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ خاصا آگے جانے کے بعد وہ اس حصے میں داخل ہوگئے جہاں سے جنگل شروع ہو رہا تھا۔ جنگل کے اندر داخل ہو کر وہ کچھ اور آگے تک چلے۔ وہ سب ایک شخص کے پیچھے پیچھے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کے قریب پہنچ کر سب سے آگے چلنے والا شخص رُکا۔ اس کے قدم رکتے ہی سب ٹھہر گئے۔ جس جگہ وہ رکے تھے، وہاں درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں تھوڑی سی صاف زمین نظر آ رہی تھی۔

سب سے آگے چلنے والا شاید اُن کا سردار تھا۔ وہ کچھ دیر تک غور سے اس زمین کا جائزہ لیتا رہا اور پھر سامنے دیکھا۔ سب لوگ خاموش کھڑے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے آنکھوں سے اشارہ کیا اور سب نے سر جھکا کر اس کا حکم بجا لانے کا اعلان کر دیا۔

اشارہ ملتے ہی اُن لوگوں نے اپنی پیٹھ پر لٹکے بڑے بڑے تھیلے اتار کر زمین پر رکھے اور رسیوں سے بند اُن کے منہ کھولنے لگے۔ ان تھیلوں میں سے کچھ میں پھاوڑے اور بیلچے نما اشیا تھیں جن سے وہ لوگ زمین کھودنے کا کام لیتے تھے۔ وہ لوگ جنگل کے سرے پر اور سڑک سے کافی دور واقع اُس ویران مقام پر گہرا گڑھا کھود رہے تھے۔ کئی گھنٹے تک وہ لوگ کھدائی کرتے رہے۔ انہوں نے کافی گہرا گڑھا کھود لیا۔ یہ ایک انسانی قبر جتنا گہرا کھودا گیا تھا۔

جب سردار کو اندازہ ہوا کہ کام مکمل ہونے والا ہے تو وہ آگے بڑھا اور گہری نظروں سے گڑھے کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ لوگ اب تک گڑھے کے اندر کھدائی کر رہے تھے۔ وہ کھنکھارا۔ سب نے ہاتھ روک دیے اور اس کا چہرہ تکنے لگے۔ اس نے داہنا ہاتھ اوپر اٹھا کر انہیں کھدائی مکمل ہونے کا اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی وہ لوگ بھی گڑھے سے باہر نکل آئے۔ پسینے میں شرابور اور مٹی میں اَٹے وہ لوگ سردار کی طرف دیکھتے ہوئے نئے حکم کے منتظر تھے۔ وہ سب گڑھے کے قریب رکھے تھیلوں کے پاس موجود تھے۔ یہ کئی بڑے بڑے تھیلے تھے جن کے منہ جنگلی گھاس کو بَٹ کر تیار کی گئی رسیوں سے کس کر باندھے گئے تھے۔ سردار گڑھے کے کنارے پہنچا اور کچھ دیر تک گردن جھکائے اُس کا جائزہ لیتا رہا۔ اُس کے بعد اُس نے کھڑے کھڑے منہ ہی منہ میں کچھ کہنا شروع کیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی دعائیہ کلمات ادا کر رہا ہے یا پھر جادوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ جب تک وہ پڑھتا رہا، سب خاموشی سے سر جھکائے کھڑے رہے۔ وہ خاموش ہوا تو سب نے سر اٹھایا اور استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔" اس نے اپنے ساتھیوں یا پھر پیروکاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز پاٹ دار اور لہجہ نہایت سنجیدہ تھا۔ "اب انہیں اندر رکھنا شروع کرو۔" اس نے انگلی سے منہ بند تھیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

یہ سنتے ہی وہ لوگ تیزی سے تھیلوں کی طرف بڑھے اور دو تین افراد گڑھے میں اُتر گئے۔ اُس کے بعد ایک ایک کر کے منہ بند تھیلے احتیاط سے گڑھے میں اتارے گئے اور پھر اُس گڑھے کو دوبارہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔ کام مکمل کر کے انہوں نے بیلچے اور پھاوڑے واپس تھیلے میں رکھے۔ ہاتھ منہ صاف کیا، کپڑے جھاڑے، کھدائی کے آلات والے تھیلے دوبارہ اپنے کندھوں پر لادے اور جس پُراسرار انداز میں چلتے ہوئے جنگل میں داخل ہوئے تھے، اُسی رازدارانہ انداز سے اُس راہ پر پلٹ گئے جس پر چلتے ہوئے وہ اس جگہ تک پہنچے تھے۔

وہ کون لوگ تھے؟ جنگل میں کیا دفنا کر گئے تھے؟ اُن کا انداز اتنا پُراسرار کیوں تھا؟...... دنیا بھر کی تاریخ کی کسی بھی کتاب میں اس واقعے کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ کسی بھی قدیم قلمی مخطوطے میں اس واقعے کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ یہ راز تھا اور راز ہی رہتا مگر تیرہ سو برس گزرنے کے بعد اُس دفینے کا راز کھل گیا پوری طرح اور اُن لوگوں کا بھی کچھ کچھ اتا پتا مل گیا جو اسے دفنا کر گئے تھے۔ ساتویں صدی کا دفینہ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں پوری طرح دنیا کی نگاہوں کے سامنے آشکارا ہوگیا مگر وہ لوگ کون تھے، یہ اب تک کچی پکی بات ہے۔ کچھ ٹھوس امکانات، کچھ نیم پختہ خیالات، کچھ ملتے جلتے تاریخی حوالے...... مگر بات پوری طرح کھلی نہیں۔ مدفون نوادرات اب انسانی نگاہوں کے سامنے موجود ہیں، اپنی تمام تر ٹھوس حقیقت کے ساتھ۔ اہلِ برطانیہ خوش ہیں کہ سائنسی آلات نے اُن کے اجداد کے کچھ اہم ٹھوس ثبوت اُنہیں مہیا کر دیے ہیں۔

پُراسرار خزانہ صرف اہلِ برطانیہ کے لیے ہی اہم نہیں تھا۔ اشیائے حرب پر مشتمل خزانے کی دریافت کی خبر پورے یورپ اور دنیا میں جہاں جہاں نوادرات کے شوقین اور علمِ آثاریات کے ماہرین موجود ہیں، انہیں چونکا گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیفورڈشائر کا علاقہ ان لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اسٹیفورڈشائر جو تیرہ سو سال پہلے گھنا جنگل تھا مگر اب نہیں۔

تیرہ سو سال تک یہ خزانہ اُسی طرح دفن رہا، جیسا کہ ساتویں صدی کے کسی سال کے کسی ایک دن پُراسرار لوگوں کے مختصر گروہ نے اسے دفنایا تھا۔ خزانہ سلامت تھا مگر صدیوں بعد وہ جنگل باقی نہیں بچا تھا۔ پرانا رومن روڈ بھی صرف تاریخ کی کتابوں میں رہ گیا ہے مگر اس کے باوجود زمین میں پوشیدہ خزانہ بحفاظت تھا۔

تیرہ صدیوں کے دوران اُس زمین پر بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جنگل کٹتا چلا گیا اور پھر وہ وقت آیا جب برطانیہ کے اس دور دراز مقام پر ساتویں صدی کے گھنے جنگل کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔ جنگل کی جگہ پر اب سرسبز چراگاہ ہے، کھیت ہیں اور کہیں کہیں آبادی بھی ہے۔ آبادیاں، جن کے اندر اور اطراف سے جدید سڑکیں گزرتی ہیں، جن کے کنارے بجلی اور ٹیلی فون کے کھمبے لگے ہوئے ہیں۔

زیرِ زمین مدفون خزانوں کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کی مدد کے لیے بیسویں صدی میں کئی طرح کے مددگار آلات ایجاد ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک آلہ metel detector کہلاتا ہے۔ بیٹری سے چلنے والے اس آلے کو ہاتھوں میں تھام کر اس کے سراغ رساں حصے کو زمین سے مس کرتے ہوئے چلو تو اگر کسی مقام پر، زمین میں کئی میٹر گہرائی میں بھی اگر کسی بھی قسم کی دھات دبی ہو تو یہ سیٹی بجا کر اُس کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ اس آلے سے لیس لوگ جگہ جگہ خزانوں کی تلاش کرتے ہیں۔ تیرہ سو سال تک پُرسکون نیند کے مزے لوٹنے والا خزانہ خاموشی سے زیرِ زمین دفن رہا مگر اب یہ آلہ اس کا پتا بتانے والا تھا۔ خزانہ لوگوں کی نظروں کے سامنے بس آنے ہی والا تھا۔

☆☆☆

یہ موسمِ گرما کی ایک دوپہر کا ذکر ہے۔ کچھ اجنبی اسٹیفورڈشائر کے ایک فارم ہاؤس میں رہائش پذیر برطانوی کسان فریڈ جانسن کے گھر پہنچے۔ جانسن بہت بڑی زمینوں کا مالک تھا۔ وہ گھوڑوں کی فارمنگ بھی کرتا تھا۔ اس کا کافی بڑا کھیت بھی تھا۔ گھوڑوں کے لیے اس کی بہت وسیع چراگاہ تھی۔ وہ اجنبی اُس کی چراگاہ اور کھیتوں پر کچھ خاص شے تلاش کرنے آئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صدیوں پہلے یہ علاقہ سیکسن باشندوں کے زیرِ نگیں تھا۔ یہاں کئی جنگیں لڑی جا چکی تھیں۔ وہ میٹل ڈیٹیکٹر سے اُن زمینوں کی جانچ کرنا چاہتے تھے۔ وہ پیشہ ور کھوجی تھے جو زمین میں دفن خزانوں کی تلاش کرتے پھرتے تھے۔ وہ فریڈ سے یہ

اجازت لینے آئے تھے کہ وہ انہیں اپنی زمینوں پر کچھ دیر گھومنے کی اجازت دے دے۔ گرمیوں کا موسم تھا، اس کی فصل کٹ چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے ان لوگوں کو کھیتوں اور چراگاہ میں گھومنے پھرنے کی اجازت دی تو... کم ازکم اس کی فصل خراب نہیں ہو سکتی۔

''میں ان کی آمد کا مقصد اور زمین کی جانچ کا فوری طور پر مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ اُن کے پاس کچھ آلات بھی تھے، جنہیں دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔'' فریڈ جانسن نے اجنبیوں سے پہلی ملاقات کا احوال بتانا شروع کیا۔ ''وہ اُن آلات کی مدد سے میری چراگاہ اور کھیت کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ میں اُن کے اصل مقصد کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر وہ گول مول باتیں کر رہے تھے، جس سے مجھے کچھ شک ہو رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا تلاش کرنا چاہ رہے تھے۔ یہ تو مجھے اُس وقت معلوم نہیں تھا، البتہ یہ ضرور سمجھ گیا تھا کہ وہ اجنبی جس شے کی تلاش میں ہیں، یقیناً کوئی بیش قیمت چیز ہوگی۔ کافی دیر سوچنے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ میں جانتا ہوں تم کس شے کی تلاش میں یہاں آئے ہو۔'' یہ کہہ کر فریڈ مسکرایا۔ ''یہ سن کر وہ سمجھ گئے کہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ جائیں اور میری زمینوں کا اچھی طرح معائنہ کریں۔ میں اس زمین کا مالک ہوں اور اس کے نیچے بھی اگر کچھ موجود ہے تو وہ میری ملکیت ہے البتہ وہ ڈھونڈ لیں تو ہم شراکت دار بن سکتے ہیں۔ وہ میری بات مان گئے۔ یوں تلاش شروع ہوگئی۔''

فریڈ کی اجازت کے بعد وہ لوگ اپنی تلاش میں مصروف ہوگئے۔ کھیت اور چراگاہ کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ اس کا مکمل جائزہ لینے میں انہیں کئی ہفتے لگ سکتے تھے مگر خوش قسمتی ان کے ساتھ تھی یا دفینہ خود زمین سے باہر آنے کے لیے بے تاب تھا۔ بہت جلد وہ گوہرِ مقصود تک پہنچ گئے۔

یہ پانچ جولائی 2009 کی بات ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ فریڈ فارم ہاؤس کے باہر کھڑا... اپنے ٹریکٹر کی مرمت میں مصروف تھا۔ اس کے اجنبی شراکت دار چراگاہ پر پر آلات کی مدد سے خزانے کی تلاش میں مصروف تھے۔ اسی دوران اس کی نظر سامنے پڑی۔ ٹیم کا سربراہ ٹیری ہربٹ نہایت خوشی کے عالم میں چراگاہ کی طرف سے دوڑتا ہوا اس کی جانب آرہا تھا۔ قریب پہنچتے ہی وہ جذباتی انداز میں چلایا۔ ''ہم نے بیش قیمتی خزانہ ڈھونڈ لیا ہے۔''

یہ سنتے ہی فریڈ بھی لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ ''تم نے کیا کہا ہے؟'' ٹیری کے قریب پہنچتے ہی اس نے پوچھا۔

''تمہاری چراگاہ سے خزانہ دریافت ہوا ہے۔'' ٹیری نے دوبارہ جذباتی انداز میں کہا۔ ''دولت مل گئی ہے۔''

''ہم سب دولت مند ہوجائیں گے؟'' فریڈ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بہت زیادہ......'' ٹیری نے جواب دیا۔ ''بڑا خزانہ ہے۔ وہ صرف خزانہ ہی نہیں، نوادرات ہیں۔ نوادرات کی منڈی میں وہ بہت ہی قیمتی ٹھہریں گے۔''

ٹیری خزانہ تلاش کرنے والی سہ رکنی ٹیم کا سربراہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آج کی دنیا میں نوادرات کی اہمیت اور قیمت کیا ہے۔ اسے پتا تھا کہ صدیوں پرانے پتھر پر کندہ ایک شبیہ بھی نوادرات کی منڈی میں ہیروں سے زیادہ مول پا سکتی ہے۔ اس کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ملا ہے، شاید وہ ان کی زندگی کی سب سے بیش قیمت دریافت ہوگی۔ سچ ہے کہ وہ کچھ غلط اندازے نہیں لگا رہا تھا مگر ایک بات تھی۔ وہ دولت تو حاصل کریں گے ہی، ساتھ ہی وہ برطانیہ کو بھی بہت کچھ دینے والے تھے۔ وہ انگریزوں کو ان کی تاریخ کے ایک اہم دور کے نوادرات بخشنے والے تھے۔

اسٹیفورڈ شائر کے تاریخی قصبے کی ایک چراگاہ سے نوادرات کے دریافت کی خبر بہت جلد پورے ملک میں پھیل گئی۔ اسٹیفورڈ شائر کے قدیم جنگجو قبائل کی نسل انگلستانی سیکسن باشندوں نے بھی یہ خبر سنی مگر وہ ہمیشہ کی طرح دم سادھے چُپ رہے۔ اسٹیفورڈ شائر کے یہ قدیم باشندے براہِ راست سیکسن نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سیکسن جنہیں اب 'انگلستانی سیکسن' کہا جاتا ہے۔

بہت جلد یہ خبر ذرائع ابلاغ کے ذریعے خاص و عام تک پہنچ گئی اور پھر عام لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن گئی۔ اس خبر سے انگلستانی سیکسن تہذیب پر تحقیق کرنے والے محققین اور ماہرینِ آثاریات کے کان بھی کھڑے ہوگئے۔ بہت جلد یہ خبر پورے برطانیہ میں پھیلنے لگی کہ اسٹیفورڈ شائر سے انگلستانی سیکسن تہذیب کے دورِ عروج سے تعلق رکھنے والے اہم نوادرات دریافت ہوئے ہیں۔ نوادرات ملنے کی خبر سے جہاں محققین اور ماہرینِ آثاریات کے کان کھڑے ہوئے تھے، وہیں نوادرات کی تجارت سے منسلک لوگ بھی چونک گئے۔ انہیں دولت کمانے کا ایک اور چانس مل سکتا تھا۔

اب تک کچھ واضح نہیں تھا کہ زمین سے کیا دریافت ہوا ہے۔ بس! ایک خبر تھی جو پھیلتی جارہی تھی۔ اس خبر نے برطانیہ ہی نہیں کئی یورپی ممالک میں بھی توجہ حاصل کرلی تھی۔ اسی دوران یہ خبر بھی پھیلی کہ دریافت شدہ نوادرات دراصل تاجِ برطانیہ کے کئی سو سال قدیم عہد سے متعلق ہیں۔ تاہم اس بات کو زیادہ پذیرائی نہیں مل سکی۔ اس کے برعکس ذرائع ابلاغ، ماہرین، تاجر اور عوام میں انگلستانی سیکسن تہذیب سے متعلق نوادرات کی دریافت کا خیال زیادہ توجہ حاصل کرتا جارہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس جگہ پر دریافت ہوئی تھی، وہاں کبھی انگلستانی سیکسن باشندوں کے قبرستان بھی ہوا کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ علاقہ سیکسن باشندوں کی قائم کردہ ریاست 'مرسیا' کا حصہ رہا تھا۔ تاجِ برطانیہ اور اُس کا عہد تو بعد کی بات ہے۔

بتاتے چلیں کہ انگلستانی سیکسن Anglo-Saxon اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے اجداد صدیوں پہلے، نارمن باشندوں کے غلبے سے بھی بہت پہلے، آج کی برطانوی سرزمین پر آبسے تھے۔ یوں یہ قدیم انگلستانی نژاد لوگ ٹھہرے۔ لفظ 'انگلستانی سیکسن' یورپ میں موجود اور انگلستان میں بس جانے والی اس قدیم قوم میں فرق ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں نارمن منڈی کے علاقے میں اسکینڈے نیویائی اور فرنگی مخلوط نسل کے لوگوں کو نارمن کہا جاتا تھا۔ اسی مخلوط نسل کے لوگوں نے 1066ء میں انگلستان کو فتح کرکے اپنا تسلط قائم کیا تھا۔ آج بھی انگلستان میں نارمن عہد سے پہلے کا رومی طرزِ تعمیر سیکسن آرکیٹیکچر کہلاتا ہے۔ نیز، ولیم اوّل سے لے کر اسٹیون تک، انگلستان کے سبھی بادشاہوں کو 'نارمن عہد' کے حوالے سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔

تو بات ہورہی تھی فریڈ جانسن کی چراگاہ سے دریافت ہونے والے نوادرات کی۔ بنا تصدیق اور نوادرات کے عہد کا تعین کیے بغیر پھیلنے والی افواہیں اور خبریں ایک طرف، سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ ملا تھا وہ نہایت بیش قیمت تھا۔ وہ نارمن دور سے بھی بہت پہلے کا تھا مگر یہ بات تحقیق سے ثابت ہونے والی تھی۔ ابتدائی طور پر تو ان نوادارت کا تعلق نارمن عہد سے جوڑا جارہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب باتیں غلط تھیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تیرہ سو سال تک زمین میں دفن رہنے کے باوجود دریافت شدہ زیادہ تر نوادرات صحیح سلامت تھے۔ کوئی ایک شے بھی خراب نہیں ہوئی تھی۔ البتہ چند ایک ایسی اشیا تھیں جو تھوڑی بہت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تھیں۔ البتہ یہ بات پریشانی کی نہیں تھی۔ نوادرات کا پتا چلانے والی ٹیم کے سربراہ ٹیری ہربٹ کو یقین تھا کہ بہت جلد سائنسی بنیادوں پر کیے گئے تجزیے سے نوادارات کے عہد کا تعین کرلیا جائے گا جس کے بعد اس کی مالی قدر متعین ہوسکے گی۔

دریافت شدہ نوادرات سونا، چاندی اور گارنٹ سے تیار کردہ تھے۔ اُن اشیا پر کندہ کاری نمایاں تھی۔ لگتا تھا کہ انہیں کسی خاص شخصیت کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہوگا۔ اس سے پہلے برطانیہ کے مختلف حصوں سے ملنے والے نوادرات پر بھی کندہ کاری ملی ہیں تاہم اُن کے مقابلے میں یہ بہت منفرد انداز کی تھی۔ ایک نظر ڈالنے سے ہی صاف پتا چل رہا تھا کہ انہیں مشاق ہاتھوں نے بنایا ہوگا۔

برطانیہ میں کندہ کاری کے قدیم آرائشی نمونوں کی تصاویر سے مزین کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں قدیم نمونوں کی شان دار تصاویر شامل ہیں۔ اگر اُن کے تناظر میں دیکھیں تو جیراڈ کی چراگاہ سے ملنے والے ان نوادرات پر کی گئی کندہ کاریوں کے نمونے اُن سب سے مختلف تھے۔

قدیم نوادرات کی تصاویر پر مشتمل ایک کتاب میں حالتِ جنگ میں سر پر پہننے والے خود کی ایک تصویر دی گئی ہے جو پینتیس سو زر و جواہر کے جڑاؤ سے تیار کردہ ہے۔ جیراڈ فارم سے ملنے والے نوادرات میں بھی ایک خود شامل ہے، جو اس سے کہیں زیادہ نفیس سونے کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ اس خود کی بناوٹ نہ صرف اس کی قدامت کو ظاہر کرتی ہے بلکہ اس کے بنانے والے کاری گروں کی مشاقی اور پہننے والے کی اہمیت کا بھی پتا دیتی ہے۔

جیراڈ کی چراگاہ سے ملنے والے نوادرات میں تین سو تلواروں کے جڑاؤ دستے، یاقوت، میانیں اور دس نگینیں شامل ہیں۔ حیرت انگیز طور پر اس خزانے میں نہ تو کوئی سکہ شامل ہے اور نہ ہی عورتوں کے پہننے کا کوئی زیور۔ اس پورے خزانے میں صرف تین ایسی اشیا ملی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ مذہبی نوعیت کی رہی ہوں گی مگر وہ کسی حد تک ٹوٹی ہوئی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اُن لوگوں کے نزدیک نہایت ہی متبرک اور بیش قیمت رہی ہوں گی۔ ماہرین کے مطابق شاید ان کی بہت اہمیت ہوگی، تبھی ٹوٹنے کے باوجود اُن گمنام لوگوں نے انہیں محفوظ کرنے کے لیے

زمین میں دفنا دیا تھا۔

اسٹیفورڈ شائر اور اس کے اطراف کا علاقہ صدیوں کی تاریخ میں نہایت غیر مستحکم اور جنگ وجدل سے نبرد آزما نظر رہا ہے۔ اس لیے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ بیش قیمت نظر آنے والا جنگی ساز وسامان اور متبرک مذہبی اشیا کسی ایسے گروہ نے دفن کی ہوں گی جن کا تعلق جنگجو قبیلے سے ہوگا۔ خیال پیش کیا گیا ہے کہ ممکنہ طور پر یہ کسی جنگی مہم میں شکست خوردہ گروہ کا سامان تھا جو ہارنے کے باوجود دشمن کے ہاتھ اپنے قیمتی ہتھیار نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ بات اس کے برعکس ہو۔ یہ سامان لٹیروں کے کسی گروہ نے لوٹا ہو اور پھر سازگار وقت کے لیے خفیہ طور پر زمین میں دفنا دیے گئے مگر 'سازگار وقت' سے قبل ہی ممکن ہے وہ موت کے منہ میں چلے گئے ہوں یا جہاں اسے دفن کیا تھا، وہ مقام بھول گئے ہوں۔ یوں یہ دفینہ تیرہ سو سال تک زمین میں خاموش پڑا رہا۔ امکانات، خیالات اور مفروضوں کی بنیاد پر تحقیق درجہ بدرجہ آگے بڑھتی ہے۔ اس خزانے کے حوالے سے بھی جو چاہے کہہ لیں مگر ایک چیز ٹھوس حقیقت ہے۔ برطانیہ سے ملنے والے یہ نوادرات اس ملک کی سرزمین کے ایک عہدِ قدیم کی داستان سناتے ہیں اور وہ بھی ثبوت کے ساتھ۔

کیلٹی اور رومی نوآبادیاتی نظام، وائی کنگ لٹیرے اور نارمن فاتحین تاریخ کے ڈیڑھ، پونے دو ہزار برس کے دوران سرزمین برطانیہ پر عذاب ڈھاتے رہے۔ وہ آتے رہے، قبضہ کرتے رہے اور جب یہ زمین اُن کے خیال میں کارآمد نہیں رہی تو وہ اُسے چھوڑ کر پیچھے پلٹتے یا آگے بڑھتے رہے۔ مگر اُن کی اس آمد اور رفت میں وہ یہاں کی تاریخ، کردار زبان، ثقافت اور سرزمین...... سب پر اپنے نقوش کی گہری چھاپ چھوڑ گئے۔

موجودہ برطانیہ کی سرزمین پر 410 عیسوی کے دوران سلطنتِ روما کا نوآبادیاتی تسلط قائم ہوا۔ اُن کے چلے جانے کے کچھ عرصے بعد شمالی یورپ سے سیکسن آئے اور انہوں نے یہاں اپنا راج قائم کیا۔ سیکسن راج چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں شروع ہو کر 1066ء میں اُس وقت تک قائم رہا، جب نارمن فاتحین نے انہیں شکست دے کر اس خطے کو فتح نہ کرلیا۔

یہ تیسری صدی عیسوی کی بات ہوگی جب یورپ کے مختلف علاقوں سے وحشی جنگجو قبائل نے مختلف اوقات میں سرزمینِ برطانیہ پر حملے شروع کیے اور یہاں پر تھوڑے یا طویل عرصے تک اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ ایک آتا تو اپنی طاقت کے بَل پر دوسرے کو مفتوح بنا کر خود حاکم بن جاتا۔ پانچویں صدی عیسوی میں موجودہ برطانیہ طاقت کے نشے میں چُور اور دنیا کے بڑے حصے پر راج کرنے والی سلطنتِ روما کا ایک صوبہ تھا۔ رومیوں نے اس زمین پر ساڑھے تین سو سال کے لگ بھگ حکومت کی۔ رومیوں نے جب اس زمین کو بے مقصد سمجھ کر چھوڑا اور اپنی فوجیں واپس بلالیں تو اُن کے جانے کے بعد پکٹس Picts اور اسکوٹی Scotti قبائل نے اس سرزمین پر حملہ کردیا۔ وہ یورپ میں بالترتیب مغرب اور شمال کی طرف بستے تھے۔ انہی اطراف سے وہ حملہ آور بھی ہوئے۔

رومی دفاعی فوج کے چلے جانے کے بعد برطانیہ تنہا اور یورپ کے لالچی جنگجو قبائل کے لیے تر نوالہ تھا۔ مذکورہ بالا بیان کردہ قبائل کے حملوں اور اس کے بعد کے حالات بھی کشت وخون سے خالی نہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی انگریز مؤرخ وینز ایبل بیڈ کی کتاب ''انگریز باشندوں کی تاریخ کلیسا'' برطانوی تاریخ کی مستند ترین قدیم دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ کتاب میں جرمن فوجیوں کے سرزمین برطانیہ پر حملہ کرنے کا واقعہ بھی مذکور ہے۔ یہ واقعہ اُنہی دنوں کا ہے جب پکٹس اور اسکوٹی حملہ کرنے والے تھے۔ کتاب کے مطابق:

''وہ 450 فوجی تھے۔ یہ فوجی جرمنی کے تین طاقت ور ترین قبائل سیکسن، اینگلز اور جوٹس سے نسلی تعلق رکھتے تھے۔'' آج کے برطانوی محققین نے اس کتاب کی مدد سے اُس عہد کے ان تین جرمن قبائل کی سرزمین کا پتا چلایا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق ان تین قبائل کا تعلق جس سرزمین سے تھا، آج وہ شمالی ہالینڈ اور ڈنمارک کا حصہ ہیں۔ مؤرخ وینز ایبل بیڈ کے مطابق ''برطانیہ پر حملہ کرنے والے غیر ملکی قبائلی لشکر تین بڑی کشتیوں میں سوار ہو کر یہاں پہنچے تھے۔ ان کے پیچھے اور بھی جنگجو آنے والے تھے۔ یہ جنگجو ایک جزیرے پر اترے اور پھر انہوں نے یہاں پر دھاوا بول دیا۔ یہ بہت جلد سرزمینِ برطانیہ پر قیامت برپا کرنے والے تھے۔''

چھٹی صدی عیسوی کے انگریز عیسائی راہب گلڈاز نے یہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا تھا۔ اس نے برطانیہ پر رومیوں کے چلے جانے کے بعد غیر

ملکیوں کے حملے کا احوال اپنی یادداشت میں لکھا ہے جس کا نام ہے 'برطانیہ کے ملبے پر'۔ یہ اُس عہد کے بیان پر مشتمل سب سے پہلا بیان ہے، کتاب میں لکھا ہے:

''وہ غیر ملکی جنگجو بڑی بڑی کشتیوں میں سوار ہو کر سمندروں کا سفر طے کر کے برطانوی جزیرے پر اترے اور پھر انہوں نے اس سرزمین پر قیامت ڈھادی۔ وہ غیر ملکی حملہ آور، جزیرے پہ آباد شہر، قصبوں اور دیہاتوں کو تباہ و برباد کرتے رہے، مقامی لوگوں کا قتلِ عام کرتے رہے تاکہ اس سرزمین اور اس کے وسائل پر قبضہ جما سکیں۔ ان کے تلوار بردار ہاتھ تب تک نہیں رُکے جب تک وہ جزیرے کو عبور کر کے دوسری طرف نہ پہنچ گئے۔''

گلڈاس کے بیان کے مطابق جرمنی سے آنے والے قبائلی جنگجوؤں نے اپنے زیرِ تسلط علاقوں میں انگریزی تہذیب وثقافت کو مٹاڈالا تھا۔ ویسے بھی وہ اب خالص انگلش تہذیب وتمدن تو رہا نہیں تھا۔ وہاں جو کچھ تھا، وہ سلطنتِ روما کے تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی اثرات کے زیرِ اثر تھا۔

جدید ماہرین آثاریات نے گلڈاس کے بیان اور دیگر تاریخی حوالوں سے اُن علاقوں کا تفصیلی جائزہ مرتب کیا ہے، جہاں پر جرمن قبائل نے قبضہ جمالیا تھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق جرمنوں نے رومیوں کے عہد کے بعد تعمیر کی گئی عمارتوں پر قبضہ کیا اور پھر ان کی اپنی ثقافت کے مطابق تزئینِ نو کی تھی۔ ماہرینِ آثاریات کو جرمن قبائل کے زیرِ قبضہ زمینوں سے کپڑوں کے ٹکڑے، روزمرّہ استعمال کے برتن اور آرائشی اشیا بھی ملی ہیں۔ ان برتنوں اور آرائشی سامان پر دلکش انداز میں نقش و نگار کندہ کیے گئے تھے۔ ماہرینِ آثاریات کے کہتے ہیں کہ ان غیر ملکی حملہ آوروں نے یہاں موجود رومی تہذیب وثقافت کو تقریباً مٹادیا تھا۔ انہوں نے برطانیہ کی ثقافت پر اپنی گہری چھاپ ڈالنا شروع کردی تھی۔

انگریز تہذیب اور ثقافت پر جرمن جنگجوؤں کی سب سے گہری چھاپ اور میراث انگریزی زبان کو قرار دیا جاتا ہے۔ جرمن جنگجوؤں نے انگریزی کو جنم دیا۔ رومی سلطنت کے اختتام پر پورے یورپ میں 'رومی زبان' مروج تھی۔ ہسپانوی، اطالوی فرنچ زبانیں لاطینی زبان سے نکلی تھیں لیکن برطانیہ کی پہچان انگریزی زبان نے جرمن زبان سے جنم لیا تھا، جس کا اصل محرک سیکسن تھے۔ انگریزوں کی زبان پورے یورپ سے لگ بھگ الگ تھی۔

برطانوی کھیت سے دریافت ہونے والے نوادرات بذاتِ خود نہایت غیر معمولی اور منفرد نہیں ہیں تاہم اُن کا عہد اور جس قوم کی یہ میراث تھے، وہ بات انہیں امتیازی حیثیت بخشتی ہے۔ دفینے سے جس طرح کی اشیا ملی ہیں، اس سے ملتے جلتے نوادرات برطانیہ کی سرزمین پر کافی تعداد میں دریافت ہوچکے ہیں۔ طلائی سکے، چاندی کے برتن، دھاتی اوزار اور قدیم ہتھیار وغیرہ کی دریافت کوئی اہم خبر نہیں۔ رومی، وائی کنگ اور خود برطانوی قدیم عہد کے نوادرات اس زمین پر کئی بار بڑی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں لیکن ان میں اور اُن میں ایک فرق ہے۔ وہ اُن حملہ آوروں کی میراث ہے جنہوں نے انگلستان کو لوٹا اور جیراڈ کی چراگاہ سے دریافت شدہ نوادرات اُن کے ہیں جن سے برطانیہ کے ایک نسبتاً جدید عہد کا آغاز ہوا تھا۔

قدیم سیکسن باشندوں کی ایک بہت مشہور دیومالائی داستان Beowulf ہے، جس کے مطابق سیکسن قبائلیوں کے کئی سُورما اپنی شجاعت کے باعث بہت مشہور تھے۔ وہ سب نہایت بہادر تھے اور کئی بار جنگوں میں دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ انہی میں سے ایک سُورما کا نام سیگمنڈ تھا۔ وہ اپنے قبیلے کا سب سے بہادر مرد سمجھا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ سیگمنڈ ایک گھنے جنگل سے تنہا گزر رہا تھا۔ چلتے چلتے اچانک اس کا سامنا ایک بہت بڑے اژدھے سے ہوگیا۔ وہ جسامت میں اتنا بڑا تھا کہ سیگمنڈ نے کبھی اپنی زندگی میں اس طرح کے جانور کے بارے میں نہ تو کچھ سُنا اور نہ ہی دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ بات کچھ خطرناک بھی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جھٹ سے ہاتھ بڑھایا اور کھٹ سے میان سے اپنی بڑی دو دھاری تلوار کھینچ کر نکالی۔ وہ تلوار سونت کر آگے بڑھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ جانور کوئی بہت خاص ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اُس پر حملہ کردے۔ اس لیے سیگمنڈ نہایت احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ جب تھوڑا آگے بڑھتا تو اژدھے کو بھی خطرے کا احساس ہوگیا۔

اژدھا دشمن کو خوف زدہ کرنے کے لیے خوف ناک انداز میں پھنکارنے لگا۔ اس کی پھنکار سے خارج ہونے والی ہوا بہت گرم اور تیز تھی۔ لمحہ بھر کے لیے تو سیگمنڈ کو لگا کہ جیسے اس کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو الٹے قدموں بھاگ نکلتا مگر سیگمنڈ تو پورے قبیلے کا ہیرو تھا۔ ایک

جانور سے خوف زدہ ہو کر راہِ فرار اختیار کرنے کو وہ اپنی مردانگی کی توہین سمجھتا تھا۔ اژدھا پھر پھنکارا مگر سیگمنڈ اس گرم ہوا کے زور سے ہلکا سا لڑکھڑایا تو سہی مگر نہ ڈرا اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہلا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ، بہادری سے آگے بڑھتا رہا۔ اسے آگے بڑھتا دیکھ کر اژدھا بھی غصے میں آ گیا۔ اس نے کس کر کر کنڈلی جمائی اور حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دونوں کو لڑائی کا یقین تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ کچھ دیر بعد اژدھا اور انسان باہم برسرِ پیکار تھے۔

وہ دونوں کافی دیر تک گتھم گتھا رہ کر ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کرتے رہے مگر کوئی کسی کو پچھاڑ نہیں پا رہا تھا۔ وہ دونوں بہت طاقت ور تھے۔ کافی جدو جہد کے بعد آخر سیگمنڈ نے اژدھے پر قابو پا لیا۔ اس نے اژدھے کی گردن کو اپنے گھٹنے سے دبایا اور اس کا سر قلم کرنے کے لیے تلوار فضا میں بلند کی۔ سیگمنڈ کا تلوار والا ہاتھ جیسے ہی اوپر اٹھا اژدھا سمجھ گیا کہ بس اب تو وہ اپنی جان سے گیا۔

”مجھے مت مارو، مجھے مت مارو۔“ اچانک وہ انسانی آواز میں سیگمنڈ سے مخاطب ہوا۔

اژدھے کو انسانوں کی طرح باتیں کرتا دیکھ کر سیگمنڈ حیرت زدہ رہ گیا مگر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اُس پر سے اپنی نظر نہ ہٹائی کہ کہیں وہ چکمانہ دے جائے۔ اُسے بولتا دیکھ کر وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ سوچ میں بھی پڑ گیا تھا۔ اُس کی تلوار بدستور فضا میں بلند تھی۔ ”تم ہماری طرح کیسے بول سکتے ہو، تم تو جانور ہو۔“ اس نے اژدھے سے سوال کیا۔ وہ دل میں تو خوف زدہ ہو چکا تھا مگر پھر بھی اس کا لہجہ مضبوط اور آواز پاٹ دار تھی۔

”اس لیے کہ میں ایک جادوئی جانور ہوں۔“ اژدھے نے جواب دیا۔

”جادوئی......“ سیگمنڈ نے دُہرایا مگر مضبوطی سے اپنی جگہ جما رہا۔ جادو، بھوت پریت اور ماورائی طاقتیں اُس دور کے مضبوط لوگوں کو بھی لرزہ دیتی تھیں۔ وہ بھی ان قوتوں سے ڈرتا تھا۔ ایک جانور کو انسانی آواز میں باتیں کرتا دیکھ کر اسے یقین ہو رہا تھا کہ اُس کی بات سچ ہے۔ وہ اژدھے سے اب اور بھی خوف زدہ ہو گیا تھا مگر پھر بھی اس کی گردن نہ چھوڑی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے چھوڑا تو وہ اسے مار ڈالے گا۔ ”تم جادو سے اپنی جان بچا لو۔“ آخر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سیگمنڈ نے جواب دیا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اژدھے نے لاچاری سے کہا۔ ”یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“

”تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ یہ کہہ کر سیگمنڈ نے وار کرنا چاہا۔

”رک جاؤ، مجھے مت مارو۔“ وہ چلایا۔ سیگمنڈ کا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ ”مجھے مار کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

”اور تمہیں چھوڑ دوں تو مجھے مرنا ہوگا۔“ سیگمنڈ نے جواب دیا۔

یہ جواب سن کر اژدھے کو معافی تلافی اور جاں بخشی کی منت رائگاں ہوتی نظر آئی۔ تب اُس نے نئی چال چلی اور لالچ کا تیر چلایا۔ وہ کہنے لگا ”میں جس جگہ بیٹھا تھا، وہاں زمین میں جادوئی خزانہ دفن ہے۔ میں اُس خزانے کا محافظ ہوں۔ تم وہ خزانہ لے لو اور اُن ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے بدلے میری جاں بخش دو، مجھے مت مارو۔“

اژدھے کی پیشکش سُن کر سیگمنڈ ہنسا اور کہنے لگا ”میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ دشمن کو زندہ چھوڑ کر خزانہ ڈھونڈنے لگوں اور تو موقع ملتے ہی مجھے مار دے۔“ یہ کہتے ہی اس نے لمحہ بھر کی بھی تاخیر کیے بنا دو دھاری تلوار پوری قوت سے ایک بار پھر اوپر اٹھائی اور اژدھے کی گردن پر بھرپور وار کیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا سر کٹ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اژدھا زمین پر مُردہ پڑا تھا۔

اژدھا جان سے گیا تو سیگمنڈ اپنی جان بچنے پر بہت خوش ہوا۔ یہ اس کی شجاعت کا ایک اور بڑا کارنامہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب پورے قبیلے میں اس کی شجاعت مثالی بن جائے گی۔ اسی دوران اچانک اسے اژدھے کی بات کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ تو مارا گیا۔ جس جگہ وہ بیٹھا تھا کیوں نہ وہ زمین کھود کر دیکھ لی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہو۔ ممکن ہے کہ وہاں خزانہ ہی دفن ہو۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور اطمینان سے کھدائی شروع کی۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ وہ کافی گہرا گڑھا کھود چکا تھا مگر اب تک اسے مدفون خزانے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ ”جھوٹ بول رہا ہوگا۔“ سیگمنڈ نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے خود کلامی کی۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا اور کسی بھی لمحے کھدائی روکنے ہی والا تھا کہ اچانک اس کی تلوار کسی شے سے ٹکرائی جس سے چھن کی آواز آئی۔ اس آواز کا آنا تھا کہ سیگمنڈ کو خزانے والی بات پر یقین گیا۔ اس نے بڑے جوش سے ایک بار پھر کھدائی شروع کر دی۔ اس

کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ زمین میں دفن سارا خزانہ باہر نکال کر ڈھیر کر چکا تھا۔ اس نے کپڑوں کے تھیلوں میں لپٹے خزانے کو کندھے پر لادا اور اپنے قبیلے کو لوٹ آیا۔

سیکسن دیومالائی داستان کا یہ ٹکڑا یہیں ختم نہیں ہوتا۔ آگے چل کر بیان کیا گیا ہے کہ جب سیگمنڈ قبیلے میں لوٹ کر آیا تو اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ وہاں کا سب سے امیر آدمی بن گیا۔ سیگمنڈ کی کہانی پورے قبیلے میں لالچ بیدار کر گئی۔ کئی سورما جنگلوں میں نکل کر اتنا بڑا اژدھا تلاش کرنے لگے جس طرح کا حلیہ سیگمنڈ نے بیان کیا تھا۔ اژدھے والے خزانے کی تلاش میں کئی بہادر جوان جنگلی جانوروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ مارے گئے جوان قبیلے کی جنگی قوت سمجھے جاتے تھے۔ ان کی موت قبیلے کا اجتماعی نقصان تھا۔ قبیلے والے سخت غصے میں تھے۔ وہ سب انتقام لینے کی سوچ رہے تھے۔ انہی لوگوں میں اایک بوڑھا سُورما بھی تھا۔ اس نے مارے گئے تو جوانوں کا انتقام لینے کے لیے جنگل کا رخ کیا۔ کئی روز کی تلاش کے بعد آخر اُسے ایک بہت بڑا اژدھا نظر آ گیا۔ وہ نہایت ہوشیاری سے اس کی طرف بڑھا اور اپنی تلوار نکال کر ایک ہی لمحے میں اس کا سر کاٹ دیا۔ بوڑھے سُورما نے اپنے جوانوں کی موت کا بدلہ لے لیا تھا۔ وہ سمجھتا کہ اس اژدھے کی تلاش میں اُس کے قبیلے کے جوان مارے گئے تھے۔ وہ بوڑھا خزانے کی تلاش میں نہیں بلکہ انتقام لینے آیا تھا۔ قصے کا اختتام اس جملے پر ہوتا ہے۔

”بوڑھے بہادر بھیڑیے نے جادوئی خزانے کے محافظ اژدھے سے اپنے جوانوں کی موت کا بدلہ لے لیا اور واپس قبیلے میں لوٹ آیا۔“

سیکسن دیومالائی داستان کا یہ ٹکڑا بتاتا ہے کہ وہ لوگ زمین میں دفن خزانوں، جادو اور ماورائی قوتوں پر ٹھوس یقین رکھتے تھے۔ خزانوں کی تلاش میں وہ مہم پر بھی جاتے تھے اور شاید وہ خود اپنے خزانوں کو محفوظ بنانے کے لیے بھی اسے زمین میں دفن کرتے ہوں گے مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسٹیفورڈ شائر سے ملنے والا خزانہ کیوں دفن کیا گیا تھا؟ ماہرین اس سوال کے جواب میں متعدد توجیہات پیش کرتے ہیں۔

ماہرینِ آثاریات کا خیال ہے کہ وہ اپنی بیش قیمت اشیا کو دشمنوں کے ہاتھ لگنے سے بچانا چاہتے تھے۔ وہ 'خوش قسمتی' کے حصول کے لیے اسے دفن کر گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ اُن کے ہاں دیوی دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھانے کا کوئی طریقہ ہو۔ ان توجیہات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ماہرین خود اسٹیفورڈ شائر کو بھی اس کی ایک بڑی وجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ علاقہ صدیوں سے ہی قبائلی خانہ بدوشوں اور جنگجوؤں کا ٹھکانا رہا تھا۔ یہاں بسنے والے زیادہ تر جنگجو تھے۔ مدفون نوادرات بھی عسکری نوعیت کے ہیں۔ اس لیے اغلب خیال ہے کہ یہ جنگجوؤں کے کسی گروہ نے دفن کیا ہوگا۔

دریافت شدہ نوادرات میں کئی خود بھی شامل ہیں جو واضح طور پر اس خیال کو تقویت دیتے ہیں کہ یہ ایسے مسلح جنگجوؤں کے زیرِ استعمال رہے ہوں گے جن کا تعلق جرمن حملہ آور قبائل سے ہوگا۔ واضح رہے کہ جس انداز کے خود دریافت ہوئے ہیں، اُس طرح کے ڈیزائن والے خود ہزار، بارہ سو سال پہلے جرمن جنگجو میدانِ جنگ میں پہنا کرتے تھے۔ اس ضمن میں تاریخ کی کئی کتابوں میں حوالے ملتے ہیں۔

سلطنتِ روما کی افواج زرہ بکتر، ڈھال اور خود کے ذریعے اپنے آپ کو دشمن کی تلوار، بھالے اور تیر سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے زیب تن کرتی تھی۔ جرمن جنگجو بھی اُن سے مرعوب تھے۔ اُن کے ہاں بھی دشمن سے بچاؤ کا یہ طریقہ رائج ہو گیا تھا۔ قدیم عہد کے مؤرخ تاسی تز نے پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی اپنی کتاب میں رومی افواج کی شان و شوکت اور خود کو محفوظ بنانے کے حوالے سے لکھا ہے۔

”انہیں اس کے علاوہ دنیاداری کا کوئی کام نہیں تھا کہ خود کو ہر وقت جنگ کے لیے تیار رکھیں اور زرہ بکتر پہن کر تلوار تھامے گھومتے رہیں۔ جب اُن کے ہاں کوئی لڑکا بلوغت کو پہنچتا تو اسے بھی زرہ بکتر اور سر پر خود پہنا دیا جاتا تھا۔ یہ اُس کی مردانگی کا اعلان تھا۔ اُن کا یہ لباس ایسا ہی تھا جیسے کوئی خلعتِ فاخرہ پہن کر گھومتا ہو۔“

تاریخی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ کئی صدیوں پہلے جنگ و جدل سے ہی آج کے برطانیہ نے جنم لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ انگلستانی سیکسن باشندوں نے مختلف جنگجو قبیلوں سے جو زمینیں چھین کر اپنی سلطنت قائم کی تھی، دراصل وہی سلطنت جغرافیائی لحاظ سے آج کے برطانیہ کی ابتدا تھی۔ انگلستانی سیکسن باشندوں نے ساتویں صدی کے اوائل میں اپنی ریاست قائم کی جسے انہوں نے 'مرسیا' کا نام دیا۔ یہ

لفظ قدیم اور متروک انگریزی کا ہے۔ یہ وہ انگلش زبان تھی جس کا بنیادی ماخذ سیکسن باشندوں کی قدیم زبان تھی۔ ماہرینِ لسانیات کہتے ہیں کہ اس لفظ کے معنی 'سرحدی حملہ آور' کے تھے۔ انگلستانی سیکسن کی اس ریاست کے باشندوں کو 'مرسیائی باشندے' کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہوئے 'سرحدوں پر حملہ کرنے والے لوگ'۔

تاریخ کے مطابق مرسیا ریاست آج کے تقریباً پورے وسطی برطانیہ پر محیط تھی۔ اس کی سرحدیں شمال میں نارتھمبریا اور جنوب میں وے سیکس سے ملتی تھیں۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں یہ ریاست اپنے عروج پر تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا زوال ہوا اور 1066 عیسوی میں مرسیا سلطنت نارمن جنگجوؤں کے ہاتھوں فتح ہوگئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انگلستانی سیکسن باشندے سخت جاں جنگجو تھے۔ انہوں نے جس سلطنت کی بنیاد مرسیا کے نام سے رکھی تھی، وہ کئی صدیوں تک کامیابی سے اس کی توسیع اور دفاع کے لیے سرگرم رہے۔ مرسیا کی تاریخ جنگ و جدل اور خوں ریزی سے بھری ہوئی ہے۔ گھڑ سوار مسلح سیکسن فوج نے 600 سنِ عیسوی سے لے کر 850 سنِ عیسوی کے دوران اپنی پڑوسی ریاست وے سیکس سے چودہ جنگیں لڑیں۔ گیارہ جنگیں ہمسائی ریاست ویلش اور دیگر دشمنوں کے خلاف اٹھارہ بڑی عسکری مہمات کیں۔ تاریخ کے اُس عہد میں یورپ میں سات سیکسن ریاستیں موجود تھیں لیکن اُن میں سب سے اہم، مستحکم اور وسیع سمجھی جانے والی ریاست انگلستانی سیکسن کی 'مرسیا' تھی۔

تلوار سیکسن باشندوں کا سب سے طاقت ور ہتھیار تھا۔ تاریخی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ دو دھاری سیدھی تلوار کو ایک خاص انداز سے بنانے کے ماہر تھے۔ اُس تلوار کی لمبائی تین فٹ ہوتی تھی۔ کئی انچ چوڑا بلیڈ اتنا تیز دھار بنایا جاتا تھا کہ اگر اس کا وار سینے پر پڑتا تو وہ فولادی زرہ بکتر کو کاٹتا ہوا پسلیوں تک پہنچ جاتا تھا اور وہاں بھی دھار کے نشان چھوڑ دیتا تھا۔

سیکسن اپنی تلوار دو حصوں میں تیار کرتے تھے۔ اول تلوار کا بلیڈ اور دوسرا اس کا دستہ، جنہیں بعد میں باہم جوڑ دیا جاتا تھا۔ دستے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط رکھنے کے واسطے اس پر نقوش ابھارے جاتے تھے۔ اس سے تلوار دیدہ زیب بھی نظر آتی اور اُس کے دستے پر گرفت بھی مضبوط رہتی تھی۔

سیکسن اپنی تلوار کو مختلف اشیا کی مدد سے بہت چمکدار بناتے تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو دشمن پر ہیبت طاری کرنا، دوسرے میدانِ جنگ میں چمکتے سورج کے باعث تلوار کی چمک دار شعاعوں سے دشمن سپاہ کے گھوڑوں کو بدکانا۔ جس سے مخالف کی اپنی صفوں میں بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ یوں تلوار ان کا صرف ہتھیار ہی نہیں بلکہ عسکری حربہ بھی تھا۔

چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں تحریر کردہ ایک قدیم یورپی مخطوطے میں اس تلوار کا تذکرہ موجود ہے جس کے مطابق سیکسن تلوار کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ سورج کی روشنی میں اس تلوار کو فضا میں گھماؤ تو آنکھوں کے سامنے رنگوں کی قوس قزح گھومتی نظر آتی تھی۔ تلوار کی چمکدار سطح سے سورج کی روشنی ٹکرا کر منعکس ہوتی تھی۔ یہ روشنی اتنی چمکدار تھی کہ اگر آنکھوں پر پڑ جائے تو لمحہ بھر کے لیے آنکھ خود بخود میچ جاتی تھی۔ یہ تلوار صرف اپنی کاٹ کے لحاظ سے ہی تیز دھار نہیں تھی، اسے مزید مہلک بنانے کے لیے اس کے بلیڈ پر نہایت زہریلے چھوٹے سانپوں کا زہر ملا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے اگر کوئی خوش قسمت تلوار کے گھاؤ سے بچ بھی گیا تو جسم میں زہر پھیلنے سے مر جاتا تھا۔

یہ تو ذکر قدیم مخطوطے کی عبارت کا تھا مگر کیا واقعی یہ تلواریں اسی قدر مہلک تھیں؟ یہ بات جاننے کے لیے برطانوی ماہرینِ حرب و بشریات نے کچھ خاص تجربے کیے ہیں۔

برطانوی علاقہ کینٹ کبھی انگلستانی سیکسن باشندوں کا مسکن تھا۔ یہاں زمین سے ایک مکمل انسانی ڈھانچا ملا ہے، جس پر کی گئی تحقیق سے ثابت ہوا کہ وہ شخص مرسیائی عہد سے تعلق رکھتا تھا۔ ڈھانچے پر تحقیق سے اُس کی عمر کا اندازہ پچیس سے پینتیس برس تک کا لگایا گیا ہے۔ اس کے سینے پر تلوار کا مہلک گھاؤ پایا گیا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ یہ شخص جنگ میں زخمی ہوا تھا یا پھر میدانِ جنگ میں ہی تلوار کا گھاؤ اُس کی موت کا سبب بنا ہوگا۔ یہ گھاؤ سولہ سینٹی میٹر لمبا ہے۔ ایسا لگتا ہے کے اُس کے سینے پر تلوار کا ترچھا وار پڑا تھا۔ تلوار، زرہ بکتر (اگر اس نے پہنی ہوئی تھی تو) کو کاٹتے اور گوشت کو چیرتی ہوئی ہڈیوں تک جا پہنچی تھی، جس سے پسلی کی ہڈی پر اتنا لمبا گھاؤ لگا۔ اس ڈھانچے پر کی گئی تحقیق کی بنیاد پر ماہرین تسلیم کرتے ہیں کہ وہ شخص یقیناً سیکسن تلوار کے گھاؤ سے مرا ہوگا۔ کیوں کہ جو زخم ڈھانچے پر ہے، اتنی کارگر تلوار صرف سیکسن جنگجوؤں کی ہی ہوتی تھی۔ تلوار سازی اور تلوار بازی، وہ دونوں میں مشاق تھے۔ دوسری بات یہ کہ جہاں سے ڈھانچا ملا ہے وہ سرحدی علاقہ تھا جہاں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔

اسٹیفورڈ شائر میں مدفون نوادرات سے تلواروں کے بانوے دستے ملے ہیں۔ یہ دستے بہت مضبوط اور نہایت خوبصورت ابھرواں نقش و نگار سے مزین ہیں۔ زیادہ تر پر سونا منڈھا ہوا ہے۔ ملنے والے آلاتِ حرب کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی بناوٹ سے لگتا ہے کہ وہ عام لوگوں کے استعمال کے ہتھیار نہیں تھے بلکہ کسی خاص شخصیت سے تعلق رکھتے ہوں گے۔

جہاں سے یہ مدفون نوادرات ملے ہیں، وہ علاقہ کبھی انگلستانی سیکسن جنگجوؤں کا مضبوط گڑھ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ دفینہ کسی ایسے بہت بڑے سردار کی ملکیت ہو، جسے اس کی موت کے بعد عسکری وارث یا خونی رشتے داروں کو منتقل کرنے کے بجائے وصیت کے مطابق دفن کر دیا گیا ہو.....
چونکہ یہ نوادرات خاصی بڑی تعداد میں ہیں، اس لیے انہیں مرنے والے کی قبر میں اُس کے ساتھ دفن کرنے کے بجائے علٰیحدہ دفن کرنا مناسب سمجھا گیا ہو۔

یہ حیران کن بات نہیں۔ اُس زمانے میں، یورپ میں جنگجو سردار کی موت کے بعد اُس کا عسکری ورثہ نئے سردار کو منتقل کر دیا جاتا تھا یا پھر اُس کے جنگجو ورثا کے حوالے ہو جاتا تھا۔ صرف یہی نہیں، کچھ بڑے جنگجو سرداروں کی موت کے بعد اُن کے خاص ہتھیار، اُن کے ساتھ دفن کرنے کی بھی روایت تھی۔

دسویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ایک وصیت برطانوی ماہرینِ آثار کو ملی تھی۔ یہ وصیت ایک جنگجو سُورما کی تھی جو اپنے گروہ کا سردار تھا۔ اس دستاویز سے یہ دلچسپ بات بھی پتا چلی کہ مرنے والا سردار آنے والے سردار کو اپنے ہتھیار اور گھوڑے سونپ دیتا تھا۔ وصیت میں تحریر ہے:

''میں اپنے شاہی سردار کو چار سونے سے بنے دستانے، چار تلواریں، آٹھ گھوڑے، آٹھ زرہ بکتر، چار خود مرنے کے بعد نئے سردار کو سونپتا ہوں۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں ایک سردار مرتے ہوئے اپنے ہتھیار اور گھوڑے نئے سردار کے لیے ترکے میں چھوڑتا تھا، وہیں جنگجو کی خاص تلوار یا تو اس کے ساتھ ہی دفن کر دی جاتی تھی یا پھر اس کے وارثوں کے حوالے کر دی جاتی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ ایسا ہی ہو۔ بعض اوقات مرنے والے جنگجو کی تلوار خاص اہتمام سے علٰیحدہ سے دفن کی جاتی تھی۔ اس روایت کی بنا پر ممکن ہے کہ اسٹیفورڈ شائر سے ملنے والے مدفون نوادرات کسی بہت بڑے عسکری سُورما کی ملکیت ہوں۔ وہ اتنا بڑا ہو کہ شاید وہ یہ خیال کرتا ہو کہ جو اس کا عسکری ترکہ ہے، اُس کا اہل اُس کے گروہ یا قبیلے کا کوئی جنگجو ہے ہی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کی موت کے بعد قبیلے والوں اور ورثا نے خیال کیا ہو کہ اس عسکری ورثے کا اہل ان کے ہاں تو ہے ہی نہیں۔ شاید اُن کے لیے اہلیت کا معیار مرنے والے کی شخصیت اور شجاعت سے مماثلت رکھنا ہوتا ہو۔ اس لیے تدفین کے بعد فیصلہ کیا گیا ہو کہ مرنے والے کے آلاتِ حرب بھی دفن کر دیے جائیں۔ اسی لیے آج کے نوادرات اور کل کے ہتھیار دفن کر دیے گئے ہوں۔

امکانات کئی ہیں تاہم تاریخی حوالوں سے اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا کہ ساتویں صدی عیسوی میں انگلستانی سیکسن کے یہ آلاتِ حرب اور آج کے نوادرات کیوں دفن کیے گئے تھے؟

کئی خیالات اور امکانات اس بارے میں اخذ کیے گئے ہیں تاہم تاریخ سے ایک بات صاف ہو جاتی ہے کہ انہیں زمین میں دبانے والے، دشمنوں سے ہرگز خوف زدہ نہیں تھے اور نہ ہی وہ انہیں دشمن کے ہاتھ لگنے سے بچانے کے خواہشمند تھے۔ اس کی وجہ ہے کہ انگلستانی سیکسن آج کے جس برطانوی علاقے پر قابض ہوئے تھے، اُن پر بعد کی صدیوں میں بھی اُن کی گرفت بہت مضبوط رہی تھی۔

سُورما کو تلوار کے ساتھ دفن کرنے کی روایت، گزری صدیوں میں یورپ کے خطے میں بہت مضبوط رہی ہے۔ اس کے علاوہ شمالی یورپ میں نوادرات، بیش قیمت اشیا اور قیمتی آلاتِ حرب کو دفن کرنے کے ثبوت تاریخ میں کانسی کے دور سے ملتے ہیں۔ یہ روایت انگلستانی سیکسن کے دور میں بھی زندہ تھی۔ تاریخی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ شمالی یورپ میں قبائل اپنی بیش قیمت اشیا کو موسمی دریاؤں کی سوکھی تہ، قدرتی چشموں کے اطراف اور گھنے جنگلوں کے اندر دفن کرتے رہے ہیں، تاہم اسٹیفورڈ شائر سے جتنا بڑا دفینہ دریافت ہوا ہے، اتنی بڑی مقدار میں ایسا کچھ پورے برطانیہ میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

''ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں پہلی بار آلاتِ حرب کسی ایک جگہ پر ملے ہیں۔'' انگلستانی سیکسن باشندوں کی تاریخ پر مستند ماہر کیون نے دفینے کے حوالے

سے بتایا۔ ”یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ انگلستانی سیکسن برطانیہ کے بانی تھے۔ ان نوادرات سے ہمیں اُن کی عسکری صلاحیتوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ آخر کس طرح انہوں نے سلطنتِ روم کا قبضہ ختم ہونے کے بعد طویل عرصے تک اس علاقے میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھے تھے۔ ظاہر ہے اس کا ایک ہی جواب ہے۔ ان کی بہادری اور ہتھیار۔ اب ملنے والے ان ہتھیاروں سے مزید تحقیق ممکن ہوگی۔“

کیون کا مزید کہنا تھا:

”اس طرح کے دفینے کی روایت صرف برطانیہ میں ہی نہیں ملتی۔ قدیم زمانے میں یہ روایت اسکینڈے نیویا کے ممالک اور جرمنی کے بھی کئی دوسرے حصوں میں مروج تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صدیوں پہلے یہ روایت وہی لوگ لے کر اس سرزمین پر پہنچے تھے جو آج برطانیہ کہلاتی ہے۔ ملنے والا خزینہ اُن کی روایت کا اہم ثبوت بھی ہے۔“

نکولس بُروک تاریخ داں اور برمنگھم یونیورسٹی سے وابستہ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”اسٹیفورڈ شائر سے ملنے والا دفینہ آج بلاشبہ بیش قیمت نوادرات ہیں۔ ایسے نوادرات جو اس سے پہلے برطانوی سرزمین پر کبھی دریافت نہیں ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے ملتے جلتے نوادرات ملتے رہے ہیں لیکن اس دفینے سے برآمد اشیا ہمیں اُن لوگوں کو سمجھنے میں مدد دے گی جو اس برطانیہ کے سب سے اول معمار ہیں۔ جنہوں نے یہاں سلطنت تشکیل دی اور پھر اس کے استحکام کے لیے لڑتے رہے۔ جب گیارھویں صدی کے نصف بعد میں نارمن باشندوں نے اِس سرزمین پر حملہ کرکے فتح حاصل کی، تب تک برطانیہ ایک مستحکم ریاست بن چکا تھا۔ وہ ریاست جس کے خدوخال بعد کی صدیوں میں بدستور واضح اور مستحکم ہوتے چلے گئے تھے۔“

نکولس کا مزید کہنا تھا کہ ”اسٹیفورڈ شائر سے ملنے والے تمام نوادرات مرد معاشرے کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جنگجو معاشرے میں عورت کی اہمیت بہت کم تھی۔ ویسے بھی اُس عہد میں مجموعی طور پر یورپ میں عورت معاشرے کی اہم فرد نہیں تھی۔ دفینے میں دفن اشیا مردوں کے زیرِ استعمال آلاتِ حرب ہیں۔ اس کے بعد کچھ مذہبی نوعیت کی چیزیں ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسی شے نہیں جس پر عورت کے زیور ہونے کا شبہ ہو سکے۔“

دفینے سے جو بھی چیزیں ملی ہیں، اُن میں استعمال کیے گئے سونے کی مقدار صرف 25 فیصد یعنی گیارہ پونڈ ہے۔ جس سے لگتا ہے کہ سونا اُن کے لیے بہت قیمتی، کم یاب اور آرائشی شے تھی۔ اس لیے بھی یہ خیال تقویت پاتا ہے کہ یہ سازوسامان کسی عام فرد کی ملکیت تو ہرگز نہیں رہا ہوگا۔ اُن اشیا کی تیاری میں دیگر دھاتوں کا استعمال 75 فیصد ہے۔

نکولس بُروک کے مطابق ”اگرچہ بادی النظر میں خیال یہی ہے کہ یہ دفینہ انگلستانی سیکسن باشندوں کا ہے تاہم اب بھی یہ بات حتمی طور پر کہنا ممکن نہیں۔ اس دفینے کے ذرائع اب تک ہمارے لیے پُراسرار معما کے مانند ہے۔ ویسے بھی دریافت اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے۔ رفتہ رفتہ اس پر سائنسی بنیادوں پر تحقیق ہوگی۔ تب ممکن ہے کہ اس سے جُڑے دیگر راز بہت دیر تک راز نہ رہ پائیں مگر فی الوقت یہی حقیقت ہے جو میں نے آپ سے کہی ہے۔“

قدیم برطانیہ میں سونے کے ذرائع مقامی نہیں تھے۔ زیادہ تر سونا دوسرے علاقوں سے یہاں لایا جاتا تھا۔ زیادہ تر سونا روم سے یہاں پہنچا۔ کبھی سونے کے ٹکڑے بطور کرنسی استعمال ہوتے تھے۔ پھر ان سے طلائی سکے ڈھالے گئے، جن کا استعمال بطور کرنسی ہونے لگا۔ روم کا تسلط ختم ہونے کے بعد اس خطے پر جرمن قبائلی جنگجوؤں کے حملے ہونے لگے۔ وہ یہاں کے شاہی خزانے کا سونا لوٹ کر لے جاتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب انگلستانی سیکسن کے قدم یہاں پر جمے اور باقاعدہ ریاست تشکیل پانے لگی، اُس وقت برطانیہ میں سونے کی مقدار بہت کم ہو چکی تھی، جس کی ایک وجہ رومیوں کے بعد یہاں سونے کی سپلائی کا لگ بھگ ختم ہو جانا بھی تھا۔ اس وجہ سے کرنسی کا چلن زندہ رکھنے کے لیے آہستہ آہستہ طلائی سکوں کا رواج متروک ہونے لگا۔ ان کی جگہ چاندی نے لینا شروع کر دی تھی۔

اسٹیفورڈ شائر سے دریافت شدہ نوادرات جب دفن کیے جا رہے ہوں گے، اُس عہد میں برطانیہ کی کرنسی میں چاندی بھی مستعمل تھی۔ لین دین میں سونے کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔ دوسرا یہ کہ سونے کی قدر میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ دفینے سے ابرک بھی ملا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ جس زمانے میں یہ استعمال کیا گیا ہوگا، تب اُس کی قدر بھی سونے سے کچھ ہی کم ہوگی۔ کہتے ہیں کہ اس وقت سونے کی قلت کے باعث یہ دھات اس کے متبادل کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ برطانوی تاریخ داں گائے ہیلسل نے دفینے سے دریافت شدہ سونے کی اُس دور کے لحاظ سے معاشی قدر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے پہلے تو یہ پتا چلانے کی کوشش کی کہ ساتویں صدی میں سونے کے سوا اور بیش قیمت کیا شے تھی۔ اُس کے بعد انہوں نے دفینے سے دریافت شدہ سونے کی مالیت متعین کی۔

”اُس زمانے میں سونے کی ہمسری صرف ایک شے کر سکتی تھی اور وہ چیز تھی پالتو جنگی گھوڑے۔“ ہیلسل نے بتایا۔ ”اُس زمانے میں، آج دریافت شدہ سونے کی قیمت آٹھ سو سولیدی یا اسّی گھوڑوں کے برابر تھی۔“ سلطنتِ روما کے آخری دنوں میں مستعمل طلائی سکہ سولیدی کہلاتا تھا۔

گائے ہیلسل نے دریافت شدہ نوادرات میں استعمال کیے گئے سونے کی وہ قدر طے کرنے کی کوشش کی ہے جو کم و بیش تیرہ سو سال پہلے رہی ہوگی۔ اس قدر میں کمی بیشی ممکن ہے تاہم 2011ء میں اس سونے کی برطانوی پاؤنڈ میں جو قدر متعین کی گئی ہے وہ نہایت درست ترین ہے۔ برطانوی کرنسی میں آج اس سونے کی قیمت 3,285,000 پاؤنڈ یا 5 اعشاریہ 3 ملین امریکی ڈالر بنتی ہے۔

گائے ہیلسل کہتے ہیں ”میرے لیے سونا قطعی غیر اہم ہے۔ اہم چیز وہ ہتھیار ہیں جو ملے ہیں۔ اس سے یہ سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ وہ کس طرح ان ہتھیاروں، خاص طور پر اپنی تلوار کے بل پر دشمنوں پر قابو پا لیتے تھے۔ تلوار ان کا سب سے اہم ہتھیار تھا۔ یہ ایسی تلوار تھی جس کی ہمسری ان کے دشمنوں کی تلوار نہیں کر پاتی ہوگی، تبھی وہ کئی صدیوں تک اس زمین پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے اور اس کامیابی کے لیے انہوں نے بعد میں بھی درجنوں جنگیں لڑیں۔ دفینے سے بیش قیمت اور منفرد نوادرات ملے ہیں۔ وہاں سے درجنوں تلواروں کے دستے ملے ہیں مگر افسوس کہ ایک بھی مکمل تلوار نہیں ملی۔“

ہیلسل گائے کا کہنا تھا کہ ”ہم ان کی خاص تلوار اور اس کے مہلک گھاؤ کے بارے میں صرف کتابی باتیں جانتے ہیں۔ یہاں سے اگر ہمیں ایک مکمل تلوار مل جاتی تو اس سے تحقیق میں بہت مدد ملتی۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ البتہ ایک بات ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اپنے ہتھیار زمین میں دفنانے والے سونے اور موتیوں سے زیادہ تلوار کے بلیڈ کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ شاید بہت مشکلوں سے ایک تلوار

بناتے ہوں گے۔ ان تلوار کے بلیڈ اور اس کے دستے کو سلاخ کی مدد سے جوڑا جاتا تھا۔ یہ بات دفینے سے ملنے والے تلوار کے دستوں سے بھی پتا چلتی ہے۔ اس لیے انہوں نے تلوار کھول کر رکھ لی دوبارہ استعمال کے لیے مگر دستے دفنا دیے۔ وہ دستے اور ان پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے اُبھارے گئے نقش و نگار نوادرات کی دنیا میں بہت قابلِ توجہ شے ہیں مگر شاید اُن کے لیے یہ غیر اہم ہوں گے یا پھر بہت زیادہ اہمیت کے حامل یقیناً نہیں ہوں گے۔ وہ ایسے دوسرے دستے باآسانی تیار کر سکتے ہوں گے مگر تلوار...... اُس کی تیاری اتنی آسان نہیں ہوتی ہوگی۔ اسی بنا پر انہوں نے کوئی تلوار دفن نہیں کی تھی۔ شاید وہ ایسا کرنا چاہتے ہوں گے مگر بوجوہ وہ ایسا نہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔"

اسٹیفورڈ شائر کا مدفون خزانہ بنیادی دور پر دھاتی عناصر پر مشتمل ہے، جس کی ڈھلائی کے بعد اشکال کندہ کی گئی ہوں گی۔ ان کی بناوٹ میں اسے دفن کرنے والوں کی کئی بندھی زندگی کے معمولات اور اُن کی رنگینیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ دریافت شدہ نوادرات پر اُبھرواں نقوش اور سونا، دونوں چیزیں اُن کی زندگی میں ماورائیت اور جادو پر یقین کا اظہار کرتی ہیں۔ ویسے بھی ساتویں صدی کا وہ دور جادوئی کرشموں اور توہم پرستی کے عروج کا زمانہ تھا۔ علم کم تھا اور دلیل کی بنیاد کسی توہم پرست کو درست راہ پر لا نہیں سکتی تھی۔ بدقسمتی سے تحفظ، خوش قسمتی کا حصول، دشمن پر غلبہ، خوراک کی بہتات، مویشیوں کے لیے چارا، سازگار موسم ...... یہ وہ ضروریات تھیں جن کے لیے وہ جادو اور ماورائیت پر یقین کرتے تھے۔ وہ شیطان سے تحفظ کے لیے بھینٹ چڑھاتے اور خوش قسمتی کے لیے ان دیکھی ماورائی مخلوقات کو نذرانے پیش کرتے تھے۔ اُن کی دنیا میں دھات اور جادو کا بہت ساتھ تھا۔ اس وقت کی قیمتی دھات سونا تھی اور وہ سونے کو جادوئی اور متبرک سمجھ کر اُن اشیا کی آرائش میں استعمال کرتے تھے، جن سے اُن کی زندگی قائم و دائم تھی۔ تلوار ان کی زندگی کا سب سے اہم ہتھیار تھا۔ وہ اس کے دستے پر سونا استعمال کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جہاں سونا ہو وہاں جادو اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے یہ زرد قیمتی دھات اُن کے لیے تحفظ کی بھی علامت تھی۔

سیکسن باشندے قدیم جرمن قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی زندگی میں سونے کی اہمیت اور اس کے بلند معیار کا اندازہ کرنے کے لیے اُن کی قدیم دیو مالائی داستانیں ہی کافی ہے۔

ایک جرمن دیو مالائی داستان میں بیان کیا گیا ہے کہ "بڑے دیوتا کے محل کا سب سے بڑا ہال سونے سے بنا ہوا تھا۔" یہی نہیں، اشاعتِ عیسائیت کے ابتدائی صدیوں میں سونے نے مبلغین کو بھی اپنی طرف راغب ہونے پر مجبور کیا۔ سونا چرچ کو بطور خراج ادا کیا جاتا تھا اور یہ خراج ادا کرنے کے شواہد سولہویں صدی عیسوی تک ملتے ہیں۔ تاریخ میں ٹھوس بیان موجود ہے کہ شاہِ اسپین، سلطنت کے لیے حاصل کیے گئے سونے کی ایک بڑی مقدار چرچ کو بطور نذرانہ پیش کرتا تھا۔ سونے کی اینٹوں پر علیحدہ علیحدہ مہر لگائی جاتی تھی۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ کون سا سونا چرچ اور کون سا شاہی خزانے کے لیے تھا۔ شمالی یورپ کے سفید فاموں ... کی لوک کتھائیں بھی سونے اور جادو سے متعلق بے شمار کہانیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

اسٹیفورڈ شائر کے دفینے سے ملنے والی تمام چیزیں یوں تو بلاشبہ آلاتِ حرب پر مشتمل ہیں لیکن ان میں تین ایسی چیزیں پائی گئی ہیں جن کے بغور مشاہدے سے کچھ اور پتا چلتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ تین نمونے اپنی بناوٹ کے اعتبار سے کسی خاص قسم کے مذہبی یا ماورائیت پر مبنی عقیدے کا پتا دیتے ہیں۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ ان چیزوں کو اُن باشندوں کے سماج میں بھوت پریت اور بُری ارواح سے محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ انہوں نے دفن کیے گئے سامان میں بھی یہ اشیا اسی لیے رکھی ہوں گی کہ ان کی وجہ سے ہر بُری قوت اس دفینے سے دور رہے۔ یہ تینوں چیزیں، دو سونے کی بنی ہوئی صلیب اور ایک لمبوترے سلینڈر نما شے پر مشتمل ہے۔ یہ بھی سونے کا بنا ہوا ہے۔ اُن تینوں پر قدیم سیکسن زبان میں بائبل کے کچھ جملے کندہ ہیں۔

برطانیہ میں عیسائی مذہب رومی فوج اور اُن کے باشندوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ جیسے جیسے یہاں پر سلطنتِ روما کی گرفت کمزور پڑتی گئی، ویسے ویسے عیسائیت بھی پس پشت جاتی رہی۔ رومیوں کے ساتھ ہی عیسائیت بھی اس سر زمین سے رخصت ہوگئی۔ اُس کے کافی عرصے کے بعد عیسائیت دوبارہ اس سرزمین پر متعارف ہوئی انگلستانی سیکسن باشندوں کے ذریعے۔ وہ کٹر عیسائی تھے اور ان کے ہاں مبلغین کی بہت اہمیت تھی۔ انگلستانی سیکسن جب برطانیہ آئے تو اس کے ساتھ ہی مبلغین کی آمد بھی شروع ہوگئی۔ زیادہ تر مبلغین آئرلینڈ اور یورپ کے دیگر ممالک سے تعلق

رکھتے تھے۔ عیسائیت انگلستانی سیکسن کا معروف مذہبی عقیدہ تھا۔ وہ اس پر سختی سے کاربند تھے۔

انگلستانی سیکسن باشندوں کے مذہبی عقائد پر مؤثر دسترس کی حامل دانش ور اور مصنفہ کیرن جولی کا کہنا ہے کہ "اس زمانے میں تصور تھا کہ جنگ مذہب کی روحانی بنیاد پر لڑی جاتی ہے۔ سیکسن باشندوں نے اس تصور کو بدل دیا۔ وہ تو اپنے ہم مذہبوں سے بھی جنگ لڑتے تھے، وہ بھی زمین کے لیے نا کہ روحانی تسکین پانے کے لیے۔"

مذہب اور جنگ، دونوں اس وقت کے باشندوں کی زندگی میں یکساں عمل دخل رکھتے تھے۔ یہ سیکسن باشندے ہی تھے جنہوں نے صلیبی نشان کو جنگوں میں بطور امتیازی نشان استعمال کرنے کی روش کو فروغ بخشا تھا۔ مورخ بیڈی اس حوالے سے ایک دلچسپ قصہ بیان کرتے ہیں:

"صلیب اٹھا کر میدانِ جنگ میں آگے بڑھنے کا مطلب تھا کہ انہیں اس مذہبی نشان کی برکت سے فتح نصیب ہوگی۔ وہ کٹر عیسائی تھے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے یہی مثال کافی ہوگی کہ نارتھمبریا کے بادشاہ اوس والڈ نے 634ء میں ویلش کے ساتھ جنگ کی۔ تاریخ میں یہ ہیون فیلڈز کی لڑائی کہلاتی ہے۔ وہ لڑائی شروع ہونے سے قبل میدان میں پہنچا اور بڑی سی صلیب زمین پر گاڑ کر اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور دعا مانگی کہ اے خدا تو اپنے ماننے والوں کی اس کڑے وقت میں مدد کے لیے آسمان سے فرشتے بھیج دے۔ اس جنگ میں اُس کی سپاہ کو فتح نصیب ہوئی۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ فتح خدا کے ان ماننے والوں کے لیے بھیجی گئی غیبی مدد سے حاصل ہوئی ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ لڑائی کے دونوں فریق الہامی مذہب عیسائیت کے ماننے والے تھے اور یہ لڑائی مذہبی عقیدے نہیں بلکہ زمین کے حصول کے لیے لڑی گئی تھی۔"

نوادرات سے دو صلیبیں ملی ہیں۔ جن پر بائیبل کے کلمات بھی تحریر ہیں۔ کیا یہ بھی جنگ میں تلوار کی طرح اہمیت رکھتی تھی۔ بیڈی کے مطابق "ہاں...... یہ ممکن ہے۔ اُس زمانے میں صلیب بھی ان جنگجو قبائل کے لیے ایک ہتھیار کی طرح ہی تھا۔ ہتھیار، جس سے لڑائی میں دشمن کے خلاف بھی مدد حاصل ہونے کی امید کی جاتی تھی۔ یہ اُن کا مضبوط عقیدہ تھا۔ اتنا ہی مضبوط جتنی اُن کی تلوار۔ وہ صلیب پر اتنا ہی بھروسا کرتے تھے جتنا کہ اپنی تلوار پر۔ اس لیے ممکن ہے کہ جہاں انہوں نے اپنے بہت سارے ہتھیار زمین میں دفن کیے، وہیں انہیں بھی دفن کر دیا۔ یہ بھی تو ان کی جنگوں کے مقدس ہتھیار ہی تھے۔"

سن 740ء میں لکھی گئی کتاب لائف آف سینٹ گوتھا لک اگرچہ ایک عیسائی مبلغ کی زندگی کے واقعات کو بیان کرتی ہے تاہم اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جن کو پڑھنے کے بعد ملنے والے نوادرات کے بارے میں ایک اور رائے جنم لیتی ہے۔

کتاب میں لکھا ہے کہ "سینٹ گوتھا لک بہت بڑی غیبی قوت کا حامل تھا۔ وہ خدا سے مدد مانگتا تو آنِ واحد میں اسے مل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ بہت سی بدروحیں اس کے سامنے پہنچ کر نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے لگیں۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بائبل کی 63 ویں آیت 'خدا کا ظہور ہو رہا ہے' کو پڑھا۔ کتاب کے مطابق اُس کے منہ سے ابھی یہ مقدس الفاظ پوری طرح ادا بھی نہیں ہو پائے تھے کہ وہ تمام بھوت پریت اور بدروحیں دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔"

مؤرخ بیڈی کے مطابق "دفینے سے ملنے والے نوادرات بظاہر آلاتِ حرب ہیں مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان کے مقدس ترین آلات حرب ہوں جو لڑنے کے لیے بلکہ جنگ میں غیبی قوت کے حصول کے لیے ساتھ رکھے جاتے ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ ہتھیار اُن کے لیے بہت متبرک و مقدس ہوں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے کسی مبلغ کے کہنے پر انہیں زمین میں دفن کیا ہو۔ اس بات کی گنجائش اس لیے موجود ہے کہ اُس عہد میں ماورائیت، مبلغین، پادریوں اور سینٹ پر، عام لوگوں کو تو چھوڑیے اُمرا کی زندگیوں پر بھی گہرا اثر تھا۔ عام لوگوں کے لیے تو وہ لوگ پُراسرار قوتوں کے حامل تھے۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ وہ ان کی پُراسرار قوتوں کے آگے گھٹنے ٹیک کر ان کی ہر بات کو حکم کا درجہ دیتے ہوئے تسلیم کر لیتے ہوں گے۔ اُن کے ہاں ضعیف الاعتقادی بہت عام ہوگی۔ وہ دور ہی ایسا تھا۔ ممکن ہے کہ جو نوادرات ملے ہیں وہ اُن کے جادوئی اثرات و قوت کی حامل اشیا ہوں۔"

بات کچھ بھی ہو مگر ایک حقیقت یہ ہے کہ وہ نوادرات آج کے ماہرینِ آثاریات و بشریات کے لیے کئی لحاظ سے اہمیت کے قابل ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ برطانوی تاریخ کے ابتدائی ایام سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ان ہتھیاروں کی مدد سے وہ جان سکتے ہیں کہ قدیم

انگلستانی سیکسن کی فوجی تیاریاں کس طرح کی ہوتی تھیں۔ تیسرا یہ کہ ان فنِ حرب کو سمجھا جاسکتا ہے۔ چوتھا یہ کہ اس کے ذریعے اُن کی فوجی زندگی کے ساتھ ساتھ اسلحہ تیار کرنے والوں کی صلاحتیں، نیز اُن کے کندہ کاری کے ماہرین کا فن بھی سامنے آتا ہے۔ پانچویں بات یہ کہ دفینے سے دریافت شدہ صلیبیں اور سلنڈر نما بڑے سے جادوئی چراغ جیسی شے سے اُن کے معاشرے کے مذہبی عقائد میں توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی سامنے آتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ بات کہ یہ نوادرات اب تک برطانیہ سے ملنے والے وہ قدیم ترین نوادرات ہیں جو ایسے حملہ آوروں کے نہیں جو آئے اور آکر چلے گئے بلکہ ان سیکسن باشندوں کے ہیں جنہوں نے یہاں پر حملہ کیا، قدم جمائے اور اس برطانوی راج کی بنیاد رکھی جو اب بھی دنیا میں موجود ہے۔ سیکسن، جنہیں یہاں مستقل طور پر ٹھہر جانے کے باعث یورپی سیکسن سے امتیاز برتنے کی خاطر انگلستانی سیکسن کا نام دیا گیا۔ انگلستانی سیکسن نے برطانوی تاریخ، ثقافت، رسم ورواج، لسانیت، تہذیب، مذہب، راج...... غرضیکہ ہر شے پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور اب ملنے والے یہ نوادرات ماہرینِ بشریات کو یہ سمجھنے میں مدد دیں گے کہ دراصل وہ مسلح جنگجو کیسے تھے جو تلوار کے بل پر ایسا راج قائم کر گئے جس کی بنیادیں آج بھی نہایت مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں۔

"دلچسپ بات یہ ہے کہ مرسیائی باشندوں کا مطلب سرحدوں پر حملہ کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ کتنی دلچسپ بات ہے کہ تاریخ میں جن لوگوں کو سرحدوں کے حوالے سے نام ملا ہے، ان کا دفینہ بھی ایک سرحدی علاقے سے ہی دریافت ہوا ہے۔" مؤرخ اور ماہرِ بشریات کیون نے کہنا شروع کیا۔ "یہ نوادرات جس علاقے سے دریافت ہوئے ہیں وہ کسی زمانے میں انگلستانی سیکسن کی قدیم ریاست مرسیا اور ویلز کے درمیان کا سرحدی علاقہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ علاقہ تھا جہاں سیکسن اور ویلز والوں نے ایک دوسرے سے کئی جنگیں لڑی تھیں۔"

تاریخی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ 650 عیسوی میں وادیِ ٹرینٹ میں واقع اسٹیفورڈ شائر کے علاقے لچ فیلڈ کے قریب مرسیائی سیکسن اور ویلز والوں کے درمیان بہت ہی خوفناک لڑائی لڑی گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہیں سے قدیم رومن روڈ گزرتا تھا۔ اگرچہ آج اس روڈ کے نشان تو موجود نہیں مگر قدیم دستاویزات کے حوالے سے یہاں رومن روڈ کے نام سے جس مقام کی نشاندہی کی جاتی ہے، وہاں سے آج کی واٹلنگ اسٹریٹ گزرتی ہے۔ جہاں سے دفینہ ملا ہے، ماہرینِ تاریخ کہتے ہیں کہ اُس سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر بھی قدیم رومن روڈ گزرتا تھا۔

برطانوی تاریخ کے اہم ترین باب سے متعلق اس دفینے کی دریافت ماہرینِ بشریات وحرب، مورخوں اور خزانہ تلاش کرنے والے دولت کے رسیاؤں کی توجہ اسٹیفورڈ شائر کے علاقے لچ فیلڈ پر مرکوز کروا گئی ہے۔ لچ فیلڈ قدیم انگلش کا لفظ ہے جس کے معنی 'مشترکا چراگاہ' ہے۔ جہاں سے دفینہ ملا ہے، وہاں تیرہ سو سال پہلے گھنا جنگل تھا مگر اب وہاں کھیت اور چراگاہیں ہیں۔ انہی میں سے ایک چراگاہ پر فریڈ جانسن کے گھوڑے بھی چرتے ہیں۔

خزانہ جن لوگوں نے دبایا، وہ کون تھے؟ انگلستانی سیکسن تھے، لٹیرے یا پھر جادوگر...... یہ بات کبھی دنیا نہیں جان پائے گی...... کیا انہوں نے خزانہ عارضی طور پر دفن کیا اور پھر گھنے جنگل میں وہ دفینے پر لگی نشانی بھول کر اُس سے محروم ہوئے۔ یہ بات بھی اب ہمیشہ راز رہے گی...... کیا وہ اپنے بعد کے آنے والے کسی عہد کے لیے کچھ ثبوت چھوڑ کر جانا چاہتے تھے، اس کا بھی پکا پتا نہیں...... کیا وہ نوادرات کسی ایسے عسکری سردار کے تھے، جس کی موت کے بعد اُسے دفن کرنے کی وصیت تھی۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ اُس دور میں یہ روایت تھی مگر اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

جو راز جانتے تھے وہ خود سربستہ راز ہیں اور تاریخ کے صفحات اس بارے میں بالکل خاموش۔ البتہ ان دریافت شدہ نوادرات کے بارے میں ایک بات حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے۔

"یہ دریافت برطانوی تاریخ کے اہم ترین دور کی وہ نشانی ہے، جو اب ہمارے پاس پہنچ چکی۔" کیون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مفروضات، امکانات اور خیالات اپنی جگہ...... مگر ایک بات طے ہے کہ اب ہماری آئندہ آنے والی نسلیں اپنی تاریخ کا صدیوں پرانا ایک اہم باب ان ٹھوس آثار کی شکل میں ضرور دیکھ سکیں گی۔"

جان کا خطرہ

ایس۔ امتیاز احمد

آگ کے شہر میں تنکے کی حقیقت کیا ہوتی ہے؟ اگر سازش پکی ہو تو آگ پورے گھر کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس ملک کے وزیراعظم کی جان کو خطرہ تھا، محب وطن اس کی جان بچانے اور غدارانِ وطن اس کی جان لینے کی سعی میں مصروف تھے۔ رسہ کشی عروج پر تھی۔ فوج کا بیرک سب سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے وزیراعظم کو ملٹری اسپتال میں رکھا گیا مگر......

موت گر تعاقب میں ہو تو قاتل کہیں نہیں رکتے

وہ سرجن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اچانک ایئر کنڈیشنر خراب ہوگیا۔ صرف چند لمحوں بعد ڈاکٹر جان کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اسے یہاں بیٹھے ہوئے تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ چھ بجے صبح ایک نرس نے اسے جگا کے بتایا تھا کہ ایک ہنگامی کیس کے سلسلے میں اس کی فوری ضرورت ہے۔ وہ اپنے ملک کی فوج کے ساتھ افریقا کے ایک نوآزاد جزیرے میں مقیم تھا۔ یہ فوج جزیرے میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ جزیرے کا وزیراعظم شدید بیمار تھا۔ اسے نیم بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا اور اس کی حالت بے حد

نازک تھی۔ یہ وزیراعظم ایک مقبول سیاست دان بھی تھا۔ اس نے غیر ملکی استعمار کے خلاف برسوں اَن تھک جدوجہد کی تھی۔ لاٹھیاں کھائیں، جیلوں میں رہا، جلاوطن ہوا مگر اپنے موقف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ جزیرے کی آزادی دراصل اسی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ قوم اس پر جان چھڑکتی تھی۔ مگر مخالف سیاسی گروہ اسے قطعاً پسند نہیں کرتے تھے اور جیسے بھی ممکن ہو اسے اپنی راہ سے ہٹانے کے درپے رہتے تھے۔ وزیراعظم پر کئی قاتلانہ حملے ہو چکے تھے لیکن خوش قسمتی سے وہ ہر حملے میں بچ گیا تھا۔

ان حالات کے تحت اعلیٰ حکام نے فیصلہ کیا تھا کہ چونکہ وزیراعظم کی جان کو مخالفین کی طرف سے خطرہ ہے اس لیے انہیں علاج کے لیے ملٹری اسپتال میں رکھا جائے۔ اس طرح مخالفین سازش بھی کریں گے تو وزیراعظم تک پہنچ نہیں پائیں گے۔ جزیرے میں بغاوت کا دور دورہ تھا۔ حکومت مخالف سرگرمیاں شباب پر تھیں اور خطرہ تھا کہ کوئی باغی اس ہر دل عزیز وزیر کو نقصان نہ پہنچا دے، چنانچہ ملٹری اسپتال کے اردگرد مسلح فوجیوں کا زبردست پہرا لگا ہوا تھا۔

جان نے بیمار وزیراعظم کا معائنہ کیا تو سمجھ گیا کہ اس کا آپریشن ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن وہ صرف اپنی ذمّے داری پر آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ جب تک ڈاکٹر بجنگو اسپتال نہ پہنچ جائے وہ آپریشن شروع نہ کرے۔ ڈاکٹر بجنگو مقامی اسپتال کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ حکومت کی طرف سے اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوراً ملٹری اسپتال پہنچ کے وزیراعظم کے علاج کی ذمّے داری سنبھال لے۔ جان کو ڈاکٹر بجنگو کا شدت سے انتظار تھا۔

وزیراعظم بہت حساس آدمی تھا۔ وہ جزیرے کی آزادی پر بے حد مسرور تھا اور ایسی تشویش ناک حالت میں بھی مسرت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹر بجنگو کو مامور کیا گیا ہے تو بہت خوش ہوا۔ اس نے ڈاکٹر جان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ صرف ڈاکٹر بجنگو کو آپریشن کی اجازت دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر جان اس کے نزدیک ایک نسبتاً نوآموز اور ناتجربہ کار معالج تھا۔ وزیراعظم مسرت کے اس موقع پر کوئی خطرہ مول لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

ڈاکٹر جان کی پیشانی پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی گنگنائی۔ اس نے پیشانی اور گردن سے پسینہ پونچھا اور فون کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ہیلو۔“

دوسری طرف سے ڈاکٹر بجنگو کی سیکریٹری اطلاع دے رہی تھی کہ ڈاکٹر ملٹری اسپتال کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ اس کی ہدایت تھی کہ آپریشن کی تیاری اس کے پہنچنے سے پہلے ہی مکمل ہو جانی چاہیے۔

جان نے کمرے کا دروازہ کھولا اور نرس کو آواز دی اور اسے جلدی جلدی چند ضروری ہدایات دیں اور کہا کہ مریض فی الفور آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا جائے۔ مریض برابر کے وارڈ میں بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ اس پر دو گھنٹے سے جان کنی کی کیفیت طاری تھی۔

نرس مریض کو لینے کے لیے بھاگی اور ڈاکٹر جان اپنی یونی فارم تبدیل کرنے لگا۔ اس نے آپریشن کا مخصوص..... لباس پہنا اور ڈاکٹر بجنگو کے انتظار میں نقاب اور سفید ٹوپی اُٹھائے ہوئے راہ داری میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے نقاب اور ٹوپی بھی پہن لی۔

آپریشن تھیٹر میں اسپتال کا تقریباً پورا عملہ جمع تھا۔ گیس کے سلنڈر کی دیکھ بھال جاری تھی تاکہ وہ کہیں عین موقع پر دھوکا نہ دے جائے۔ جان نے احتیاطاً دوسرے سلنڈر کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ وہ انتظام کے سلسلے میں کوئی الزام اپنے سر لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

جان نے خوب رگڑ رگڑ کے اپنے ہاتھ اور بازو کہنیوں تک دھوئے۔ اس معاملے میں وہ بہت محتاط تھا۔ پھر جب وہ ہاتھوں کی صفائی سے مطمئن ہو گیا تو اس نے نرس کی طرف دیکھا۔ نرس اسے یہ بتانے آئی تھی کہ مریض آپریشن تھیٹر میں پہنچ چکا ہے اور ہدایت کے مطابق اسے بے ہوش کرنے والی دوائیں بھی دی جا چکی ہیں۔ جان اب پوری طرح تیار تھا۔ اگر آپریشن صرف چند لمحوں بعد بھی شروع ہو جاتا تو اس کے انتظامات میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اس قسم کے ہنگامی آپریشنوں کے لیے وہ عموماً صرف چند لمحوں میں تیار ہو جاتا تھا اور کام شروع کر دیتا تھا لیکن آج اسے ڈاکٹر بجنگو کا انتظار کرنا تھا۔

جان اس سے پہلے ڈاکٹر بجنگو سے کبھی نہیں ملا تھا کیونکہ دراصل فوجی اسپتال کا مقامی اسپتال سے بہت کم تعلق رہتا تھا۔ یہ رابطہ اسی وقت ہوتا تھا جب کوئی ایسا مریض آ جائے جسے... بے پناہ احتیاط سے رکھنے کی ضرورت ہو اور یہ خیال کیا جائے کہ مقامی اسپتال کا عملہ اس مریض کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکے گا۔

وہ انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر بجنگو انتہائی ماہر ڈاکٹر ہوگا۔ اسی وجہ سے وزیراعظم کے آپریشن کے لیے اسے بیس میل دور سے بھیجا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر بجنگو ایک مقامی ڈاکٹر تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جزیرے میں اس سے زیادہ قابل کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ اسی لیے حکام کی خواہش تھی کہ وزیراعظم کا آپریشن وہی کرے۔ غالباً اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اگر آپریشن ناکام ہو جائے تو ناکامی کا الزام فوجی ڈاکٹر پر نہ آئے۔ ڈاکٹر جان نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا کہ اگر وزیراعظم کا آپریشن وہ تنہا کرتا اور آپریشن ناکام ہو جاتا تو اس کی ناکامی سیاسی حلقوں میں افواہوں کا باعث بن سکتی تھی۔ جب اسے یہ بتایا گیا تھا کہ وزیراعظم کے کیس کا نگراں ڈاکٹر بجنگو ہوگا تو اسے یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی کہ ڈاکٹر بجنگو برطانیہ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور اس کا شمار دنیا کے بہترین سرجنوں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بجنگو ملٹری اسپتال پہنچا تو جان دستانے پہن چکا تھا۔ افریقی ڈاکٹر نقاب اور سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ وہ جان کی طرف دیکھ کے اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھا اور اشارہ کیا کہ آپریشن کسی تاخیر کے بغیر شروع کر دیا جائے۔ ڈاکٹر بجنگو نے جلدی جلدی ..... ہاتھ دھوئے۔ گاؤن وہ پہلے ہی پہن چکا تھا۔ اس نے ہاتھ دھو کر دستانے پہنے اور جان کے ساتھ آپریشن تھیٹر میں آ گیا۔

افریقی ڈاکٹر گھوم کر میز کے دوسری جانب چلا گیا تاکہ آپریشن کے دوران..... وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ وزیراعظم کا پیٹ فوراً چاک کر کے کھول دیا گیا۔ پیٹ کھلتے ہی انہیں خون کے اخراج کا سبب معلوم ہو گیا۔ وزیراعظم کے پیٹ میں بہت بڑا ناسور تھا۔ جان کو خون کے اخراج کا سبب معلوم ہوا تو اس کے حلق سے ایک طویل سانس نکل گئی۔ اس نے انگلی سے ناسور کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں تیزی سے کام کرنے لگے۔ جان نے ڈاکٹر بجنگو کی یہ خواہش آپریشن شروع ہوتے ہی محسوس کر لی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کام جان کرے۔ اسے افریقی ڈاکٹر کی اس خواہش پر حیرت تو ہوئی تھی مگر اس نے کوئی رّدِعمل ظاہر کیے بغیر بیشتر کام خندہ پیشانی سے اپنے ذمّے لے لیا تھا۔

چنانچہ آپریشن کا زیادہ تر کام اسی نے کیا۔ ڈاکٹر بجنگو بھی اس کی مدد کرتا رہا۔ جان نے ناسور کی طرف اشارہ کیا تو ڈاکٹر بجنگو نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے دونوں ہاتھ مریض کے کھلے ہوئے پیٹ میں داخل کر دیے۔ دونوں خاموشی سے جلدی جلدی کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر جان نے ناسور میں ٹانکے لگائے۔ جب وہ آخری ٹانکا لگا رہا تھا تو ڈاکٹر بجنگو نے جلدی سے قینچی آگے بڑھائی اور دھاگا کاٹ دیا۔ جان نے محسوس کیا کہ یہ حرکت اس سے غیر ارادی طور پر ہوئی ہے۔ ڈاکٹر بجنگو دھاگا کاٹتے وقت جھٹکے کی وجہ سے توازن برقرار نہیں رکھ سکا اس لیے قینچی اچانک پھسلی اور ناسور میں گہری دھنس گئی۔ ڈاکٹر بجنگو نے جلدی سے قینچی نکالی۔ قینچی نکلتے ہی ناسور سے خون کا فوارہ

اُبل پڑا۔ وزیراعظم نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا پھر بھی درد سے بلبلایا اور خوف زدہ ہو کے اچھل پڑا۔ پھر اس کے زخم سے خون کا اخراج اس قدر زیادہ ہونے لگا کہ اس پر قابو پانا ممکن نہیں رہا۔

اسے جلدی سے دوبارہ لٹا گیا۔ ڈاکٹر جان نے بہت احتیاط سے زخم پر ہتھیلی رکھ دی لیکن قینچی بہت گہری لگی تھی لہٰذا کھلے ہوئے پیٹ میں خون ہی خون بھر گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر احتیاط کے باوجود صرف دو منٹ کے قلیل عرصے میں دونوں ڈاکٹروں کے سامنے وزیراعظم نے دم توڑ دیا۔

ڈاکٹر جان ڈاکٹر بجنگو کو کڑی نگاہ سے گھورنے لگا۔ افریقی ڈاکٹر چند لمحوں تک تشویش ناک انداز میں ساکت کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے گھوما اور برابر کے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر جان تھکے تھکے قدموں سے اس کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ڈاکٹر بجنگو اپنے ہر دل عزیز وزیراعظم کا آپریشن کرتے وقت حواس باختہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کبھی کبھی بہت زیادہ جذباتی ہونا بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

اس نے دروازے کے قریب رک کر وزیراعظم کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ موت کی وجہ سے بھیانک ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر جان جانتا تھا کہ اس کی موت کس قدر اہمیت رکھتی ہے، جزیرے کی انقلابی حکومت اس کے بغیر معطل تھی۔ جان سر سے پاؤں تک کانپ کے رہ گیا۔

وہ تیزی سے گھوما اور فون کی طرف بڑا۔ وہ اپنے افسر کو اس حادثے کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ جب وہ فون کے قریب پہنچا تو یکایک گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے تیز تیز آواز آئی۔ ”میں ڈاکٹر بجنگو بول رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری کار کا ایک پہیا پنکچر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر جان! کیا آپ مہربانی کر کے میرے پہنچنے تک آپریشن شروع کر سکتے ہیں؟ میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔“

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 68

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سویرا جو میرے دل کا حصہ تھی وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ میں نے

کاروبار شروع کیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آگیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومتِ چین کا ایک بریف کیس آگیا۔ وہ بریف کیس شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کرلیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کر کے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کر لایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکا دی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہوچکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میسج کر کے ایمن کو بلوالیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ..... بکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں پہنچے تو فون آگیا۔ آواز مرشد کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے انکار کیا کہ یہاں شہباز نہیں رہتا مگر پیغام پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کہ میری موجودگی سے وہ آگاہ ہوگیا تھا۔ ہم دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ پھر اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ اندازہ درست تھا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا راستے سے لاپتا ہوگئی ہے۔ بعد میں فون آیا کہ اسے فتح خان نے حویلی پہنچادیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر پھر... نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ زخمی فتح خان اور زروسکی کو لے کر چلا۔ راستے میں فتح خان کو اتار دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک کوٹھی نظر آئی جو ایک ملیٹری آفیسر کی تھی۔ میں نے اسے حالات بتا کر مدد طلب کی۔ زروسکی کو ملیٹری پولیس کے حوالے کرنے چلا گیا تھا کہ کوٹھی پر حملہ ہوگیا۔ میں نے حملہ پسپا کیا۔ ملیٹری افسر زخمی تھا، مجھے ملیٹری انٹلی جنس والے ساتھ لے گئے۔ انہی لوگوں نے مجھے پنڈی پہنچانے کا انتظام کردیا۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ تلاش میں نکل پڑا۔ ان کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑلیں۔ صابر تو پکڑ میں آگیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ کالی کوٹھی کو تباہ کرنے کے لیے ہم نے دھماکا کیا تھا کہ پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔

.... (اب آگے پڑھیں)

میں چونکا، وہاں کچھ نہیں تھا، نہ ہیلی کاپٹر آگ کا گولا بنا تھا اور نہ کوئی دھماکا ہوا تھا۔ واقعات کی تیز رفتاری نے میرے تخیل کے ساتھ مل کر مجھے وہ دکھایا تھا جو ہو سکتا تھا جس کا خدشہ میرے ذہن میں تھا۔ لیکن وہ حقیقت میں ہوا نہیں تھا۔ ہیلی کاپٹر تھوڑا اوپر اٹھا تھا اور گولیاں لگنے کے بعد دھواں اگلتے ہوئے دوبارہ زمین پر آبیٹھا تھا۔ وہ جس طرح گرا تھا اسے بیٹھنا ہی کہا جا سکتا۔ ذرا جھکنے سے اس کا پر گھومتے ہوئے زمین سے ٹکرایا اور اس نے کنکریٹ کو چھیل دیا اور پھر تصادم نے ایک پر اڑا دیا۔ وہ اڑ کر دور رن وے پر جا گرا۔ عبداللہ اور دوسرے لوگ جو ہیلی کاپٹر کی کریش لینڈنگ سے بچنے کے لیے دور ہٹ گئے تھے معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ اب ہیلی کاپٹر ترچھا کھڑا تھا اور اس کا پر گھومتے ہوئے بار بار فرش سے ٹکرا رہا تھا۔ اگر وہاں کنکریٹ کے ٹھوس فرش کی جگہ کچی مٹی کا میدان ہوتا تو گھومتا پر زمین میں دھنس جاتا اور پھر پر رک جانے سے انجن ہیلی کاپٹر کے جسم کو گھماتا اور امکان تھا کہ وہ خود ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسرا پر بھی ٹوٹ گیا اور اڑ کر اس طرف گیا جہاں چھوٹے طیارے کھڑے تھے۔ وہاں اس نے کیا تباہی مچائی میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ اب ہیلی کاپٹر کا ایک ہی پر گھوم رہا تھا اور وہ اسے بھی جھلا رہا تھا۔ اچانک مجھے وسیم کی آواز نے چونکایا۔ وہ چلّا رہا تھا۔

"شہباز صاحب ....اس کو روکیں، وہ ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کر رہا ہے.....شہباز صاحب۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے سنبھل کر کہا۔ "وسیم وین کی گن سے اس جگہ کو نشانہ بناؤ۔"

"نہیں وہاں آپ ہیں۔" اس نے انکار کردیا۔ "اسے روکیں اس سے پہلے وہ چوپر کے ٹینک کو ہٹ کردے۔"

میں پستول نکالتے ہوئے درختوں کے اوپری حصے کی طرف بڑھا۔ دور مار گن والا وہیں کہیں تھا۔ آواز اسی طرف سے آرہی تھی۔ وسیم سے گفتگو کے دوران میں جھنڈ میں داخل ہوگیا اور وسیم سے کہا۔ "وین لے کر فوراً وہاں پہنچو اور انہیں نکالو۔"

"میں پہلے ہی روانہ ہوچکا ہوں۔" وسیم نے کہا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سیاہ وین رن وے پر آچکی تھی اور تیزی سے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جس کا انجن بند ہوگیا تھا لیکن باقی رہ جانے والا پر گھوم رہا تھا اور جب تک یہ نہیں رک جاتا کوئی اس کے پاس نہیں جا سکتا اور نہ کوئی ہیلی کاپٹر سے اتر کر باہر آسکتا تھا۔ میں نے فی الحال ہیلی کاپٹر اور اس میں موجود افراد کو ذہن سے نکال دیا اور محتاط قدموں سے اوپر کی طرف بڑھا۔ محتاط ہونے کے باوجود میرے قدموں تلے آنے والے سوکھے پتے جو بارش میں بھیگنے سے محفوظ رہے تھے چرمرا رہے تھے اور معمولی آوازیں نکال رہے تھے۔ وہاں سناٹا تھا اس لیے خود مجھے یہ آوازیں بہت بلند لگ رہی تھیں۔ اوپر موجود بھاری مشین گن رہ رہ کر گولیاں برسا رہی تھی۔ میں نے آواز سے شناخت کرلیا تھا یہ میدانِ جنگ میں استعمال ہونے والا پیدل دستوں کے خلاف سب سے موثر ہتھیار تھا۔ اس بھاری مشین گن کی مار ایک کلومیٹر سے زیادہ ہی ہوتی ہے اور اس کی تین انچ لمبی گولی ایک فٹ موٹی ٹھوس کنکریٹ کی دیوار کے پار ہوجاتی ہے۔ اس کی خوفناک مار کے مقابلے میں اس کی آواز بہت کم ہوتی ہے۔ وسیم نے یقیناً اس جگہ کو اسپاٹ کرلیا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ میں کہیں آس پاس تھا اگر وہ وین کی دور مار اسنائپر گن استعمال کرتا تو امکان تھا میں نشانے پر آجاؤں۔

اب میں اس جگہ کے بہت پاس تھا جہاں سے مشین گن گولیاں برسا رہی تھی۔ گولیوں کے راہ میں آنے والی گھاس اور پودے ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں بکھر رہے تھے۔ کوئی پون صدی پہلے جرمنوں کی ایجاد کردہ یہ گن آج بھی پروڈکشن میں تھی اور اب اس کے کئی نئے ماڈل آگئے تھے۔ فائرنگ کرنے والوں نے یقیناً اسے اسٹینڈ پر لگایا ہوگا اسے ہاتھ میں لے کر صرف ریمبو چلا سکتا تھا اور وہ بھی فلموں میں۔ عملی طور پر ایسا ممکن نہیں تھا۔ زمین پر اسے جمانے کے لیے جگہ بنائی گئی ہوگی اور اسے یہاں تک اس کی گولیوں کی بیلٹ یا بکس سمیت لانا بھی کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہاں ایک سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی عین ممکن تھی۔ میں ان کے اتنے قریب تھا کہ انہیں شبہ ہوجاتا تو وہ صرف مشین گن کا ہلکا سا رخ بدلتے اور میں فوت ہوجاتا۔

مجھے حیرت تھی کہ انہیں اب تک میری آمد کا پتا کیوں نہیں چلا۔ حالانکہ میں نے درختوں کے باہر آکر بات بھی کی تھی اور جب اوپر جارہا تھا تب بھی خاصی آہٹیں ہوئی تھیں۔ بے شک وقفے وقفے سے مشین گن بھی چل رہی تھی اور اس کا بھی خاصا شور تھا لیکن وہ خاموش بھی ہوتی تھی اور اس دوران میں انہیں میری آواز سن لینی چاہیے تھی۔ مگر ایسا لگ رہا تھا وہاں موجود لوگ بہرے تھے۔ یہ چالاکی بھی ہوسکتی تھی کہ میں پاس آؤں اور وہ اچانک مجھے گولی ماردیں۔ جس

جگہ سے گولیاں گزر رہی تھیں میں اس سے ذرا بائیں طرف سے اوپر نکلا اور پھر میری آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کچی مٹی میں مشین گن کا اسٹینڈ گاڑ کر فکس کیا گیا تھا اور مشین گن کی لمبی نال خودکار طریقے سے گولیاں برسا رہی تھی۔ اس کے اوپر ایک دوربین لگی تھی۔ مشین گن کے ساتھ اس کا گولیوں کا بکس تو فٹ تھا ہی ساتھ ہی کچھ اور چیزیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ گن کے نیچے ایک موٹر اور بیٹری کا سسٹم لگا تھا اور اس کے اوپر کنٹرولنگ سسٹم تھا۔ یہ سب میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا دوسرے لمحے میں اسے بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے اس کے لیے زیادہ کوشش بھی نہیں کرنا پڑی۔ اس کے اوپر ہی ایک چھوٹا سا کھینچنے والا سرخ بٹن لگا تھا میں نے اسے نیچے کیا تو اگلے ہی لمحے مشین گن خاموش ہو گئی۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا ہیلی کاپٹر کا واحد پر بھی رک گیا تھا اور لوگ اس کے آس پاس جمع ہو رہے تھے۔ میں نے موبائل پر وسیم سے کہا۔

"وسیم یہاں ریموٹ سے آپریٹ ہونے والی مشین گن ہے۔ اسے چلانے والا آس پاس ہوگا۔ اس کے پاس شاید لیپ ٹاپ جیسا کوئی آلہ ہوگا لیکن کوئی بھی آدمی ہوا سے چیک ہوئے بغیر جانے مت دینا اگر کوئی رکنے کے بجائے بھاگے تو اسے گولی مار دینا۔"

وسیم میری بات سمجھ گیا اور اس نے فوری طور پر اپنے آدمیوں کو ہدایت دینا شروع کر دی۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔ "سب خیریت ہے؟"

"ہم انہیں چوپر سے نکال رہے ہیں۔ باقی سب ٹھیک ہیں لیکن مونا بی بی...."

"کیا ہوا مونا کو؟"

"بہ ظاہر چوپر گرنے سے کوئی چوٹ آئی ہے۔ شکر ہے کیبن فائرنگ سے محفوظ رہا ہے۔ ہم انہیں اسپتال لے جا رہے ہیں۔"

"عبداللہ اپنے دوسرے آدمی بھی بلا لو وسیم تم بھی اپنے سارے آدمی بلوا لو۔ دشمن کا کوئی بھروسا نہیں ہے وہ دوسرا وار بھی کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ ان سب کے محفوظ ہونے کا سن کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں نے اس دوران میں گن کا سسٹم مزید سمجھ کر اسے بیکار بنانے کا آغاز کر دیا تھا اس کی بیٹری نکال کر اس کے تار توڑ دیے اور بیٹری .... نیچے اچھال دی۔ پھر اس کے اوپر لگی دوربین جس میں کیمرا بھی لگا تھا اسے توڑ کر گن سے اتار لیا۔ آخر میں وائرلیس کنٹرول سسٹم کے تار بھی کھینچ کر توڑ دیے اب یہ کسی صورت استعمال نہیں ہو سکتی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کام کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ مرشد اس قسم کی کارروائی کا قائل نہیں تھا اس کے پاس مرنے کے لیے آدمی نما کتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ پھر مجھے فاضلی کا خیال آیا۔ مرشد کے آدمیوں میں وہی یہ کام کر سکتا تھا۔ فاضلی کا خیال آتے ہی میں چوکنا ہو گیا تھا۔

دن کا وقت تھا ورنہ میں وسیم سے کہتا کہ وین کی دوربین کا نائٹ موڈ استعمال کر کے اس ڈھلان میں کسی اور کو تلاش کرنے کی کوشش کرے لیکن دن میں یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پوری ڈھلان کا جائزہ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جس نے بھی یہ کام کیا تھا اس نے سب سے پہلے اپنی حفاظت کا بندوبست کیا ہوگا اور اسی لیے اس نے یہ نہایت مہنگا سسٹم یہاں لگایا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس سسٹم کی قیمت ایک ملین ڈالرز تھی۔ یعنی کوئی چھ کروڑ پاکستانی روپے۔ گن استعمال کرنے والا یقیناً کسی ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ اپنا کام کر کے فوری فرار ہو سکے۔ اسے ڈھلان پر موجود رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گن کے ساتھ نہایت موثر قسم کا وائرلیس سسٹم تھا اور یقیناً اسے خاصی دوری سے آپریٹ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے گن سے اتاری دوربین سے کام لیا۔ یہ خاصی طاقتور دوربین تھی۔ ایک میل دور کھڑے آدمی کے نقوش واضح دکھاتی تھی۔ میں نے پہلے ہیلی کاپٹر کی طرف رخ کیا۔ اس وقت وین ان سب کو لے کر وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ میں نے آس پاس کا معائنہ کیا لیکن جہاں تک میں دیکھ رہا تھا مجھے کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا جب کہ گن کو آپریٹ کرنے والا لازمی آس پاس ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ بہ آسانی اپنی کارروائی کر سکے اور اس کے بعد فرار ہو جائے۔

"وسیم تم کہاں ہو؟"

"میں یہیں ہوں جناب.... عبداللہ اپنے آدمیوں کے ساتھ وین کے پیچھے ہے۔"

"تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟"

"تین بائک والے ہیں۔"

"میرا خیال ہے گن آپریٹ کرنے والا نیچے کسی ایسی جگہ موجود ہے جہاں سے وہ اپنا کام کر کے آسانی سے فرار ہو سکے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ ڈھلان پر ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"وسیم نہ جانے کیوں مجھے خیال آ رہا ہے یہ فاضلی کا کام ہے۔ مرشد کے آدمیوں میں وہی اتنا شاطر اور شیطانی دماغ رکھتا ہے۔"

"آپ نیچے آ جائیں ہم یہاں سے نکلنے والے راستوں پر نظر رکھتے ہیں۔"

"نہیں یہاں سے نکلنے کی کرو کچھ دیر میں پولیس آ جائے گی ویسے عبداللہ کو یہاں رکنا چاہیے تھا وہی پولیس سے نمٹ سکتا ہے۔"

"عبداللہ واپس آ جائے گا۔" وسیم نے کہا۔ "لیکن آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

میں تیزی سے پہاڑی سے نیچے اترا اور کئی بار پھسل کر گرتے گرتے بچا بس اللہ نے بچا لیا ورنہ براہِ راست نیچے جاتا اور مجھے بھی اسپتال لے جانا پڑتا۔ میں نے موبائل بند کیا اور بائک اسٹارٹ کر کے ائر کلب کی عمارت کی طرف روانہ ہو گیا۔ چوپر سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا اور ائر کلب کا عملہ اس پر کاربن ڈائی آکسائیڈ کا اسپرے کر رہا تھا۔ اگر اس میں آگ لگ جاتی تو پھر کسی کا بچنا محال تھا۔ اللہ نے بچت کی اور پائلٹ شفاعت نے بہت مناسب انداز میں کریش لینڈنگ کی تھی ورنہ وہ جس طرح بے قابو ہو کر گھوم رہا تھا ایسا لگتا تھا بہت بری طرح گرے گا۔ مگر شفاعت نے واقعی مہارت کا ثبوت دیا تھا اور اس نے کوشش کر کے ہیلی کاپٹر کو مکمل تباہ ہونے سے بچا لیا۔ وہ اس وقت اپنے زخمی پرندے کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف جانے کی کوشش نہیں کیونکہ وسیم مجھے عمارت کے پاس ہی نظر آ گیا تھا۔ جیسے ہی میں نے بائک روکی وہ پیچھے بیٹھ گیا۔

"یہاں سے نکل جائیں کلب انتظامیہ نے پولیس کو اطلاع کر دی ہے۔"

میں نے بائک تیزی سے آگے بڑھائی۔ "تم نے کسی مشکوک فرد کو دیکھا؟"

"نہیں ایسا کوئی آدمی نظر نہیں آیا جس پر شک کر سکتا۔"

میں ائر کلب کے گیٹ کی طرف جا رہا تھا اچانک اس طرف سے فائروں کی آواز سنائی دی۔ کوئی چلایا بھی تھا۔ میں نے بائک تیز کی اور جیسے ہی درختوں کے پیچھے چیک پوسٹ پر نکلا سامنے دو افراد خون میں لت پت پڑے تھے اور ان میں سے کم سے کم ایک مر چکا تھا کیونکہ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور خون کے ساتھ اس کا مغز بھی بہہ نکلا تھا۔ دوسرا شاید زندہ تھا۔ ایک گولی اس کے سینے پر اور دوسری گردن پر لگی تھی۔ دونوں چیک پوسٹ کے گارڈ تھے۔ مجھے اندر آتے ہوئے انہوں نے ہی روکا تھا۔ میں نے بائک روکی تو وسیم اترا اس نے زخمی گارڈ سے پوچھا۔ "کیا ہوا یہ کس نے کیا ہے؟"

"ہم.... اسے روکنے کی کوشش.... کی۔" گارڈ نے مشکل سے کہا۔

"کسے؟" وسیم بولا۔ گارڈ کچھ دیر کا مہمان لگ رہا تھا۔

"لمبے بالوں والا.... سلور رنگ کی گاڑی میں گیا ہے۔"

میں لمبے بالوں والے کے لفظ پر چونکا۔ فاضلی کے بال بھی لمبے تھے۔ وسیم اس سے پوچھ رہا تھا کہ گولی اسی نے چلائی تھی؟ گارڈ نے بہ مشکل بتایا کہ گولی گاڑی میں سے کسی نے چلائی تھی اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وسیم جیسے ہی بیٹھا میں نے بائک دوڑائی۔ گارڈ نے گاڑی کی وضاحت نہیں کی تھی لیکن اس کا رنگ بتا دیا تھا۔ آگے سڑک سنسان تھی۔ وسیم اپنے آدمیوں سے موبائل پر رابطہ کرنے لگا کیونکہ وین مونا کو لے کر اسپتال جا چکی تھی۔ وہ آس پاس موجود تھے وسیم نے انہیں سلور رنگ کی گاڑی پر نظر رکھنے کا حکم دیا جس میں ایک لمبے بالوں والا شخص بھی موجود تھا۔ جیسے ہی ان میں سے کسی کو یہ گاڑی نظر آتی وہ فوراً وسیم کو مطلع کرتا۔ میں ہر ممکن رفتار سے بائک چلا رہا تھا۔ ون ٹو فائیو کا پک اپ اچھا ہے۔

"تمہارے پاس ہتھیاروں میں کیا ہے؟"

"ایک پستول اور ایک مشین پسٹل ہے۔" وسیم نے جواب دیا۔ "آپ فکر نہ کریں مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

"ہوشیار رہنا اگر سلور گاڑی میں سچ مچ فاضلی ہوا تو اس سے کچھ بعید نہیں ہے ایٹم بم بھی مار سکتا ہے۔ مومن بغیر لڑے ہی شہید ہو جائے گا۔"

"آپ نے گن کیسے ناکارہ کی؟"

"اس میں سوئچ لگا تھا میں نے اسے بند کیا لیکن اس کے بعد اس کے سسٹم کو تباہ کر دیا دوربین اتار لی تھی تاکہ کوئی مینولی بھی استعمال نہ کر سکے۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس قسم کے ہتھیار اب ہمارے ہاں بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس گن کی

ویڈیو دیکھی تھی۔"

"یار ہمارے جو نام نہاد ہمدرد یہاں آئے ہیں وہ سب سے زیادہ اسلحہ ہی لائے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ اس ملک میں تمام متحارب گروہوں کو حلق تک اسلحے سے بھر دیں تاکہ یہ ملک خانہ جنگی سے تباہ ہو جائے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وسیم نے میرے کان میں سرد آہ بھری۔

میں بائیک کو اس کی استعداد سے زیادہ تیزی سے دوڑا رہا تھا اور پھر مجھے آگے سلور رنگ کی گاڑی کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ اسی لمحے دائیں طرف سے ایک بائیک سڑک پر آئی۔ وہ وسیم کا آدمی تھا باقی دو پیچھے تھے۔ وسیم نے دوبارہ انہیں کال کر کے مطلع کیا کہ سلور کار نظر آ گئی ہے اور وہ اس طرف آ ئیں۔ ابھی تک سڑک سنسان تھی لیکن آگے جا کر یہ سڑک پنڈی کے پُر ہجوم علاقوں سے بھی گزرتی تھی۔ ابھی تو پنڈی کا مضافات تھا اس لیے ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا مجھے امید تھی آگے جا کر سلور کار کی رفتار لازمی سست ہو گی اور تب ہم اسے جا لیں گے ابھی تو وہ آدھے کلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلے پر تھی۔ وسیم نے نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹی سی لیکن طاقتور دوربین برآمد کی اور اس کی مدد سے کار میں بیٹھے افراد کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چلتی بائیک میں یہ کام مشکل تھا۔ سڑک بھی ماشااللہ سے گڑھوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان سے بچنے کے لیے بائیک کو لہرانا پڑ رہا تھا اس لیے وسیم کو اپنا کام کرنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ لیکن بالآخر وہ کامیاب رہا۔

"اس میں وہی حرامی لگ رہا ہے.... لمبے بالوں والا.... وہ ڈرائیور کے ساتھ ہے اور گاڑی میں وہی دو بندے ہیں۔"

"ممکن ہے کوئی تیسرا پچھلی سیٹ پر لیٹا ہو۔ گارڈ نے بھی یہی کہا تھا کہ کسی نے گاڑی سے فائرنگ کی تھی اگر ڈرائیور نے کی ہوتی تو وہ اس کا نام لیتا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں دشمنوں سے اچانک نمٹنے کی یہ ترکیب اچھی ہے۔ پچھلی سیٹ کی طرف دھیان نہیں جاتا اور وہیں سے گولی آتی ہے۔ کئی مواقعوں پر ہم نے بھی یہ ترکیب استعمال کی تھی۔"

"جب کہیں فاضلی موجود ہو تو آدمی کو دوگنا چوکنا رہنا چاہیے۔"

"لگتا ہے آپ اس سے متاثر ہیں؟"

"ہاں یار میں نے مرشد کے پاس صرف گدھے دیکھے ہیں یا بھیڑیے ہیں جو بغیر کسی احساس کے آدمی کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ فاضلی پہلا آدمی ہے جو اپنا ذہن استعمال کرتا ہے اور بہت مشکل کام کر جاتا ہے۔ یاد ہے اس نے ایمبولینس.... کو اغوا کر کے ہمیں کس طرح حیران کر دیا تھا؟"

"آپ نے ٹھیک کہا اگر اس حملے میں مرشد ملوث ہے تو یقیناً اس کی پلاننگ فاضلی نے کی ہے اور شاید گن بھی وہی آپریٹ کر رہا تھا۔"

سلور کار اب آبادی والے علاقے میں داخل ہو گئی تھی اور یہاں سڑک خالی نہیں تھی۔ شروع میں تو بچے سڑک پر کرکٹ کھیل رہے تھے انہیں اپنی لکڑی کی وکٹ ہٹانے کا موقع نہیں ملا اور کار اسے اڑاتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے کہا۔ "وسیم وقت آ گیا ہے کار کا ٹائر برسٹ کر کے اسے روکنا ہے۔"

وسیم نے اپنے آدمی کو ہدایت کی۔ اس کے دو بائیک والے ابھی پیچھے تھے لیکن وہ بھی چند منٹ میں پہنچ جاتے اگر ہم کار روکنے میں کامیاب ہو جاتے۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا آگے سڑک پر ٹریفک تھا۔ ہم بائیک پر تھے اس لیے بہتر پوزیشن میں تھے اور رفتہ رفتہ کار کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ وسیم کا آدمی آگے نکل گیا تھا۔ مجھے یقین تو نہیں تھا لیکن شبہ تھا کہ سلور کار والے ہمارے تعاقب سے باخبر ہو گئے تھے اور اب اس ٹریفک سے نکلنے کی دیوانہ وار جدوجہد کر رہے تھے۔ اس میں ان سے غلطیاں بھی ہو رہی تھیں پہلے انہوں نے ایک رکشے کو ٹکر ماری اور وہ ایک ریڑھی میں گھس گیا ریڑھی والا مالٹے بیچ رہا تھا۔ لوگ اس حادثے سے محظوظ ہو رہے تھے اور مدد کے بہانے مالٹے لوٹ رہے تھے کہ سلور کار نے غلط سائیڈ سے آنے والے ایک بائیک سوار کو بچانے کی بالکل کوشش نہیں کی اور بائیک والا بونٹ سے ہوتا ہوا سڑک پر دوسری طرف گرا اس کی بائیک بونٹ کے اسی طرف رہ گئی تھی۔ میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا وہ نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ زار زار رو رہا تھا۔

کار کے ان دو حادثوں نے آگے والے ٹریفک کو ہوشیار کر دیا لوگوں نے فرض کر لیا کہ کار میں کوئی نشہ کر کے ڈرائیو کر رہا ہے یا کوئی جرم کر کے بھاگ رہا ہے دونوں صورتوں میں اس کے سامنے آنا خودکشی کرنے کے مترادف تھا اس لیے اب لوگ رضاکارانہ اسے راستہ دے رہے تھے اس وقت ہم کار سے سو گز کے فاصلے پر آ گئے تھے۔ ابھی ہتھیار استعمال کرنے کا موقع نہیں تھا فاصلہ بہت تھا اور درمیان میں اور بھی ٹریفک تھا۔ گولی کسی اور کو بھی لگ سکتی تھی۔ میں اور وسیم کا آدمی کار سے فاصلہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان حادثات سے واضح ہو گیا تھا کہ کار والے ہمارے تعاقب سے واقف ہو چکے تھے اور اب ہم سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک کار سے لمبے بالوں والے نے اپنا نصف دھڑ باہر نکالا اور ہماری طرف پستول سے فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے بائیک لہرائی اور وسیم کا آدمی بھی یہی کرنے لگا۔ فائرنگ کی آواز نے دہشت پھیلا دی تھی اور ہمارے بیچ میں موجود ٹریفک تتر بتر ہونے لگا۔ ایک گولی ایک گدھا گاڑی والے کو لگی اور وہ اپنے گدھے پر گر کر واویلا کرنے لگا اس کے شور سے بدحواس گدھا ایک گلی میں گھس گیا۔ میں نے راستہ صاف ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا ورنہ گدھا وہیں رک کر راستہ بھی روک سکتا تھا۔ اس فائرنگ کا جواب وسیم نے دیا اس نے اپنے پستول سے لمبے بالوں والے کو ڈرانے کے لیے لگاتار کئی فائر کیے۔ وہ فوراً اندر ہو گیا۔ اس کے بال اس طرح اڑ رہے تھے کہ اس کی صورت صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی اس کے باوجود میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ فاضلی ہے۔ فائرنگ رکتے ہی میں نے رفتار بڑھائی۔

پھر ایک غیر متوقع مدد سامنے آئی۔ ایک سیمنٹ ڈپو کے سامنے بڑا ٹرک لوڈ ہونے کے بعد ٹرن لے کر ہماری طرف آنے کے لیے مڑ رہا تھا اس نے پوری سڑک بلاک کر دی تھی۔ سلور کار کے ڈرائیور نے اسے ذرا تاخیر سے دیکھا شاید اس کی توجہ عقب کی طرف زیادہ تھی۔ اچانک ٹرک سامنے آیا تو اس نے بریک لگائے لیکن کار کی رفتار خاصی تیز تھی وہ رکتے رکتے بھی ٹرک سے جا ٹکرائی۔ تصادم بہت شدید نہیں تھا لیکن پھر بھی اس میں موجود افراد کے لیے غیر متوقع تھا۔ میں نے رفتار بڑھائی کار کے پاس لوگ جمع ہو رہے تھے اچانک میں نے فائرنگ کی آواز سنی اور لوگ پلٹ کر بھاگے۔ میں نے بائیک کچھ فاصلے پر روک لی بالکل پاس جانا بھی مناسب نہیں تھا ورنہ ان لوگوں کے لیے آسانی ہو جاتی اور وہ شکریے کے ساتھ ہمیں گولی رسید کرتے کہ خود مرنے کے لیے سامنے چلے آئے ہو۔ میں نے بائیک اور ہیلمٹ وسیم کے حوالے کیے۔ "میرے پیچھے آؤ۔"

وسیم کا ساتھی دوسری طرف سے گھوم کر جا رہا تھا۔ میں مختلف گاڑیوں اور چیزوں کی آڑ لیتا ہوا کار تک پہنچا۔ لیکن اس میں سوائے ایک ڈرائیور اور ایک عقبی نشست پر لیٹے آدمی کوئی نہیں تھا اور ڈرائیور اسٹیرنگ پر سر رکھے ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا۔ اس کی کنپٹی میں سوراخ تھا جس سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ پیچھے لیٹے آدمی کی پیشانی میں سوراخ تھا اور لمبے بالوں والا غائب تھا۔ لوگ اب ذرا فاصلے سے حیرت اور خوف سے گاڑی میں موجود لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک نوجوان لڑکے کا بازو پکڑا۔ "ان کو مارنے والا کہاں گیا؟"

"اس طرف....." نوجوان نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا تو میں وقت ضائع کیے بغیر اس طرف دوڑا تھا۔ میں نے کنارے سے گلی میں جھانکا تو مجھے لمبے بالوں والا گلی کے سرے پر دائیں طرف مڑتا دکھائی دیا۔ میں نے موبائل پر وسیم کا نمبر ملایا فری ہینڈ میرے کان پر پہلے ہی لگا ہوا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔" وسیم بولا۔

"تم میرے پیچھے مت آؤ مین روڈ پر رہو وہ یہیں کہیں نکلے گا۔ اپنے آدمی سے کہو وہ آگے چلا جائے۔"

میں گفتگو کے دوران گلی کے سرے تک آیا اور جب اندر جھانکا تو سامنے سے گلی بند دکھائی دی لیکن لمبے بالوں والا غائب تھا۔ وہ یقیناً کسی گھر میں گھس گیا تھا۔ اکثر دروازے بند تھے لیکن ایک دروازے پر صرف پردہ تھا اور ظاہر ہے کوئی بھی اس سے اندر گھس سکتا تھا۔ میں دبے قدموں دروازے تک آیا اور ذرا سا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ یہ بہت چھوٹا سا شاید ایک کمرے کا مکان تھا جس میں سامنے دس بائی دس کا صحن تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا غسل خانہ یا لیٹرین تھا اور اس کے ساتھ باورچی خانہ تھا جس پر صرف چھت تھی وہ بھی شیٹ کی۔ کمرے کے اوپر پکی چھت تھی۔ صحن میں ایک عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ سہمی کھڑی تھی۔ مگر لمبے بالوں والا یہاں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کمرے یا لیٹرین میں گھسنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا اس چوہے دان میں گھس کر وہ آرام سے پکڑا جاتا ورنہ مارا جاتا۔ اچانک چھت کی طرف سے سایہ لہرایا اور میں اندر گھس گیا۔ ایک اور مسلح آدمی کو دیکھ عورت نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ میں نے پستول اس کی طرف اٹھا دیا۔ اسے خاموش رکھنے کا یہی ایک حربہ تھا ورنہ جتنی دیر میں زبان یا اشارے سے اس سے چپ رہنے کی استدعا کرتا وہ چیخ چلا کر سارے محلے کو اکٹھا کر چکی ہوتی۔ پستول نے اثر کیا، عورت کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور وہ آرام سے فرش پر

دراز ہوگئی۔ دونوں بچے نو دس سال کے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ میں نے سرگوشی میں ان سے کہا۔
''آپ شور مت کرنا اپنی امی کے منہ پر پانی مارو اور پلاؤ بھی۔''
لڑکی ہوشیار تھی اس نے سر ہلایا اور کونے میں رکھے گھڑے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے آس پاس دیکھا ایک طرف جگہ بچانے کے لیے چارپائی کو لمبائی کے رخ سے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ دیوار اس سے دو فٹ اوپر تھی اور چھت دیوار سے دو فٹ اوپر تھی۔ میں نے پستول جیکٹ میں رکھا اور پائے پکڑ کر چارپائی پر چڑھ گیا۔ شکر ہے اس نے میرا بوجھ برداشت کرلیا اور ٹوٹی نہیں۔ دیوار پر ہاتھ رکھ کر میرا کام آسان ہوگیا لیکن میں نے فوراً چھت پر جانے سے گریز کیا عین ممکن تھا وہ میرا منتظر ہوتا کہ میرے سر میں بھی سوراخ کرے اور اس کے بعد اطمینان سے یہاں سے فرار ہوجائے۔ میں نے ذرا سا سر نکال کر فوراً نیچے کرلیا لیکن کسی طرف سے بھی گولی نہیں آئی تھی۔ دوسری بار سر نکال کر نیچے کیا اور تیسری بار میں چھت پر چڑھ گیا۔ چھت خالی تھی۔
وہ خبیث دوسری چھت سے ہوتا تیسری چھت پر جا رہا تھا اس نے میرے انتظار میں وقت ضائع کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ اس کی بچت اسی میں تھی کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائے۔ اس مکان کے تینوں طرف موجود مکان تین منزلہ تھے۔ اوپر کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جس کی مدد سے وہ اوپر چڑھتا۔ پھر میری نظر ایک مکان کی نکلی ہوئی اینٹوں پر گئی۔ دیوار مضبوط بنانے کے لیے اینٹیں سیدھی نہیں رکھتے ہیں بلکہ اینٹ پر آدھی اینٹ رکھتے ہیں اور آدھی دوسری اینٹ پر ہوتی ہے اس طرح دیوار مضبوط بنتی ہے اور ایک ڈیزائن بھی بن جاتا تھا۔ یہی ڈیزائن آدھی اینٹ کو دیوار کے کونے سے باہر نکال دیتا ہے۔ وہ یقیناً ان ہی اینٹوں کے سہارے دوسری چھت تک گیا تھا میں بھی اسی ترکیب سے اوپر آیا اور نیچے جاتے جاتے بچا کیونکہ آخری اینٹ ہاتھ میں لیتے ہی ٹوٹ گئی تھی اگر میں بروقت چھت کا کنارہ نہ تھام لیتا تو نیچے جاتا البتہ اینٹ دھماکے سے نیچے گری اور کوئی چلایا۔
''اے کی اے اوتے۔''
لمبے بالوں والا تیسرے مکان کی چھت پر پہنچ گیا تھا شور پر اس نے چونک کر دیکھا اور اس بار میں نے اسے واضح دیکھ لیا وہ منحوس صورت فاضلی ہی تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور ایک فائر کرکے دوڑ پڑا۔ گولی نہ جانے کہاں گئی اور میں اس کی پروا کیے بغیر چھت پر آگیا۔ فاضلی مجھ سے مشکل سے پچاس فٹ دور تھا میں نے اطمینان سے اس کا نشانہ لیا اور گولی چلادی۔ میں نے خیال رکھا تھا کہ گولی اوپر نہ لگے اس کے پیروں پر لگے۔ تیسرے فائر پر اس نے قلابازی کھائی اور میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے دوڑ کر دو چھتیں پار کیں اور تیسری چھت پر آیا فاضلی یہیں سے غائب ہوا تھا لیکن یہاں غائب ہونے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چڑھتے دن میں آس پاس گری سوئی بھی صاف دکھائی دیتی۔ فاضلی جن یا بھوت بھی نہیں تھا۔ چھت کے کنارے والی جگہ پر تازہ خون گرا تھا میں نے انگلی لگا کر چیک کیا یہ خون ہی تھا۔
اگلی چھت ذرا نیچی تھی اور شاید کسی خاندانی کباڑی کی تھی کیونکہ اس چھت پر لوہا لکڑ، ٹوٹی چارپائیاں، فرنیچر، ڈبے، ٹن اور نہ جانے کیا کیا پڑا تھا اور کب سے پڑا تھا چھت یقیناً بہت مضبوط تھی ورنہ اس ٹنوں وزنی ملبے تلے اسے بیٹھ جانا چاہیے تھا۔ فاضلی قلابازی کھا کر یقیناً اسی چھت پر گیا تھا لیکن وہ کہاں تھا یہ نہیں معلوم تھا۔ اگر وہ اس کباڑ میں کہیں چھپ گیا تھا تو اسے تلاش کرنا آسان نہیں تھا اور وہ مسلح بھی تھا جیسے ہی میں نیچے اترتا وہ آرام سے مجھے گولی مار دیتا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا ہو۔ میں نے ذرا پیچھے ہوکر وسیم کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ''تم اگلی گلی کے سرے تک آجاؤ اور آس پاس سے ہوشیار رہنا اس کے پاس موبائل ہوگا وہ مدد منگوا سکتا ہے۔''
''فکر نہیں.... میرے آدمی بھی آگئے ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''وین مونا کو اسپتال چھوڑ کر واپس آرہی ہے۔''
''سفیر اور سعدیہ کہاں ہیں؟''
''سعدیہ کو عبداللہ نے واپس کوٹھی بھیج دیا ہے۔''
''وسیم ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ مرشد ہمارے پورے پلان سے واقف ہے۔ اس نے بھی متبادل منصوبے سوچ رکھے ہوں گے۔''
''ہوسکتا ہے جناب۔''
میں نے محفوظ رہ کر چھت کا جائزہ لیا۔ سیڑھیوں والا حصہ کاٹھ کباڑ سے صاف تھا یہ جگہ استعمال کی جاتی تھی کپڑے سکھانے کے لیے اور گرمیوں میں چھت پر سونے کے لیے۔ یہاں دو عدد تخت کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے

ایک بار سوچا اور پھر خطرہ مول لیتے ہوئے دوڑ کر نیچے کودا اور قلابازی کھاتا ہوا ایک تخت کے پیچھے جا گرا۔ فاضلی کی چلائی گولی میرے پاس سے گزری تھی۔ میں بچ گیا اور فوراً ایک تخت کی آڑ میں ہوگیا۔ فاضلی لوہے کی ایک پیٹی کے پیچھے تھا۔ میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ وہ بالکل ٹھیک جگہ پھنسا تھا۔ اس مکان کے تین طرف دو منزلہ مکان تھے اور اترنے کے واحد راستے یعنی سیڑھیوں پر میں بیٹھا تھا۔

''فاضلی میرا خیال ہے گولی تمہاری.... میں لگی۔'' میں نے ایک ناقابلِ ذکر جگہ کا ذکر کیا۔ ''اب عافیت اسی میں ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آجاؤ ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔''

جواب میں مشتعل فاضلی نے کئی وزنی گالیوں کے ساتھ ایک گولی بھی ارسال کی تھی جو تخت میں سوراخ کرتی گزر گئی۔ میں محتاط ہوگیا۔ میں اسے محفوظ آڑ سمجھ رہا تھا وہ بالکل بھی محفوظ نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے دوسرے تخت کی آڑ لے لی۔ اگرچہ یہ بھی محفوظ نہیں تھا لیکن ایک کے بجائے دو تختوں سے گزر کر آنے والی گولی یقیناً کم خطرناک ہوتی۔ میں نے قہقہہ مارا۔ ''صرف ایک گولی اور تین گالیاں ...لگتا ہے تمہارے پاس دونوں کا اسٹاک کم ہوگیا ہے۔''

جواب میں اس نے ایک فائر اور کیا۔ شاید یہ بتانے کے لیے کہ اس کے پاس گولیاں کم نہیں ہیں لیکن اس کی ایک فائر کی حکمتِ عملی بتا رہی تھی کہ گولیاں سچ مچ کم پڑ گئی تھیں۔ میں نے وسیم کو مکان کی نشان دہی کی۔ ''تم یہیں آجاؤ.... نیچے کوئی ہو تو اسے قابو کر لینا۔''

''ٹھیک ہے لیکن آپ جلدی کریں فائروں کی آواز یہاں تک آرہی ہے اور جلد یا بدیر پولیس آجائے گی۔''

وسیم کی بات سے ایک خدشہ اور میرے ذہن میں آیا تھا۔ فاضلی کے پاس موبائل کی موجودگی یقینی تھی اور اس نے مدد تو طلب کی ہوگی ساتھ ہی پولیس کو بھی کال کر دی ہو گی۔ پولیس مرشد کی خادم تھی اس لیے فاضلی کے طلب کرنے پر دوڑی چلی آتی۔ فاضلی اسی وجہ سے فرار کے بجائے اس محفوظ جگہ دبک گیا تھا۔ میں نے گھڑی اتار کر اس کا چمکیلا ڈائل تخت سے باہر کر کے اس ممکنہ جگہ کا جائزہ لیا جہاں فاضلی دبکا ہوا تھا وہاں زیادہ لوہے کا کاٹھ کباڑ تھا جو اسے پناہ مہیا کر رہا تھا۔ میں نے گھڑی ساکت رکھتے ہوئے کہا۔ ''فاضلی کتے کی اولاد.... باہر آجا تیرے پاس صرف تین منٹ کی مہلت ہے۔''

''اس کے بعد تم ایٹم بم پھینک دو گے؟'' اس نے طنز کیا۔

''نہیں میں مرشد کی طرح بے پناہ مالِ حرام نہیں رکھتا کہ اس خود کار گن جیسا مہنگا اسلحہ خرید سکوں لیکن تم جانتے ہو دستی بم ہمارے ہاں کتنی آسانی سے مل جاتا ہے۔ میرے پاس ایک عدد دستی بم ہے وہ میں نے پھینک دیا تو تم یہیں مارے جاؤ گے۔''

اسے سانپ سونگھ گیا تھا پھر اس نے کہا۔ ''اگر تم نے دستی بم استعمال کیا تو کیا خود بچ جاؤ گے؟''

''ہاں کیونکہ میں سیڑھیوں کے پاس ہوں بم ارسال کرتے ہی میں نیچے اتر جاؤں گا اور چھت بیٹھ گئی تب بھی سیڑھیاں بچ جائیں گی۔''

''پھینک دو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''تمہارے سامنے ہتھیار ڈالنے سے بہتر ہے میں یہیں مر جاؤں۔''

''فکر مت کرو تمہیں اتنی آسانی سے مرنے نہیں دیں گے۔''

''میں مکان کے سامنے ہوں جناب۔'' وسیم کی آواز آئی۔ ''یہاں تالا لگا ہے اور محلے والے بھی جمع ہیں۔''

میں نے ممکنہ حد تک دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''تالا توڑ کر اندر آجاؤ خود کو کسی ایجنسی کا نمائندہ ظاہر کرو اور لوگوں سے کہو کہ اندر خطرناک مجرم ہیں جنہیں گھیر لیا گیا ہے۔ ایک ایس ایم ایس کر رہا ہوں وہ دیکھو۔''

دھیمی آواز میں بات کرنے کے باوجود مجھے شبہ تھا کہ فاضلی تک آواز جا رہی ہوگی۔ میں نے اصل بات ایس ایم ایس میں کی اور وسیم کا جواب آیا کہ دو منٹ اور لگیں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ وین آنے والی تھی۔ تین منٹ بعد نیچے مکان کا تالا ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس سے پہلے وسیم نے خود کو کسی خفیہ ایجنسی کا نمائندہ ظاہر کر کے لوگوں کو منتشر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وین گلی میں آگئی تھی۔ اس دوران میں گھڑی کے شیشے سے فاضلی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اس کاٹھ کباڑ میں سکون سے نہیں تھا۔ مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ شاید اس کا زخم بھی اس بے چینی کی وجہ تھی تالا ٹوٹتے ہی میں نے اعلان کیا۔

''اب تمہارے پاس صرف دو منٹ کی مہلت ہے اس کے بعد.....''

مشتعل فاضلی نے ناقابلِ اشاعت الفاظ میں بتایا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ وہ بری طرح پھنس گیا ہے زخمی الگ ہے اور اس کے مددگار بھی نہیں پہنچے تھے جب کہ دشمن آگئے تھے اس لیے اس کا حوصلہ جواب دے رہا تھا۔ وسیم نے سرگوشی کی۔ ''میں اندر آگیا ہوں جناب۔''

''ٹھیک ہے خاموشی سے اوپر آکر وہ چیزیں مجھے دے دو اور واپس نیچے جا کر انتظار کرو۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ نیچے آجائیں اور میں....''

''مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

وسیم دبے قدموں سیڑھیوں تک آیا۔ میں نے اسے خبردار کیا کہ سر مت نکالنا۔ اس نے سامنے آئے بغیر دونوں چیزیں میری طرف اچھال دیں اور میں نے انہیں کیچ کر لیا۔ یہ دو چیزیں تھیں ایک گیس ماسک اور دوسرا گیس بم۔ ماسک چہرے پر چڑھا کر میں نے چھوٹے باڈی اسپرے سائز اور صورت کے گیس بم کی چابی گھمائی اور فوراً اس سے دھواں خارج ہونے لگا۔ میں نے بم اس کاٹھ کباڑ میں پھینک دیا جس میں فاضلی چھپا ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے ذرا دور پھینکا تھا تاکہ وہ اسے فوراً کہیں اور نہ پھینک دے۔ بم سے گیس خارج ہونے کی رفتار بہت تیز تھی۔ فاضلی نے چلا کر گالی دی اور میری طرف اندھا دھند فائرنگ کی۔ میں پہلے ہی نیچے لیٹ گیا تھا اور سر بازوؤں میں چھپا لیا۔ گولیاں دونوں تختوں کے پار ہو رہی تھیں اور اس کی چوتھی یا پانچویں گولی میری کمر سے رگڑ کھاتی گزر گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے گرم چھری مرچیں لگا کر کمر پر پھیر دی ہو۔ میں بے ساختہ کراہا تو وسیم نے بے چینی سے کہا۔ ''کیا ہوا جناب؟''

''کچھ نہیں ایک گولی کمر کو چھوتی گزر گئی ہے۔'' میں نے زخم ٹٹولتے ہوئے کہا میری انگلیوں سے خون لگ رہا تھا۔ زخم لمبا تھا لیکن گہرا نہیں تھا۔ فاضلی کا پستول خالی ہوگیا تھا اور وہ اسے بھرنے کے قابل نہیں رہا تھا کیونکہ گیس اس تک پہنچ گئی تھی اور وہ کھانس کھانس کر بے حال ہو رہا تھا۔ گیس سے بچنے کے لیے وہ اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا تھا اور اب کھلی جگہ کے پاس ہی تھا لیکن میں نے اٹھ کر سامنے آنے کی حماقت نہیں کی۔ اس کے پاس لازمی ایک سے زیادہ ہتھیار تھے۔ مجھے سامنے آنے کی ضرورت نہیں تھی گیس خود اس کا کام کر دیتی۔ چھت اب دھواں دھار ہو رہی تھی۔ فاضلی کھلی

جگہ تھا اور میں اسے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن
تھا کہ میں اسے مارنا نہیں چاہتا ہوں زندہ گرفتار کر
جانا مقصد ہے اسی لیے وہ چانس لے کر کھلی جگہ آیا تا
بھی کھلی جگہ آؤں تو وہ مجھ پر وار کر سکے۔ میں اسے مو
دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا رہا تھا شاید گو
میں لگی تھی۔

''شہباز...!'' اس نے مجھے للکارا۔ ''سامنے آ...
جملے کے خاتمے پر اس نے چار پانچ مرصع
شامل کی تھیں۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ گیس اس
کر گئی ہے اور وہ زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔
وہ سانس لیتا اسے کھانسی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ گیس ا
تک آگئی تھی لیکن میں ماسک کی وجہ سے محفو
بالآخر فاضلی لڑکھڑایا اور فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ میں
منٹ اور انتظار کیا اور پھر آڑ سے نکل آیا فاضلی بے ہو
چکا تھا میں نے اس کی تلاشی لی اور ایک چھوٹا پستول بر
لیا یہ بھرا ہوا تھا اور فاضلی اسی کے استعمال کی حسرت
بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس سے ا
خطرناک قسم کا کمانڈو چاقو بھی نکلا تھا۔ میں نے یہ سا
ہتھیار اپنے قبضے میں لیے اور اسے کھینچ کر سیڑھیوں تک
آیا۔ گیس یہاں تک آگئی تھی اور وسیم میری مدد کو نہیں
تھا اس مردے کو مجھے ہی ڈھو کر نیچے لے جانا تھا۔ لیکن
وقت میں نے شکر کا سانس لیا جب وسیم کو ماسک
سیڑھیوں پر موجود پایا۔

''پکڑا گیا نا۔'' وسیم نے فاضلی کی طرف دیکھ
کھینچ کر شانے پر ڈال لیا۔ ''اس حرامی کو بھی پہنچا
حویلی کے تہ خانے۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں یار معمولی سا زخم ہے۔'' میں اس کے
نیچے اترا۔ گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اور اچھی با
کہ بچ گئے ورنہ فاضلی ان کو یرغمال بنا سکتا تھا یا راستہ ر
پر بے دریغ اڑا دیتا۔ وسیم نے وین پہلے ہی دروازے
منگوائی تھی۔ اس نے ماسک نہیں اتارا تھا۔ میں نے
ماسک اتارنے سے گریز کیا اچھی بات تھی۔ جتنے کم
ہماری صورت دیکھتے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ وسیم نے فاضل
وین کے عقبی حصے میں ڈالا اور میں اس سے ہیلمٹ لی
بائک کی طرف بڑھا۔ میں آگے نکلا اور وین پیچھے آئی
خفیہ ایجنسی کا نام سن کر لوگ گلی سے غائب ہو گئے تھ
اب کھڑکیوں اور دروازوں کے جھروکوں سے جھانک ر

تھے۔ وسیم نے موبائل پر میرے زخم کے بارے میں پوچھا۔ "وین میں ڈریسنگ کا انتظام ہے۔"

"نہیں میں جا کر ڈریسنگ کرا لوں گا۔ فاضلی کی پوری تلاشی لو یہ بہت خطرناک آدمی ہے اس کا موبائل آف کر دو اور اس کا الیکٹرانک چیک بھی کرو اس کے پاس کوئی سگنل دینے والا آلہ نہ ہو۔"

"آپ بے فکر رہیں میں ابھی چیک کرر ہا ہوں اوہ....اس کے تعویذ میں کچھ ہے۔"

وسیم نے فاضلی کے گلے میں موجود تعویذ میں کوئی سگنل دینے والا آلہ دریافت کرلیا تھا۔ وہ اس نے وین سے باہر پھینک دیا۔ میں نے کال کاٹ کر عبداللہ کا نمبر ملایا۔ "عبداللہ مونا کا کیا حال ہے؟"

عبداللہ کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔ "ڈاکٹر اسے آپریشن روم میں لے گئے ہیں۔ شہباز صاحب آئی تھنک شی از مس کیرج۔"

میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ کیا سچ مچ مونا اور سفیر کی یہ پہلی خوشی چھن جائے گی؟ میں نے سفیر کا پوچھا۔ "وہ مونا بی بی کے ساتھ ہے۔"

"اس کے پاس موبائل ہے؟"

"ہاں موبائل ہے۔" عبداللہ نے بتایا۔ "آپ کہاں ہیں؟"

"میں اور وسیم فاضلی کے پیچھے تھے یہ سب اسی حرامزادے کا کیا دھرا ہے۔"

عبداللہ یہ سن کر بے تاب ہو گیا۔ "تو آپ نے اسے پکڑ لیا؟"

"ہاں شکر ہے وہ ہاتھ آ گیا وسیم اسے لے جا رہا ہے تم اس سے بات کرلو۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں اس آبادی سے خاصا دور نکل آیا تھا اور اب خطرے کی بات نہیں تھی اس لیے میں نے سڑک سے ہٹ کر ایک درخت کے ساتھ بائک روک دی اور سفیر کو کال کی۔ اس نے چند بیل کے بعد کال ریسیو کی۔

"شہباز...." اس نے بوجھل لہجے میں کہا تو میں سمجھ گیا۔

"سفیر کیا ڈاکٹر نے تصدیق کر دی ہے؟"

"ہاں یار انہوں نے تو آپریشن کے لیے سائن بھی کرا لیے ہیں اگر دیر ہوئی تو مونا کی زندگی کو بھی خطرہ ہو جائے گا۔" سفیر بولا۔ "تو کہاں ہے؟"

"ہم نے اس واقعے کے ذمے دار کُتّے کو پکڑ لیا ہے وسیم اسے لے گیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"مرشد کا پالتو.... فاضلی۔" میں نے کہا۔ "تو فکر نہ کر میرے یار نقصان تو ہوا ہے لیکن مجرم بھی نہیں بچے گا۔"

"فاضلی صرف ایک مہرہ ہے اصل مجرم مرشد ہے۔" سفیر نے تلخی سے کہا۔

"میرا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ فاضلی اس کا بہت اہم آدمی ہے وہ اس کے بارے میں بہت کچھ بتائے گا۔"

سفیر کو تسلی دے کر میں نے موبائل بند کیا۔ وسیم کا ایک آدمی میرے ساتھ رک گیا تھا۔ میں نے اسے بھی رخصت کیا اور دوبارہ عبداللہ کو کال کر کے سعدیہ کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ وہ واپس کوٹھی پہنچا دی گئی ہے اور اس نے کوٹھی کی سیکورٹی کو الرٹ کر دیا ہے۔ اس کے چھ آدمی اسپتال میں تھے۔ اسپتال کے باہر دو آدمی وسیم کے بھی تھے۔ اس طرف سے تسلی ہوئی تو میں نے فارم جانے کا سوچا لیکن پھر مجھے خیال آیا۔ گزشتہ روز میں نے جس بنگلے کے لیے بات کی تھی وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے مالک افنان احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ دن میں کسی وقت اس سے مل لوں۔ میں نے وسیم اور عبداللہ کو اس بارے میں ایس ایم ایس کیا اور روانہ ہو گیا۔ مری روڈ پر واقع یہ بنگلا مین روڈ کے ساتھ ہی تھا اور اس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ پورا بنگلا ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھا۔ مین گیٹ تک جانے کے لیے پتھروں سے بنا خوب صورت ڈرائیو وے تھا اور گیٹ سڑک سے کوئی بیس فٹ بلند تھا۔ اندر بنگلے کی اصل عمارت اس سے زیادہ بلندی پر تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ اسکیم نہیں تھی پتا نہیں افنان احمد نے یہاں مکان بنانے کی اجازت کس طرح حاصل کی تھی۔ میں نے کال بیل بجائی تو کچھ دیر بعد اندر سے ایک تقریباً چالیس برس کا گورا چٹا اور سفید فرنچ کٹ والا آدمی نکلا۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال بالکل سفید تھے۔ یہ سفیدی عمر کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ یہ بالوں کا اصلی رنگ تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"افنان احمد؟"

"جی میں ہی ہوں۔"

"شہباز احمد.... آپ سے مکان کے سلسلے میں بات ہوئی تھی کل۔"

اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ "میں نے پہچان لیا آئیں اندر آئیں۔"

وہ مجھے اندر لے گیا۔ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں چھوٹا سا خوب صورت لان تھا۔ ٹیلے کی ڈھلان کو برقرار رکھتے ہوئے باغ ترتیب دیا گیا تھا۔ پورچ تک ڈرائیو وے ڈھلان کی صورت میں تھا لیکن پورچ ہموار تھا اور اسے رنگ برنگے پتھروں سے بنا کر ہموار کیا گیا تھا۔ مکان دو منزلہ اور خوب صورت جدید انداز کا بنا ہوا تھا۔ اس میں شیشے کا کام بہت زیادہ تھا۔ اوپر کم سے کم... دو کمروں میں گلاس وال تھی ممکن ہے پیچھے کی طرف بھی ہو۔ لیکن ساتھ ہی ڈیزائن والی فولادی گرلز سے حفاظت کا بھی پورا انتظام تھا۔ پورچ کے ساتھ ایک بڑا کمرا تھا یہ نشست گاہ ثابت ہوئی۔ اس میں وال ٹو وال کارپٹ کے ساتھ سادہ لیکن خوب صورت انداز کے دو بڑے صوفہ سیٹ تھے۔ ایک طرف بڑی سی گلاس ٹاپ والی ڈائننگ ٹیبل تھی جس کے گرد دس کرسیاں تھیں۔ صرف یہی کمرا بتانے کے لیے کافی تھا کہ باقی گھر کس طرح سے فرنش ہو گا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اپنا سجا سجایا گھر اس طرح سے کرائے پر دے رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"مجبوری ہے۔" افنان احمد نے گہری سانس لی۔ "میرا ایک ہی بیٹا ہے جو امریکا میں پڑھ رہا ہے۔ آج کل وہاں کے جیسے حالات چل رہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اس کے پاس جا کر رہوں۔ حالانکہ یہ گھر میں نے رہنے کے لحاظ سے بنایا ہے اور ایک سال پہلے ہی مکمل ہوا ہے۔"

اس نے پہلے مجھے چائے بنا کر پیش کی۔ پھر اس نے پورا گھر دکھایا..... اوپر بہت اچھی طرح فرنش کیے ہوئے تین بیڈ روم تھے۔ تینوں اٹیچ باتھ کے ساتھ تھے۔ نیچے بھی ایک بیڈ روم تھا۔ کچن مکمل تھا اور اس میں ضرورت کی ہر چیز لگی ہوئی تھی۔ جب ہم واپس ڈرائنگ روم میں آئے تو میں نے کہا۔ "مجھے آپ کا مکان پسند آیا ہے۔ شرائط بھی مناسب ہیں۔ یہ بتائیں کہ معاہدہ کرنے کب آؤں۔"

"آج شام کو آجائیں۔" اس نے کہا۔ "میرے پاس معاہدہ نامہ تیار ہے بس اس پر میرے آپ کے اور دو گواہوں کے سائن اور این آئی سی کی کاپی لگانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے میں آج شام یا کل صبح حاضر ہو جاؤں گا اور ادائیگی کیش کی صورت میں کروں گا۔"

اس نے کسی قدر تامل کے ساتھ کہا۔ "لیکن میں بینک ڈرافٹ کو ترجیح دوں گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں یہ کام کل صبح ہی ہو سکے گا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے کل صبح صحیح۔" وہ خوشدلی سے بولا۔ "دراصل آج کل حالات ایسے نہیں ہیں کہ آدمی اتنے بڑے کیش کو سنبھالے اس میں مالی نقصان کے ساتھ جان کا رسک بھی ہوتا ہے۔"

وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آیا تھا۔ میں نے واپس جانے کے بجائے اسپتال جانے کو ترجیح دی۔ پہلے میں نے او پی ڈی میں جا کر اپنے کمر کے زخم کی مرہم پٹی کرائی۔ کمپاؤنڈر نے زخم صاف کر کے اس پر خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑک کر اوپر سے چکنی پٹی رکھ کر سخت ٹیپ لگا دیا۔ اس نے مجھے ایک دن پانی سے احتیاط کا کہا اور ایک انجکشن بھی لگا دیا۔ زخم معمولی خراش کی صورت میں تھا۔ او پی ڈی سے باہر آ کر اندر جانے کے بجائے میں نے سفیر کو کال کر کے باہر بلا لیا تھا۔ اس کے ساتھ عبداللہ بھی آیا تھا۔ مونا آپریشن کے بعد کمرے میں شفٹ کر دی گئی تھی اور اس کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن اسے دو دن اسپتال میں ہی رہنا تھا۔ عبداللہ نے اسپتال انتظامیہ سے بات کر کے اندر دو مسلح محافظ رکھوا دیے تھے۔ باہر اس کے چار آدمی مستقل موجود رہتے اور ان کا اندر کے آدمیوں سے ریڈیو پر رابطہ رہتا۔ اندر والے چھوٹے اسلحے سے مسلح تھے لیکن باہر موجود گارڈز کے پاس جدید خودکار اسلحہ اور دو عدد گاڑیاں تھیں۔ میں نے سفیر سے کہا۔ "یار اتنے انتظامات کے بجائے مونا کو کوٹھی منتقل کر کے ڈاکٹر اور نرس کو وہیں نہ بلوا لیا جائے؟"

"میں نے بھی یہی کہا تھا لیکن جس لیڈی ڈاکٹر نے آپریٹ کیا ہے اس کا کہنا ہے کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مونا بی بی کو دوبارہ اسپتال ہی لانا پڑے گا۔ اس لیے اسپتال میں رکنا لازمی ہے۔"

"ائر کلب والے معاملے کا کیا ہوا؟"

عبداللہ بولا۔ "مجھے علاقے کے ایس پی کی کال آئی تھی میں کچھ دیر میں اس سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے کوشش کرنا کہ سعدیہ کا ذکر نہ آئے صرف مونا اور سفیر کا ذکر بھی کافی ہے۔"

"میں سمجھ گیا کوشش ہو گی لیکن اس میں ائر کلب والے بھی شامل ہیں اور وہ غلط بیانی نہیں کریں گے۔"

"راجا صاحب سے بات کرو وہ اوپر سے کوئی چیک

لگائیں۔"

"راجا صاحب سے میں نے بات کی ہے امید ہے وہ کسی مشکل کی صورت میں معاملے کو سنبھال لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے مری روڈ پر راول چوک سے ذرا آگے ایک کوٹھی دیکھی ہے جو ایک بلند ٹیلے پر ہے۔"

"جاتے ہوئے بائیں طرف آتی ہے اوپر والے حصے میں گلاس وال بھی ہے۔" عبداللہ نے تصدیق چاہی۔

"بالکل یہی کوٹھی ہے فرنش حالت میں پورے سال کے لیے کرائے پر مل رہی ہے۔ میں نے لینے کا فیصلہ کیا ہے میرا آئی ڈی کارڈ تمہارے پاس پڑا ہے وہ مجھے چاہیے اور ہاں ایک دس لاکھ کا بینک ڈرافٹ افنان احمد کے نام سے چاہیے۔"

"ہو جائے گا لیکن یہ کام کل ہی ہو سکے گا۔"

"ظاہر ہے میں تم سے کل صبح لے لوں گا۔ وسیم سے بات ہوئی؟"

"ہاں اس خبیث کے بارے میں سنا تھا۔" عبداللہ بولا۔ "میری بھی خواہش ہے اسے دیکھوں اس نے بہت چکر دیے ہیں۔"

"جلد تم دیکھ سکو گے۔" میں نے کہا۔ "سفیر یہیں رہے گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اسے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

میں نے سوچ کر کہا۔ "چلو ٹھیک ہے مونا کو ویسے بھی اس کے مورال سپورٹ کی ضرورت ہے۔"

"میں نے ایاز کو اسپتال کے باہر رہنے کے لیے بلا لیا ہے۔"

"باہر کے بجائے وہ اندر رہے تو زیادہ بہتر ہو گا۔" میں نے ہدایت کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میرا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ مرشد کے دوسرے کتوں کی یہاں موجودگی کا امکان تھا۔ راستے میں میں نے وسیم کا نمبر ملایا۔ "کہاں ہو تم؟"

"ہم پہنچ گئے ہیں، ابھی اس ولد الحرام کی مرہم پٹی کر رہے ہیں پھر اس سے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔"

میں خود فاضلی سے بات کرنے کا مشتاق ہو رہا تھا۔ "میں آ رہا ہوں۔"

"یہ اور اچھا رہے گا۔"

میں نے راستے میں جیتو کو کال کی اور اسے مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد صابر اور اس کی بیٹی کا پوچھا۔ مونا کا سن کر اسے دکھ ہوا تھا اس نے صابر کے بارے میں بتایا۔ "وہ بہت شور کر رہا تھا لیکن ہم نے نہیں سنا اب آرام سے ہے۔"

"ہوشیار رہنا خطرناک آدمی ہے۔ وہ ایک سوٹ کیس لایا تھا میں نے اس میں سے اسلحہ نکال لیا تھا لیکن ممکن ہے کوئی چھپا ہوا اسلحہ ہو اس لیے اگر اس کے کمرے میں جانا پڑے تو بہت محتاط رہنا۔"

"آپ فکر مت کرو۔" اس نے کہا۔ "ہم ہوشیار رہے گا۔"

چند دن میں بائک نے خاصی بھاگ دوڑ کی تھی اور مجھے اس میں پیٹرول ڈالنے کا خیال نہیں رہا تھا یہ سارے کام ایاز نے اپنے ذمے لے رکھے تھے لیکن وہ ابھی کوٹھی میں تھا اس لیے کسی اور نے زحمت نہیں کی۔ ٹینک تقریباً خالی ہو رہا تھا۔ میں نے راستے میں آنے والے پہلے پیٹرول پمپ سے ٹینک فل کرایا اور حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کھلی سڑک پر بائک نے یہ فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے کر لیا جب کہ گاڑی کو پون گھنٹا لگتا تھا۔ وسیم ایک کمرے میں قالین پر نیم دراز چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کا آدمی مجھے دیکھ کر فٹ چائے لے آیا۔ میں بھی اس کے پاس نیم دراز ہو گیا۔ "یار کھانے کے وقت چائے۔"

"شہباز صاحب پی کر دیکھیں، بہت عرصے بعد مزے کی چائے ملی ہے۔"

"کوئلے پر بنائی ہے جی۔" چائے لانے والا بولا۔

واقعی مزے کی چائے تھی۔ پی کر تھکن اتر گئی اور میں فاضلی کے دیدار کے لیے تازہ دم ہو گیا تھا۔ وسیم مونا کے بارے میں جان گیا تھا۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے عبدل اور اسلم کے بارے میں پوچھا۔ وسیم بولا۔ "ان کے دم خم خاصے نکل گئے ہیں۔"

"چلو بات کرتے ہیں۔"

فاضلی کو ایک ستون کے گرد لپٹی فولادی زنجیر کے دوسرے سرے پر موجود تالے والے کڑے سے باندھا ہوا تھا۔ وہ ایک مخصوص دائرے سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتا تھا اور فی الحال وہ حرکت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس کی ٹانگ سے گولی آپریشن کر کے نکال لی گئی تھی۔ عبدل اور اسلم اس سے دور بندھے تھے۔ وسیم نے انہیں بھی ستونوں کے ساتھ لگی زنجیروں سے بندھوایا تھا۔

یہ زنجیریں اتنی مضبوط تھیں کہ وہ کسی صورت نہیں کھول سکتے تھے۔ فاضلی نیم غشی کی حالت میں تھا اس کی پینٹ کا پائنچہ خون میں بھیگا ہوا تھا۔ وسیم کے آدمی نے مہارت سے جراحی کی تھی۔ اس نے بتایا۔ "کل تک اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔"

اچانک فاضلی اٹھ بیٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "شہباز تم نے بلاوجہ مجھے یہاں لانے کی زحمت کی تم مجھ سے کچھ نہیں اگلوا سکتے بہتر ہو گا مجھے مار دو۔"

"تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تمہاری زبان بند رہے گی۔ چند دن رک جاؤ اسی جگہ تم سب اگل رہے ہو گے۔"

فاضلی یوں مسکرانے لگا جیسے میں لاف و گزاف کر رہا ہوں۔ وسیم کو غصہ آ گیا۔ "تین دن کی کیا ضرورت ہے یہ حرامی آج ہی بولے گا۔ ایک گھنٹے میں اس کے سارے کس بل نکل جائیں گے۔"

"نہیں یار یہ ایسے ہی بولے گا اور اسے ہاتھ لگانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی یہ خود گڑگڑا کر بتائے گا۔"

فاضلی کے لیے تو یہ بات ناقابلِ یقین تھی۔ وسیم نے بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلایا کہ بعد میں بتاؤں گا پھر میں عبدل اور اسلم کی طرف آیا۔ "تم دونوں نے کیا فیصلہ کیا ہے، مرشد کے بارے میں بتاؤ گے؟"

اسلم خوف زدہ تھا اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم مرشد کے اہم ترین آدمی کو بھی پکڑ لائے تھے اس نے کہا۔ "میں جو جانتا ہوں وہ سب بتا دوں گا۔"

فاضلی نے عقب سے قہقہہ لگایا۔ "تم جانتے ہی کیا ہو کُتّے کے پلّے، تم صرف بھونک سکتے ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میرا بھی یہی خیال تھا۔ انہیں مرشد کے ساتھ ملے ہوئے چند دن ہوئے تھے اور مرشد ان پر اس حد تک بھروسا نہیں کر سکتا تھا کہ انہیں کوئی اہم بات معلوم ہو۔ عبدل ابھی حوصلے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ اسے چھڑا لیا جائے گا۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ "فاضلی ٹھیک کہہ رہا ہے یہ صرف بھونکنے والے پلّے ہیں۔ مرشد کا اصل کتا یہ خود ہے جو بھونکتا بھی ہے اور کاٹتا بھی ہے یہی اس کے بارے میں بتائے گا۔ ان دونوں کو ٹانگ دو۔"

"کیا...!" عبدل تڑپ کر چلّایا۔ "تم ہمیں قتل کر رہے ہو؟"

"اسے قتل نہیں انصاف کہتے ہیں۔" میں نے تصحیح کی۔ "تم نے مرشد کے آدمیوں کے ساتھ مل کر تین بے قصور عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا صرف اسی پر تم کئی بار سزائے موت کے مستحق ہو چکے ہو۔ اس کے علاوہ تم نے انہیں قتل بھی کیا۔ ایک لڑکی اپنی قسمت سے بچ گئی۔ صابر کے ساتھ مل کر تم لوگ اس سے پہلے بھی جرائم کرتے رہے ہو۔"

وسیم کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے تہ خانے کی چھت سے لگے کڑوں سے رسّے گزارے اور پھر ان کا پھندا بنا کر پہلے اسلم کی گردن میں ڈالا۔ اس کی ہتھکڑی کھول دی تھی۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی لیکن اس کی ایک نہیں چلی۔ رسّی کھینچتے ہی پھندا اس کے گلے میں فٹ ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہیں بندھے تھے اس لیے وہ ہاتھوں سے پھندا ڈھیلا کرنے کی کوشش کے ساتھ لاتیں بھی چلا رہا تھا۔ ایک بار اس نے پھندا ڈھیلا کر لیا تھا لیکن وسیم کے آدمیوں نے اچانک رسا چھوڑ کر دوبارہ کھینچ لیا۔ اس بار پھندا سختی سے اس کی گردن میں دھنس گیا اور اس کا دم گھٹنے لگا تھا، چند منٹ میں اس کی سانس رک گئی اور زبان باہر نکل آئی تھی۔ موت کے کرب نے اس کے نقوش بگاڑ دیے تھے۔ عبدل دہشت زدہ انداز میں اس کی موت کا تماشا دیکھ رہا تھا اور خوف سے اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ جیسے ہی اسلم کا دم نکلا اس نے چلّانا شروع کر دیا۔

"خدا کے لیے..... مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو۔"

"ان عورتوں نے بھی تم سے زندگی اور عزت کی بھیک اسی طرح مانگی ہو گی۔" وسیم نے اسے لات رسید کی جو سیدھی جبڑے پر لگی اور اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ جب وسیم کے آدمی اسے لٹکا رہے تھے تو وہ مضحکہ خیز آواز میں رو رہا تھا۔ دو منٹ سے پہلے اس کی لاش بھی رسّی سے جھول رہی تھی۔ میری زندگی میں ایسے مواقع کم آئے تھے جب میں نے کسی انسان کو سوچ سمجھ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ عبدل اور اسلم کے لیے میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا وہ سزائے موت کے پوری طرح مستحق تھے۔ وسیم کے آدمی ان کی لاشیں اوپر لے گئے۔ فاضلی آرام سے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس نے ان دونوں کی موت کا ذرا بھی اثر قبول نہیں کیا تھا۔

"مرشد کو اس سے اتنا فرق بھی نہیں پڑے گا جتنا اپنے

گندے ہاتھ دھونے سے پڑتا ہے۔"

"تمہارے مرنے سے تو پڑے گا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مرشد کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہے بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گدھے ہیں اپنی صحیح قیمت وصول نہیں کر پاتے۔"

"تم عقل مند ہو اپنی قیمت صحیح وصول کرتے ہو۔" میں نے طنز کیا۔ "لیکن یہ قیمت اپنی قبر میں تو استعمال کرنے سے رہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ قیمت میں نے اپنے لیے نہیں لی ہے جن کے لیے لی ہے وہ ساری عمر عیش و آرام سے رہیں گے۔"

"تم مرشد کے قریب ترین آدمی ہو اس کے بارے میں سب جانتے ہو۔"

"یہ دعویٰ تو مرشد کی کوئی بیوی بھی نہیں کر سکتی۔ میں بہت کچھ جانتا ہوں لیکن سب نہیں جانتا۔ جو جانتا ہوں وہ تمہیں بتاؤں گا نہیں کیونکہ یہاں مجھے موت ملے گی چاہے میں زبان کھولوں یا نہ کھولوں اور اگر زبان کھول دی تو مرشد میرے گھر والوں کو نہیں چھوڑے گا ورنہ وہ ان سے تعرض نہیں کرے گا۔"

میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میں وسیم کے ساتھ اوپر آیا۔ وسیم نے کہا۔ "اب اس کا کیا کرنا ہے آپ نے دعویٰ بہت بڑا کر دیا ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔" میں نے کہا اور وسیم کو اپنے آئیڈیے سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ممکن ہے فاضلی کے معاملے میں یہ حربہ کام نہ کرے۔ ہر شخص کی قوتِ ارادی مختلف ہوتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے آدمیوں سے کہو اس پر کام شروع کر دیں۔ دوسری صورت میں اس سے کچھ اگلوا لینا بہت ہی مشکل کام ہو گا۔ ہمیں بھی درندگی کی ان انتہاؤں سے گزرنا پڑے گا جن سے شاید ہم نہ گزر سکیں۔ فاضلی نے بتا دیا ہے کہ معاملہ اس کے گھر والوں کی سلامتی کا بھی ہے اس لیے وہ ہر اذیت سے گزر جائے گا۔"

"ٹھیک ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "اب ان دونوں کا کیا کرنا ہے؟"

"ان کا خوب صورت پارسل بنواؤ اور کسی گاڑی والے کو دے کر مرشد ہاؤس بھیج دو۔"

"ساتھ ہی پولیس کو اطلاع نہ کر دیں؟" وسیم نے تجویز پیش کی۔

"نہیں یار پولیس اس کی نمک خوار ہے۔ وہ فوراً اسے بتا دیں گے۔ اس کے بجائے تم میڈیا کو اطلاع کر دو۔ وہ اپنے کیمرے لے کر پہنچ جائیں گے تو مرشد مشکل میں پڑ جائے گا۔"

وسیم نے سوچا۔ "لیکن اس میں ٹائمنگ پرفیکٹ ہونی چاہیے اِدھر یہ پارسل مرشد ہاؤس پہنچیں اُدھر میڈیا والے پہنچ جائیں۔"

"بس کوئی ایسی ہی کوشش کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہو گا ان کا پارسل تابوت اسٹائل میں ہو لیکن لے جانے والے کو شک بھی نہ ہو اسے عام چارج سے زیادہ دو گے تو وہ خوشی خوشی لے جائے گا۔"

"میں عبداللہ سے بات کر کے سیٹنگ کرتا ہوں۔"

وسیم کے آدمیوں نے بکرے کی سجی تیار کی تھی۔ جب ہم اوپر آئے تو دسترخوان بچھایا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک بڑے سے تھال میں سجی کو سجائے دو افراد اندر لائے۔ اسے درمیان میں رکھ دیا۔ سجی سے بھاپ اور اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ سوائے نگرانی پر مامور افراد کو چھوڑ کر سب کھانے کے لیے آ گئے تھے۔ سجی کے ٹانکے کھولے تو اس کے اندر بھرے چاول اور میوے باہر آ گئے۔ سب نے اپنی اپنی طرف سے گوشت کاٹ کر اور چاول نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ بنانے والا ماہر تھا۔ آج ہم بڑے حادثے سے دوچار ہوتے ہوتے رہ گئے تھے۔ مونا اور سفیر کو دھچکا لگا تھا۔ پھر مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ کے بعد ابھی ہم نے دو بدبخت افراد کو ان کے کیے کی سزا دی تھی۔ اس کے باوجود ہماری بھوک برقرار تھی اور میں نے ٹھیک طرح سے کھایا تھا۔ یہ پیٹ ایسی چیز ہے جو کسی بھی حالت میں اپنا کام نہیں چھوڑتا ہے۔ کھانے کے بعد میں اور وسیم باہر نکل آئے۔

"یہ ٹھکانا اچھا ہے لیکن میں نے ایک اور جگہ دیکھ لی ہے۔ کل اس کی بات کر لیں گے۔"

"یہ ضروری ہے ہمارے پاس کئی ٹھکانے ہوں، اب تو رقم کا بھی مسئلہ نہیں ہے اپنے پیر صاحب نے مدد فرمائی ہے۔"

"آگے بھی فرماتے رہیں گے۔ انشاءاللہ ان کی مدد سے ان کا بیڑا غرق کریں گے اور انہیں جہنم رسید کریں گے۔"

"آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں واپس جا کر صابر سے بات کرتا ہوں۔ میں اسے بریف کیس کی تلاش پر لگاؤں گا۔"

"وہ قابلِ بھروسا نہیں ہے۔"

"ہے نہیں لیکن رہے گا۔" میں نے کہا۔ "میں نے سوچ لیا ہے اس کی لڑکی ہمارے قبضے میں رہے گی۔"

وسیم چونکا۔ "یرغمال....؟"

"بالکل درست.... آج کل شرافت کا دور ہی نہیں ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "لڑکی کو عبداللہ والی کوٹھی پہنچا دیا جائے گا اور صابر کو چھوڑ دوں گا اگر وہ اپنی بیٹی کی صحیح سلامت واپسی چاہتا ہے تو بریف کیس حاصل کرے اور اس کے بدلے اپنی بیٹی لے جائے۔"

وسیم خوش ہو گیا۔ "آپ نے اس آدمی کا بالکل صحیح مصرف تلاش کیا ہے ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ اس کا کیا کریں اگر چھوڑتے ہیں تو خدشہ ہے یہ سیدھا مرشد کے پاس جائے گا اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دے گا۔ دوسری طرف اسے مارنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا ہے۔ کم سے کم اس کی بیٹی بالکل بے گناہ اور مظلوم ہے۔"

"درست.... ہم اسے سعدیہ اور مونا کے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ اسے یہاں یا فارم ہاؤس میں رکھنا تو ممکن نہیں ہے۔"

"آپ صابر سے دوٹوک بات کریں گے؟"

میں نے سر ہلایا۔ "بہتر یہی ہے وہ اپنی بیٹی کو سمجھا دے گا اگر ہم نے زبردستی سے کام لیا تو لڑکی شور مچائے گی یا اسے قابو میں رکھنے کے لیے کہیں قید میں ڈالنا پڑے گا۔"

وسیم نے سر ہلایا۔ "میں فی الحال یہیں ہوں کیونکہ کئی آدمی ابھی چلے جائیں گے عبداللہ کے پاس نفری کم پڑ رہی ہے۔"

"فارم ہاؤس پر ہم تین بھی کافی ہیں۔" میں نے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں میں نے بہت ساری کھانے کی تیار اور ڈبا بند چیزیں لیں اسی طرح بیکری کا سامان لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ مانی اور بیتو کے سپرد یہ چیزیں کروں گا اور ان سے کہوں گا کہ یہی کھاؤ ورنہ باہر لان میں گھاس بہت ہے۔ روز کھانے کے لیے باہر جانا یا بار بار کوریئر سے کھانا منگوانا ٹھیک نہیں تھا اس طرح یہ جگہ اتفاق سے بھی دشمن کی نظر میں آ سکتی تھی۔ وہ دونوں بھوکے بیٹھے تھے اس لیے بیتو نے جھپٹ کر سارا سامان اٹھایا اور کچن کی جانب روانہ ہو گیا۔ کھا پی کر ان کے حواس بحال ہوئے تو انہیں آج کے واقعات کا خیال آیا۔ میں نے انہیں کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ آج کیا ہوا۔ بیتو فاضلی کے پکڑے جانے کا سن کر خوش ہو گیا اس نے کہا۔ "شوبی مجھے اُدھر لے جانا میں دیکھوں گا کیسے اپنی زبان بند رکھتا ہے۔"

"برخوردار وہ بہت اونچی چیز ہے۔ اس کے چکر میں مت پڑو یہ بتاؤ کہ صابر نے کوئی اور ہنگامہ تو نہیں کیا؟"

"نہیں شرافت سے بیٹھا ہے۔ میں نے صبح ناشتا دے دیا تھا پھر دوپہر میں کھانا دیا تھا۔"

مانی کھانے کی چیزیں چیک کر رہا تھا اس نے مایوسی سے کہا۔ "شوبی بھائی یہ کیا لائے ہیں؟"

"صبر شکر کر کے کھا لو.... آج کے واقعے سے اندازہ ہو گیا ہے کہ دشمن کس حد تک ہماری نگرانی کر رہا ہے اور اگر کوئی بلاوجہ باہر گیا تو وہ اس کی نظر میں آ سکتا ہے۔ اب کم سے کم باہر جانا ہو گا۔"

"مونا دیدی کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے لیکن ابھی اسپتال میں ہے دو دن بعد واپس جا سکے گی۔" میں نے کہا۔ فاضلی سے یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ مرشد اس کارروائی کے پیچھے ہے اور وہ اب کھلی دشمنی پر اتر آیا ہے غالباً اس نے کالی کوٹھی کی تباہی کو ہمارے کھاتے میں ڈال کر ہمیں سبق سکھانے کے لیے یہ کام کیا ہے۔ میں فکر مند ہو گیا تھا۔ مرشد نے پہلے کبھی اس طرح کھل کر کارروائی نہیں کی تھی وہ مجھے ڈرانے کے لیے ضرور بہت کچھ کرتا رہا تھا اور شاہد بھائی کی موت میں بھی اس سے زیادہ نادر کی خواہش کا عمل دخل تھا۔ وہ اپنی معذوری کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا اور جب مجھ پر بس نہیں چلا تو میرے گھر والوں کے خلاف کارروائی کرنے لگا۔ مرشد کو لگام دینا ضروری ہو گیا تھا۔ میرے پاس مرشد ہاؤس کے نمبر تھے۔ انٹرنیٹ کی مدد سے مرشد ہاؤس کے ایک نمبر پر کال ملائی۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی نے کال ریسیو کی۔ "مرشد سے بات کراؤ۔"

وہ میرے تحکمانہ انداز سے مرعوب ہو گئی۔ "آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں ایم این اے ملک بات کر رہا ہوں۔"

"صفدر ملک صاحب؟" لڑکی نے خود تصدیق چاہی تو مجھے ملک صفدر بننے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد مرشد لائن پر تھا۔

"یار ملک.... کل ہی تو پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔

سب طے ہو گیا تھا اب کون سی بات یاد آ گئی۔‘‘
’’بات نہیں تمہاری موت یاد آ گئی۔‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
اسے جھٹکا لگا کیونکہ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔ ’’شہباز ملک...... تم......‘‘
’’تم مجھے کوئی بھی نام دے سکتے ہو۔‘‘ میں نے بے پروائی سے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کال ریکارڈ ہو رہی ہو گی اس لیے میں نے شہباز ملک ہونے کا اعتراف نہیں کیا۔ ’’اصل بات وہی ہے جو میں نے کہی ہے۔‘‘
’’تم نے کیوں کال کی ہے؟‘‘
’’صرف یہ بتانے کے لیے کہ تمہارا خاص آدمی فاضلی میرے پاس ہے اور اس نے سب اگل دیا ہے۔‘‘
’’فاضلی میرا ملازم تھا۔‘‘ مرشد نے کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔ ’’لیکن کل رات وہ مرشد ہاؤس سے رقم اور دوسری قیمتی اشیا چرا کر فرار ہو گیا تھا اس کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرائی جا چکی ہے۔‘‘
’’اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے‘ اس کی زبان تمہارے کالے کرتوت کے بارے میں جو اگلے گی وہ مجھے کسی عدالت میں پیش نہیں کرنا ہے۔ مرشد میں تمہیں خود جواب دوں گا اور یہ جواب ایسا ہو گا کہ تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔‘‘
’’تم مجھے...... مرشد علی کو دھمکی دے رہے ہو۔‘‘
’’نہیں‘ کالی کوٹھی کا واقعہ تمہیں سمجھانے کے لیے کافی ہونا چاہیے اس کے باوجود تم نہیں سمجھتے ہو تو مرشد ہمارے پاس دوسرے طریقوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم بعد میں پچھتاؤ اس لیے ابھی سنبھل جاؤ۔‘‘
’’تم تسلیم کر رہے ہو کہ کالی کوٹھی تم نے تباہ کی ہے؟‘‘
’’نہیں۔‘‘ میں نے اس کی عیاری کا عیاری سے دیا۔ ’’مجھے علم ہوا ہے کہ وہاں تمہارے آدمیوں نے شہلا نامی ایک عورت کو جنسی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور پھر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہاں کچھ ہوا شاید شارٹ سرکٹ سے آگ لگ گئی اور وہاں موجود گولہ بارود کا ذخیرہ آگ لگنے سے پھٹا اور پوری کوٹھی تباہ ہو گئی۔ یہ قدرت کی طرف سے تمہیں ایک اشارہ ہے اگر تم سمجھو تو۔‘‘
’’شہباز...... مجھے اس کوٹھی کی تباہی میں بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہ تمہیں بھی سستا نہیں پڑے گا۔‘‘

’’تم اس کی فکر مت کرو‘ جلد تمہیں دو تحفے اور ملیں گے۔‘‘
’’کیسے تحفے؟‘‘ اس نے پوچھا۔ اسی لمحے کسی نے اس کی خلوت میں مداخلت کی۔ میں نے ایک آواز سنی۔
’’مرشد بادشاہ باہر ایک گاڑی والا دو بکسے لایا ہے۔ کسی نے آپ کے لیے بھیجے ہیں۔‘‘
’’میرے لیے۔‘‘ مرشد بولا۔ ’’میں نے کسی سے کچھ نہیں منگوایا اور نہ کسی نے مجھے کچھ بھیجا ہے بکسے کہاں ہیں؟‘‘
’’باہر پورچ میں رکھے ہیں مرشد بادشاہ۔‘‘
’’پورچ میں...... تمہارا دماغ خراب ہے‘ کسی نے ان میں بم رکھ کر بھیج دیا تو پوری عمارت تباہ ہو جائے گی۔‘‘ مرشد چلایا اور اس نے آنے والے کو چند خاص گالیاں دیں۔ وہ بدحواس ہو گیا۔
’’مرشد بادشاہ مجھے کیا معلوم تھا؟‘‘
’’دفع ہو جاؤ‘ سیکورٹی سے کہو اسے چیک کرے اور پہلے عمارت سے دور لے جائے۔‘‘
اس آدمی کے جانے کے بعد مرشد کو خیال آیا کہ میں فون پر یہ ساری بات سن رہا تھا۔ اس نے ریسیور میں کہا۔ ’’شہباز یہ تمہاری حرکت ہے؟‘‘
’’کون سی حرکت؟‘‘ میں نے معصومیت سے پوچھا۔
’’یہ دو بکس تم نے بھیجے ہیں؟ ابھی تم نے مجھے دو تحفے بھیجنے کی بات کی تھی۔‘‘
’’ہاں میرا ارادہ تمہارے انتقال اور سوم والے دن تمہاری قبر پر پھولوں کی چادر بھیجنے کا ہے۔ بکس کسی اور نے بھیجے ہوں گے۔‘‘
اسی لمحے اسی بدحواس ملازم کی آواز آئی۔ ’’مرشد بادشاہ ان بکسوں میں لاشیں ہیں۔‘‘
اس بار مرشد نے لائن کو ہولڈ کر دیا اور اپنے غلام سے نمٹنے لگا جو اسے اتنی اہم اطلاعات عین دوران فون سنا رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وسیم اور عبداللہ نے بہت تیزی سے کام دکھایا تھا اگر عبدل اور اسلم کی لاشوں والے بکس آ گئے تھے تو ساتھ ہی میڈیا والوں کو بھی آنا چاہیے تھا۔ میں نے نمبر کاٹ کر عبداللہ کو کال کی۔ کال ملتے ہی وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ’’اگر مرشد کو ہارٹ اٹیک ہو جائے تو تعجب کی بات نہیں ہو گی۔‘‘
’’اللہ تمہاری زبان مبارک کرے‘ کیا میڈیا والے مرشد ہاؤس پہنچ گئے ہیں۔‘‘

’’میں یہیں ہوں اور میڈیا والے اب بکسوں سے نکلنے والی لاشوں کی تصویریں اور ویڈیو بنا رہے ہیں۔ مرشد خود باہر نہیں آیا ہے لیکن اس کے ملازم بدحواس ہیں وہ میڈیا والوں کو روک رہے ہیں۔ اب گارڈ آ گئے ہیں اور وہ سب کو دھمکیاں دے کر باہر نکال رہے ہیں۔‘‘ عبداللہ رننگ کمنٹری کر رہا تھا۔ ’’مگر میڈیا والے کہاں کسی سے دبتے ہیں وہ اپنا کام کر رہے ہیں۔‘‘
’’پولیس کا کچھ اتا پتا ہے؟‘‘
’’پولیس جائے بھاڑ میں‘ اب کچھ دیر بعد ٹی وی چینلز پر جب یہ فوٹیج اور ویڈیوز چلیں گی تو آپ سوچ سکتے ہیں پولیس کتنی مجبور ہو جائے گی۔‘‘
’’عبداللہ تم نے وہاں پہنچ کر خطرناک کام کیا ہے‘ مرشد کے آدمیوں میں تمہیں پہچاننے والے ہوں گے۔ اس لیے بہتر ہے اب وہاں سے کھسک لو۔‘‘
’’آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ویسے میں اکیلا نہیں ہوں میرے ساتھ دو گارڈز ہیں اور کوئی مجھے آسانی سے ہاتھ نہیں لگا سکتا...... ابھی تو مرشد کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وہ ان لاشوں کے بارے میں کیا جواب دے گا؟‘‘
’’زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے دوست، مرشد سیاست دان ہے وہ لاشوں کو اپنے سیاسی مخالفین کے سر تھوپ سکتا ہے کہ انہوں نے اسے بدنام کرنے کے لیے یہ لاشیں بکسوں میں بند کر کے اس کے گھر بھیجی ہیں اور ساتھ ہی میڈیا کو اطلاع دے دی۔‘‘
’’وہ کچھ بھی وضاحت کرے اس چکر میں تو آئے گا۔ وہ لاشوں کو خاموشی سے دفنا کر معاملہ نمٹا نہیں سکتا...... اور ممکن ہے اس کے خلاف ایف آئی آر بھی درج کروا دی جائے۔‘‘
’’یار قانون اس جیسے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... اس لیے بس اسے دل خوش کرنے کا ایک تماشا سمجھو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ٹی وی چینل والے بھی ایک دو دن اس خبر کو چلائیں گے اور چند دن بعد وہ اسے بھول چکے ہوں گے۔ ہمارے ہاں لوگوں کی یادداشت کچھ مٹی پاؤ قسم کی ہے، جلد سب بھول جاتے ہیں۔‘‘
عبداللہ مایوس ہوا۔ ’’یعنی ہماری اتنی تگ و دو کا کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے؟‘‘
’’فائدہ تو ہوا ہے‘ مرشد کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتے ہیں‘ ابھی میں نے اسے

فون کر کے خوش خبری سنا دی ہے کہ فاضلی ہمارے پاس زندہ سلامت موجود ہے۔ اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے فاضلی کے غائب ہوتے ہی اس کے خلاف تھانے میں چوری کی رپورٹ لکھوا دی ہے اس طرح وہ اس کے کیے سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔‘‘
’’ایسا ہو گا نہیں...... اس نے جو حرکت کی ہے اس کے بعد ہم اسے اتنی آسانی سے بچ کر نکلنے کا موقع نہیں دیں گے۔‘‘
’’فاضلی کی زبان کھل جائے نا تو پھر مرشد کے گرد قانونی گھیرا ابھی ڈالا جا سکتا ہے۔‘‘
’’مجھے امید ہے آپ نے جو ترکیب کی ہے اس کی زبان کھل جائے گی۔‘‘
’’مگر اس کے بیان کی عدالت میں کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی۔ ہاں فاضلی ہمیں مرشد کی کمزوریوں سے آگاہ کر سکتا ہے ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔‘‘
اس گفتگو کے دوران عبداللہ وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اس سے بات کر کے میں نے دوبارہ انٹرنیٹ سے مرشد ہاؤس کا نمبر ملایا۔ کال اسی لڑکی نے ریسیو کی اور میری آواز پہچان کر رونے والے انداز میں بولی۔ ’’آپ نے مجھے مروا دیا جی......‘‘
’’فکر مت کرو مرشد تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ اسے کہو میری کال ہے میں اس سے بات کروں گا۔‘‘
’’میں پوچھتی ہوں پتا نہیں وہ آپ سے بات کرتے ہیں یا نہیں۔‘‘
لیکن مرشد نے مجھ سے بات کرنا قبول کر لی اور وہ مشتعل تھا اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’بڑا اچھا ڈراما تیار کیا ہے تم نے لیکن تم کیا سمجھتے ہو اس طرح مرشد کا بال بھی بیکا ہو گا۔‘‘
’’نہیں...... میں احمق نہیں ہوں۔ یہ تو تمہارا دل خوش کرنے کے لیے تھا۔ ایسے چھوٹے موٹے معاملات سے تو تمہارے ملازمین بھی نمٹ لیتے ہیں باقی رہے میڈیا والے تو وہ دو تین دن تمہیں رگڑیں گے اور اس کے بعد بھول کر کسی اور معاملے میں الجھ جائیں گے۔ بہرحال اسے گولی مارو مجھے تم سے دو اہم باتیں کرنی ہیں۔ اول میں نے اس لڑکی کو بے وقوف بنایا کہ میں ایم این اے ملک ہوں۔ امید ہے تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔‘‘
’’کیا تمہاری یہی خواہش ہے؟‘‘
’’خواہش تو یہی ہے میں تو تم جیسے موذی انسان کو بھی

بے دریغ مار دینے کا قائل نہیں ہوں وہ تو بے چاری عام سی لڑکی ہے۔"
مرشد میرا جملہ پی گیا۔ "ٹھیک ہے وہ اس قابل تو نہیں ہے لیکن میں تمہارے کہنے پر اسے معاف کرتا ہوں۔"
"اب آتے ہیں فاضلی کے معاملے کی طرف....."
وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "فاضلی نے جو کیا وہ اپنے طور پر کیا ہے، میں نے اس سے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا۔"
"گویا تم کہنا چاہتے ہو کہ فاضلی نے از خود فیصلہ کیا اور ہیلی کا پٹر اڑانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔"
"میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ یہ معاملہ میرے علم میں تھا۔ دراصل تمہارا معاملہ میں نے فاضلی کے سپرد کر دیا ہے اور وہ اپنے طور پر تم سے نمٹ رہا ہے۔"
"مرشد تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم جانتے ہو اب میں اس جنگ میں اکیلا نہیں ہوں، مجھے بہت سارے لوگوں کی مدد و حمایت حاصل ہے۔"
"راجا عمر دراز....." اس نے کہنا چاہا۔
میں نے قہقہہ لگایا۔ "مرشد اس سے اندازہ ہوتا ہے تمہاری انفارمیشن کتنی ناقص ہیں۔ راجا عمر دراز بہت پہلے سے میرے ساتھ ہے لیکن تم نے یہ سوچا ہے کہ تمہارے کتنے دشمن ہیں؟ تمہارے اپنے خاندان میں ایسے کتنے ہیں جو جلد از جلد تمہیں جہنم میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ میں نے اس فارمولے پر عمل کیا ہے۔ ڈیوڈ شا اب غیر جانبدار ہے یقین نہیں ہے تو اس سے معلوم کر لو اور عین ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی طرف سے حکم آ جائے کہ شہباز کے ساتھ پنگا لینا بند کر دو۔"
"تمہارا کیا خیال ہے میں اس کی بات مان لوں گا۔" مرشد نے حقارت سے کہا۔
"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے، میں تمہیں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ جب میں اپنے زور بازو پر بھروسا کرتا تھا تب بھی تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے لیکن اب طاقت کا توازن تقریباً برابر ہو گیا ہے۔ اس لیے کسی حماقت سے باز رہو۔"
"پہل تم نے کی تھی۔" اس نے الزام دیا۔
"نہیں تمہارے آدمیوں نے شہلا کو اٹھا کر میرے کام میں مداخلت کی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اسے واپس لینے کے لیے میں وہاں گیا تھا۔"
مرشد سوچ میں پڑ گیا تھا خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں تم سے صلح کے لیے تیار ہوں لیکن تمہیں فاضلی کو چھوڑنا....."
"اسے بھول جاؤ اس کے جرائم کی فہرست خاصی لمبی ہو گئی ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھے ذاتی نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اور مجھے شک ہے کہ شاہد بھائی کا قاتل بھی وہی ہے۔ اگر تم صلح کرنا چاہتے ہو تو تمہاری طرف سے اس کی قیمت فاضلی ہو گا۔"
"جواب میں تم کیا دو گے؟"
"میں تمہارے معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا دوسرے تم میرے کیس ختم کرانے کی کوشش میں ٹانگ نہیں اڑاؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو سیز فائر ختم ہو جائے گا۔"
"مجھے منظور ہے۔" اس نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ میری طرف سے اتنی تیز کارروائی پھر فاضلی کی ناکام کوشش اور اس کے بعد اس کا پکڑا جانا مرشد کے لیے کم دھچکا نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم اتنے تر نوالے نہیں تھے جتنا اس نے سوچا تھا۔ میں نے کال کاٹ دی۔ باہر شام ہو چکی تھی اور کچھ دیر میں سورج غروب ہو جاتا۔ عبداللہ نے ہیلی کاپٹر کے کریش کے بعد حویلی کال کر کے بابا جان کو مطلع کر دیا تھا۔ لیکن میں نے کال نہیں کی تھی۔ میں نے بابا جان کا نمبر ملایا۔ سلام دعا کے بعد میں نے کہا۔
"اللہ نے کرم کیا لیکن ہمارے دشمن بہت ہوشیار ہیں۔"
"اس واقعے نے مجھے بھی فکر مند کر دیا ہے اب میں حویلی کی حفاظت بڑھانے کا سوچ رہا ہوں۔ پیچھے کی طرف کی زمین لے کر میں نے اس پر فوج سے ریٹائر ہونے والے کچھ لوگوں کو آباد کیا ہے وہ اپنے خاندان سمیت آ گئے ہیں۔ گھر بھی بنا لیے ہیں وہ عقب سے حویلی کی حفاظت کرتے ہیں ان کے پاس لائسنس یافتہ اسلحہ ہے۔"
"بابا جان میرے پاس ایک الیکٹرانک سیکورٹی کا ماہر ہے، میں اسے کچھ دن میں حویلی بھیجتا ہوں وہ وہاں ایسا سیکورٹی سسٹم لگا دے گا جس کے ہوتے ہوئے کوئی بے خبری میں حویلی میں نہیں گھس سکے گا۔"
"یہ اچھا ہو گا، میں نے تہ خانے کا ایک حصہ الگ کر لیا ہے کسی مشکل میں حویلی کے لوگ وہاں پناہ لے سکتے ہیں۔ کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا..... اور اگر لگا لے تو اسے آسانی سے کھول نہیں سکتا۔"
"یہ آپ نے اچھا کیا ہے۔"

ماں جی اور دوسرے لوگوں سے بات کر کے میں نے فون بند کر دیا۔ سویرا سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اسے میں صرف براہِ راست کال کر سکتا تھا۔ میں نے اب صابر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں دبے قدموں اس کے کمرے تک آیا بغیر آواز کے کنڈی کھولی اور اچانک دروازہ کھول دیا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا صابر چونک گیا۔ شازیہ بستر پر نیم دراز تھی اور اس کی حالت خاصی بہتر لگ رہی تھی۔ میرے اچانک دروازہ کھولنے سے وہ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔ میں نے صابر سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

اس نے ناگواری سے کہا۔ "تم نے ہمیں دھوکا دے کر یہاں قید کیا ہے اور اس طرح اچانک اندر کیوں آئے؟"

"بکواس کرنے کے بجائے باہر آجاؤ۔" میں نے اسے گھورا۔ "اگر تم اپنی بیٹی کے سامنے بے عزتی کرانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔"

بادلِ ناخواستہ وہ باہر آیا میں اسے خالی کمرے میں لایا اور اچانک اسے پیچھے سے دھکا دے کر منہ کے بل گرایا اور اس کی پشت پر گھٹنا رکھتے ہوئے اس کی تلاشی لینے لگا۔ وہ چیخا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

میں کوئی جواب دیے بغیر اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ گالیاں دینے لگا۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے گھٹنا ہٹا لیا۔ وہ مشکل سے اٹھا اور چیخا۔ "تمہارا دماغ خراب ہے۔"

میں پیچھے ہٹا اور اچانک باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ دروازہ پیٹنے اور شور کرنے لگا۔ میں اس کے کمرے میں آیا تو شازیہ جو پہلے ہی باپ کی چیخ و پکار سے پریشان تھی مجھے دیکھ کر ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن پھر اسے نظر انداز کر کے صابر کے سوٹ کیس کی تلاشی لی۔ اس میں بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں مطمئن نہیں تھا اس لیے اب پورے کمرے کی تلاشی لی اور بالآخر مجھے بیڈ کے پاؤں والی طرف سے گدا ہٹانے پر وہ چھوٹا سا ریوالور مل گیا جسے صابر نے یہاں چھپایا تھا۔ صرف ریوالور مل جانے سے میرا اطمینان نہیں ہوا تھا میں نے باقی کمرے کی تلاشی بھی لی اور پھر شازیہ سے کہا۔ "اٹھو..... تمہیں تمہارے باپ کے پاس جانا ہے۔"

وہ لرزتے کانپتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ اس کے منہ سے از خود ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی حالت افسوسناک تھی۔ لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنے باپ کا کیا دھرا بھگتنا پڑا تھا۔ میں اسے بھی خالی کمرے میں لایا۔ صابر دروازہ کھلتے ہی جھپٹا لیکن شازیہ اور میرے ہاتھ میں اپنا ریوالور دیکھ کر چونک گیا۔ میں نے ریوالور نمایاں کیا۔ "اسے پہچانتے ہو اسے میں نے تمہارے کمرے کے بیڈ کے نیچے سے برآمد کیا ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور شکست خوردہ نظر آنے لگا۔ "تم نے اسے تلاش کر لیا۔"

"ہاں تم نے مجھے دھوکا دیا، بے وقوف بنانے کی کوشش کی لیکن میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں اپنی اور اپنی بیٹی کی جان بچانے کا۔"

"کیسا موقع؟" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"صابر، مجھے مہرو تلاش کر کے لا دو یا اس کے بارے میں یقینی اطلاع دو اس کے قبیلے کو تلاش کرو۔"

"میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔"

"تم کر سکتے ہو تمہارے رابطے ہیں۔"

"لیکن میں تمہارے لیے کیوں کروں؟"

"اگر تمہیں اپنی بیٹی پیاری ہے تو تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تب تک شازیہ ہمارے پاس رہے گی۔"

یہ سنتے ہی شازیہ نے پھر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ صابر نے میری طرف دیکھا۔ "یہ نہیں رہ سکتی یہ مر جائے گی۔"

"نہیں مرے گی تم اسے سمجھا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس آج رات تک کی مہلت ہے اگر تم نے کل تک فیصلہ نہیں کیا تو میں تم دونوں کو مرشد کے حوالے کر دوں گا۔"

صابر لرز گیا۔ "نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔"

"تم خود اس کے پاس جانے کا سوچو تو ٹھیک ہے اور میں اس کے حوالے کروں تو غلط ہے۔" میں نے طنز کیا اور کمرے سے نکل آیا۔ دروازہ باہر سے بند کر کے میں نیچے آیا تو مانی نشست گاہ میں بیٹھا تھا اس نے میری طرف دیکھا۔

"شوبی یہ لڑکی کیوں چیخ رہی تھی؟"

"تمہارا کیا خیال ہے میں اس سے کوئی غیر انسانی سلوک کر رہا تھا۔" میں نے کسی قدر سخت لہجے میں پوچھا کیونکہ مانی کا لہجہ شک والا تھا۔ وہ بوکھلا گیا۔

"نن... نہیں شوبی بھائی.... میرا مطلب ہے وہ کیوں چلا رہی تھی۔"

"میں نے اسے کوٹھی بھیجنے کا فیصلہ کیا اور وہ اپنے باپ سے الگ ہونے کو تیار نہیں ہے۔"

"کوٹھی کیوں بھیج رہے ہیں؟"

بیتو کبھی مجھ سے اس طرح سوال نہیں کرتا تھا اسے معلوم تھا مجھے جو مناسب لگے گا میں اسے بتا دوں گا۔ مانی اس سے مختلف مزاج کا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی مار دھاڑ نہیں دیکھی تھی اسی لیے وہ ایسی باتوں پر پریشان ہو جاتا تھا۔ میں نے اس بار نرمی سے کہا۔ "برخوردار تم اس قسم کے معاملات میں اپنے ذہن پر زیادہ زور مت دو۔ اس سے تمہیں سوائے پریشانی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"اور کیا تم کمپیوٹر چلاؤ..... گیم کھیلو اور مزے کرو۔"

بیتو بولا۔ "شوبی کا معاملہ شوبی جانے۔"

مانی خاموش ہو گیا لیکن میں نے محسوس کیا وہ مطمئن نہیں تھا۔ شاید اس کے خیال میں ہم نے صابر اور اس کی بیٹی کو یہاں قید کر کے زیادتی کی تھی۔ بہرحال وہ ایسا سمجھتا تھا تو سمجھتا رہے۔ سفیر اپنے پاس تمام اقسام کی دوائیاں رکھتا ہے میں اس کے کمرے میں آیا تو مجھے دواؤں کے شیلف میں مطلوبہ گولیاں مل گئیں یہ نیند کی گولیاں تھیں۔ میں نے اس میں سے پانچ گولیاں نکال لیں اور بیتو کے حوالے کیں۔ "کھانے کے بعد کافی بنانا اور اس میں یہ گولیاں ملا کر صابر اور اس کی بیٹی کو دے دینا۔"

"ہم سمجھ گیا۔" وہ بولا۔ مانی کے چہرے پر سوالیہ نشان نظر آیا تھا لیکن اس نے زبان سے نہیں پوچھا اور اچھا ہوا ورنہ وہ مجھ سے جھاڑ کھاتا۔ صبح والے واقعے کے بعد یہ ظاہر میں پُرسکون تھا لیکن میرے اعصاب سخت کشیدہ ہو گئے تھے ہم سب ایک بہت بڑے سانحے سے دوچار ہوتے ہوتے رہ گئے تھے۔ اللہ کی مہربانی کے بعد یہ پائلٹ شفاعت کی مہارت تھی جو اس نے بے قابو ہیلی کاپٹر کو کامیاب طریقے سے لینڈنگ کرائی۔ شروع میں مجھے اچھا نہیں لگا تھا لیکن بعد میں اس نے ثابت کر دیا کہ وہ غیر ذمے دار سہی لیکن اپنے کام میں ماہر تھا اور انعام کا مستحق تھا۔ عبداللہ ائر کلب اور پولیس کے معاملات سے نمٹ کر آ چکا تھا۔ میں اس سے پوچھنا بھول گیا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے کال کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ اس کی کال آ گئی۔

"سوری میں ائر کلب والی بات بتانا بھول گیا تھا۔ مرشد ہاؤس میں جو ہوا اس نے مجھے ایکسائٹڈ کر دیا تھا۔"

"ہیلی کاپٹر کس کا ہے اور اس کا نقصان کون پورا کرے گا؟"

"ہیلی کاپٹر کلب کا ہے اور وہ انشورڈ ہے کلب خود انشورنس والوں سے رقم وصول کر لے گا۔"

"شفاعت نے کمال کر دیا وہ انعام کا مستحق ہے۔"

"جی، میں اسے پچاس ہزار دے آیا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔ "وہ لے نہیں رہا تھا بلکہ شرمندہ تھا کہ ایک مسافر زخمی بھی ہوا۔"

"تم نے ٹھیک کیا وہ انعام کا مستحق ہے۔ پولیس میں کیا رپورٹ کرائی ہے؟"

"نامعلوم افراد کے خلاف جنہوں نے ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کر کے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔"

"ایک اچھا کام اور کیا ہے، میں نے پولیس کے تلاش کرنے سے پہلے ہی وہ خود کار گن وہاں سے ہٹا لی اب وہ ہمارے پاس ہے۔ آپ نے اسے خاصا نقصان پہنچایا ہے لیکن وہ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔ یہ بڑا کارآمد ہتھیار ہے جو کبھی ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "عبداللہ میں نے صابر سے کام لینے کا سوچا ہے اور اس سے کام لینے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی بیٹی کو یرغمال بنا لیا جائے۔ آج رات انہیں کافی میں نیند کی دوا دے دی جائے گی اور اس کے بعد تم اپنے آدمی بھیج کر لڑکی کو کوٹھی بلوا لینا یہ وہیں رہے گی۔ اگر یہ نارمل رہتی ہے تو اسے سعدیہ اور مونا کے ساتھ رکھنا ورنہ اسے تہ خانے میں منتقل کر دینا۔"

"صابر سے کیا کام لینے کا سوچا ہے؟"

"مہرو کی تلاش کا۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر مہرو مل گئی تو اس کا بھی امکان ہے کہ بریف کیس بھی مل جائے۔"

"یہ ٹھیک ہے لیکن وہ مرشد کے ہتھے چڑھ گیا تو.....؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا..... ایک منٹ میں وسیم کو بھی کال ملا لوں تاکہ ایک ساتھ سب جان جائیں۔" میں نے کہا اور وسیم کو کال ملائی پھر عبداللہ کو کانفرنس کال میں لیا۔ میں نے انہیں مرشد سے ہونے والی ڈیل کا بتایا اور ساتھ ہی صابر کے معاملے سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ اس وقت اس سے بہترین حکمتِ عملی ممکن نہیں تھی۔ مرشد پر اصل وار کرنے سے پہلے اسے دھوکے میں رکھنا ضروری تھا۔ عبداللہ نے کہا کہ وہ اپنے دو آدمی بھیج رہا ہے جو شازیہ کو لے جائیں گے۔ وسیم نے فاضلی کے بارے

میں بتایا۔ ”اسے پہلا ڈوز دیا جا چکا ہے۔“
”گڈ.... وقفے وقفے سے ڈوز جاری رکھو تا کہ وہ جلد از جلد تیار ہو جائے۔“
”امید ہے ایسا ہی ہو گا۔“ وسیم نے کہا۔ ”اب خواتین کی منتقلی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“
”انہیں منتقل کرنا ہے لیکن دیکھ بھال کر۔“
”سوال یہ ہے کہ اتنی احتیاط کے باوجود مرشد ہمارے پلان سے کیسے واقف ہو گیا؟“
”اس سوال کا جواب فاضلی دے گا اور ابھی اسے دو تین دن لگیں گے۔ بہرحال ہمیں مزید محتاط ہو جانا چاہیے۔ جیسے ہم مرشد کو دھوکا دے رہے ہیں اسی طرح وہ بھی ہمیں دھوکا دے رہا ہے اور اسے جیسے ہی موقع ملے گا وہ پھر وار کرے گا۔“
وسیم نے کہا۔ ”کیا ایسا نہ کیا جائے کہ خواتین کو نئے ٹھکانے پر منتقل کر دیا جائے؟“
”نہیں، وہ صرف چھپ کر رہنے کے لحاظ سے ٹھیک ہے خواتین کے لیے وہاں رسک ہے۔ اگر وہاں کھلی سیکورٹی رکھی گئی تو جگہ مشکوک ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”فی الحال عبداللہ والی کوٹھی ہی ٹھیک ہے۔“
”میرا خیال آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کسی نئی جگہ یا تو نئے سرے سے حفاظتی انتظامات کرنے پڑیں گے یا پھر چھپ کر رہنا ہو گا۔ دونوں صورتوں میں خطرہ باقی رہے گا۔“
ان سے بات کر کے میں نے سفیر کو کال کی تو اس نے اچھی خبر سنائی۔ ”مونا کی حالت اتنی بہتر ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر نے اسے کل صبح لے جانے کی اجازت دے دی ہے۔“
”وہ جاگ رہی ہے تو میری بات کراؤ۔“
مونا میری آواز سن کر سسکیاں لینے لگی تھی۔ میں نے پیار سے کہا۔ ”گڑیا اس میں رونے کی بات نہیں ہے اللہ دینے والا ہے وہ پھر تم دونوں کو اولاد دے گا اور اس کا شکر ہے کہ تم سب محفوظ رہے۔“
مونا نے خود پر قابو پایا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہیلی کاپٹر بے قابو ہو کر جس طرح گھوم رہا تھا مجھے لگا ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔ مگر جب وہ زمین پر گرا اور ہم سب صحیح سلامت رہے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔“
”بس تو اب دکھی مت ہونا اور اللہ کا شکر ادا کرنا۔ تم دونوں سلامت رہو گے تو ایسی خوشیاں بہت دیکھنے کو ملیں گی۔“
”اوہ بھائی کیا بددعا دے رہا ہے۔ پندرہ سولہ بچوں کے بعد ہماری لائف کہاں باقی رہے گی۔“
”ٹھیک کہا پھر تو بوجھ ڈھونے والا گدھا بن جائے گا۔“
”تب اللہ کرے تیرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ میں حویلی جاتے ہی تیری شادی کی قرارداد پیش کرتا ہوں۔“
”بکواس بند کر کے ذرا میری بات توجہ سے سن۔“ میں نے کہا اور اسے بھی مرشد اور صابر کے بارے میں آگاہ کیا۔ ”کل صبح تک بہت محتاط رہنا مرشد جیسے لوگ اسپتال کا احترام بھی نہیں کرتے ہیں۔“
”تو نے ٹھیک کہا ہے میں اور ایاز یہیں ہیں ایک آدمی اور ہے اور باہر بھی کئی ہیں۔“
”ڈاکٹرز اور نرس کے معاملے میں بھی محتاط رہنا اگر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر یا نرس کے علاوہ کوئی پاس آنا چاہے تو اسے مونا کے پاس پھٹکنے بھی مت دینا۔ فاضلی ڈاکٹر بن کر ہی اسپتال میں گھسا تھا۔“
”میں محتاط رہوں گا۔“ سفیر نے یقین دلایا کیونکہ معاملہ مونا کا تھا اس لیے مجھے یقین تھا وہ سچ مچ محتاط رہے گا۔ رات ہو چکی تھی بیتو نے مانی کے ہاتھ صابر اور شازیہ کے لیے اوپر کھانا پہنچایا۔ باپ کو پاس پا کر شازیہ بہل گئی تھی۔ مگر اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ عبداللہ والی کوٹھی میں خواتین کے ساتھ بھی آسانی سے رہنے پر آمادہ نہیں ہو گی اور اسے تہ خانے میں دواؤں کے زیرِ اثر رکھنا پڑے گا۔ وہ نیچے آئے تو ہم نے کھانا کھایا اور پھر بیتو کافی بنانے لگا۔ میں نے لاؤنج میں ٹی وی آن کیا تو حسبِ توقع مختلف چینلز پر مرشد ہاؤس پہنچنے والی دو لاشوں کا ذکر تھا۔ پولیس نے لاشیں اپنے قبضے میں لے کر انہیں وہاں لانے والے پک اپ ڈرائیور کو گرفتار کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ غریب تھا اور اس کی کوئی شنوائی نہیں تھی جب کہ مرشد بااثر اور دولت مند شخص تھا اس لیے پولیس کے نزدیک مستند تھا اس کا فرمایا ہوا۔
مرشد نے لاشوں کو شناخت کرنے یا ان سے کسی قسم کے تعلق سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اسے اپنے سیاسی مخالفین کی سازش قرار دیا تھا۔ چینلز اپنے اپنے حساب سے واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ انتظامیہ اور پولیس نے مرشد کو اس واقعے میں ملوث قرار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈرائیور کے بیان کے بعد کہ لاشوں والے بکس کسی اجنبی آدمی نے

بک کرائے تھے مرشد کی پوزیشن خود بہ خود صاف ہو گئی تھی۔ انتظامیہ اور پولیس کو جواز مل گیا مرشد کو بے قصور قرار دینے کا۔ اس دوران میں بیتو کافی لایا تو مانی نے اپنا مگ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”دوا احتیاط سے ملائی تھی کہیں ہم نہ سوتے رہ جائیں۔“
”میں تمہاری طرح کام نہیں کرتا ہوں۔“ بیتو نے خفگی سے جواب دیا۔ ”میں انہیں کافی دے آیا ہوں۔“
”کچھ دیر میں عبداللہ کے آدمی آ کر شازیہ کو لے جائیں گے۔“
”شوبی بھائی کیا اسے بھیجنا ضروری ہے۔“ مانی نے کسی قدر بے چینی سے کہا تو بیتو نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔
”مانی.... کیا بات ہے تم لڑکی کے جانے کا سن کر بے چین ہے۔“
مانی جھینپ گیا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“
”بات یہ ہے برخوردار کہ ہمیں جلد یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ ممکن ہے کل یا پرسوں ہم اپنے نئے ٹھکانے کی طرف چلے جائیں۔“
”اور یہ جگہ؟“ بیتو نے پوچھا۔
”صابر اس جگہ کو دیکھ چکا ہے اس لیے یہاں رہنا مناسب نہیں ہو گا۔“
”اچھا خاصا ٹھکانا ہے۔“ مانی مایوسی سے بولا۔ ”اگلی جگہ پتا نہیں یہ سب سہولتیں ملیں یا نہ ملیں۔“
”وہ جگہ اس سے بھی اچھی ہے اور سڑک کے بالکل ساتھ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسلام آباد اور پنڈی دونوں کے پاس ہے۔ کوٹھی اس سے بھی جدید انداز کی بنی ہوئی ہے اور اردگرد کا منظر بھی برا نہیں ہے۔ وہاں ہر قسم کی سہولت بھی ہے۔“
”لیکن یہاں سارا سیٹ اپ ہے اسے لے جا کر پھر سے لگانا پڑے گا۔“
”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے یہاں لگایا ہے ویسے ہی وہاں لگا دینا۔ یہ اس سے تو بہتر ہے کہ دشمن یہاں آ جائیں اور تمہیں لے جائیں۔“
دشمن کا سن کر مانی تیار ہو گیا تھا۔ بیتو تو تھا ہی یس ماسٹر ٹائپ کا آدمی۔ ہر حال میں اور ہر حکم پر خوش ہونے والا۔ مانی کو مین میخ نکالنے کی عادت تھی۔ آدھے گھنٹے بعد بیتو نے آ کر رپورٹ دی کہ دونوں باپ بیٹی بے ہوشی کی نیند سو رہے ہیں۔ اسی لمحے فارم کے گیٹ پر ایک گاڑی آ کر رکی۔ اس کی اطلاع مانی نے دی تھی۔ بیتو نے جا کر گیٹ کھولا اور عبداللہ کے آدمی گاڑی اندر لے آئے۔ انہوں نے شازیہ کو ایک چادر میں لپیٹ کر گاڑی میں منتقل کیا۔ وہ دونوں اجنبی نہیں تھے۔ میں کئی بار انہیں عبداللہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانا کہ لڑکی کو صرف بھروسا کر کے ان کے ساتھ کر دوں۔ میں ان کو اتنی اچھی طرح بھی نہیں جانتا تھا ہمارے سامنے تو وہ یس ماسٹر بنے رہتے تھے۔ میں نے بیتو کو اشارے سے الگ بلایا۔ ”تم ان کے ساتھ جاؤ گے اور ان پر نظر رکھو گے لڑکی تمہاری تحویل میں ہے اگر یہ ذرا بھی گڑبڑ کریں تو عبداللہ کو کال کر دینا۔“
بیتو نے سر ہلایا اور تیار ہونے چلا گیا۔ میں نے عبداللہ کے ان دونوں آدمیوں کو روک لیا۔ وہ گاڑی کے

پاس کھڑے تھے۔ ”بیتو بھی تم دونوں کے ساتھ جائے گا۔“

ان کے چہرے پر واضح مایوسی کے آثار نظر آئے تھے۔ بیتو نیچے آیا تو میں نے اس سے کہا کہ اگر یہ آپس میں کوئی بات کریں تو مجھے اس سے بھی آگاہ کرنا۔ بیتو ان کے ساتھ چلا گیا۔ میں اندر آیا تو مانی اکیلا اداس بیٹھا تھا۔

”کیا ہوا یار؟“

”آج میرا بیتو کے ساتھ گیم تھا۔“

”کوئی بات نہیں کل بیتو آجائے گا تب تم کھیل سکو گے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے ابھی کچھ کام نہ کر لیا جائے؟“

مانی مستعد ہو گیا۔ ”نیٹ سے متعلق ہے؟“

”بالکل۔“

ہم اسٹڈی میں آئے جہاں مانی نے بڑے سائز کے ایل سی ڈی ٹی وی کو اپنے لیپ ٹاپ سے بھی منسلک کر دیا تھا اور اب یہ مانیٹر بھی تھا۔ یہ چھتیس انچ کا ٹی وی تھا اور ظاہر ہے اس پر ہر چیز بہت واضح دکھائی دیتی۔ میں نے مانی سے گوگل ارتھ اکاؤنٹ کھولنے کو کہا۔ پھر اسے خانقاہ مرشدیہ دکھانے کو کہا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ ہے کہاں؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ صابر نے مجھے اس کی لوکیشن سمجھائی تھی۔ میں نے وہ نئی سڑک تلاش کرنے کو کہا خانقاہ اس سے کچھ ہی دور واقع تھی۔ مانی نے سڑک تلاش کر لی اور اس سڑک کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ اس نے لائیو ویڈیو کے بجائے ہائی ریزولیوشن امیجز کھولے تھے جن میں ہر چیز بہت واضح تھی۔ اس میں کچھ وقت لگا لیکن بالآخر ہم نے خانقاہِ مرشدیہ تلاش کر لی۔ یہ اس سڑک سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور خانقاہ تک جانے کے لیے پختہ چوڑی سڑک شاید حال ہی میں بنی تھی۔ صابر نے میاں سبحان نامی زمیندار کے ڈیرے کا بتایا تھا جو اصل میں مرشد کا آدمی تھا اور اس کے ڈیرے سے ایک خفیہ سرنگ مرشد کے اڈے تک جاتی تھی۔ یہ مرشد کے اڈے سے شمال میں تھا۔ مانی نے اسے بھی تلاش کر لیا۔ ڈیرے کی عمارت بہ ظاہر ایک منزلہ اور اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ قابلِ ذکر بات اس کا احاطہ تھا۔ یہ بہت بڑا تھا اور شاید نصف ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا جب کہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا اگر یہاں گاڑیاں پارک کرنی تھیں تو ایک کنال جگہ بھی بہت ہوتی کیونکہ تصویر بالکل اوپر سے لی گئی تھی اس لیے دیواروں کی اونچائی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا لیکن احاطے کی فصیل ایک فٹ سے زیادہ چوڑی تھی اور اتنی چوڑی فصیل کم سے کم آٹھ دس فٹ بلند دیوار کی ہوتی ہے۔ گویا اس احاطے کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ مانی نے حساب لگا کر بتایا کہ یہ ڈیرا نئی سڑک کے متوازی مرشد کے ٹھکانے سے کوئی چھ سو میٹرز شمال میں تھا۔

اصل چیز مرشد کا اڈا تھا۔ میں اسے خانقاہ کا لفظ نہیں دینا چاہتا کیونکہ ہمارے ذہن میں خانقاہ سے ایک الگ تاثر ابھرتا ہے۔ ایک زمانے میں جب منگولوں کے حملے کے بعد پورے عالمِ اسلام میں ایک مایوسی اور قنوطیت کی کیفیت پیدا ہوئی تھی لوگوں کا جینے مرنے سے اعتماد اٹھ گیا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ اور دین سے اعتبار بھی اٹھ جاتا۔ ایسے میں صوفیوں نے دین کو بچانے کے لیے خانقاہوں کا جال بچھا دیا۔ ہندوستان سے لے کر وسط ایشیا تک صوفی تحریک نے دین بچانے کی مہم چلائی اور مسلمانوں کو اس مایوسی کی کیفیت سے نکال لیا جس نے بالآخر یورپ کی عیسائی اقوام کو سیکولر ازم کی طرف دھکیل دیا۔ صلیبی جنگوں میں عبرتناک شکست کا وہی نتیجہ نکلا تھا اور عیسائیت کو بچانے کے لیے کوئی صوفی تحریک سامنے نہیں آئی اس کا انجام آج سامنے ہے۔

لیکن ان بزرگانِ دین اور خانقاہوں کی کوششوں کو سبوتاژ کیا خود ان کی آل اولاد اور مقابر کے مجاوروں نے جنہوں نے خانقاہوں کو مزاروں اور اس کی سجادہ نشینی کو موروثیت میں بدل دیا۔ جب یہ حربہ کامیاب رہا تو موقع شناس لوگوں نے نت نئے مزار ایجاد کرنا شروع کر دیے اور وہاں سے خلقِ خدا کو گمراہ اور ان کا جذباتی استحصال کیا جانے لگا۔ خانقاہِ مرشدیہ ایسی ہی ایک ..... ایجاد تھی جہاں اب تمام شیطانی کام پورے زور و شور سے جاری تھے۔ لوگ جانتے تھے، حکام واقف تھے لیکن کوئی اس کاروبار کو روکنے والا نہیں تھا۔ مرشد جیسے لوگ اب بے لگام ہو گئے تھے۔ یہ جگہ کوئی نصف مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف فصیل نما احاطہ تھا۔ وسط میں مرکزی عمارت تھی جس کا کورڈ ایریا تقریباً دس ہزار مربع میٹرز تھا۔ احاطے کے داخلی دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی عمارت تھی لیکن یہ بھی کم سے کم دو ہزار گز پر پھیلی ہوئی تھی اور شاید مسجد تھی۔ تیسری عمارت مرکزی عمارت کے عقب میں کوئی پچاس ساٹھ میٹرز کے بعد تھی اور بہ ظاہر یہ جگہ باغ لگ رہی تھی۔ اسے باقی احاطے سے الگ کرنے کے لیے دیوار بنائی گئی تھی اور چھوٹی عمارت کے گرد بھی دیوار تھی جیسے کسی کوٹھی کے گرد ہوتی ہے۔

عمارت کوئی ایک ہزار مربع میٹرز پر تھی۔ اس کا ڈرائیو وے بھی الگ تھا۔ جو سڑک احاطے کے اندر آتی تھی وہ درمیان میں پارکنگ کی طرف گھوم جاتی تھی جس میں گھنے سایہ دار درخت لگے تھے اسی سے ایک سڑک الگ ہو کر مرکزی عمارت کے گرد گھومتی ہوئی اس چھوٹی عمارت تک جاتی تھی اور راستے میں دو جگہ مزید گیٹ سے گزرتی تھی ایک باغ کے احاطے کے گیٹ سے اور پھر کوٹھی کے احاطے کے گیٹ سے۔

”جناب اس عمارت میں کوئی خاص بات ہے اس کی خاص سیکورٹی کی گئی ہے۔“

”میرا خیال ہے یہ مرشد کی ذاتی رہائش گاہ ہے جہاں وہ اپنے اہلِ حرم کے ساتھ رہتا ہوگا۔“

”لیکن مرشد ہاؤس؟“

”وہ اس کی سیاسی رہائش گاہ ہے۔ یہاں اس کی ایک آدھ بیوی ہوگی یا صرف ملازمین کے ساتھ رہتا ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، عورتوں کی کمی تو اسے یہاں بھی نہیں ہوگی بلکہ یہاں کھل کر عیاشی کرتا ہوگا۔“

”بالکل، مرشد ہاؤس کو وہ ان ہی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا ہوگا اپنے گھر میں تو اسے کئی بیویوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہوگا۔ دنیا والوں کے نزدیک وہ مرشد ہے لیکن بیوی تو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے۔“

مانی ہنسنے لگا۔ ”بالکل جی، بیوی تو اسے سب سے زیادہ جانتی ہوگی۔“

مانی نے مجھے مرشد ہاؤس کا لائیو منظر بھی دکھایا لیکن ایک تو رات کا وقت تھا دوسرے لائیو بہت واضح نہیں تھا۔ بس روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ احاطے میں چند لوگ ہی چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے عام لوگوں کے لیے مزار مغرب کے بعد بند ہو جاتا تھا۔ اس لیے یہ اندر کے ملازمین یا گارڈز ہو سکتے تھے۔ احاطے کی دیواروں پر طاقتور سرچ لائٹیں لگی تھیں اور اندر بھی بہت روشنی تھی کوئی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر چوری چھپے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مانی بہت متاثر تھا اس جگہ کی وسعت دیکھ کر۔ ”یہ تو بہت بڑی جگہ ہے۔“

”ہاں ایسے ہی لوگ اس ملک اور اس کی زمین پر قابض ہیں میرا خیال ہے زمین بھی قبضے کی ہے مرشد یا اس کے خاندان کی ملکیت نہیں ہے لیکن کوئی ان سے چھڑا نہیں سکتا ہے۔“

کچھ دیر بعد بیتو کی کال آگئی۔ ”شوبی آپ کا اندازہ درست تھا یہ بہت غلط لوگ ہیں، میری وجہ سے وہ کوئی حرکت تو نہیں کر سکے لیکن وہ شازیہ کے بارے میں غلط باتیں کر رہے تھے۔“

”عبداللہ کو ان کے بارے میں بتا دو اور اس سے کہہ دو ان کی چھٹی کر دے اور انہیں سمجھا دے کہ کوئی الٹا سیدھا خیال بھی ذہن میں نہ لائیں ورنہ ہمیشہ کے لیے غائب کر دیے جائیں گے۔“

”میں ابھی عبداللہ بھائی کو بتاتا ہوں۔“

”شازیہ کو کہاں رکھا ہے؟“

”اسے ابھی تو دیدی کے کمرے میں رکھا ہے، انہوں نے کہا ہے وہ اسے سنبھال لے گی لیکن اگر اس نے شور مچایا تو اسے نیچے تہ خانے میں ڈال دیں گے۔“

”عبداللہ سے کہنا اس کا خیال رکھے وہ مظلوم لڑکی ہے اس سے سختی سے نہ پیش آئے اگر زبردستی کی ضرورت پڑے تو ڈاکٹر کو طلب کر کے اسے کوئی ٹرنکولائزر دلوا دے۔“

”عبداللہ بھائی بھی یہی کہہ رہا ہے۔“ بیتو نے کہا پھر التجا آمیز لہجے میں بولا۔ ”شوبی میں اِدھر رک جاؤں بہت عرصے بعد دیدی کے ہاتھ کا کھانا ملا ہے۔“

”عیش کرو برخوردار جب تک تمہاری یہاں ضرورت نہ پڑ جائے۔“

میں نے موبائل بند کیا تو مانی فکرمند تھا۔ ”آج رات بس ہم دو ہوں گے؟“

”ہاں تمہیں کیا فکر ہے؟“

”فکر کی بات تو ہے جناب آپ اوپر جا کر سو جائیں گے اور دشمن آگئے تو نیچے میں مارا جاؤں گا۔“

”تب تم اوپر جا کر سو جاؤ۔“

”مجھے کام کرنا ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آج کل ایک پروجیکٹ ملا ہے اگر کام ہو گیا تو دس ہزار ڈالرز ملیں گے۔“

”یہ تو اچھا معاوضہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چلو میں ایسا کرتا ہوں یہاں کاؤچ پر سو جاؤں گا۔“

مانی خوش ہو گیا۔ ”آپ میری خاطر یہاں سو جائیں گے؟“

”ہاں یار تم ہم سے کوئی الگ تھوڑی ہو۔ تمہاری مشکلات ہماری ہیں اور ان کو حل کرنا سب کی ذمے داری ہے۔“

مانی تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔ ”سچ کہہ رہے ہیں شوبی بھائی.... آپ مجھے ملازم نہیں سمجھتے۔“

”برخوردار میں کوئی کمپنی نہیں چلا رہا ہوں جس میں

کوئی ملازم ہو۔ ہم سب ساتھی ہیں۔ سفیر، مونا، وسیم، سعدیہ، بیتو، عبداللہ اور اب تم۔‘‘

’’سفیر بھائی مجھے چھیڑتے ہیں۔‘‘ اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ’’مجھے دو ٹکے کا ملازم قرار دیتے ہیں۔‘‘

میں ہنس پڑا۔ ’’بے وقوف جینئس اگر وہ تمہیں دو ٹکے کا ملازم سمجھتا تو تمہارے لیے کھانے بناتا۔ سفیر تمہیں چھیڑتا ہے دل کا وہ ہیرا بندہ ہے۔‘‘

مانی مسکرانے لگا۔ ’’ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں خاص طور سے سفیر بھائی کے پراٹھوں کا جواب ہی نہیں ہے۔ اب کھانے پڑیں گے بازار کے پراٹھے یا ڈبل روٹی۔‘‘

’’فکر نہیں کرو جب موقع ملے تکے اور پزے بھی منگوا لینا۔ لیکن ابھی کچھ دن احتیاط کرو مرشد پاگل ہو رہا ہے۔‘‘

مانی نے جھرجھری لی۔ ’’خدا کا شکر ہے آپ نے اس کی سازش ناکام بنادی ورنہ سفیر بھائی، مونا باجی اور سعدیہ باجی تو مارے جاتے۔‘‘

’’نہیں یار سب اللہ کی ذات کرتی ہے۔ اگر اس کی مرضی نہ ہوتی تو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔‘‘

مانی میرے لیے کافی لے آیا اور اس نے رضا کارانہ پیش کش کی کہ وہ صبح کا ناشتا بھی تیار کر دے گا۔ میں کمبل لے کر کاؤچ پر لیٹ گیا۔ یہ کاؤچ پانچ فٹ کی قامت رکھنے والے شخص کے لیے موزوں تھی میرا تقریباً چھ فٹ قد اس میں مشکل سے سمایا تھا۔ بہرحال نیند کے بارے میں حکما فرما گئے ہیں کہ وہ سولی پر بھی آجاتی ہے۔ یہ تو پھر بھی آرام دہ... گدیلی کاؤچ تھی۔ میں سو گیا اور اٹھا تو مانی نیچے قالین پر کمبل میں لپٹا سو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری آنکھ ایسے ہی کھل گئی ہے لیکن کچھ دیر بعد اوپر سے دروازہ بجانے کی آواز آئی۔ یہ صابر تھا جو جاگ گیا تھا اسے کافی میں دوا دیے ہوئے دس گھنٹے سے اوپر ہو گئے تھے اور اب تک دوا کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ میں اوپر آیا منہ ہاتھ دھوئے اور پھر صابر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ بیتو نے وہاں کمبل اور تکیے دے دیے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی صابر اچھل کر کھڑا ہو گیا اس نے چلا کر کہا۔ ’’شہباز شازیہ کہاں ہے؟‘‘

’’اس کی فکر مت کرو وہ بالکل آرام اور حفاظت سے ہے۔ ایک مہینے تک وہ اسی طرح رہے گی۔‘‘ میرا لہجہ سرد تھا۔

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟... ایک مہینے تک... اس کے بعد؟‘‘

’’اس کے بعد میں اسے مرشد کے حوالے کر دوں گا۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ وہ چیخ کر میری طرف جھپٹا۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ ’’تم ایسا نہیں کر سکتے۔‘‘

’’تم شاید میرے شریفانہ رویّے سے دھوکا کھا رہے ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ وہ نہیں کیا جو تم اور مرشد جیسے لوگ دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں۔‘‘ میں نے حقارت سے کہا۔ ’’میں نے کل ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ مجھے بہرصورت مہرو یا اس کا یقینی پتا درکار ہے۔ اس کے لیے تمہارے پاس صرف ایک مہینے کی مہلت ہے۔‘‘

’’مجھے یقین نہیں ہے کہ شازیہ خیریت سے ہے۔‘‘ اس نے سوچ کر کہا۔ ’’کیا تم مجھے اس کی خیریت کا یقین دلا سکتے ہو۔‘‘

میں نے سوچا اور عبداللہ کو کال کی۔ ’’لڑکی کا کیا حال ہے؟‘‘

’’سعدیہ کو دیکھ کر پُرسکون ہے سعدیہ نے اسے سنبھال لیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بھی بلایا ہے۔‘‘

’’گڈ... اس کا باپ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔‘‘

ایک منٹ بعد شازیہ کی آواز آئی تو میں نے موبائل صابر کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بے تابی سے کہا۔ ’’شازیہ! میری بچی تم ٹھیک ہو... ہاں میں ٹھیک ہوں... ہاں میں نے خود تمہیں بھجوایا ہے... میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں... کچھ دن بعد آکر تمہیں لے جاؤں گا... ہاں تب تک تم ان کے ساتھ رہو... یہ بہت اچھے لوگ ہیں... انہیں تنگ نہ کرنا... یہ تمہارا خیال رکھیں گے... خدا حافظ میری بچی۔‘‘ صابر کی آواز بھرا گئی اور اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ عبداللہ کال پر تھا میں نے اس سے کہا۔ ’’میں کچھ دیر میں تمہیں کال کرتا ہوں۔‘‘

میں نے کال کاٹ کر صابر کی طرف دیکھا تو اس نے گہری سانس لی۔ ’’ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن تم نے کوئی دھوکا کیا تو...؟‘‘

’’تو تم مرشد کے پاس جانے کے لیے آزاد ہو گے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے تمہارے دونوں مجرم اپنے کیے کی سزا پا گئے ہیں اور ان کی لاشیں پیک کر کے مرشد ہاؤس پہنچا دی گئی تھیں یہ کل شام کی بات ہے۔‘‘

اس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ’’تم عدیل اور اسلم کی بات کر رہے ہو تو مجھے یہ سن کر واقعی خوشی ہوئی ہے مرشد کا کیا ردِعمل تھا؟‘‘

’’پیچھے سے میڈیا بھی پہنچ گیا اور اس نے لاشوں کی تصویریں اور ویڈیو بھی بنالی تھیں، وہ ابھی بھی چینلز پر چل رہی ہوں گی۔‘‘

’’یہ مرشد کی سیاسی ساکھ پر بہت بڑا دھبا ہوگا۔‘‘

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’مرشد کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کا حلقۂ انتخاب اس کا حلقۂ ارادت بھی ہے اگر مرشد خود کو شیطان قرار دے دے تب بھی اس کے لوگ اسے ہی ووٹ دیں گے۔ ہمارے ہاں سیاست تو نام ہی گند کا ہو گیا ہے اس میں موجود افراد کے بارے میں پہلے سے یقین کر لیا جاتا ہے کہ وہ بدترین قسم کے لوگ ہوں گے۔ بہرحال اسے دھچکا تو لگا ہے۔ اب تم اپنا ارادہ بتاؤ۔‘‘

’’اگر تم مجھے چھوڑتے ہو تو میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس وقت قافلے واپس آنے لگتے ہیں۔ کیونکہ گرمی میں بہت سارے مقامات جو سردیوں میں خالی پڑے ہوتے ہیں، یہ قافلے ان مقامات سے سرحد پار کرتے ہیں اور سرحدی چوکیوں کے آباد ہونے سے پہلے یہ کنٹرول لائن کے اس طرف آجاتے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے آج کسی وقت میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔‘‘ میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ کچن میں آکر ناشتا تیار کیا خود ناشتا کر کے صابر کو بھی ناشتا دیا اور مانی کو اٹھا دیا وہ ابھی تک پڑا سو رہا تھا۔ ’’برخوردار ناشتا کر لو اور ہوشیار ہو جاؤ میں باہر جا رہا ہوں شاید دو تین گھنٹے میں واپسی ہو اور اگر میں تمہیں کال کر کے سب سمیٹنے کو کہوں تو کتنی دیر لگے گی۔‘‘

’’کم سے کم تین گھنٹے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

میں نے سوٹ کیس سے دس لاکھ کی رقم نکالی۔ یہ صرف دو پانچ ہزار کی گڈیوں کی صورت میں آگئی تھی اور میری جیکٹ کی ایک جیب میں سما گئی تھی۔ سوٹ کیس کے لاک ٹوٹ گئے تھے میں نے مانی سے کہا۔ ’’جب نکلنے کا وقت آئے تو اس سوٹ کیس کا خیال رکھنا اسے یہیں نہ چھوڑ جانا۔‘‘

’’آپ فکر نہ کریں۔‘‘ وہ بولا۔

میں باہر آیا اور پہلے عبداللہ کو کال کی۔ راستے میں ٹریفک کا شور بہت ہوتا ہے آواز ٹھیک سے سنائی نہیں دیتی۔ ’’عبداللہ میں مکان کی بات کرنے جا رہا ہوں تم مجھ سے باہر کہاں مل سکتے ہو دس لاکھ کا ڈرافٹ بنوانا ہے اور اسامہ کا این آئی سی لیتے آنا۔‘‘

عبداللہ نے ایک بنک کا بتایا جہاں اس کا اکاؤنٹ تھا ڈرافٹ وہیں سے بنتا۔ میں روانہ ہوا آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچا تو عبداللہ پہلے سے موجود تھا۔ وہ مجھے بنک میں لے گیا۔ میں نے اسے دس لاکھ کی رقم دی تو اس نے کسی قدر بحث کے بعد لے لی اور اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی۔ میں نے افنان احمد کو کال کی اور اس سے ڈرافٹ کے لیے کچھ تفصیلات پوچھیں۔ ’’میں ایک گھنٹے کے اندر آپ کے پاس آرہا ہوں۔ میرے ساتھ میرا ایک ساتھی ہوگا جو گواہ کے طور پر دستخط کرے گا ایک آدمی آپ بلوا لیں۔‘‘

’’میں نے یہ کام کر لیا ہے آپ آجائیں۔‘‘

ڈرافٹ بنوا کر ہم افنان احمد کی کوٹھی پہنچے تو عبداللہ نے کہا۔ ’’مکان تو بہت خوب صورت ہے لیکن نمایاں نہیں ہے؟‘‘

’’ہاں ہمیں اسی چیز کا فائدہ اٹھانا ہے۔ یہاں کم سے کم آمدورفت رکھیں گے اور وہ بھی زیادہ تر رات کو۔ فرنٹ کا حصہ استعمال نہیں کریں گے یہاں بس ایک آدھ گاڑی رہے گی وہ بھی کور سے ڈھک کر رکھیں گے۔‘‘

اسی لمحے کال بیل کے جواب میں افنان احمد آگیا۔ وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اس کی سجاوٹ دیکھ کر عبداللہ حیران ہوا تھا۔ افنان احمد چائے کا پوچھ کر اندر گیا تو عبداللہ نے سرگوشی میں کہا۔ ’’جناب یہ اتنی فرنش کوٹھی دے رہا ہے؟‘‘

’’اندر سے بھی بالکل فرنش ہے اس سے بھی زیادہ۔‘‘ میں نے جوابی سرگوشی کی۔

’’اتنے کرائے میں تو خالی کوٹھی ملتی ہے، یہ پورے سامان کے ساتھ دے رہا ہے۔‘‘

’’اس نے اپنے لیے بنائی تھی اب بیٹے کی وجہ سے باہر جا رہا ہے۔ اگر خالی چھوڑ کر جاتا ہے تو خطرہ ہے کوئی گھس کر سامان چرا کر لے جائے گا اور چوکیدار رکھتا ہے تو اس کی تنخواہ الگ دینی پڑے گی۔ یہاں زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ کا سامان ہوگا وہ ہم سے یک مشت دس لاکھ لے جا رہا ہے اگر ہم اس کا سامان اٹھا کر لے جاتے ہیں تب بھی وہ نقصان میں نہیں رہے گا۔ اس کے گھر کی حفاظت بھی ہوتی رہے گی۔‘‘

عبداللہ نے سر ہلایا۔ اسی لمحے افنان احمد ایک اور شخص کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے تعارف کرایا۔ ’’یہ جلیل خانزادہ ہیں میرے وکیل... معاہدے کے گواہ یہ ہوں گے اور میرے بعد کوٹھی کی دیکھ بھال اور کسی بھی مسئلے سے نمٹنا ان کی ذمے داری ہے۔ یہ مہینے میں ایک بار آکر کوٹھی کا معائنہ کریں گے اور آپ معائنہ کرانے کے پابند ہوں گے۔ یہ بات معاہدے میں شامل ہے۔‘‘

افنان احمد سادہ نہیں تھا۔ اس نے پورا بندوبست کیا

تھا۔ میں نے بنک ڈرافٹ اسے دیا اپنی اور عبداللہ کی آئی ڈی کارڈ کی کاپی دی جو جلیل خانزادہ نے کرائے داری کے معاہدے پر پن کر دی۔ یہ ایک سال کا معاہدہ تھا۔ ہم نے دستخط کیے۔ یہ مارچ کی اٹھائیس تاریخ تھی۔ افنان احمد نے کہا۔ ”آپ دو دن بعد یکم کو آسکتے ہیں۔“

”یعنی فرسٹ اپریل کو۔“ عبداللہ بولا۔ ”بڑی غلط تاریخ دے رہیں آپ قبضے کی۔“

”مگر مجھے امید ہے ہم میں سے کوئی فول نہیں بنے گا۔“ افنان احمد نے کہا اور چائے لے آیا۔ بہ ظاہر وہ اکیلا ہی تھا اور سارے کام خود کرتا تھا۔ چائے پی کر ہم کھڑے ہوئے تو میں نے معاہدے کی فائل اٹھانی چاہی تو جلیل نے کہا۔

”اسے چھوڑ جائیں، میں اس کی کاپی کرا کے یہ اوریجنل آپ کو لا دوں گا۔“

”نہیں جناب ہمارے پاس یہی ایک پروف ہے کہ ہم نے یہ مکان سال بھر کے لیے دس لاکھ روپے ادا کر کے لے لیا ہے۔“ میں نے انکار کیا۔ ”جہاں تک کاپی کا تعلق ہے تو وہ ہم کرا کے لے آئیں گے پرسوں۔“

افنان احمد اور جلیل خانزادہ کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نظر آئے تھے انہوں نے کوشش کی کہ میں فائل نہ لے جاؤں لیکن میں نے ان کی سنی نہیں اور فائل اٹھا لی۔ ”افنان صاحب معذرت کے ساتھ میں نے ادائیگی کر دی ہے اور چیز مجھے دو دن بعد ملے گی اس لیے میرے ہاتھ میں کچھ پروف تو ہونا چاہیے کیوں، میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

مجبوراً ان دونوں نے میری تائید کی تھی۔ ہم باہر آئے تو عبداللہ نے فوراً کہا۔ ”شہباز صاحب مجھے معاملہ مشکوک لگ رہا ہے۔ آخر یہ کرایہ داری کا معاہدہ کیوں قبضے میں کرنا چاہ رہے تھے۔“

وہاں سے کچھ دور ایک مناسب قسم کے اوپن ائر ریستوران میں بیٹھ کر ہم نے فائل کا بہ غور مطالعہ کیا لیکن اس میں کوئی بات الگ سے نہیں تھی۔ افنان احمد اور جلیل خانزادہ کے این آئی سی بھی اصلی تھے۔ اس پر ان کی تصاویر بھی اصلی تھیں۔ ان کے پتے پنڈی اور اسلام آباد کے تھے۔ معاہدے میں بھی کوئی دھوکے والی بات نہیں تھی، ہر شق صاف الفاظ میں لکھی تھی۔ میں نے عبداللہ کو قائل کرنے کی کوشش کی وہ شاید پرسوں تک بہر صورت معاملہ نمٹانے کے لیے فائل اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے انہیں خدشہ ہوگا کہ کہیں ہم کاپی دینے میں تاخیر نہ کریں اور افنان احمد کی روانگی کا پروگرام متاثر ہو مگر عبداللہ کچھ اور سوچ رہا تھا اس نے کہا۔

”ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن مجھے اپنی تسلی کی اجازت دیں؟“

”وہ کس طرح؟“

”میں اپنا ایک آدمی ان کی نگرانی پر لگاتا ہوں۔“

”تمہاری مرضی۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”ویسے ہمارے پاس دو دن تو ہیں۔“

”بس تو میں اپنے آدمی ان کے پیچھے لگاتا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”میں نے ان دونوں کی چھٹی کر دی ہے اس سے پہلے بھی ان کے بارے میں شکایت ملتی رہی ہے اور میں انہیں وارننگ دیتا رہا ہوں۔“

”تم نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ اپنی زبانیں بند رکھیں؟“

عبداللہ مسکرایا۔ ”بالکل جی.... ان کے گھر والوں کا پتا ہے انہیں سمجھا دیا تھا کہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے انہیں اپنے گھر والوں سے محروم ہونا پڑے۔“

”آدمی کم رکھو لیکن بالکل پکے رکھو۔“

”میں یہی کر رہا ہوں۔ پچھلے کچھ عرصے میں خاصے بندے بھرتی کیے اور ان میں سے کام کے رکھ کر باقی فارغ کر دیے۔“

میں نے اسے صابر کے بارے میں بتایا۔ ”میں اسے چھوڑ رہا ہوں لیکن اس کے بعد ہم فارم بھی چھوڑ دیں گے۔ وہاں رہنا رسکی ہوگا۔“

”بالکل ٹھیک سوچا آپ نے.... صابر جیسے لوگ کبھی بھروسے کے قابل نہیں ہوتے ہیں تب بہتر یہ ہے کہ اسے اس وقت چھوڑیں جب آپ خود وہاں سے نکل آئیں۔“

”اس سے پہلے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میں سوچ رہا ہوں ذرا مرشد کے اڈے کا قریب سے جائزہ لوں۔“

”یہ بہت رسکی ہے جناب۔“ عبداللہ جلدی سے بولا۔ ”آپ پہچان لیے گئے تو....“

”یار میں پہلے کے مقابلے میں خاصا تبدیل ہو گیا ہوں۔“

”عام لوگوں کے لیے جناب، مرشد اور اس کے آدمی آپ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔“

میں نے اپنے بڑھے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ”میرا خیال ہے میں کسی سیلون کا چکر لگا لوں اور وہاں مشورہ کرتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”ہاں کسی ماہر سے مشورہ کر لیں لیکن پلیز ہمیں بتائے بغیر کہیں جانے کی کوشش مت کریے گا۔“ عبداللہ نے التجا کی۔ ”آپ تو آرام سے دشمن کی تحویل میں چلے جاتے ہیں اور قسمت کے دھنی ہیں کہ صحیح سلامت واپس بھی آجاتے ہیں۔ یہاں ہماری جان پر بن جاتی ہے جب تک آپ واپس نہیں آجاتے۔“

میں ہنس پڑا۔ ”اچھا یار نہیں جاؤں گا بغیر بتائے یا مشورہ کیے۔“

عبداللہ رخصت ہوا تو میں نے اسلام آباد کے ایک پوش ایریے میں واقع ایک مہنگے سیلون کا رخ کیا، کسی زمانے میں میں یہیں آتا تھا۔ اس وقت میرے بال بڑے اسٹائلش انداز میں بنتے تھے۔ اب تو بال بنائے ہی مہینے گزر جاتے ہیں۔ میں اندر داخل ہوا تو آرائش اور عملہ بدلا ہوا تھا۔ یہ اس سیلون کے مالک کا شوق تھا۔ آرائش وہ ہر سال بدلتا تھا اور اس کا عملہ خود بدل جاتا تھا اس کے پاس کام کرنے والے لڑکے جب کام سیکھ جاتے تو خود کہیں جا کر اپنا سیلون کھول لیتے تھے یا اچھی تنخواہ پر ملازم ہو جاتے تھے۔ وہ بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ نئے لڑکے لے آتا تھا اور ان سے معمولی معاوضے پر کام لیتا تھا۔ دو تین اچھے لڑکوں کو اتنا معاوضہ دیتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاتے تھے اور دو تین سال کام کرتے تھے۔ میرا خیال تھا وہ مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ میں تقریباً سال بعد اس کے پاس آیا۔ لیکن اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”آپ... اتنے عرصے بعد آئے؟“ اس نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کا نام شفقت تھا لیکن میرا نام لینے سے گریز کیا۔ ”آئیے میں نے آپ کے لیے کچھ اسپیشل چیزیں رکھی ہیں۔“

شفقت مجھے ایک الگ پارلر میں لے آیا اس کا مقصد مجھے دوسروں کی نظروں سے بچانا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”شہباز صاحب یہ کیا غضب کر رہے ہیں، اس طرح سرِعام گھوم کر۔“

”تم نے مجھے پہچان لیا؟“

”جی... پولیس بھی دیکھے گی تو پہچان لے گی۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ ”تب کیا کروں؟“

”میں کچھ کرتا ہوں جناب۔“ اس نے کہا اور مجھے کرسی پر بٹھایا۔ پہلے تو اس نے تقریباً دس منٹ میرے چہرے کا معائنہ کیا۔ ”آپ کا چہرہ کسی قدر گول بھی ہے اور لمبا بھی ہے۔ اگر بالوں اور داڑھی کی ترتیب رکھی جائے تو اسے دونوں میں سے کوئی بھی صورت دی جا سکتی ہے۔ بالوں کا رنگ ریڈش بلیک ہے۔ اسے ریڈش براؤن یا ریڈش لائٹ گولڈن کیا جا سکتا ہے۔ کونٹیکٹ لینس لگانے سے آپ کی آنکھوں کا رنگ اور کلر بدل جائے گا۔ آپ کا رنگ سرخ و سفید ہے۔ میں ایک کریم دیتا ہوں اسے لگائیں گے تو آپ کا رنگ کسی قدر سانولا ہو جائے گا۔“

”او کے میرا حلیہ بدلنے کے لیے تم جو مناسب سمجھتے ہو وہ کرو لیکن جلدی، ایسا نہ ہو پولیس یا میرے دشمن یہاں آجائیں اور میرے ساتھ تمہیں بھی لے جائیں۔“

وہ ہنسا۔ ”ایسا نہیں ہے جی.... پولیس میرے سیلون میں قدم نہیں رکھ سکتی..... ان کو پتا ہے کہ ان کے ڈی آئی جی تک یہیں آتے ہیں۔ میری ایک فون کال پر ان کی پیٹی اتر جائے گی۔“

”مگر میرے دشمن اس کی پرواہ نہیں کریں گے۔“

اس نے پہلے میرے بال شیمپو کیے پھر انہیں کاٹا۔ اس کے بعد دوبارہ دھو کر ڈرائر سے خشک کیے۔ یہ سارے کام اس..... نے مشکل سے بیس منٹ میں کر لیے تھے۔ اس کے بعد اس نے کلر کا عمل کیا۔ اس نے ریڈش براؤن کا انتخاب کیا تھا کیونکہ میری سانولی ہو جانے والی رنگت سے میچ کرتے گولڈن براؤن بال مصنوعی لگتے۔ اس نے بہت اعلیٰ درجے کا کلر استعمال کیا تھا۔ کلر کرنے کے نصف گھنٹے بعد اس نے پھر کنڈیشنر سے میرے بال دھوئے۔ انہیں ڈرائر سے خشک کیا۔ میں نے آئینے میں خود کو دیکھا تو بال بالکل مختلف لیکن اصلی لگ رہے تھے۔ اس کے بعد اس نے میری شیو پر کام کیا اور اسے قلموں سے گول شیو کی صورت دی۔ میرا ہیئر اسٹائل بھی ایسا تھا کہ میرا چہرہ گول لگ رہا تھا۔ میری براؤن آنکھوں کو اس نے سرمئی رنگ کے لینس سے تبدیل کیا ان کا تاثر بھی بدل گیا تھا۔ مونچھیں اس نے صاف کر دی تھیں۔ دو گھنٹے بعد آئینے میں میرے سامنے ایک اجنبی تھا میں اس حد تک بدل گیا تھا کہ مجھے دن رات دیکھنے والے بھی مشکل سے شناخت کرتے۔ شفقت واقعی فن کار آدمی تھا۔

اس کے بعد اس نے مجھے کچھ مشورے اور دیے۔ ایک تو یہ کہ بالکل پتلے تلے کے جوتے استعمال کروں اور ذرا جھک کر چلا کروں۔ اس سے میری طویل قامتی کا تاثر زائل ہو جائے گا۔ اگر میں گردن ایک طرف جھکا کر رکھوں اس سے چہرہ بھی واضح نظر نہیں آئے گا۔ اس نے ٹی شرٹ یا

جرسی کے بجائے ہاف آستین کی شرٹ اور سادہ ڈریس پینٹ کا مشورہ دیا۔ ”اس سے آپ کا تاثر نرم اور معزز شخص کا ابھرے گا۔“

”وہ تو میں اب بھی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جی میں ان کے نقطہ نظر سے کہہ رہا ہوں جن کو آپ کی تلاش ہے۔ آدمی کا لباس اور حلیہ بھی دوسروں کو متوجہ کرتا ہے۔“

شفقت نے مجھے ایک شاپ کا پتا بتایا جہاں ہر قسم کے ریڈی میڈ سوٹ ملتے تھے اور اگر سائز میں مسئلہ ہوتا تھا۔ تو دکان پر موجود ٹیلر اسے آدھے گھنٹے میں ٹھیک کر کے دے سکتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور معاوضہ پوچھا۔ اس نے نیازمندی سے کہا۔ ”آپ جو اپنی خوشی سے دے دیں جناب۔“

مجھے اس کے معاوضے کا اندازہ نہ تھا لیکن یہ سارے کام میں نے پہلی بار کرائے تھے اس لیے اندازے سے معاوضہ دیا۔ اس کے تاثرات نے بتا دیا کہ وہ اس کی توقع سے بڑھ کر ہی تھا۔ کپڑوں کی شاپ شفقت کے بھائی کی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اپنا معاوضہ وصول کرلیا تھا اور اپنے بھائی کا بھی بھلا کر دیا تھا۔ شفقت کا بھائی نزاکت خوش خلقی سے پیش آیا۔ میں نے اس سے تین شرٹس اور تین ہی پتلونیں لیں۔ اتفاق سے سب چیزیں میرے سائز کی مل گئیں اس لیے ان کو ٹھیک کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ شاپ سے نکلا تو زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور مانی کے لیے پیک کرا لیا۔ اسے معلوم ہوتا کہ میں نے باہر سے کھایا ہے تو وہ شور مچاتا۔ گھر میں موجود چیزیں اس کے حلق سے کہاں اترتیں؟ گزشتہ رات بھی اس نے منہ بنا کر کھایا تھا۔

میں واپس پہنچا تو مانی حسب توقع بھوکا بیٹھا تھا پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ”شوبی بھائی یہ آپ ہیں .... جاتے وقت تو کچھ اور تھے۔“

”بس بھائی ایسے ہی دل چاہا حلیہ بدل لیا۔ یہ خواتین بھی تو بیوٹی پارلر جا کر حلیہ بدل لیتی ہیں بعض اوقات بے چارہ شوہر بھی نہیں پہچان پاتا ہے خیر چھوڑو یہ بتاؤ کھانا کھایا۔“

”نہیں۔“ اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ”اتنی ساری چیزیں پڑی ہیں ان سے کیوں پیٹ نہیں بھرا؟“

”جناب میں ایسی چیزیں نہیں کھا سکتا .... صبح بھی بڑی مشکل سے ناشتا کیا تھا۔“

”یہی سوچ کر تمہارے لیے کھانا لے آیا ہوں ایک ہوٹل سے، مٹن کڑاہی ہے اور اسپیشل آئس کریم ہے۔ آئس کریم فریج میں رکھ دی ہے۔“

مانی اچھل کر بھاگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے سجا کر لایا اور کھانے میں مصروف ہوگیا۔ اس کی مصروفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے وسیم کو کال کر کے تازہ ترین احوال لیا اور اسے یہاں کے احوال سے آگاہ کیا۔ اس نے فاضلی کے بارے میں بتایا کہ اسے اب تک تین ڈوز دیے جا چکے تھے۔ فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اب ایک کام اور کرو.... ہو سکے تو نادر کو بھی اٹھا لو۔ عبداللہ نے اس کا موجودہ ٹھکانا دیکھ لیا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ مرشد پر ایک وار اور ہوگا۔“

”مرشد کو نادر کی پروا نہیں ہے لیکن اسے خاندان کے دوسرے لوگوں کی پروا یقیناً ہوگی وہ سب سے ایک ساتھ نہیں لڑ سکتا۔“

”ہم ایسا تاثر دے سکتے ہیں کہ نادر کو مرشد نے غائب کرایا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن نادر کے ساتھ مسئلہ ہے وہ مکمل معذور ہے اور اسے کسی کی دیکھ بھال کی ضرورت ہوگی۔“

”میرا خیال ہے تمہارے آدمی اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔“

”ہاں یہ بہت مشکل بھی نہیں ہے اسے کب اٹھانا ہے؟“

”تم دیکھو عبداللہ کا کوئی آدمی اس کے ٹھکانے کی نگرانی کر رہا ہے اس سے بات کرو اور اپنے آدمی لگا دو اگر موقع آسان لگے تو لگے ہاتھوں سے اسے اٹھوا لو۔ ایسا نہ ہو کہ مرشد پہل کر جائے پہلے اس کے ساتھ سیکورٹی تھی لیکن اب وہ ایسے ہی رہ رہا ہے۔“

”میں جلدی کرتا ہوں۔“

وسیم سے بات کر کے میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا۔ ”افنان احمد کی نگرانی کرنے والوں کی طرف سے کوئی اپ ڈیٹ آئی ہے؟“

”نہیں جب میرے آدمی یہاں پہنچے تو مکان خالی تھا، افنان احمد کہیں چلا گیا ہے۔“

”کہیں چلا گیا ہے؟“

”ہاں ابھی مکان خالی ہی ہے اور باہر تالا لگا ہے۔“

”ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی ہے ممکن ہے کسی کام سے گیا ہو۔“

”ممکن ہے لیکن خاص بات یہ ہے جو کلٹس ہم نے کھڑی دیکھی تھی وہ بدستور وہاں موجود ہے۔“

”ممکن ہے وہ ٹیکسی یا کسی اور ذریعے سے گیا ہو۔ اگر شہر کا کام ہو تو بہت سارے لوگ پارکنگ کے مسئلے کی وجہ سے گاڑی لے جانا پسند نہیں کرتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ عبداللہ بولا۔ ”افنان احمد نے آپ کو بتایا تھا کہ اس کا بینک اکاؤنٹ کس بینک میں ہے؟“

میں نے نفی میں جواب دیا۔ ”نہیں اس نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔ مجھے بھی پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔“

”اب مجھے دال میں پہلے سے زیادہ کالا لگ رہا ہے۔“

”فکر مت کرو یار دال میں جو بھی کالا ہے وہ جلد سامنے آجائے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”وسیم سے بات کرلو.... میں نے اسے نادر کو اٹھانے کا مشورہ دیا ہے۔“

”میں خود بھی یہی مشورہ دینا چاہ رہا تھا خوش قسمتی سے نادر اس وقت بے یار و مددگار ہے اسے اٹھانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا وہ مرشد کے خلاف بہت کچھ بتا سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے میرا تو خیال ہے اسے اس طرح اٹھاؤ کہ اسے شبہ ہو اسے کسی سرکاری ایجنسی نے اٹھا لیا ہے۔ آخر مرشد ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔“

”میں ابھی وسیم سے بات کرتا ہوں میرا خیال ہے آج یا کل تک یہ کام ہو جانا چاہیے۔“

کمر کے زخم کی بینڈیج کو چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ مانی نے اسے تبدیل کر کے دوسری بینڈیج لگائی اور مجھے آگاہ کیا کہ زخم پر کھرنڈ آگیا ہے۔ میں چاہوں تو نہا بھی سکتا ہوں۔ مانی کو میں نے صابر والے کمرے میں جانے سے منع کیا تھا وہ اس کے بس کی چیز نہیں تھا۔ اسے خود جا کر کھانا دیا اور کچھ تسلیاں بھی دیں کہ جلد اسے رہا کر دیا جائے گا تب تک وہ صبر و سکون سے یہاں بیٹھے۔ مانی کھانے کے بعد اپنے دس ہزار ڈالرز والے پروجیکٹ میں مگن ہو گیا۔ میں نے سفیر سے معلوم کیا اس نے مونا کو واپس کوٹھی منتقل کر دیا تھا۔ یہ وہی بات ہوئی تھی کہ کھایا پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا بارہ آنے۔ جس کام کے لیے ہم نے اتنی بھاگ دوڑ کی اور رازداری سے کام لیا۔ وہ تو ہوا نہیں الٹا ہمیں نقصان اٹھانا پڑا تھا اگرچہ سب کی جان بچ گئی تھی مگر مونا اور سفیر کو بہت بڑا ذاتی نقصان اٹھانا پڑا تھا ہم اس غم میں ان کا بار بھی ہلکا نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ مونا اور سفیر نے مجھ سے بہت حوصلے سے بات کی تھی لیکن میں ان کی دلی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔

مرشد نے فون پر مجھ سے خاصی بے پروائی سے بات کی تھی لیکن فاضلی جیسے آدمی سے محرومی اس کے لیے چھوٹا نقصان نہیں تھا۔ اس کے پاس فاضلی جیسا ایک آدمی بھی نہیں تھا یہ فاضلی تھا جس نے کئی محاذوں پر مرشد کو کامیابی دلوائی۔ فاضلی کے بعد نادر بھی غائب ہو جاتا تو مرشد کی مشکلات میں یقیناً اضافہ ہو جاتا۔ اس کے گرد گھیرا تنگ کرنا ضروری تھا کیونکہ مرشد کے پاس وسائل اور آدمیوں کی کمی نہیں تھی وہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے لامحدود مدت تک یہ جنگ جاری رکھ سکتا تھا جب کہ ہم لامحدود جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمارے پاس نہ تو وسائل تھے اور نہ افراد جنہیں بے دریغ استعمال کیا جا سکے۔ میری اور میرے ساتھیوں کی مرشد جیسی فطرت بھی نہیں تھی۔ وہ وقت پڑنے پر اپنے سگے بھائی کو بے جان مہرے کی طرح پٹوا سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کی تو اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ لیکن ہمارے لیے ہمارا ایک ایک فرد قیمتی ہے۔ ایسے میں ضروری ہو گیا تھا کہ مرشد کو اس طرح گھیرا جائے کہ وہ کھل کر ہمارے خلاف کارروائی کرنا بھول جائے۔ اس کی حرکت کا اسے فوری اور بھرپور جواب ملا تھا وہ اپنے مقصد میں تو ناکام رہا تھا ساتھ ہی اپنے اہم ترین آدمی سے ہاتھ بھی دھو بیٹھا تھا۔

فتح خان اور کرنل کا مجھے علم نہیں تھا فی الحال دونوں منظر عام سے غائب تھے۔ شہلا کی موت یقیناً فتح خان کے لیے بڑا دھچکا ثابت ہوئی ہوگی کیونکہ وہ بریف کیس والے واقعہ میں برابر کی شریک تھی۔ ممکن ہے وہ اس کا سودا کرانے میں مددگار ہو۔ جیسے وہ فتح خان کے لیے ہیرے بیچنے کے لیے تیار ہو گئی تھی یقیناً اس میں اس کا حصہ ہوگا۔ بریف کیس کے معاملے کو شہلا دیکھ رہی تھی۔ اب وہ نہیں رہی تھی اور شاید فتح خان کو اس کی موت کا علم بھی نہیں تھا کیونکہ وہ دھوکے میں ماری گئی تھی۔ نہ صابر پر بھروسا کرتی اور نہ وہ اسے اتنی آسانی سے مرشد کے حوالے کرتا۔ اس کا امکان تھا کہ شہلا نے فتح خان کو صابر کے بارے میں بتایا ہو لیکن یہ فتح خان کیسے جان سکتا تھا کہ شہلا کی گم شدگی میں صابر کا کوئی کردار ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ شہلا کی گم شدگی کا علم ہوگا۔ اگر اسے علم بھی ہو جاتا کہ شہلا مرشد کے آدمیوں کے ہاتھوں ماری جا چکی ہے تب بھی اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ فتح خان کے لیے شہلا اہم ہستی نہیں تھی وہ صرف کاروباری لحاظ سے اس

کی شریک تھی۔ مرشد سے فتح خان پہلے ہی اپنے کزن شہباز خان کا خاصا انتقام لے چکا تھا۔ صرف شہلا کے لیے وہ مرشد پر چڑھ دوڑتا اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔

شام کے وقت وسیم کی کال آئی۔ ''میرے آدمی نادر کے گھر کی ریکی کر رہے ہیں ممکن ہے آج رات ہم اسے اٹھالیں۔''

''ٹھیک ہے عبداللہ کو میں نے کہا تھا کہ انداز ایجنسی والا رکھنا۔ نادر کو ہم پر شبہ نہ ہو۔''

''بالکل ایسا ہی کریں گے۔ اسے الگ رکھا جائے گا اور پوچھ گچھ بھی اسی انداز میں کی جائے گی۔''

''بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے مرشد کو شک نہ ہو کہ نادر کو اٹھانے والے ہم ہیں۔''

''اس کا پہلا شک ہم پر ہی جائے گا جناب۔''

''شک سے کچھ نہیں ہوتا بس تم کوئی ثبوت مت چھوڑنا اس کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟''

''بہ ظاہر دو ہی ملازم ہیں وہی اس کے اور گھر کے سارے کام کرتے ہیں۔''

''کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ مرشد نے اسے یوں چھوڑ دیا ہے۔ اگر مرشد نے اس سے قطع تعلق کر لیا ہے اور اس سے مالی وسائل بھی چھین لیے ہیں تو اس خاندان میں اور افراد بھی تو ہیں۔''

''میرا خیال ہے وہ بھی مرشد سے ڈرتے اور کھل کر اس کے سامنے آنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے کوئی نادر سے نہیں ملتا ہوگا اور نہ کسی نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی ہوگی۔''

''ظاہر ہے دولت اور گدی کے ساتھ بدمعاش مریدوں کی ساری طاقت بھی مرشد کے پاس ہے۔ وہ اس سے کھل کر لڑ نہیں سکتے ہیں لیکن اگر ہمارا تعاون حاصل ہو جائے تو وہ بھی ہمت کر سکتے ہیں۔ وہ اندر کے راز جانتے ہیں۔''

''وہ مرشد کے دشمن ہیں پیری مریدی کے اس دھندے کے دشمن نہیں ہیں۔ وہ ہمیں ایسا کوئی راز نہیں بتائیں گے جس سے اس کاروبار کو خطرہ ہو۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اگر ان کو یقین دلا دیا جائے کہ ہمیں صرف مرشد سے جان چھڑانی ہے۔ کیونکہ وہ ہماری جان چھوڑنے کو تیار نہیں ہے تب مجھے یقین ہے وہ ہم سے تعاون پر آمادہ ہو جائیں گے۔''

''لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہم اپنی طاقت کا کوئی مظاہرہ کر کے دکھائیں۔''

''کالی کوٹھی کی تباہی کافی نہیں ہے؟''

''نہیں مرشد نے اسے حادثہ ظاہر کیا ہے اور جلد یا بدیر پولیس بھی یہی رپورٹ کرے گی۔ ہمیں مرشد کے اڈے کو نشانہ بنانا ہوگا۔'' میں نے کافی مگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ وسیم سے گفتگو کے دوران میں نے یہ کام کر لیا تھا۔ مانی کے لیے بھی کافی نکالی اور دوسری چیزوں کے ساتھ اسے پہنچا دی۔ وہ کریم اور ڈھیروں چینی کے ساتھ کافی نوش کرتا تھا۔

''شہباز صاحب آپ نے وہ جگہ دیکھی ہے؟'' وسیم نے ہچکچا کر کہا۔

''ہاں اچھی طرح دیکھ لی ہے' مانی نے اس کی سیٹلائیٹ تصاویر نکال کر دکھائی ہیں۔''

''میرے آدمیوں نے وہاں کا سروے کیا ہے وہ مزار پر حاضری اور دکھی فریاد کے بہانے ہر جگہ گھوم پھر کر آئے ہیں۔ عورتوں والا حصہ بھی دیکھا ہے وہاں حفاظتی انتظامات بہت سخت ہیں۔ گارڈز کی تعداد جو جدید ترین اسلحے سے لیس ہیں سو سے بھی زیادہ ہے اور ان میں سے اکثر چھٹے ہوئے مجرم ہیں۔ وہاں جانا تو آسان ہے لیکن وہاں سے واپس آنا آسان نہیں ہوگا۔''

''کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا ہے۔ اگر صحیح پلاننگ کی جائے تو ہم جا بھی سکتے ہیں اور واپس بھی آسکتے ہیں۔''

''درست پلاننگ میں تھوڑا وقت لگے گا۔''

''یار مجھے کون سی جلدی ہے کہ میں آج کل میں مرشد کے اڈے کا رخ کروں گا یہ کام آرام سے اور خوب سوچ سمجھ کر کرنے والا ہی ہے۔ پہلے تو تم برادر خورد کو منتقل کرو اس کے بعد مرشد کا رد عمل دیکھتے ہیں۔''

فی الحال کوئی کام نہیں تھا اس لیے وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگا لیا۔ مانی نے دن میں مزے کر لیے تھے لیکن رات میں اسے وہی ٹن بند کھانا کھانا پڑا ساتھ میں فروزن پراٹھے تھے۔ میں نے دودھ اور سیریل کو ترجیح دی تھی کیونکہ کئی دن سے ایسے ہی کھانے کھا رہا تھا۔ مانی نے سیریل کے پیالے کو دیکھا۔ ''شوبی بھائی آپ یہ کیسے کھا لیتے ہیں؟''

''بس مجھے عادت ہے جب میں اسلام آباد آیا تو اکیلا تھا اور کچھ بنانا نہیں آتا تھا باہر سے میں کم ہی کھاتا ہوں اس لیے زیادہ تر اس قسم کی چیزوں پر گزارہ ہوتا تھا۔ میں تو سادہ دلیا نمک مرچ کے بغیر بھی شوق سے کھا لیتا ہوں۔''

مانی کانپ اٹھا۔ ''میں شاید بھوک سے قریب المرگ ہوں تو اس صورت میں جان بچانے کے لیے یہ چیزیں کھا سکتا ہوں ورنہ تو.....''

''ٹھیک کہا تم نے برخوردار جان بچانے کے لیے سب حلال ہے۔ یہ کیا کبھی ایسا موقع آیا تو تم لکڑ پتھر، چھپکلیاں اور چوہے تک کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ گے۔''

مانی نے منہ بنایا۔ ''جی نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔''

کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ ''وہ آپ کا منتقل ہونے کا پروگرام تھا؟''

''ہاں بات ہو گئی ہے چابی یکم کو ملے گی۔''

''فرسٹ اپریل۔'' مانی نے سوچ کر کہا۔ ''کہیں وہ آپ کو بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے؟''

''عبداللہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے اس نے اپنے آدمی ان کے پیچھے لگائے ہیں اگر ایسا کچھ ہوا تو پتا چل جائے گا۔''

مانی مسکرانے لگا۔ ''میں تو ایسے ہی فرسٹ اپریل کی وجہ سے کہہ رہا تھا لیکن عبداللہ بھائی نے کیوں کہا؟''

میں نے مانی کو بتایا کہ کس طرح افنان احمد نے فائل لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ بولا۔ ''آپ نے اچھا کیا اسے فائل نہیں دی۔ ویسے مکان کیا اسی شخص کا ہے؟''

''ہاں اسی کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ مالک ہے اور بنوایا بھی اسی نے ہے۔''

''تب میں چیک کر سکتا ہوں کہ مکان بیچ اس کے نام پر ہے یا نہیں۔''

''تم چیک کر سکتے ہو؟''

''بالکل جناب..... اسلام آباد کی حد میں زمین اور جائداد کا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ ہو گیا ہے۔''

''ابھی چیک ہو سکتا ہے؟''

''کوشش کرتا ہوں دراصل رات میں جب سرکاری دفاتر بند ہوتے ہیں تو عام طور سے کمپیوٹر بھی بند کر دیے جاتے ہیں۔ اگر وہ آن ہوں گے اور انٹرنیٹ ایکسیز ہو گی تب ہی کام ہو سکے گا ورنہ کل صبح تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب کمپیوٹر آن ہوں گے اور ان کا انٹرنیٹ بھی کام شروع کرے گا۔''

''چلو برخوردار ابھی چیک کرو اگر کمپیوٹر آن ہیں تو۔''

کھانے کے بعد مانی نے نہایت شرافت سے برتن اٹھائے اور دھو کر بھی رکھے آخر میں کچن بھی صاف کیا تھا۔ وہ کچرے کا شاپر اٹھا کر باہر پھینکنے جا رہا تھا کہ میں نے روک دیا۔ ''بس یار جتنا کر دیا ہے اتنا کافی ہے۔ تمہیں ویسے بھی ان کاموں کی عادت نہیں ہے۔''

''نہیں جی یہ سفیر بھائی نے بدنام کیا تھا اور کچھ ان کی ضد میں نہیں کرتا تھا ورنہ میں امریکا سے پڑھ کر آیا ہوں وہاں رہنے والا لازمی اپنے کام خود کرنے کا عادی ہوتا ہے۔''

''پھر بھی شاپر میں پھینک آتا ہوں۔ تم جب تک اپنی کوشش کا آغاز کرو۔''

''میں پہلے کافی بنا لوں..... جب تک آپ آئیں گے میں بنا لوں گا۔ معاف کیجیے گا آپ بہت خراب کافی بناتے ہیں۔''

''کیونکہ مجھے تلخ کافی پسند ہے۔'' میں نے باہر جاتے ہوئے کہا ویسے یہ سچ تھا مانی بہت شاندار کافی بناتا تھا۔ میں بھی اسی نیس کیف گولڈ کی کافی بناتا تھا مگر مانی کی کافی کا ذائقہ مختلف ہوتا تھا۔ میں روڈ کے ساتھ رکھے ایک کچرے دان میں شاپر ڈال کر آیا تو مانی کافی بنا چکا تھا اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور کام میں لگ گیا۔ میں کاؤچ پر نیم دراز ہو گیا۔ مانی جو کر رہا تھا وہ بڑے ایل سی ڈی پر بھی آ رہا تھا اس نے کوئی ایسا سسٹم کر دیا تھا کہ کمپیوٹر کی اسکرین دونوں جگہ آتی تھی۔ اس نے اپنی کوشش کا آغاز کر دیا تھا۔ اس قسم کا سینٹرلائزڈ ریکارڈ بڑے کمپیوٹرز میں ہوتا ہے جن کو مین فریم کہتے ہیں اور وہ ہمہ وقت آن رہتے ہیں ان کو صرف کسی مرمت یا خرابی دور کرنے کے لیے بند کیا جاتا ہے۔ مگر شاید یہاں ان کو بھی عام پی سی کی طرح بند کر دیا جاتا ہو۔ مانی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد اس نے کوشش ترک کر دی اور مایوسی سے بولا۔

''ایکسیز نہیں مل رہی ہے۔''

''یعنی کمپیوٹرز کا نیٹ سے رابطہ نہیں ہے۔''

''عین ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ عام طور سے اداروں کے درمیان کونٹرا نیٹ استعمال ہوتا ہے یعنی اس میں صرف ادارے کے کمپیوٹرز ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ مگر اس نیٹ میں بھی دراندازی ممکن ہے یہاں شاید سرے سے کوئی کونٹرانیٹ ہی نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں تم دن میں کوشش کرنا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ صابر کو کھانا دے دیا تھا میں نے بچی ہوئی کافی بھی اسے ڈال کر دے دی۔ اس نے پوچھا۔

”تم مجھے کب جانے دو گے میری بچی پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا ہے۔“
”اس پر بھاری لمحات گزر چکے ہیں اور وہ جہاں ہے بالکل آرام سے ہے۔ اتنی محفوظ وہ تمہارے ساتھ نہیں ہوگی جتنی کہ اس وقت ہے۔ بہتر ہوگا کہ میرا کام کرنے کے بعد بھی تم اس وقت اسے وہاں سے لینا جب کسی محفوظ ٹھکانے کا انتظام کرلو۔“
”میرے پاس محفوظ ٹھکانے ہیں لیکن میں شازیہ کو لے کر باہر چلا جاؤں گا۔“
”یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“ میں نے کہا اور برتن اٹھا کر باہر آگیا۔ اپنے کمرے کی طرف آیا تھا کہ وسیم کی کال آگئی۔
”جناب ہم نادر کے گھر میں داخل ہونے والے ہیں۔“
”کس طرح داخل ہوگے؟“
”براہ راست گیٹ سے.... ہم نادر سے بات کرنے کے بہانے اندر داخل ہوں گے اور پھر اسے ساتھ لے جائیں گے اس کے نوکر بعد میں یہی بتائیں گے کہ نادر کو لے جانے والے ایجنسی والے تھے۔“
”وہ تمہیں پہچانتا ہے۔“
”میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا میرا ایک آدمی لیڈنگ رول ادا کرے گا۔“
”کتنے آدمی ہیں تمہارے ساتھ؟“
”دو گاڑیاں اور سات آدمی ہیں چھ اندر جائیں گے اور میں باہر رہوں گا۔“
”اگر نادر اور اس کے آدمیوں نے مسلح مزاحمت کی تو؟“
”تب اسلحے کا جواب اسلحے سے دیا جائے گا۔“
”لیکن خیال رہے نادر کو بچانا ہے۔“
”اصل خدشہ اس کے آدمیوں سے ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”میرے آدمی ان کو ہتھکڑیاں لگا کر بے بس کردیں گے۔“
وسیم یہ سب مجھے راستے میں بتا رہا تھا۔ اس نے اپنے موبائل کا اسپیکر فون آن کردیا اب مجھے آس پاس کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ وہ نادر کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچ گئے تھے وسیم کے آدمی اتر کر کوٹھی میں داخل ہو رہے تھے وہ دبے لہجے میں مجھے بتا رہا تھا کہ اس کے آدمی کیا کر رہے تھے۔ اس چھاپے میں اس نے وین استعمال نہیں کی تھی بلکہ دو سیاہ گاڑیاں لے کر گیا تھا جیسا کہ سرکاری آدمی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے آدمی ریڈیو سے منسلک تھے۔ وسیم کے آدمیوں نے اندر داخل ہوتے ہی نادر کے دونوں آدمیوں کو قابو میں کر لیا تھا اور اب کوٹھی کی تلاشی لیتے پھر رہے تھے۔ نادر اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے شور شرابا سن لیا تھا اور وہیں سے نوکروں سے پوچھ رہا تھا کہ یہ ہنگامہ کیسا ہے؟
بالآخر وسیم کے آدمی نادر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وسیم کے لیڈنگ مین نے کھردرے لہجے میں نادر کو بتایا کہ بعض وجوہات کی بنا پر اسے سرکاری تحویل میں لیا جا رہا ہے۔ نادر یہ سن کر چیخنے چلانے لگا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ نہیں جائے گا لیکن جانے والے پوری تیاری کے ساتھ گئے تھے انہوں نے نادر کو بے ہوشی کا انجکشن لگایا اور پھر اسے بوری کی طرح لاد کر گاڑی میں لے آئے۔ اس کے دونوں نوکر بے بس کردیے گئے تھے لیکن وہ ہوش میں تھے اور ساری روائی دیکھ رہے تھے۔ وسیم کے آدمی نے ان سے کہا کہ وہ شور نہ کریں اور اس بارے میں پولیس کو رپورٹ نہ کریں کیونکہ نادر کو لے جانے والے خود بھی سرکاری آدمی تھے جلد اسے چھوڑ دیا جائے گا تب تک وہ آرام سے بیٹھیں اور چاہیں تو نادر کے بھائی کو اطلاع کردیں۔
وسیم اور اس کے آدمیوں نے خلاف توقع یہ کام بہت آسانی سے کرلیا تھا جب کہ مجھے توقع تھی کہ وہاں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نادر تر نوالہ نہیں تھا اس کا اتنی آسانی سے ہاتھ آجانا حیران کن تھا۔ مرشد نے سچ مچ اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ عبداللہ اور اس کے آدمی بیک اپ میں موجود تھے کہ کوئی غیر متوقع صورت حال درپیش آئے تو وہ مداخلت کریں۔ مگر اس کا موقع ہی نہیں آیا وسیم آرام سے نادر کو حاصل کر کے حویلی کی طرف روانہ ہوگیا جہاں پہلے ہی اس کے لیے ایک کمرا تیار کرلیا گیا تھا۔ میں نے عبداللہ کو کال ملائی اور ہم کانفرنس میں آگئے۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔ ”افنان احمد کی نگرانی کی کوئی رپورٹ ملی؟“
”ہاں رپورٹ ملی ہے وہ رات آٹھ بجے واپس آیا تھا اور اب تک گھر میں ہے۔“
”شاید اس کے بارے میں ہمارا شبہ غلط ہے۔“ میں نے کہا پھر ہنسا۔ ”ویسے مانی بھی اپریل فول والی بات کہہ رہا تھا۔ اس نے انٹرنیٹ سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ مکان افنان احمد کے نام پر ہی ہے یا نہیں لیکن رات کے وقت سرکاری کمپیوٹر بند ہوتے ہیں۔“
وسیم نادر کو لے کر شہر سے نکل گیا تھا عبداللہ اطمینان کرنے کے بعد کہ کوئی اس کے پیچھے نہیں واپس لوٹ گیا تھا

اور آدھے گھنٹے بعد نادر بھی حویلی پہنچ چکا تھا اسے اسپیشل کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ فاضلی کے بارے میں بتایا کہ اسے چوتھا ڈوز بھی دیا جاچکا تھا اور وہ خاموش پڑا تھا۔ میں نے ٹی وی آن کیا مجھے امید تھی کہ مرشد علی نادر کی گم شدگی کی اطلاع پاتے ہی میڈیا پر واویلا کرے گا کہ اس کے بھائی کو ایجنسیوں نے اٹھالیا ہے تاکہ اسے حکومت کا ساتھ چھوڑنے پر مزہ چکھایا جائے۔ مگر رات بارہ بجے تک ایسی کوئی بریکنگ نیوز نہیں آئی تھی اس لیے میں سونے اوپر آگیا۔ مانی اپنے کام میں ایسا گم تھا کہ اسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اکیلا ہے ورنہ وہ مجھے اوپر نہیں جانے دیتا۔ کاؤچ پر سونے سے میری کمر میں کبڑے عاشق جیسا خم نکل آیا تھا اور صبح میں بڑی مشکل سے سیدھا ہوا تھا اس لیے آج رات میرا وہاں سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ زخم بھر گیا تھا اور میں نے دو دن بعد غسل کیا تو طبیعت کو بڑی فرحت ملی تھی۔
اگلا دن بھی خاموش اور بور گزرا تھا۔ بس وسیم نے نقاب پہن کر نادر سے ذرا پوچھ گچھ کی تھی اور اسے ڈرایا دھمکایا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے غیر قانونی کاموں میں برابر کا شریک ہے۔ مگر ابھی نادر کا حوصلہ برقرار تھا۔ فاضلی کو ڈوز دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ بوریت دور کرنے کے لیے میں نے دوپہر کا کھانا باہر کھانے کا فیصلہ کیا جس کی مانی کو بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ جب سے وہ یہاں آیا تھا اسے باہر نکلنے کا موقع کم ملا تھا۔ ہم نے پی سی اسلام آباد کا بوفے آزمانے کا فیصلہ کیا جس کی بڑی تعریف سنی تھی۔ مانی مزید خوش ہوا تھا کہ اس طرح اسے اپنی پسند کی ہر چیز کھانے کا موقع ملے گا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اتنا کھالیا کہ اس کے لیے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے اب تمہیں اسپتال لے جانا پڑے گا تمہیں لازمی ہیضہ ہوجائے گا۔“
”ہوجائے۔“ اس نے کولڈ ڈرنک پیٹ میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ ”بھوکے مرنے سے کھا پی کر مرنا بہتر ہے اور سمجھ لیں میں نے رات کا کھانا بھی ابھی کھالیا ہے ورنہ گھر میں وہی سب چیزیں زہر مار کرنا پڑیں گی جو آپ اٹھالائے ہیں۔“
”ہوٹل والے تمہیں بوفے میں دیکھ کر پچھتا رہے ہوں گے۔“
”کہاں جناب میرے جیسے تو ایک دو ہوتے ہیں ورنہ زیادہ تر ایسے آتے ہیں جو سلاد کے پتے براؤن بریڈ میں رکھ کر چکھتے ہیں۔“ مانی نے سامنے والی میز پر بیٹھی لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جو سچ مچ اسی قسم کا پرہیزی کھا رہی تھیں۔ وہ پہلے ہی وزن بڑھنے کے اندیشوں سے دبلی ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کے دبلاپے کا اندازہ ان کے لباس سے ہوتا تھا جس میں کفایت شعاری مقصود تھی یا دکھاوا۔ میں نے مانی سے اتفاق کیا کہ ہوٹل والے خسارے میں نہیں رہتے ہوں گے۔ اٹھتے اٹھتے بھی مانی نے پشاوری آئس کریم کا ایک کپ خالی کیا تھا۔ وہ گاڑی میں ہی سو گیا اور کچھ دیر بعد باقاعدہ خراٹے لینے لگا تھا۔ اس کے خراٹوں سے بچنے کے لیے میں نے ریڈیو آن کیا اور ایک اسٹیشن لگا لیا جہاں سے موسیقی نشر کی جا رہی تھی۔ ایک گلوکار نے فیض کی نظم کا وہ حشر کیا تھا جو مرشد اپنے دشمنوں کا کرتا تھا۔ سازوں کے شور وغل میں الفاظ مشکل سے سمجھ میں آرہے تھے۔ بہرحال اس سے یہ ہوا کہ مانی کے خراٹوں نے سمع خراشی کم کردی تھی۔ فارم ہاؤس

گسماؤ سانانا
(Gusmao Xanana)

مشرقی تیمور کے رہنما اور صدر۔ انہوں نے قبل ازیں صحافی اور استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1978ء میں مشرقی تیمور کے مزاحمتی رہنما لوباٹو کو قتل کردیا گیا تو .... ان کی جگہ انہیں مزاحمتی رہنما بنا دیا گیا۔ 1992ء میں ان کو گوریلا سرگرمیوں کے نتیجے میں گرفتار کرلیا گیا۔ 1993ء میں عدالت نے انہیں عمر قید کی سزا سنائی جسے بعدازاں صدر سہارتو نے کم کر کے بیس سال کردی۔ عالمی برادری کے دباؤ پر انڈونیشیا کی حکومت نے 1999ء میں انہیں جیل سے گھر میں نظر بند کردیا، تاہم بعدازاں رہا کردیے گئے۔ رہائی کے بعد 20 ستمبر 1999ء کو جکارتا سے شمالی آسٹریلیا... چلے گئے، جہاں انہوں نے مشرقی تیمور کی جلاوطن حکومت قائم کی، مشرقی تیمور میں استصواب رائے کے بعد وہ وطن واپس آگئے اور 2002ء کو جب مشرقی تیمور کی آزادی کا اعلان ہوا تو انہوں نے اس کے پہلے صدر کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا۔

مرسلہ: نسیم حسن، جھنگ

پر وہ بہ مشکل گاڑی سے اترا اور اندر جاتے ہی کاؤچ پر ڈھیر ہو کر پھر خراٹے لینے لگا تھا۔ میں شدت سے بور ہو رہا تھا۔ عبداللہ کی کوٹھی کا چکر لگانے کا سوچا لیکن اسے رسک سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا۔ وسیم کے پاس جا سکتا تھا لیکن مانی اکیلا تھا اور بیتو بھی جا کر بیٹھ گیا تھا یہ اس کا سیانا پن تھا وہاں اسے اپنی پسند کے کھانے مل رہے ہوں گے تو وہ یہاں ٹن بند پیک کھانے زہر مار کرنے کیوں آئے گا۔

شام کو مانی سو کر اٹھا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "رات کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ کھل اٹھا۔ "دامنِ کوہ چلیں وہاں باربی کیو بہت اچھا ملتا ہے۔"

"تو تیار ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"ابھی سے؟"

"ہاں کچھ کام بھی ہے۔" میں نے کہا اور سوٹ کیس سے اچھی خاصی رقم نکالی تھی۔ صابر جس کمرے میں قید تھا وہاں سے وہ از خود نہیں نکل سکتا تھا پھر بھی میں نے نکلنے سے پہلے عبداللہ کو کال کر کے کہا کہ وہ بیتو کو بھیج دے۔ ہماری واپسی تک کوئی تو ہو۔ مانی پُر تجسس تھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے میں نے اسے راستے میں بتایا کہ میں اپنی آبائی حویلی کی ای سیکورٹی کروانا چاہتا ہوں اس کے لیے درکار آلات خریدنا تھے۔ مانی نے کہا۔

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔"

"دیکھو سیکورٹی ایسی کرنی ہے کہ کوئی عام آدمی بھی اس کے سسٹم کو سمجھ سکے اور استعمال کر سکے۔ یہ کام تمہیں وہاں جا کر کرنا ہے اور سمجھانا ہے اس کے بعد تم واپس آ جاؤ گے۔ دوسرے لوگ اس سسٹم کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔"

مانی اچھی طرح جانتا تھا کہ کمپیوٹر اور اس کے دوسرے آلات یہاں کہاں سے اور کس قیمت پر ملتے تھے۔ وہ مجھے ایک ایسی ہی مارکیٹ لے گیا۔ اس نے راستے میں مجھ سے حویلی کا سائز اور نقشہ خاصی حد تک سمجھ لیا تھا اس نے اسی لحاظ سے آلات کی خریداری کی اور ہر چیز کا بیک اپ بھی لیا۔ اس نے دو عدد لیپ ٹاپ لیے۔ اس کے علاوہ درجنوں کے حساب سے سیکورٹی کیمرے اور مائک لیے۔ کئی ایسے آلات لیے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور نہ یہ معلوم تھا کہ ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ مانی نے سارا سامان چیک کر کے لیا اور پھر ان کی اصلی پیکنگ میں پیک کرا لیا۔ یہ سارے آلات دو بڑے کارٹن میں آ گئے تھے اور جب ادائیگی کا مرحلہ آیا تو تقریباً آٹھ لاکھ کا بل دیکھ کر میں حیران ہوا تھا۔

"یہ سب اتنا مہنگا ہے؟"

"آپ کیا سمجھتے ہیں شوبی یہ سب جدید ترین چیزیں ہیں اور اگر میں نہیں ہوتا تو آپ کو دس سے بھی اوپر کی ملتیں۔"

"میں اعتراض نہیں کر رہا حیران ہو رہا ہوں۔ یہ مغرب والے ہم سے چند ڈالرز کے عوض خام مال اور دھاتیں خریدتے ہیں اور انہیں آلات کی شکل دے کر ہم سے ہزاروں ڈالرز وصول کر لیتے ہیں۔"

"یہی تو ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔ انہوں نے سائنس میں ترقی کر لی اور ہم پیچھے رہ گئے اس لیے قیمت تو ہمیں ادا کرنی ہوگی۔" مانی نے پتے کی بات کی۔ "اب ان آلات کا کیا کرنا ہے۔"

"تم بیتو کے ساتھ جاؤ گے وہاں جا کر پہلے سے سیکورٹی پر موجود افراد کو یہ سسٹم لگا کر سمجھاؤ گے۔ اس میں تین چار دن لگ سکتے ہیں۔"

"یہاں کے سیٹ اپ کا کیا ہوگا؟"

"اسے ہم وائنڈ اپ کر دیں گے۔ تم کل صبح بیتو کے ساتھ نکل جاؤ ایاز بھی تمہارے ساتھ جائے گا وہ ڈرائیونگ کرے گا اور میری حویلی سے بھی واقف ہے۔"

"جیسا آپ کہیں۔" مانی نے کہا۔

ہم نے دامنِ کوہ کے ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ وہیں سے میں نے عبداللہ کو کال کر کے ایاز کو بھی بھیجنے کو کہا۔ بیتو پہلے ہی فارم ہاؤس جا چکا تھا مانی یہ سن کر اداس تھا کہ ہم یہ فارم ہاؤس چھوڑ رہے تھے۔ "میرا تو اس جگہ دل لگ گیا ہے۔ یہاں سکون اور آرام ہے۔"

"ہاں لیکن دشمن آ گئے تو یہی جگہ ہمارے لیے خوفناک ہو جائے گی۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔"

واپسی پر میں نے مری روڈ کی طرف جا کر مانی کو افنان احمد کا گھر دکھانے کا سوچا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگلی صبح مانی کو بیتو کے ساتھ روانہ کر دوں گا۔ اس کے بعد ہم افنان احمد سے مکان کی چابی لیں گے اور سامان یہاں منتقل کریں گے۔ مانی اور بیتو یہیں واپس آئیں گے۔ میں نے مانی سے کہا تو وہ بھی تیار ہو گیا۔ کھانے کے بعد ہم اس طرف روانہ ہو گئے۔ بیس منٹ بعد ہم افنان احمد کی کوٹھی کے سامنے تھے اس ... کا اوپری حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور صرف پورچ

میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ مجھے آس پاس عبداللہ کا آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ یقیناً کسی ایسی جگہ تھا جہاں سے ہم اسے نہیں دیکھ سکتے تھے خود میں نے احتیاطاً گاڑی ایک درخت کے نیچے روکی تھی اور اپنے سیاہ رنگ کے باعث یہ بالکل نزدیک آنے پر دکھائی دیتی۔ کوٹھی سے اس کا نظر آنا ممکن نہیں تھا۔ مانی نے کوٹھی کا معائنہ کیا اور بولا۔ "دیکھنے میں تو اچھی لگ رہی ہے اور جگہ بھی اچھی ہے یہاں بھی سکون ہے۔"

میں نے عبداللہ کو کال کی۔ "تمہارا آدمی کہاں ہے وہ افنان احمد کی کوٹھی کے پاس نظر نہیں آ رہا ہے۔"

عبداللہ نے پریشانی سے کہا۔ "میں خود اس سے دو گھنٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اس کا موبائل بند جا رہا ہے۔"

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ "میں کوٹھی کے سامنے ہوں اور یہاں سناٹا اور خاموشی ہے۔"

"میں اپنے آدمیوں کے ساتھ نکل رہا ہوں۔ میرے آنے تک آپ دیکھتے رہیے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے میں کچھ نہ کروں؟"

"آپ مانی کے ساتھ ہیں وہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے اور اکیلے اندر جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے میں تمہاری آمد کا انتظار کرتا ہوں لیکن حالات میں کوئی تبدیلی آئی تو مجھے ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے۔"

"وہ تو آپ خود سمجھدار ہیں۔" عبداللہ بولا۔ "اسے میری درخواست سمجھیں۔"

میں ہنسا۔ "ہاں بھائی ایسا ہی سمجھ رہا ہوں۔"

میں محسوس کر رہا تھا کہ اس بار جب میں واپس آیا تو میرے ساتھی مجھے کچھ احتیاط سے ٹریٹ کر رہے تھے۔ اگر میں کوئی قدم اٹھانا چاہتا تو وہ فوراً فکرمند ہو جاتے تھے کہ کہیں میں اکیلا ہی کچھ کرنے کے چکر میں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جاؤں۔ کچھ عرصے سے میں نے بھی اغوا ہونے کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا تھا اس لیے ان لوگوں کی تشویش برحق تھی۔ اس کے باوجود ان کا رویہ مجھے تھوڑا سا محسوس ہو رہا تھا وہ کچھ زیادہ ہی فکرمند تھے ان کے خیال میں، میں زیادہ خطرات مول لینے لگا تھا اور اپنی ذات سے بے پروا تھا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بعض اوقات حالات دیکھ کر مجھے خطرہ مول لینا پڑتا تھا اور کیونکہ وہ ان حالات کو نہیں سمجھ پاتے تھے اس لیے وہ میرے ردِعمل کو بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی عبداللہ نے ڈھکے چھپے انداز میں درخواست کی تھی کہ میں خود سے پنگاہ لینے کی کوشش نہ کروں بلکہ ان کے آنے کا انتظار کروں۔ میرا خود بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مانی یہ گفتگو سن کر سہم گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"کوئی خطرے والی بات ہے تو مجھے اجازت دیں میں ذرا محفوظ فاصلے پر چلا جاؤں؟"

"خطرے والی بات ہے برخوردار لیکن تم کہاں جاؤ گے؟"

"وہ سامنے والے ٹیلے پر چلا جاتا ہوں وہاں گولیوں سے بچ جاؤں گا۔"

"موت سے بچ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ممکن ہے وہاں پہلے سے دشمن کا کوئی آدمی موجود ہو جو تمہارا کام تمام کر دے۔"

مانی جو گاڑی سے اترنے کی تیاری کر رہا تھا فوراً واپس سیٹ پر آ گیا اور رونے والے لہجے میں بولا۔ "آپ نے مروا دیا جی، مجھے مکان دکھانے لائے تھے یہاں دوسرا چکر شروع ہو گیا ہے۔ اب میرا کیا ہوگا؟"

"ابھی سے کیوں مرے جا رہے ہو۔ ابھی تو کچھ ہوا نہیں ہے۔"

"جب ہوگا تب رونے سے فائدہ؟" وہ بولا۔ "پہلے کیوں نہ رو لوں۔"

"ٹھیک ہے رو لو۔" میں نے اجازت دے دی۔ "بس آواز گاڑی سے باہر نہ جائے ممکن ہے کوئی دشمن آس پاس ہو تمہارے سروں پر کھنچا چلا آئے۔"

اس کے بعد مانی کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ میں نے پستول نکال لیا تھا۔ عبداللہ کے آدمی کا غائب ہونا نہایت تشویش ناک تھا اگر وہ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ اس سے نہ جانے کیا کچھ معلوم کر چکے ہوں گے۔ سب سے اہم بات افنان احمد کی نگرانی کرتے ہوئے اس کا غائب ہونا ثابت کرتا تھا کہ افنان احمد درست آدمی نہیں تھا۔ عبداللہ کا آدمی کوئی عام شخص نہیں تھا وہ تربیت یافتہ اور لڑنے بھڑنے کا ماہر ہوگا اس کا مسلح ہونا بھی یقینی تھا اس پر قابو پانے والے عام لوگ نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ مکان کے اتنے پاس گاڑی کھڑی کرنا بھی مناسب نہیں تھا بے شک یہاں تاریکی تھی اور گاڑی کا رنگ بھی سیاہ تھا لیکن کوئی آ جاتا تو اسے گاڑی نظر بھی آ سکتی تھی، میں نے مانی سے کہا۔ "برخوردار نیچے اترو۔"

وہ اچھل پڑا۔ "کیوں جناب؟"

"میں گاڑی کو ذرا آگے چھوڑنے جا رہا ہوں تب تک تم یہاں کی نگرانی کرو۔"

"نہیں جی میں اکیلا کسی صورت نہیں رہوں گا۔" اس نے فوراً انکار کر دیا۔

"دیکھو اگر میں گاڑی چھوڑنے گیا اور اس دوران میں یہاں کوئی آیا یا گیا تو ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا تم سامنے والی جھاڑیوں میں چھپ جاؤ وہاں سے دیکھتے رہو۔"

"نہیں جناب وہاں دشمن کا کوئی آدمی ہوا تو؟... آپ ہی نے تو کہا تھا۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا وہ میری ہی بات مجھے لوٹا رہا تھا میں نے بھنا کر کہا۔ "اچھا بیٹھو۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے روانہ ہو گیا میرا رخ مری کی طرف تھا۔ ایک منٹ بعد بائیں طرف سڑک کے ساتھ تھوڑی سے جگہ نظر آئی اور میں نے گاڑی وہیں روک دی۔ گاڑی میں ایک عدد چھوٹی سیمی آٹو میٹک رائفل تھی۔ میں نے رائفل اور اس کے فاضل میگزین نکال لیے۔ میں نے نیچے اترتے ہوئے مانی سے کہا۔ "اب تم یہیں ٹھہرو۔"

اس نافرمان نے پھر انکار کر دیا۔ "نہیں جناب اکیلا میں نہیں رہوں گا۔"

"میرے ساتھ مارے جاؤ گے یا مجھے مرواؤ گے بہتر ہے تم یہیں رکو اور گاڑی کے دروازے اندر سے لاک کر لو۔"

مانی مجبوراً رکا تھا میں اتر کر روانہ ہوا۔ عبداللہ کو کال کیے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور وہ کسی وقت بھی یہاں پہنچنے والا تھا۔ پیدل واپسی میں پانچ منٹ لگے۔ اگر اتنی دیر میں مکان میں کوئی آیا تھا یا نکل کر چلا گیا تھا تو میں اس سے بے خبر تھا میں سامنے والے ٹیلے پر آیا یہاں بلندی سے مکان کا منظر واضح تھا۔ دوربین کے بغیر بھی سب نظر آ رہا تھا پورچ میں تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ اچانک پورچ کے سامنے مکان کا داخلی دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک شخص نکل کر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ عبداللہ کا آدمی تھا شبہ اس لیے کہ وہ صرف ایک انڈر ویئر میں تھا اور سر سے پاؤں تک زخمی تھا۔ اس کا رخ مین گیٹ کی طرف تھا۔ لیکن اسے گیٹ تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اندر سے افنان احمد برآمد ہوا اور اس نے ایک لمبی نال والے پستول سے فرار ہونے والے آدمی پر گولی چلائی۔ گولی کی آواز نہیں آئی پستول پر سائلنسر تھا۔ بھاگنے والا اچھل کر ڈرائیو وے پر گرا اور تڑپنے لگا۔ افنان احمد بھاگتا ہوا آیا اور اسے بازوؤں سے کھینچ کر اندر لے جانے لگا۔

عبداللہ ابھی تک نہیں آیا تھا میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر ٹیلے سے اتر کر ایسی جگہ سے سڑک کراس کی کہ کوئی کوٹھی سے دیکھ رہا ہو تو میں اسے نظر نہ آؤں پھر سیدھے راستے سے کوٹھی کی طرف جانے کے بجائے میں ٹیلے کے ساتھ ساتھ اوپر آیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف سات آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی اور اسے پھلانگنا یوں بھی آسان نہیں تھا کہ دیوار پر کانچ کے ٹکڑے لگے تھے۔ ایک جگہ دیوار کے ساتھ کچھ مٹی جمع تھی جس سے دیوار کی اونچائی کم ہو کر میرے ہاتھوں کی رینج میں آ گئی تھی۔ مسئلہ شیشوں کا تھا اگر میں ان کو توڑتا تو اس سے آواز پیدا ہوتی۔ سامنے گیٹ کے سوا اندر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں گھوم کر گیٹ کی طرف آیا اور ایک جھری سے جھانکا۔ بہ ظاہر اندر کوئی نہیں تھا۔ تیز روشنی میں ڈرائیو وے پر پھیلا اس شخص کا خون دکھائی دے رہا تھا جسے افنان احمد گولی مارنے کے بعد کھینچ کر اندر لے گیا تھا۔ میں نے ہمت کر کے گیٹ پھلانگ لیا اور فوراً باغ میں چلا گیا یہاں پورچ کے بلب کی روشنی بہت واضح نہیں تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مکان کے بائیں طرف آیا۔ یہاں کمروں کی کھڑکیاں تھیں اور سب بند تھیں ان کے پیچھے مکمل تاریکی تھی۔ میں مکان کے پچھلے حصے میں آیا یہاں بھی خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ یہاں ایک دروازہ تھا میں نے چیک کیا تو اسے کھلا پایا۔ یہ کچن کا دروازہ تھا اندر تاریکی تھی۔ میں بغیر آہٹ کے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔ چند لمحے سن گن لیتا رہا اندر بھی مکمل خاموشی تھی۔ میں آگے بڑھا مکان کا نقشہ میرے ذہن میں تھا ذرا آگے ڈائننگ روم تھا اور اس کے بعد ایک بیڈ روم اور پھر ڈرائنگ روم تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ ان سیڑھیوں کے نیچے بھی ایک دروازہ تھا لیکن نہ تو مجھے خیال آیا اور نہ افنان احمد نے اس بارے میں بتایا تھا۔ میں سیڑھیوں کے پاس آیا تو میں نے اس دروازے کو کھلا پایا اور اس کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں نیچے جاتی سیڑھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں کھلے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں وہاں اکیلا نہیں تھا۔ کوئی ڈائننگ ٹیبل کے پاس تاریکی میں ساکت کھڑا تھا۔ جیسے ہی میں نے اس طرف دیکھا تاریکی میں ایک شعلہ چمکا تھا۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(رانا حبیب الرحمٰن، گوجرہ کا جواب)

نیاز اکبر..........گجرات

اک کلی سے خوشبو کی رسم و راہ کافی ہے
لاکھ جبر موسم ہو یہ پناہ کافی ہے

امیر الحسن..........لاہور

ان سے ترکِ عاشقی
بھی کر گئے تو کیا

تطہیر الحسن..........لاہور

اس زمین کے بغیر
عرش پر گئے تو کیا

نازش ممتاز..........گوجر خان

اک خشمگیں سحر سے انا کا سبق پڑھا
اک بے چراغ رات سے حسنِ دروں لیا

مرتجس علی..........ایبٹ آباد

آج اگر کچھ لوگ سرشارِ مئے خیرات ہیں
کیا فقط امروز ہی امروز ہے فردا نہیں

(فریحہ ادریس، لاہور کا جواب)

شکور حسین..........چنیوٹ

نیند آئے تو اچانک تری آہٹ سن لوں
جاگ اٹھوں تو بدن سے تری خوشبو آئے

(مدحت بانو، سیالکوٹ کا جواب)

محمد سعید قاسمی..........ڈلوال

زندگی میں آ گیا جب کوئی وقتِ امتحان
اس نے دیکھا ہے جگر بے اختیارانہ مجھے

(اکبر حسن رند، ڈی جی خان کا جواب)

نوشاد اسلم..........بہاولپور

لہولہان بھی ہے اور تشنہ کام بھی ہے
مری زمین کی خصلت بھی کربلا کی ہے

(شمع محسن کا جواب)

طارق خواجہ..........لاہور

نئی تہذیب کے ہاتھوں میں ہیں پتھر طارق
تو نے شیشے کے دریچوں کو سجا رکھا ہے

(سندس رفیق کراچی کا جواب)

اختر صبا..........بنوں

ادا قاتل، نگاہ قاتل، بیاں قاتل زباں قاتل
تمہارا سلسلہ شاید کسی قاتل سے ملتا ہے

(مقبول خالد کا جواب)

ڈاکٹر محمود فیضانی..........ایبٹ آباد

نام کر جاتے ہیں دنیا میں جو خوش قسمت ہیں
کوئی مجنوں کی طرح کوئی ارسطو کی طرح

(زاہد وجدانی لاہور کا جواب)

سلیم کامریڈ..........کھاناں

اب کے برس بہار کی صورت بدل گئی
زخموں میں آگ لگ گئی گلزار ہنس پڑے

(مقیم زیدی کراچی کا جواب)

شیخ غلام حیدر..........کبیر والہ

ہوش و حواس تاب و تواں داغؔ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

(ابتہال سلیم، حیدر آباد کا جواب)

ندا فیصل..........کریم نگر گلگت بلتستان

یہاں ہے جو بھی یوسف خود زلیخاؤں کا گاہک ہے
روایت یہ نئی کیا جانے کس بازار سے آئی

(عصمت جہاں لاہور کا جواب)

منظر علی خان..........لاہور

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے

(اکبر حیات مخدوم، ملتان کا جواب)

عاصی اختر............ٹھٹھہ

وقت وہی محدود دل کہتا ہے دیکھ
آنکھ کہے مفقود دل کہتا ہے بول

(ارباز گل پشاور کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

اگر ملے فرصت تو میرے آئینہ دل کو بھی دیکھ
اس میں تیری صورتِ زیبا کے سوا کچھ بھی نہیں

(فتح علی میانوالی کا جواب)

اکبر حسن..........کمالیہ

کچھ اور زور تو عہدِ ہوس کا چلتا نہیں
بس امتحانِ تعیش میں ڈالتا ہے مجھے

نصرت ہالانی..........سکھر

کون سنائے، کون سنے
شہر ہے سارا قبرستان

فتح علی خان..........شنکیاری

کشش رکھتا نہیں اب پھول میرے واسطے کوئی
کہ مجھ تک ہر مہک اس زلفِ خوشبودار سے آئی

احمد حسن عرضی خان..........قبولہ شریف

کوئی تعویز دو ردِ بلا کا
محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے

نوازش مہتاب..........ٹنڈو آدم

کوئی لطیف اشارا نہ کوئی رمز کی بات
بس اس کے ہاتھ پہ حرفِ زباں کھلا رکھنا

جیہ روبی..........حاصل پور

کس راہ نکلنا ہے یا رخت اٹھانا ہے
پیروں میں سفر پہنا پلّو میں دعا باندھی

ابتہال سلیم..........حیدرآباد

کھیلنے سے جو مجھ کو روکتی تھی مٹی میں
اوڑھے مٹی کی چادر آج سو رہی ہے وہ

(قاضی شرف مصروف حمیدی کراچی کا جواب)

نصرت شاہین..........سرگودھا

یہ خوابِ پریشاں ہے کہ بینائی کی رفعت
میں جہل کی دیوار میں در دیکھ رہا ہوں

عتیق احمد..........فیصل آباد

یہ ذوق بے دلی تو اب ملا ہے ورنہ جب دیکھو
درِ دل پر تمناؤں کے سوالی نکلتے تھے

(پروفیسر فوزیہ انصاری کراچی کا جواب)

سید جلال..........گوجرہ

اے بزمیٔ کبھی مجمع خوباں میں کسی پر
آجائے اگر دل تو گنہگار نہیں ہے

امداد علی..........ساہیوال

آہی گیا ہے بیکاری میں جینا اب
ایک زمانے تک میں جب بے کار رہا ہوں

مہناز اسد..........کاموکی

اس طرح سے طاقِ ہجراں میں جلا ہوں رات بھر
بکھرا بکھرا سا گھر آنگن میں دھواں دن بھر رہا

فرید الدین عطاری..........شیخوپورہ

ایک اونگھ سی آئی تھی تہمت ہے کہ سوتے ہیں
ایک یاد کی کترن تھی وہ خواب میں لا باندھی

بشیر علی..........سیالکوٹ

اپنے کچھ کرنے نہ کرنے پر بھروسا کیا کریں
اصل میں ہم تو کسی کارِ دگر میں قید ہیں

نوشاد اسلم..........بہاولپور

اک تیرے جانے سے عالم نامکمل ہوگیا ہے
کل سے پرسوں تو نہ ہوگا آج سے کل ہوگیا ہے

سلیم یوسف زئی..........لاہور

اداس لوگ بڑھ رہے ہیں رفتہ رفتہ
اِک شہر ان کا بھی ہونا چاہیے

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 86

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک صفحی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 دسمبر 2012ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

اردو کے نامور شاعر، والد کا نام خواجہ علی بخش، دہلی کے رہنے والے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آئے۔ یہیں مذکورہ شاعر کی پیدائش ہوئی۔ نواب مرزا محمد تقی خان کے ملازم ہو کر ان کے ہمراہ لکھنو چلے گئے۔ وضع قطع سپاہیانہ تھی۔ بزرگوں میں پیری مریدی تھی۔ گیروا تہ بند باندھتے تھے اور کاکل رکھتے تھے۔

علمی آزمائش 84 کا جواب

بہزاد لکھنوی آفریدی النسل تھے۔ ایسٹ انڈین ریلوے میں ٹی ٹی آئی کی نوکری کی۔ 1932ء میں آل انڈیا ریڈیو اور 1942ء میں پنچولی اسٹوڈیو میں نوکری کی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے۔ 1952ء سے 1963ء تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ نغمہ نور، کیف و سرور، چراغ طور، کفر و ایمان، بتکدہ، وجد و حال، نغمہ روح، کرم بالائے کرم، ثنائے حبیب اور حکیم بڈھن مشہور تصنیف۔ کراچی ہی میں انتقال کیا۔

انعام یافتگان

1۔(ارشد ممتاز، لاہور) 2۔(زینب فاروقی، فیصل آباد) 3۔(کریم اللہ انصاری، حیدر آباد)
4۔(نواز اسدی، کراچی) 5۔ (ملک سراج الحسن، سیالکوٹ)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

جھنگ صدر سے عطا المصطفیٰ، صدیق حسین، محمد باقر رضا، واحد نیازی، بلند اقبال۔ واہ کینٹ سے محمد رفیق خان، حکیم اللہ خان، نازش ممتاز رفیق، عثمان خان، فہیم فرحت۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے محمد کریم مدنی، یوسف عطاری، ذیشان اسلم، خاقان خان۔ پشاور سے شیر نواز گل، سید علی خورشید، فرحت انصاری، مسلم اختر مسلم، نیاز احمد۔ چشتیاں سے معظم علی، اختر ہاشم،

عبدالخالق، اسرار پرویزی۔ کراچی سے خلش منظر، جاوید علی، وجیہہ الحسن، صرافروز، ملک سرفراز گوندل، نصرت فاروقی، فہیم احمد فہیم، تنویر حسین یدی، رجب علی مرزا، کلیم اللہ فہمی، نازش علی شاہ، منور علی، نجم الدین، حیدر علی احمد، کاوش اختر، عنایت مسیح، ابرار احمد، کہکشاں تسنیم، عارفہ سلطان، بختاور شاہ، نگار بھائی، فہد احمد، انصار حسین، وجاہت وکیل، عثمان خان، سید احترام حسین رضوی، سید عزیز الدین، تنویر احمد، خالد مظفر، مظفر محسن، افتخار احسن، قائم علی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، نذر علی برمانی۔ راولپنڈی سے نسرین اشرف، صفدر شیرازی، رانا فتح یاب، تنویر الحسن، سید محمد تقی، بخت خان۔ راولپنڈی سے نسرین اشرف، صفدر شیرازی، رانا فتح یاب، تنویر الحسن، سید محمد تقی، بخت خان، زید عباسی، خاقان خان، زبیر شاہ اشرفی، کائنات بانو، نرجس علی، زویا بخاری، فتح الاسلام خان، نسرین اشرف، ڈاکٹر سعادت علی خان۔ اسلام آباد سے خضر حیات عباسی، سعید اختر، محمد متین، ردا ممتاز، شاہین اشفاق، شہناز فیضی، بشیر فاروقی، محمد شہزاد، انور یوسف زئی، متین جاوید، انور یوسف زئی۔ لاہور سے تابش عطاری، ناصر حسین، زبیر اسلم، ممتاز الحسن، نعمان بٹ، ارشاد علی، عمیرا خاتون، ماہ جبین، نازش خان، ابرار احمد، انعام الحق، احمد علی اشرفی، نثار اختر، نعمان اشرف، ملک حامد، پروین چنا، نیاز احمد ملک، اکرم صدیقی، گل زیب زیبا، حدیقہ اشرف، ارباز خان، ممتاز الحسن، فہیم مرزا، نعمان اشرف، احمد بشیر بٹ، عقیل سندھو، خالد علی، برق ضیائی، مسرت اسلم (اپر جنگ نگر) امجد بشیر ملک، امجد شبیر ملک۔ ملتان سے لبنیٰ ظہیر، فاضل خان اچکزئی، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، سعیدہ جلال، قدوس بخش، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، نیاز احمد ملتانی، نشاط جہاں، بیگم احمد دین، ندا یونس، عزادار حسین، مہوش ندو خان، جنید شرف، توفیق سلطان، اشرف علی شیروانی، زبیر شاہ، نگار سلطانہ، ربریز بشیر، مناف سید، فضل الحق، جمیل ملک، بہار فر خان، کوکب جہاں، فہیم الدین فاروق، خالد ڈار۔ جہلم سے شاور ترمذی، عثمان علی شاہ، ملک شفاعت، کمال احسن کمال، رباز خان اچکزئی، اقبال حسن سید، ارباز خان اچکزئی، نگار بٹ، نصرت چنگیزی، خاقان اصعران، صالح شفیع، قتیل سید پوری، فیض اللہ خان، ارباز خان۔ سرگودھا سے خضر حیات، خلیق الحق، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، حیات خان، فصیح الزمان، نادر شاہ۔ شجاع آباد سے زوار حسین زیدی، سید عباس علی، ارباز خان۔ حیدر آباد سے رام مل چوکھامل اسرانی، نصیر بھٹو، ممتاز خان، نظر علی بھٹو، نواز عثمان آبادی، تہمینہ سلطان، عبدالقیوم حسین خان، فراز انور، نواز علی زیدی، کاشان دولتانہ منیر احسن، صالح الحق، ذیشان اکمل، فیض انصاری، ملک نوروز، خیر محمد لاشاری۔ ساہیوال سے بدیع الزماں، عثمان احمد، فدا حسین، ممتاز فخر، امجد سروش، نسرین مجتبیٰ۔ حاصل پور سے اختر عباس، خالد بن ماجد، مہوش ملک، شیخ فخر الدین، ارباز ملک۔ ڈی جی خان سے محمد سہیل انجم، نصیر الدین، رانا وجدانی، زبیر ملک، کاشف زیدی۔ بہاولپور سے نوازش علی نوازش، اصرار صدیقی، دھیرومل۔ جہانیاں سے زبیر خان، خضر حیات، نیق احمد، صالح احمد، وزیر حسن، خوش خان۔ کوٹ ادو سے اظہر حسین سعید، نعمت اللہ۔ حسن ابدال سے سید محمد رضا، کرم الہیٰ۔ چوٹالہ سے فلک شاہ، ثناء احمد۔ پاک پتن سے سدرہ شفیق۔ جھنگ سے زویا رفیق، امجد علی انجم (احمد پور سیال) امتیاز حسن، ملک سرفراز، عجب گل، احباب زیدی۔ سکھر سے نعمان شیخ۔ پشاور سے نسیم فردوس، جویریہ بشیر نواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاالحق، جمال شاہ، نوید فہیم، محمود اکزئی، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ اوکاڑہ سے راجا احسن، سید احسن محمود، ملک صفدر، اظہر الدین، لیاقت علی مجاز۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، نرجس زیدی، مہ جبیں فلک، محمد رضا، اسلام الدین، نصیر اجتہادی، فراست اللہ، ام حبیبہ، ناصر خان، جاوید محمود ملک، فیض الحسن۔ اٹک سے ثناء جبران، زبیر اللہ خان، عرضیہ اقبال۔ حافظ آباد سے خالد جاوید خالد جاوید ٹیچر، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم محمد صدیق مستری۔ نواب شاہ سے ارحم شاہ، عزیز حسن، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، نوید انصاری۔ میر پور آزاد کشمیر سے نصرت رند، کاشف حسین۔ میاں والی سے نوشین احمد، حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ، نعمان نیازی۔ بھکر سے غازی شاہ، حافظ گل عمر۔ ٹنڈو آدم سے ناصر بگھیو، فاطمہ عباسی، خالد خان چوٹالہ۔ کمالیہ سے ناصر ملک۔ لیہ سے خالد یوسفی، راجا ابرار۔ گولارچی سے سید ایس ڈی ساغر فتح آباد، ایس صارم آرائیں، توحید آباد۔ نارووال سے محمد عدیل اختر (موٹے کلاں) انعام احسن شاہ جمال سے رانا محمد سجاد۔ ایبٹ آباد سے محمد خورشید جدون، میاں احسن۔ مردان سے محمد انور، باڑی چم ہوتی، معراج الدین۔ تربیلہ ڈیم سے صفدر حسین جعفری۔ چھچھ برہ زئی سے ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، محمد ایاز ایاز (چھچھ کونکے)۔ بیرون ملک سے شہزاد موسیٰ زبیری، احسن فاروقی (العین یو اے ای) نصیر خان ناصری (جدہ سعودیہ) حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنت اومان)

☆☆☆

خواب ہو گئے

جناب ایڈیٹر!
سلام مسنون
انسان کا خون کس طرح سفید ہوجاتاہے۔ یہ آپ کو میرے حالاتِ زندگی سے پتا چل جائے گا لیکن انسان جو کچھ کرتا ہے اس کی سزا اور جزا بھی اسے اسی دنیا میں مل جاتی ہے، خود میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے۔

اعجاز جوزی
(کراچی)

میں نے اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھایا ہی تھا کہ ابو گھر میں داخل ہوئے اور بولے۔ ”جوزی بیٹا! ذرا دکان پر چلے جاؤ۔ آٹے اور چاول کا ٹرک آنے والا ہے۔ تم اپنی نگرانی میں بوریاں اتروالو۔ یہ شکور تو اب کسی کام کا نہیں رہا۔“

میں سلگ کر رہ گیا۔ اس دن اتنی شدید گرمی تھی کہ سورج گویا آگ برسا رہا تھا۔ اس پر ابو کا یہ حکم کہ جاؤ بوریاں اترواؤ۔

”ارے، یہ ابھی تو اسکول سے آیا ہے۔“ امی نے کہا۔ ابھی تو اس نے کھانا کھا کر پانی بھی نہیں پیا ہے اور آپ......“

”میں نے پانی پینے کو کب منع کیا ہے۔“ ابو نے رومال سے چہرے کا پسینا خشک کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”پیدل مت جانا، میری سائیکل لے جانا۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے کپڑے بھی پسینے میں تر تھے۔

”اونہہ، سائیکل میں تو جیسے اے سی لگا ہوا ہے نا؟“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ پھر شائلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تو کیا کھڑی کھڑی دانت نکال رہی ہے۔ پانی پلا مجھے اور ٹھنڈا نہیں ہوا تو گلاس تیرے سر پر توڑ دوں گا۔“

شائلہ عام حالات میں مجھے ترکی بہ ترکی جواب دیتی تھی لیکن اس وقت وہ کچھ بولی نہیں۔

مجھے شروع ہی سے ابو کی اس کریانے کی دکان سے چڑ تھی۔ آٹا، دالیں اور چاول تولنا میرے لیے ایک مسئلہ تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ میں اکلوتا تھا۔ یہ کام تو کرنا ہی پڑتے تھے۔

ابو بہت شفیق باپ تھے۔ میری ہر فرمائش پوری کرتے تھے اور ہر طرح سے میرا خیال رکھتے تھے۔ میں دل سے ان کا احترام کرتا تھا لیکن دکان پر بیٹھنے سے میری جان جاتی تھی۔

ابو بے چارے حالات کی وجہ سے خود تو زیادہ نہیں پڑھ سکے تھے لیکن انہیں تعلیم کا بہت شوق تھا۔ اپنے اس شوق کی تکمیل وہ مجھے اور شائلہ کو بہترین اسکول میں تعلیم دلا کر کر رہے تھے۔

خاص طور پر میں تو شہر کے اس اسکول میں پڑھتا تھا جہاں بڑے سرکاری افسران، بیوروکریٹس اور صنعت کاروں کے بچے پڑھتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھے اس اسکول میں داخلہ کیسے دلایا تھا۔ اب میں میٹرک میں تھا اور اپنی کلاس کے ذہین ترین لڑکوں میں شمار ہوتا تھا۔

شائلہ پانی لائی تو آدھے سے زیادہ گلاس میں برف کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔

”میں نے تم سے پانی مانگا تھا یا برف کے ٹکڑے؟“ میں نے بھنا کر کہا۔

”بھائی؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ٹھنڈا پانی لاؤ۔“ شائلہ بھی تیز لہجے میں بولی۔

میں بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا ورنہ ابو پھر اپنے کمرے سے نکل آتے۔ میں نے پانی پیا اور سائیکل لے کر جھلستی ہوئی اس دوپہر میں نکل گیا۔ شدید گرمی میں سائیکل چلانا بھی ایک سزا سے کم نہیں ہے لیکن پیدل چلنا اس سے بھی بڑی سزا ہے۔

میں دکان کی طرف جاتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی بہترین نوکری کرلوں گا اور سب سے پہلے ابو سے یہ کریانے کی دکان بند کراؤں گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ اس دکان ہی کی بدولت میں شہزادوں کی طرح رہتا ہوں، اس سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے ہیں اور اس دکان سے میری اور شائلہ کی تعلیم کے بھاری اخراجات پورے ہوتے ہیں۔

دکان پر اس تپتی ہوئی دوپہر میں بھی اچھا خاصا رش تھا۔ کاؤنٹر پر شکور بیٹھا تھا۔ اس میں ایک خوبی تھی جس سے مجھے حیرانی بھی ہوتی تھی کہ وہ گاہک کو دیے گئے تمام مال کا حساب زبانی لگالیا کرتا تھا۔ دکان میں تین لڑکے ملازم تھے۔ وہ گاہکوں کو سامان دے کر کاغذ پر کیلکولیٹر کے ذریعے حساب کرتے تھے، پھر فائنل چیکنگ کے لیے شکور کو بتاتے جاتے تھے۔ آٹا ایک سو بیس روپے، دال 32 روپے، شکور فوراً کہتا تھا ایک سو باسٹھ، مرچیں بچپن روپے، شکور فوراً کہتا دو سو سترہ روپے، صابن پینتیس روپے، شکور کہتا دو سو باون روپے!

اس طرح وہ پورا حساب سیکنڈوں میں زبانی کر دیا کرتا تھا۔ حیرت تو مجھے اس وقت ہوتی تھی جب کسی لڑکے کے حساب میں کوئی غلطی نکلتی تھی۔ کیلکولیٹر تو وہی بتائے گا جو آپ اس سے پوچھیں گے۔ اس میں غلطی تو حساب کرنے والے ہی کی ہوتی تھی۔ شکور ہزاروں روپے کا حساب زبانی ہی کر دیا کرتا تھا۔

مجھے دیکھ کر شکور نے اپنی کرسی میرے لیے چھوڑ دی۔

میں نے اسے سلام کیا اور کہا۔ ”ارے چاچا، آپ بیٹھیں، مجھے شرمندہ مت کیا کریں۔“ ابو کے بعد شکور دوسرا آدمی تھا جس کی میں دل سے عزت کرتا تھا۔ وہ میری پیدائش سے پہلے سے اس دکان میں کام کر رہا تھا۔ انتہائی دیانت دار اور فرض شناس آدمی تھا۔ ابو اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔

”ارے بیٹھو جوزی میاں!“ شکور نے کہا۔ ”تم ابھی باہر سے آئے ہو۔ ذرا یہاں بیٹھ کر پسینا خشک کرلو۔“ شکور کی کرسی بریکٹ فین کے بالکل سامنے تھی۔

میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ ٹرک سے بوریاں اتروانے کا کام شکور مجھ سے کہیں زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا ہے لیکن اگر وہ یہ کام چھوڑ کر گودام کی

طرف جاتا تو یہ کام کون کرتا؟ گودام دکان کے پیچھے ہی تھا۔

ابو اکثر مجھے بتایا کرتے تھے کہ تمہارے دادا کے انتقال کے بعد میں نے بہت برا وقت گزارا ہے۔ دادا ابو کسی سرکاری دفتر میں چپراسی تھے لیکن مسلم لیگ کے کٹر حامی اور قائداعظم کے دیوانے! مسلم لیگ ہی کی وجہ سے انہوں نے اپنی اس سرکاری نوکری پر لات ماردی تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ کراچی چلے آئے اور مسلم لیگ کے رضاکاروں میں شامل ہوگئے۔

پاکستان میں بھی انہیں وہی سرکاری نوکری مل گئی۔ سر چھپانے کو حکومت کی طرف سے گورا قبرستان کے ساتھ وسیع وعریض میدان میں مہاجرین کے لیے ایلومینیم کوارٹرز بنائے گئے تھے۔

مجھے تو سوچ کر ہی جھرجھری آتی ہے۔ ایسے مکانات جن کی چھتیں بھی ایلومینیم کی چادروں کی ہوں اور دیواریں بھی! وہ گرمی میں تو تندور بن جاتے ہوں گے۔

اس ٹین کے مکان میں دادا ابو کی شادی ہوئی۔ اس مکان میں میرے تایا امان علی پیدا ہوئے۔ تایا جان ابو سے سات آٹھ سال بڑے تھے۔

پھر دادا جان نے بھاگ دوڑ کرکے اور اپنے محکمے کے افسرانِ اعلیٰ کی خوشامد کرکے کسی نہ کسی طرح جیکب لائن میں ایک کوارٹر الاٹ کرالیا۔ ابو کی پیدائش اسی کوارٹر میں ہوئی تھی۔

تایا جان کو پڑھنے لکھنے سے کوئی شغف نہیں تھا۔ سترہ سال کی عمر میں دادا ابو نے کہہ سن کر انہیں بھی اسی دفتر میں چپراسی لگوادیا کیونکہ وہ خود ریٹائر ہونے والے تھے۔

ریٹائر ہونے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے ریٹائر ہوگئے اور وہ کوارٹر تایا جان کے نام منتقل ہوگیا۔

ابو ان دنوں ایک سرکاری اسکول میں چھٹی کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ دادا جان کے انتقال کے دو سال بعد دادی جان کا بھی انتقال ہوگیا۔

اس وقت تک وہ تایا جان کی شادی کرچکی تھیں اور وہ دو بچوں کے باپ تھے۔

دادی جان کے مرتے ہی تایا جان نے پہلا کام تو یہ کیا کہ ابو کو اسکول سے اٹھالیا اور بولے۔ ”میں اکیلا کمانے والا ہوں، مجھ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ اب تم بھی میرا ہاتھ بٹاؤ۔“

ابو نے ان کی بہت خوشامد کی کہ بھائی جی، مجھے میٹرک تو کرلینے دیں، پھر میں کوئی اچھی نوکری کرکے گھر کا سارا خرچ برداشت کرلوں گا۔ آپ اور بھابی تو بس بیٹھ کر کھایئے گا۔“

تایا جان نے ان کی ایک نہ سنی اور انہیں حکم دیا کہ تم کل سے صدر میں لڑکیوں کے اسکول کے باہر آلو چھولے اور چاٹ کا ٹھیلا لگاؤ گے۔

انہوں نے ٹھیلے کا بندوبست بھی کرلیا تھا اور تائی جان کو راضی بھی کرلیا تھا کہ وہ ابو کے لیے چھولے اور چاٹ وغیرہ تیار کردیا کریں۔

یوں ابو تعلیم چھوڑ کر لڑکیوں کے اسکول کے باہر آلو چھولے اور چاٹ کا ٹھیلا لگانے لگے۔

چند ہفتے تو تائی نے ابو کو آلو چھولے اور چاٹ بناکر دی، پھر وہ ٹال مٹول کرنے لگیں کہ بچے چھوٹے ہیں، گھر کے کاموں سے وقت نہیں ملتا وغیرہ وغیرہ۔ پھر ابو نے اپنے طور پر یہ سب کچھ بنانا سیکھ لیا۔

اب اسے ابو کے ہاتھ کی لذت کہیں یا ان کی صفائی ستھرائی۔ ان کا ”کاروبار“ خوب چلنے لگا۔ انہوں نے دہی بڑے بھی لگانا شروع کردیے۔

بعض اوقات تو گرلز اسکول کی ٹیچریں اور ہیڈ مسٹریس تک ابو سے چاٹ، دہی بڑے اور آلو چھولے منگا کر کھائی تھیں۔

ابو ایک معقول رقم تایا کو دینے کے بعد باقی پیسے اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔

تائی اکثر کمیٹیاں ڈالتی رہتی تھیں۔ ابو اس بکھیڑے کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے پہلے تو اپنی رقم گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے پاس جمع کرائی۔ وہ ایک ہمدرد اور مہربان خاتون تھیں اور ابو کی شرافت اور دیانت داری سے متاثر تھیں۔ پھر انہوں نے ابو کو بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کا مشورہ دیا۔ ابو کو ان کا یہ مشورہ پسند آیا۔ وہ روزانہ کے اخراجات نکالنے کے بعد اپنی رقم بینک میں جمع کرنے لگے۔

اس دن ابو گھر میں داخل ہوئے تو ماحول میں کچھ کشیدگی تھی۔ ابو نے ہاتھ منہ دھویا اور تائی جان سے کھانا مانگا۔

تائی جان شاید پہلے ہی تایا سے لڑ جھگڑ کر بیٹھی تھیں۔ وہ تلخ لہجے میں بولیں۔ ”احسان، تم سمجھتے ہو کہ مہینے میں سو روپلی بھائی کو دے کر تم اپنے فرض سے سبک دوش ہوگئے۔ حالانکہ اس بھائی نے تمہیں باپ بن کر پالا ہے۔ تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھا ہے۔“

”تو آپ کے خیال میں سو روپے کم ہیں؟“ ابو نے حیرت سے کہا۔ ”اتنی تو بھائی جی کی تنخواہ بھی نہیں ہے۔ اتنے پیسے آپ کہاں خرچ کرتی ہیں؟“

اچانک تایا جان کمرے سے باہر نکلے اور تلخ لہجے میں بولے۔ ”اب تو اپنی بھابی سے خرچ کا حساب لے گا؟“

”بھائی جان...... میرا یہ مطلب نہیں تھا...... میں تو......“

”بس، بکواس بند کر! تجھے ٹھیلا اور سامان دلانے میں مقروض ہوگیا ہوں میں۔ تجھے اس کا بھی احساس نہیں ہے۔“

”مقروض؟“ ابو نے حیرت سے کہا۔ ”میں نے وہ رقم تو تین مہینے بعد ہی ادا کردی تھی۔ ویسے اگر آپ کو پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھے بتائیں، میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔“

”اے بھیا، تو ہم کیا تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے؟“ تایا نے ترخ کر کہا۔ ”چھوٹے چھوٹے تین بچوں کا ساتھ ہے۔ ان کے دودھ اور دوا دارو کا خرچہ، گھر کے اخراجات، لینا دینا، یہ سب کون کرتا ہے؟“

”میں تو اپنی بساط سے بڑھ کر آپ کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ابو نے کہا۔ ”ویسے آپ بتایئے، آپ کو کتنی رقم کی ضرورت ہے؟“

”تم کھانا تو کھالو۔“ تایا نے نرم لہجے میں کہا۔

ابو نے جیسے تیسے دو چار لقمے زہر مار کیے اور ہاتھ کھینچ لیا۔

”تم اپنا موڈ خراب مت کرو۔“ تایا نے کہا۔ ”آؤ میں تمہیں اچھی سی چائے پلاؤں، وحید کے ہوٹل میں بہت اچھی چائے ملتی ہے۔“

وہ ابو کو لے کر باہر نکل گئے۔

چائے پیتے ہوئے تایا جان نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم اپنی بھابی کی باتوں کا برا مت مانا کرو۔ وہ اصل میں آج کل کچھ زیادہ ہی پریشان ہے۔“

”بھابی پریشان ہیں؟“ ابو نے پوچھا۔ ”کیوں؟ مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں۔“

”ارے یار، اس کی بہن نفیسہ کی منگنی ٹوٹ گئی ہے، اچھی خاصی خوب صورت اور سگھڑ لڑکی ہے لیکن وہ لوگ کچھ زیادہ ہی لالچی تھے، جہیز کے نام پر لمبی چوڑی ایک لسٹ تھمادی۔ اب میرے سسر کے پاس کیا رکھا ہے۔ وہ بے چارے تو خود ملازمت پیشہ آدمی ہیں۔ بس اسی بات پر منگنی ٹوٹ گئی۔“

”ارے، یہ تو بہت برا ہوا۔“ ابو نے کہا۔

تایا جی نفیسہ کو خوب صورت اور سلیقہ مند کہہ رہے تھے، وہ ایک نمبر کی زبان دراز کام چور اور ہٹ دھرم تھی۔ شکل وصورت تو خیر اللہ تعالیٰ بناتا ہے لیکن وہ بے چاری خوب صورت تو کیا ہوتی، قبول صورت بھی نہیں تھی۔ گول مٹول اور موٹی تازی لڑکی تھی، رہی سہی کسر اس کی گہری سانولی رنگت نے پوری کردی تھی۔

”کس سوچ میں پڑ گئے احسان؟“ تایا نے کہا۔ ”اب اس مسئلے کو تم ہی حل کرسکتے ہو۔“

”میں؟“ ابو نے حیرت سے کہا۔ ”میں حل کرسکتا ہوں۔“

”ہاں میرے بھائی تم!“ تایا نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہاری بھابی کو تم سے بہت امیدیں ہیں۔ تم نفیسہ سے شادی کرلو۔ یوں بھی تمہیں اپنا گھر تو بسانا ہے۔ نفیسہ دیکھی بھالی باحیا اور باکردار لڑکی ہے۔“

ابو نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہوگئے۔

”تم کل تک اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔“ تایا نے کہا۔ ”پرسوں جمعے کا مبارک دن ہے، پرسوں ہم لوگ تمہارے لیے نفیسہ کا رشتہ مانگنے جائیں گے۔“

پھر تایا جان اٹھ گئے۔

ابو گھر آئے تو بہت دیر تک سوچتے رہے۔ وہ نفیسہ کی زبان درازیوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور اس کے پھوہڑ پن سے بھی۔ ساری رات انہوں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ وہ کروٹیں بدلتے رہے اور سوچتے رہے۔

فجر کی اذان ہوئی تو وہ معمول کے مطابق اٹھ بیٹھے۔ نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے بالآخر ایک فیصلہ کرلیا اور مطمئن ہوکر سوگئے۔

وہ ساری رات بے چین رہے تھے اس لیے وہ پھر ایسے سوئے کہ گیارہ بجے کے قریب انہیں تائی جی نے اٹھایا۔ وہ کرخت لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ”احسان! کیا آج کام پر نہیں جاؤ گے؟“

ابو کا معمول تھا کہ وہ چھولے رات ہی کو ابال لیا کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد وہ دہی بڑے بناتے، چاٹ کا سامان تیار کرتے اور ناشتا کرنے کے بعد گھر سے روانہ ہوجاتے تھے۔ اس دن تو انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

انہوں نے تائی سے کہا۔ ”بھابی! آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں کام پر نہیں جاؤں گا۔“

”ایسے روز روز چھٹیاں کرتے رہے تو کرچکے کام؟“ تائی نے درشت لہجے میں کہا۔

ابو نے شاید اس پورے عرصے میں یہ دوسری چھٹی کی تھی۔ وہ تو اتوار کو بھی اپنا ٹھیلا لے کر کلفٹن کی طرف نکل

جاتے تھے۔ وہاں بھی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔

وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تو تائی نے کہا۔ ”احسان! کل تمہارے بھائی جی نے تم سے کوئی بات کی ہے؟“

”بھائی جی نے تو مجھ سے بہت سی باتیں کی ہیں بھابی!“ ابو نے تجاہل سے کام لیا۔ ”آپ کس بات کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟“

”ارے بھئی، میں نفیسہ کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اپنے منہ سے کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگتا لیکن......“

”بھابی!“ ابو نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے۔“

”جیتے رہو بھیا!“ تائی خوش ہو کر بولیں۔ ”اپنا خون پھر اپنا ہوتا ہے، تمہارے بھائی جی نے بہت مان سے کہا تھا کہ احسان میرا بھائی ہے۔ وہ میری بات کبھی ٹالے گا نہیں۔“

”لیکن بھابی!......“

”بھئی، اب تو تمہیں کل بھی چھٹی کرنا پڑے گی۔“ تائی نے کہا۔ ”کل ہم لوگ تمہارا رشتہ لے کر جائیں گے۔ اب وہ لوگ کوئی غیر تو ہیں نہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلے چلنا۔ میں نے تمہارا عید والا نیا سوٹ دھوبی سے پہلے ہی دھلوا لیا ہے۔“

”بھابی، آپ میری بات بھی تو سنیں۔“ ابو جھنجلا کر بولے۔ ”میں نفیسہ سے شادی نہیں کروں گا“ ابو نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

تائی کو چند لمحے کے لیے سکتہ ہو گیا، پھر وہ درشت لہجے میں بولیں۔ ”کیا...... کیا کہا تم نے؟ تم نفیسہ سے شادی نہیں کرو گے؟“

”جی بھائی میں نے یہی کہا ہے۔“ ابو نے کہا۔

”تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ گلی گلی پھیری لگاتے ہو اور دماغ شہزادوں والے ہیں۔ تمہارے بھائی کو بہت ناز تھا کہ احسان میری بات ٹال ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے ہر طرح سے تمہارا خیال رکھا، اپنی اولاد کی طرح چاہا، تم انہیں اس کا یہ صلہ دے رہے ہو؟“

ابو کے دل میں تو آئی کہ کہہ دیں، بہت خیال رکھا، میں پڑھنے کے لیے ان کی خوشامدیں کرتا رہا، انہوں نے مجھے ایک ٹھیلا دے کر آلو چھولے بیچنے پر مجبور کر دیا۔ میں تو چودہ سال کی عمر سے کما رہا ہوں، اور انہیں کھلا رہا ہوں۔ انہوں نے کب میری مدد کی ہے؟

وہ کچھ بولتے تو تائی مزید تکرار کرتیں۔ وہ ان کی بات کا جواب دیے بغیر گھر سے باہر نکل آئے اور وحید کے ہوٹل پر بیٹھ گئے۔

”ارے یار احسان!“ وحید نے کہا۔ ”آج تم کام پر نہیں گئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں یار، طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ارے بھئی احسان!“ اچانک پیچھے سے انہیں کسی نے پکارا۔

ابو نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ان کا ایک کلاس فیلو امتیاز تھا۔ ابو تو پڑھائی چھوڑ چکے تھے۔ امتیاز نے میٹرک کر لیا تھا اور اب کسی سرکاری ادارے میں کلرک تھا۔

”کیسے ہو امتیاز؟“ ابو نے مسکرا کر کہا۔

”یار، ابھی وہی کولھو کے بیل والی زندگی ہے۔“ امتیاز نے کہا۔ ”صبح اٹھ کر دفتر جاؤ، دن بھر فائلوں میں سر کھپاؤ، اور شام کو تھکے ہارے، بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے واپس آؤ۔ اور ملتا کیا ہے، مہینے میں صرف ایک سو بیس روپے۔ ہم سے اچھے تو تم رہے۔ اپنا کام ہے، نہ وقت کی پابندی، نہ بسوں کے دھکے، نہ کسی افسر کی ڈانٹ ڈپٹ!“

اس لمحے ابو کو خیال آیا کہ واقعی میں ہر طرح سے امتیاز سے اچھا ہوں۔ تعلیم نہ ہونے کے باوجود سارے اخراجات نکالنے کے بعد تین چار سو کما لیتا ہوں۔

”چائے پیو گے؟“ ابو نے امتیاز سے پوچھا۔

”ہاں یار، چائے ہی پینے تو آیا تھا۔“

ابو نے امتیاز کے لیے چائے کے ساتھ بسکٹ اور کیک پیس بھی منگا لیے۔

چائے پیتے پیتے امتیاز نے اچانک کہا۔ ”یار احسان! تم مکان بنانے کے لیے پلاٹ خریدنا چاہتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“ ابو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”یار، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں کے ڈی اے میں ملازم ہوں۔ آج کل ڈرگ کالونی میں بہت سستے پلاٹ الاٹ ہو رہے ہیں۔ (ان دنوں شاہ فیصل کالونی کا نام ڈرگ کالونی تھا) ارے تمہارے پاس بیس ہزار روپے ہیں تو میں تمہیں بہت اچھا کارنر کا ساڑھے چار سو گز کا پلاٹ دلا سکتا ہوں۔“

”یار، اتنے پیسے میرے پاس کہاں ہیں۔ ویسے مجھے پلاٹ لینا تو ہے۔ دیکھ، کوشش کرتا ہوں کہ کہیں سے پیسوں کا بندوبست ہو جائے ورنہ پلاٹ تو الاٹ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں نہ سہی، کہیں اور سہی!“

”ارے یار، تمہیں اس جگہ کی ویلیو کا اندازہ نہیں ہے، یہاں سے ائرپورٹ ابھی نزدیک ہے اور ڈرگ روڈ بھی چند قدم کے فاصلے پر ہے، دو سال بعد یہی پلاٹ چالیس ہزار میں بھی نہیں ملے گا۔ تم دو ایک دن سوچ لو، کوشش کر لو، پھر مجھے بتا دینا۔“ امتیاز نے کہا اور جیب سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکال کر اس پر اپنے دفتر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھ دیا اور بولا۔ ”مجھ سے ملاقات کرنا ہو تو اس پتے پر آ جانا یا ٹیلی فون کر لینا۔“

امتیاز کے جانے کے بعد ابو کافی دیر تک سوچتے رہے کہ اب تک بینک میں میرے کتنے پیسے جمع ہو گئے ہوں گے۔ پھر وہ وہاں سے سیدھے اپنے بینک پہنچ گئے۔ بینک کا عملہ ابو کو پہچانتا تھا کیوں کہ ابو روز کے روز یا ایک دن چھوڑ کر وہاں اپنی رقم جمع کراتے تھے اور بینک کے عملے کو چاٹ بھی کھلایا کرتے تھے۔

ابو نے کیشیئر سے اپنے اکاؤنٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے دبیز سا ایک رجسٹر نکال کر دیکھا اور بولا۔ ”احسان بھائی! تمہارے اکاؤنٹ میں چھتیس ہزار پانچ سو چوہتر روپے ہیں۔“

یہ سن کر ابو کو خوش گوار حیرت ہوئی۔ انہوں نے کیشیئر سے کہا۔ ”بھائی، ایک دفعہ پھر اچھی طرح دیکھ لو۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنی ہی رقم ہے؟“

”ارے بھائی، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“ کلرک نے کہا۔

ابو وہاں سے نکلے تو کافی دیر تک صدر اور بوہری بازار کے علاقے میں گھومتے رہے۔ گھر جانے کو ان کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

بالآخر شام کو وہ گھر پہنچے تو تایا انہیں دیکھتے ہی برس پڑے۔ ”احسان! یہ صلہ دیا ہے تو نے ہمارے احسانوں کا؟ تو نے اپنی بھابی سے صاف انکار کر دیا کہ تو نفیسہ سے شادی نہیں کرے گا؟ وہ بے چاری صبح سے رو رہی ہے۔ جا اب جا کر اسے منا لے۔“

”بھائی جی!“ ابو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں آپ سے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نفیسہ سے شادی نہیں کروں گا۔“

اچانک تائی کمرے سے باہر نکلیں اور چیخ کر بولیں۔ ”ایسے نمک حرام کے لیے ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اپنا بوریا بستر سنبھالو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”بھائی جی، میں......“

”تمہاری بھابی ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ تایا نے کہا۔ ”مجھے تم سے اس احسان فراموشی کی امید نہیں تھی۔ میرے گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ دو۔“

ابو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے ایک تھیلے میں اپنے کپڑے ٹھونسے، ضرورت کا دوسرا سامان لیا اور وہ سامان اپنے ٹھیلے پر لاد کر بوجھل قدموں سے نکل پڑے۔ ان کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی، کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

وحید کا ہوٹل ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ وہ وہاں پہنچے اور اس سے کہا کہ اگر تم دو چار دن کے لیے میرا سامان رکھ سکتے ہو تو رکھ لو۔“ پھر انہوں نے وحید کو مختصراً بتایا کہ بھائی جی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔

”تو کوئی فکر ہی نہیں ہے“ وحید نے کہا۔ ”تم اپنے تھیلے کا سامان تو میرے ہوٹل میں ایک طرف رکھ دو۔ ٹھیلے کو ہوٹل کے باہر کھڑا کر کے زنجیر سے باندھ دو اور بے فکر ہو جاؤ۔“ پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ”یار، اگر تم کہو تو میں امان بھائی سے بات کروں۔ بھائیوں میں گرما گرمی ہو ہی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بھائی کو گھر ہی سے نکال دیا جائے۔“

”گرما گرمی!“ ابو نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو بھائی جی سے کبھی اونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔ میں ابو کی طرح ان کا بھی احترام کرتا ہوں لیکن یہ مسئلہ کچھ اور ہے۔“

وحید نے زیادہ زور نہیں دیا۔ وہ شرمندگی سے بولا۔ ”یار احسان! اگر میرے گھر میں جگہ ہوتی تو میں تمہیں کہیں جانے نہیں دیتا لیکن تم تو جانتے ہو کہ......“

”ارے تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو یار“ ابو نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہارے اس دو کمرے کے کوارٹر میں بیوی، تین بچوں اور دو جوان بہنوں کے علاوہ تمہارے والدین بھی رہتے ہیں۔ میں ایک آدھ دن میں کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لوں گا۔“

”ایسا کرو۔“ وحید نے کہا۔ ”آج تو تم میرے ہوٹل ہی میں سو جاؤ۔“ اس کا ہوٹل کیا، چھوٹی سی ایک دکان تھی۔ جس کے باہر اس نے فٹ پاتھ پر ناجائز جگہ گھیر کر لکڑی کی میزیں اور کرسیاں رکھ لی تھیں، رات کو وہ بھی کرسیاں اور میزیں دکان میں رکھتا تھا تو دکان میں بالکل گنجائش نہیں ہوتی تھی۔

اس نے کسی نہ کسی طرح دو میزیں جوڑ کر اس پر ایک دری بچھا دی اور ابو سکڑ سمٹ کر اس پر سو گئے۔ ساری رات بے چینی میں گزری۔ وہ ذرا سی کروٹ بھی بدلتے تو میزیں

یوں بلتیں جیسے ابھی دھڑام سے زمین پر آجائیں گی۔
انہوں نے صبح وحید کے ہوٹل ہی پر ناشتا کیا اور مکان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔
انہیں سب سے پہلے گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس میڈم خورشید جہاں کا خیال آیا۔ وہ انتہائی شریف النفس اور ہمدرد خاتون تھیں اور ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔
وہ اسکول پہنچے تو چپراسی قدیر انہیں دیکھ کر بولا۔ "بھائی احسان! دو دن سے کہاں غائب ہو تم اسکول کی میڈم اور لڑکیاں یوں کھو باؤلی ہو رہی ہیں۔ میاں، تم اپنی چاٹ میں کوئی نشہ تو نہیں ملاتے ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی کچھ چسکا سا پڑ گیا ہے۔" قدیر بہت باتونی تھا۔ وہ سانس لینے کو رکا تو ابو نے کہا۔ "یار میں دو دن سے بیمار ہوں۔ ابھی تو بڑی میڈم سے ملنے آیا ہوں، ایک ضروری کام ہے۔"
"ارے یار، تو تمہیں کون روکے گا۔ جاؤ مل لو، میڈم بھی اس وقت راؤنڈ لگا کر فارغ ہی بیٹھی ہیں۔"
ابو نے دفتر میں داخل ہو کر انہیں سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دے کر خوش دلی سے بولیں۔ "احسان! تم دو دن سے کہاں غائب ہو؟ طبیعت خراب ہے یا کوئی اور پرابلم ہے؟ میں تو آج قدیر کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتی تھی۔"
ابو نے انہیں مختصراً سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ فی الحال تو میں بے گھر ہوں۔ جب تک میرے رہنے کا ٹھکانا نہیں ہو جاتا میں اپنے کام پر توجہ کیسے دے سکتا ہوں؟
"میں کچھ سوچتی ہوں۔" میڈم نے کہا "تم اطمینان سے بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے بھجواتی ہوں۔ میں ذرا لیبارٹری کا راؤنڈ لگا کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دفتر سے نکل گئیں۔
چند منٹ بعد ان کا پیون نادر علی ابو کے لیے چائے اور پانی لے آیا۔ اس نے بھی ان سے غیر حاضری کا سبب پوچھا۔ انہوں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ دنوں سے میری طبیعت خراب ہے۔
تھوڑی دیر بعد میڈم واپس آگئیں۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہیں، پھر بولیں۔ "احسان! میری مانو تو تم اپنے لیے کوئی پلاٹ خرید لو۔ فی الحال میں اپنی ایک ٹیچر کے گھر کا آدھا پورشن تمہیں کرائے پر دلا دیتی ہوں۔ جب تک تمہارا ذاتی مکان نہ بن جائے تم وہاں رہ سکتے ہو۔ ویسے تو وہ غیر شادی شدہ لوگوں کو اپنا مکان کرائے پر نہیں دیتی ہیں لیکن وہ تم سے اچھی طرح واقف ہیں، پھر میں بھی تمہاری ضمانت لے رہی ہوں۔ وہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ "احسان، یہ بتاؤ کہ اس وقت تمہارے اکاؤنٹ میں پیسے کتنے ہیں؟ میرے شوہر کے ڈی اے میں انجینئر ہیں، وہ بتا رہے تھے کہ ڈرگ کالونی میں حکومت بہت سستے پلٹ الاٹ کر رہی ہے۔"
"میڈم! میرا ایک دوست بھی کے ڈی اے میں کلرک ہے۔ وہ بھی مجھ سے یہی کہہ رہا تھا۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک پلاٹ الاٹ کرا ہی لوں۔ میرے اکاؤنٹ میں اس وقت تقریباً پینتیس ہزار روپے موجود ہیں۔"
"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ تمہیں وہاں بیس ہزار روپے میں ساڑھے چار سو گز کا پلاٹ مل جائے گا۔ مکان بنانے کے لیے حکومت سے تمہیں قرضہ بھی مل جائے گا، جو تم آسان قسطوں میں واپس کر سکو گے۔"
"ٹھیک ہے میڈم! میں وہاں ایک پلاٹ الاٹ کرا لیتا ہوں۔ مکان بنانے کے لیے میں کسی قرضے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آہستہ آہستہ مکان بنا لوں گا۔"
"تم ایسا کرو، شام کو میرے گھر آجاؤ۔ میں طاہر صاحب سے تمہاری ملاقات کرا دوں گی۔ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر تمہارا کام کرا دیں گے۔" پھر انہوں نے ایک کاغذ پر ابو کو اپنے گھر کا پتا اور شوہر کا نام لکھ کر دے دیا اور بولیں۔ "میں مسز صابر کو بلاتی ہوں۔ ان سے مکان کے پورشن کی بات کر لیتی ہوں۔"
تھوڑی دیر بعد مسز صابر دفتر میں داخل ہوئیں اور ابو کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولیں۔ "کیسے ہو احسان میاں؟"
"اللہ کا کرم ہے میڈم!" ابو نے جواب دیا۔
"میڈم بتا رہی تھیں کہ تمہیں مکان کی ضرورت ہے؟"
"جی ہاں۔" ابو نے مختصر جواب دیا۔
"میرے مکان کے اوپر کا حصہ خالی ہے۔ پورشن کیا، وہ ایک کمرے کا مکان ہے، بجلی سمیت اس کا کرایہ پچھتر روپے ہوگا۔ ویسے تو میں تمہیں جانتی ہوں کہ تم بہت شریف النفس اور ایماندار آدمی ہو۔ کوشش کرنا کہ وہاں تمہارے زیادہ دوست نہ آئیں کیونکہ اوپر کا راستہ میرے ہی مکان میں سے گزرتا ہے۔"
"میرا کوئی ایسا دوست ہے ہی نہیں میڈم جسے میں گھر پر بلاؤں۔ ہاں کبھی کبھار بھائی یا بھابی آسکتے ہیں۔"
ان کا مکان لالوکھیت (لیاقت آباد) میں تھا۔ ابو نے مکان دیکھے بغیر جیب سے پچھتر روپے نکالے اور ان کے حوالے کر دیے۔ یوں ان کے رہنے کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔
شام کو وہ میڈم خورشید کے گھر پہنچے۔ وہ ناظم آباد میں رہتی تھیں۔
ان کے شوہر طاہر صاحب بھی بہت خوش اخلاق آدمی تھے۔ انہوں نے ابو سے کہا کہ کل تم میرے دفتر آجاؤ۔ وہاں تمہیں ایک فارم پُر کر کے دینا ہوگا۔ پھر پیسے بینک میں جمع کرانے کے بعد اس کی رسید فارم کے ساتھ لگا کر میرے پاس آجانا۔ ایک ہفتے میں انشاء اللہ تم پلاٹ کے مالک بن جاؤ گے۔"
وہاں سے ابو مسز صابر کے گھر گئے۔ اچھا خاصا مکان تھا، اوپر صرف ایک ہی کمرا تھا جو خاصا بڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی باورچی خانہ، غسل خانہ اور بیت الخلا تھا۔ کمرے کے سامنے چھوٹا سا ایک صحن بھی تھا۔ وہ مکان ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ ابو نے ان سے کہا کہ میں آج ہی یہاں منتقل ہو رہا ہوں۔
رات تک وہ وہاں منتقل ہو گئے۔ وہ بیچاری اتنی مہربان تھیں کہ انہوں نے اپنے صحن میں ابو کو اپنا ٹھیلا کھڑا کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ ابو آتے ہوئے اپنے لیے ایک گدا، چادر اور تکیہ لیتے آئے تھے۔ مسز صابر نے اس دوران میں مکان کی اچھی طرح دھلائی اور صفائی کر دی تھی۔ یہ تو ابو کو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کام ان کی بیٹیوں نے کیا تھا۔
تایا کا خیال تھا کہ ابو ایک دو روز ہی میں واپس آجائیں گے۔ اس زمانے میں سر چھپانے کو ٹھکانا بھی بہت مشکل سے ملتا تھا۔ پھر ابو جیسے تنہا، نوجوان کو تو کوئی بھی مکان کرائے پر دینے کو تیار نہ ہوتا۔ انہیں شاید یہ علم نہیں تھا کہ ابو نے اپنے طور پر بھی خاصی رقم پس انداز کر رکھی ہے۔
ابو کا کاروبار ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا۔ اس دوران میں میڈم خورشید کے شوہر طاہر صاحب نے وعدے کے مطابق ابو کو ڈرگ کالونی کا وہ پلاٹ الاٹ کرا دیا۔ پھر انہوں نے ہی ابو کو سمجھایا کہ تم مکان تھوڑا تھوڑا کر کے بناؤ گے تو اس میں اخراجات بھی زیادہ آئیں گے اور مکان میں وہ خوبصورتی بھی نہیں آئے گی۔ یک مشت قرض لے کر مکان بناؤ گے تو دو تین مہینے ہی میں اپنے گھر میں منتقل ہو جاؤ گے۔ قرض کی قسط مکان کا کرایہ سمجھ کر دیتے رہنا۔ تم جلد ادائیگی کے لیے زیادہ رقم بھی واپس کر سکتے ہو۔
ابو نے ان کی بات مان لی اور ہاؤس بلڈنگ سے قرض لے کر مکان کی تعمیر شروع کرا دی۔ مکان کا نقشہ بھی اس دور کے لحاظ سے طاہر صاحب نے ایک ماہر آرکیٹیکٹ سے بنوا کر دیا تھا۔
چھ مہینے کے اندر اندر ڈرگ کالونی میں عیدگاہ میدان کے نزدیک ابو کا وسیع و عریض اور شاندار مکان تعمیر ہو گیا۔
ابو کی مالک مکان مسز صابر بیوہ تھیں۔ ان کی صرف دو ہی بیٹیاں تھیں، ناصرہ اور حمیرا، ناصرہ کی منگنی ہو چکی تھی اور ابو کے اس مکان میں منتقل ہونے کے دو مہینے بعد اس کی شادی ہو گئی۔ اس شادی میں ابو نے بالکل مسز صابر کے بیٹوں کی طرح کام کیا۔ ابو ایک طرح سے اب ان کے گھر کے ایک فرد ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لیے دیے رہتے تھے۔ انہوں نے کئی دفعہ حمیرا کو دیکھا تو تھا لیکن بہ نظر غائر اس کا جائزہ نہیں لیا تھا۔
ابو کے مکان کی تیاری آخری مرحلے میں تھی جب قدیر نے انہیں بتایا کہ ہیڈ مس نے کہا ہے چھٹی کے بعد مجھ سے مل کر جانا۔
اب ایک کی بجائے ابو کے تین ٹھیلے تھے۔ آلو چھولے اور چاٹ کا ٹھیلا تو وہ خود سنبھالتے تھے، دوسرے ٹھیلے پر قلفی، ٹھنڈا کولا اور شربت وغیرہ بکتا تھا۔ تیسرے ٹھیلے پر گول گپے اور سموسے وغیرہ بکتے تھے۔ اس کے لیے ابو نے دو ملازم رکھ لیے تھے۔ ان دونوں ٹھیلوں پر بھی ابو نے صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام کیا تھا۔ ان کا مال بھی ہر طرح سے بہترین ہوتا تھا اور وہ برتن وغیرہ بھی بہت اچھی قسم کے استعمال کرتے تھے۔
گول گپوں اور سموسے کے ٹھیلے پر چاچا شکور ہوتے تھے۔ وہ اس وقت سے ابو کے ساتھ تھے اور تینوں ٹھیلوں کی آمدنی اور خرچ کا حساب بھی وہی رکھتے تھے۔
چھٹی کے بعد ابو نے چاچا شکور سے کہا۔ "مجھے تو میڈم نے نہ جانے کس کام سے بلایا ہے۔ تم سارا سامان سنبھال لینا۔ ابو نے اب اسکول کے قریب ہی ایک دکان کرائے پر لے کر اس میں ٹھیلے اور دوسرا سامان رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دکان میں ابو اپنا صاف ستھرا ایک جوڑا بھی رکھتے تھے۔ وہ خاصے خوب رُو اور جامہ زیب تھے۔ صاف ستھرے اور ڈھنگ کے لباس میں کوئی یقین بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص اسکول کے باہر ٹھیلا لگاتا ہوگا۔
ابو لباس تبدیل کر کے اسکول پہنچے تو میڈم خورشید ان کے انتظار ہی میں بیٹھی تھیں۔

''آؤ احسان!'' انہوں نے کہا ــــ ''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

''کوئی خاص بات ہے میڈم؟'' ابو نے پوچھا۔

''خاص ہی سمجھو۔'' میڈم نے مسکرا کر کہا۔ ''اب ہفتے پندرہ دن میں تمہارا بنگلا ماشاءاللہ تیار ہو جائے گا۔''

''بنگلا کہاں میڈم!'' ابو نے ہنس کر کہا۔ ''وہ تو بس معمولی سا ایک مکان ہے۔''

''ارے تو بنگلے کیسے ہوتے ہیں؟'' میڈم نے ہنس کر کہا۔ ''اس میں بڑے بڑے پانچ کمرے ہیں، بڑا سا برآمدہ ہے۔ برآمدے کے آگے اچھا خاصا بڑا لان ہے۔ پچھلے حصے میں بھی بہت جگہ ہے۔ وہاں تم آم، امرود اور کیلے کے درخت لگا سکتے ہو یا سبزیاں اُگا سکتے ہو۔ ہاں، تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ اب تمہارا مکان تیار ہو جائے گا تو تم اس میں منتقل ہو جاؤ گے۔''

''جی میڈم!'' ابو نے کہا۔

''تو کیا اتنے بڑے مکان میں تم اکیلے رہو گے۔ دیکھو احسان! جب تک کسی گھر میں گھر والی نہ ہو، وہ مکان ہی رہتا ہے، کبھی گھر نہیں بنتا۔''

ابو اُن کی بات کا مطلب سمجھ گئے اور بولے۔ ''میڈم! بھائی اور بھابی نے تو لوٹ کر خبر تک نہیں لی حالانکہ میں ایک دو مرتبہ وہاں گیا بھی لیکن بھابی نے مجھے دروازے ہی سے چلتا کر دیا۔ میری بڑی بہن تو آپ ہیں۔ آپ ہی اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟''

''بھئی اگر تم مجھے واقعی اپنی بڑی بہن سمجھتے ہو تو میں نے تو تمہارے لیے لڑکی پسند بھی کر لی ہے۔'' میڈم نے مسکرا کر کہا۔

''اگر آپ نے لڑکی پسند کی ہے تو اچھی ہی ہوگی۔ آپ ہی باقی باتیں بھی طے کر لیں۔'' ابو نے سر جھکا کر کہا۔

''ارے بھئی، یہ نہیں پوچھو گے کہ لڑکی کون ہے، کیسی ہے؟''

''مجھے آپ کی پسند پر اعتماد ہے باجی!'' ابو نے پہلی دفعہ انہیں میڈم کی بجائے باجی کہا۔ ''آپ نے میرے لیے کسی اچھی اور نیک لڑکی ہی کا انتخاب کیا ہوگا۔'' پھر وہ چونک کر بولے ''معاف کیجیے گا میں نے جذبات میں آ کر آپ کو باجی کہہ دیا۔ کہاں ایک ٹھیلے والا اور کہاں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیڈ مسٹریس!''

''اب یہ تم غیروں والی باتیں کر رہے ہو احسان!''

میڈم نے کہا۔ ''مجھے تمہارا باجی کہنا اچھا لگا۔ میرا کوئی بھائی بھی تو نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو وہ بالکل تم جیسا ہی ہوتا۔'' پھر وہ مسکرا کر بولیں۔ ''تم نے مسز صابر کی چھوٹی بیٹی حمیرا کو دیکھا ہے؟''

''جی ہاں، دیکھا تو ہے۔'' ابو نے کہا۔

''تمہیں وہ کیسی لگتی ہے؟'' باجی نے پوچھا۔

ابو نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا کر بولے۔ ''میں نے کبھی اسے اتنے غور سے نہیں دیکھا۔ بس آتے جاتے کبھی سامنا ہو جاتا ہے۔''

''تو پھر آج اسے غور سے دیکھو۔'' باجی نے مسکرا کر کہا۔ ''ممکن ہو تو اس سے دو چار باتیں بھی کر لو۔ میں نے تمہارے لیے حمیرا ہی کو پسند کیا ہے۔''

''جی، آپ کا مطلب ہے کہ...... حمیرا...... وہ...... مسز صابر......''

''ہاں، وہی حمیرا۔'' باجی نے کہا۔ ''اور مسز صابر کی فکر تم مت کرو۔ میں ان سے بات کر لوں گی۔''

''لیکن باجی، محلے والے کیا کہیں گے؟ وہ تو یہی سوچیں گے کہ وہاں کرائے دار بن کر آیا اور......''

''محلے والوں کی فکر بھی تم مت کرو۔'' باجی نے کہا۔ ''لوگ تو باتیں بناتے ہی ہیں۔''

اس دن ابو کہیں اور جانے کی بجائے سیدھے گھر چلے گئے۔ ان کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی لڑکی کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ حمیرا کے نام ہی سے ان کے دل میں گدگدی ہو رہی تھی۔

وہ عموماً شام ڈھلے گھر میں داخل ہوتے تھے۔ اس دن وہ ڈھائی بجے ہی گھر پہنچ گئے۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے کھڑکی بھی نہیں تھی۔ مسز صابر شاید اپنے کمرے میں تھیں۔ اس دن گرمی بھی بہت تھی۔

ابو سر جھکا کے زینے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی وہ زینہ طے کر کے اوپر پہنچے ہی تھے کہ ان کے کانوں میں انتہائی مترنم آواز آئی۔ کوئی لڑکی بہت خوب صورت آواز میں گنگنا رہی تھی، گنگنانا کیا بلکہ وہ تو خاصی بلند آواز میں گا رہی تھی۔ شام کا ڈھلتا ہوا سایہ، خوشیوں کا پیغام لایا!

پھر اس نے وہ گانا ادھورا چھوڑ دیا اور دوسرا گانا شروع کر دیا۔ زخم دل کی دوا خریدیں گے، گیسوؤں کی گھٹا خریدیں گے، آپ فرمائیں، کیا خریدیں گے، آپ فرمائیں کیا خریدیں گے؟

ابو اچانک کمرے میں داخل ہو گئے۔ گانے والی حمیرا

تھی جو کمرے کی صفائی بھی کر رہی تھی اور گا بھی رہی تھی۔

وہ ابو کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی۔ ابو نے اس دن واقعی اسے غور سے دیکھا، درمیانہ قد، متناسب جسم، انتہائی پُرکشش چہرہ، سرخ و سفید رنگت اور پیشانی پہ بکھرے ہوئے بھورے بال!

وہ ابو کو دیکھ کر ایسی حواس باختہ ہوئی کہ نزدیک ہی پلنگ پر پڑا ہوا اپنا دوپٹا اٹھانا بھی بھول گئی۔

اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ دروازے میں تو ابو کھڑے تھے۔

''ہائے اللہ، راستہ چھوڑیں نا! امی آجائیں گی۔''

اب یہ میڈم خورشید کی باتوں کا اثر تھا یا حمیرا واقعی ابو کو پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی کہ وہ عادت کے خلاف مسکرا کر بولے۔ ''تم پہلے تو یہ بتاؤ کہ میرے کمرے میں کیوں آئی ہو؟'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے دوپٹا اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔

''میں تو روز ہی آتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کے کمرے کی صفائی جادو کے زور سے ہو جاتی ہے۔''

ابو بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر انہیں بھی ہوش آگیا کہ اگر واقعی مسز صابر آگئیں تو میرے بارے میں کیا سوچیں گی؟ انہوں نے حمیرا کا راستہ چھوڑ دیا۔

وہ بری طرح وہاں سے نکلی اور ایک ایک چھلانگ میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

دوسرے دن ابو نے باجی کو اپنی رضامندی سے آگاہ کر دیا، پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''باجی! حمیرا اس سال میٹرک کا امتحان دے چکی ہے۔ وہ رزلٹ کے انتظار میں ہے۔ میں نے تو آٹھویں جماعت بھی پاس نہیں کی۔ کیا مسز صابر اپنی پڑھی لکھی اور خوب صورت بیٹی کے لیے مجھ جیسے جاہل کا رشتہ قبول کر لیں گی؟''

''ارے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔'' باجی نے کہا۔ ''مرد کی کمائی دیکھی جاتی ہے اور تم تو ماشاءاللہ بی اے اور ایم اے پاس نوجوانوں سے زیادہ کماتے ہو۔ رہی مسز صابر کی بات تو وہ یہ رشتہ قبول کر چکی ہیں۔ میں اور طاہر باقاعدہ تمہارا رشتہ لے کر وہاں آئیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے نئے گھر میں اپنی دلہن کے ساتھ جاؤ۔''

پھر تمام معاملات طے ہو گئے اور ایک مہینے کے اندر اندر ابو اور حمیرا کی شادی ہو گئی۔ وہی حمیرا اب میری امی ہیں۔ امی کو پسند نہیں تھا کہ ابو کسی اسکول کے آگے ٹھیلا لگائیں۔ انہوں نے ابو کو مشورہ دیا کہ مارکیٹ میں کوئی موقع کی دکان دیکھ کر اس میں کوئی کاروبار شروع کر دیں۔

اس موقع پر چاچا شکور کام آئے۔ انہوں نے بتایا کہ مارکیٹ میں کریانہ کی ایک دکان بک رہی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے اس کے مالک کا انتقال ہوا ہے۔ اس کے دونوں بیٹے دکان بیچ کر اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں۔

دکان خاصی بڑی تھی اور ڈرگ کالونی کی مارکیٹ میں بہت موقع کی جگہ پر تھی۔ سامان سمیت مالک کے بیٹے اس دکان کا ایک لاکھ روپیا مانگ رہے تھے۔

ابو کے پاس اس وقت اتنی بڑی رقم کہاں تھی۔ کچھ رقم تھی بھی تو وہ مکان کے فرنیچر اور اپنی شادی میں خرچ کر چکے تھے۔ ان کے بینک میں صرف بائیس ہزار روپے تھے۔ چاچا شکور نے سودے بازی کر کے ان دونوں بھائیوں کو کسی نہ کسی طرح اسّی ہزار پر راضی کر لیا۔ وہ اس سے ایک پیسا بھی کم لینے کو تیار نہیں تھے۔

اسّی ہزار کی رقم بھی اس دور میں معمولی تو نہیں ہوتی تھی۔

اس موقع پر بھی میڈم خورشید کام آئیں۔ انہوں نے کچھ روپیا تو نقد دیا جسے ابو نے بہت مشکل کے بعد قبول کیا۔ پھر انہوں نے بیس ہزار روپے کی ایک کمیٹی کا بندوبست کر دیا۔ یوں وہ رقم پوری ہوئی۔

ابو دکان پر بیٹھے تو چاچا شکور اُن کے ساتھ تھے۔ اب بھی دکان کا سارا حساب کتاب وہی کرتے تھے۔ اللہ نے کاروبار میں ایسی برکت دی کہ ابو نے صرف چھ ماہ کے عرصے میں نہ صرف میڈم خورشید کا قرض واپس کر دیا بلکہ ہاؤس بلڈنگ کا باقی ماندہ قرض بھی چکا دیا۔

☆☆☆

یہ سب باتیں میں نے امی اور ابو سے اتنی بار سنی تھیں کہ مجھے ان کی ایک ایک بات اور واقعہ ازبر ہو گیا تھا۔ مجھے کبھی اس پہ شرمندگی نہیں ہوئی کہ میرے ابو کسی زمانے میں لڑکیوں کے اسکول کے باہر آلو چھولے کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ ہاں، ابو کبھی موڈ میں ہوتے تو امی ان سے آلو چھولے اور چاٹ بنانے کی فرمائش کر دیتیں۔ ابو کے ہاتھ میں آج بھی وہی لذت تھی۔ میں اور شائلہ بہت شوق سے ابو کے ہاتھ کی بنی ہوئی چاٹ کھاتے تھے۔ کبھی چاچا شکور کو بلا لیتے اور ان سے گول گپوں اور سموسوں کی فرمائش کرتے۔ مجھے فخر تھا کہ ابو ایک سیلف میڈ آدمی تھے۔

میری پیدائش کے بعد انہوں نے اپنی دکان کے برابر والی دو دکانیں مزید خرید لی تھیں۔

امی اکثر مجھ سے کہتی تھیں "جوزی! تم بہن بھائیوں کی خاطر ابھی تک تمہارے ابو نے گاڑی نہیں خریدی۔ تم دونوں کے تعلیمی اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ ابھی مزید کوئی خرچہ بڑھانا نہیں چاہتے۔

میں بھی خوب دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔ اسکول کی ساری ٹیچرز مجھ سے خوش تھیں۔ پھپو اب ریٹائرڈ ہو چکی تھیں۔ میڈم خورشید کو میں اور شائلہ اب پھپو ہی کہتے تھے۔ ابو اکثر ہم لوگوں کو لے کر ان کے گھر چلے جاتے تھے۔ ان کے بیٹے ناصر سے میری بہت دوستی تھی۔

وہ لوگ بھی اکثر ہمارے گھر آجاتے تھے۔

طاہر پھوپا بھی ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور اب ان لوگوں کے پہلے جیسے حالات نہیں رہے تھے۔ بس وہ اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھے۔ ہاں، ابو کی شادی میں تایا اور تائی میں سے کوئی بھی شریک نہیں ہوا تھا۔

اس دن ٹرک سے مال اتروانے کے بعد میں دوبارہ دکان میں آیا تو شکور چاچا نے میرے لیے ٹھنڈے دودھ کی بوتل منگالی۔ وہ کولڈرنک کی بجائے ہمیشہ ٹھنڈا دودھ پلاتے تھے۔ پھر وہ مسکرا کر بولے۔ جوزی میاں، جانتے ہو، تمہارے ابو نے تمہیں اس وقت یہاں کیوں بھیجا ہے؟"

"ظاہر ہے چاچا، گودام میں مال اتروانا تھا۔ آپ کے پاس تو فرصت ہے نہیں۔"

شکور چاچا مسکرائے۔ "یہ بات نہیں ہے جوزی میاں!" انہوں نے کہا۔ "گودام میں مال اتروانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اصل میں وہ تمہیں بھی اپنی طرح سخت جان بنانا چاہتے ہیں۔ اسکول سے آنے کے بعد تم گھنٹوں ٹھنڈے کمرے (ائرکنڈیشنڈ) میں پڑے رہتے ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بھی اس محنت کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے جو انہوں نے کی ہے۔"

"لیکن شکور چاچا! یہ تو ظلم ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں کہ باہر کتنی شدید گرمی ہے۔ اس گرمی میں سائیکل پر سفر کرنا مزید عذاب ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ابو بھی آگئے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ "جوزی بیٹا! اب تم گھر چلے جاؤ۔" پھر انہوں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور بولے۔ "گرمی بہت ہے، ٹیکسی میں چلے جانا۔"

میں نے دیکھا، شکور چاچا کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

میں دکان سے نکلنے ہی والا تھا کہ دکان میں ادھیڑ عمر کا ایک شخص داخل ہوا۔ اس کے سر کے بال کھچڑی ہو رہے تھے، جسم پر صاف ستھرا شلوار قمیص تھا لیکن کثرتِ استعمال سے اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ پیروں میں ہوائی چپل تھی اور دھوپ میں سنولایا ہوا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔

اس کی طرف ابو کی پشت تھی۔ وہ دکان کے ملازمین کو کوئی ہدایات دے رہے تھے۔ شکور چاچا بھی مصروف تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "جی فرمائیے، آپ کو کیا چاہیے؟"

اس شخص نے رومال سے چہرے پر بہنے والا پسینا خشک کیا اور مجھے غور سے دیکھ کر بولا "تم احسان کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں۔" میں الجھ کر بولا۔

اسی وقت ابو کاؤنٹر کی طرف مڑے اور اس شخص پر نظر پڑتے ہی وہ والہانہ انداز میں بولے۔ "بھائی جی! اندر آئیے نا، آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟"

تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص میرے تایا امان ہیں۔ مجھے اسی لیے ان کا چہرہ شناسا سا لگ رہا تھا کہ ان میں ابو کی شباہت تھی۔

تایا دکان کے اندر آگئے۔ ابو والہانہ انداز میں ان سے لپٹ گئے اور بولے۔ "کیسے ہیں بھائی جی، بھابی اور بچے تو خیریت سے ہیں؟"

"ہاں سب خیریت ہے احسان میاں!" تایا نے کہا۔ "میں اب ریٹائرڈ ہو چکا ہوں اور کچھ ہی دنوں بعد سر چھپانے کا وہ ٹھکانا بھی چھن جائے گا۔"

"اللہ بڑا کارساز ہے بھائی جی!" ابو نے کہا۔ پھر وہ مجھ سے بولے۔ "اعجاز بیٹا! یہ تمہارے تایا جان ہیں۔"

میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔ "ماشاء اللہ، بالکل اپنے دادا پر گیا ہے۔ وہی قد کاٹھ، وہی کسرتی بدن اور کالے سیاہ چمک دار بال! جیتے رہو بیٹا!"

تایا کچھ دیر دکان میں بیٹھے اور ابو سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرتے رہے۔ پھر ابو نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور خاموشی سے کچھ نوٹ نکال کر انہیں دے دیے۔

تایا جانے کے لیے اٹھے تو بولے۔ "احسان! کبھی گھر کا

ہی چکر لگا لو۔ کل نہ معلوم ہم تمہیں اس گھر میں ملیں یا نہ ملیں۔"

"بھائی جی! میں تو کئی دفعہ گھر آیا لیکن بھابی نے تو مجھے گھر میں گھسنے ہی نہیں دیا۔"

"اس نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

"ارے بھائی جی! آپ بڑے ہیں مجھے شرمندہ مت کریں۔ میں فرصت ملتے ہی حمیرا کے ساتھ آپ کے گھر آؤں گا۔" پھر وہ مجھ سے بولے۔ "احسان! تم ٹیکسی سے جاؤ گے، جاتے ہوئے راستے میں اپنے تایا کو بھی ان کے گھر چھوڑ دینا۔"

انہوں نے ابو کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ تو اگر ابو دور اندیشی سے کام لے کر رقم پس انداز نہ کرتے تو شاید فاقوں کی نوبت آجاتی۔ مجھے تو تایا اور تائی کے نام سے بھی نفرت تھی۔ وہ لوگ تو ابو کی شادی میں بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ شادی کے بعد ابو ایک دفعہ امی کو لے کر ان کے گھر گئے تھے تو تائی نے انہیں دروازے ہی سے لوٹا دیا تھا۔

میں انہیں ٹیکسی میں بٹھا کر جیکب لائن لے گیا۔ گھر پہنچ کر تایا نے بہت اصرار کر کے مجھے گھر میں بلا لیا۔

وہ چھوٹے چھوٹے دو کمروں کا بوسیدہ سا کوارٹر تھا۔ غربت اور تنگ دستی اس کے در و دیوار سے ٹپک رہی تھی۔ تایا نے دروازے ہی سے بانگ لگائی۔ "ارے دیکھو تو کون آیا ہے؟"

کمرے سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت نکلی۔ میں سمجھ گیا کہ یہی تائی ہیں۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے تایا کو دیکھا، پھر بہت غور سے مجھے دیکھا اور بولیں۔ "یہ تو مجھے احسان کا بیٹا لگ رہا ہے۔"

"لگ رہا ہے نہیں بلکہ ہے۔" تایا نے کہا۔ "یہ احسان کا بیٹا اعجاز ہے۔" پھر وہ مجھ سے بولے۔ "اعجاز بیٹا! یہ تمہاری تائی ہیں۔"

میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے نہایت روکھے انداز میں میرے سلام کا جواب دیا۔

پھر جیسے وہاں چاند طلوع ہو گیا۔ کمرے سے نکلنے والی لڑکی انتہائی حسین تھی۔ اس کے گھنے، سیاہ چمک دار بال اس کی پشت سے نیچے تک بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا اور لال لال ڈورے سے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا لیکن چہرہ اتنا پُرکشش اور جسم اتنا متناسب تھا کہ اس پر سے نگاہ ہٹانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بھی حیرت سے پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ارے شہلا بیٹی! یہ تمہارے چاچو احسان کا بیٹا ہے اعجاز!" اس نے نظریں جھکا کر مجھے سلام کیا اور دبے دبے انداز میں مسکرائی۔

"اچھا تایا جان! اب مجھے اجازت دیں۔" میں نے کہا۔

"ارے بیٹا! بیٹھو۔" تایا نے کہا۔ "اب کھانا کھا کر جانا۔"

"کھانے کا تکلف نہ کریں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یوں بھی ابھی کھانے میں بہت دیر ہے۔ میں پھر آؤں گا تو کھانا بھی کھاؤں گا۔"

"اچھا ایک کپ چائے تو پی لو۔" تایا نے کہا۔ "اپنے بھائیوں سے بھی مل لو۔ میں ان دونوں کو ابھی بلوا لیتا ہوں۔ نزدیک ہی تو ان کا ورکشاپ ہے۔"

"ورکشاپ!"

"ہاں بیٹا!" تایا افسردگی سے بولے۔ "جاوید اور رشید دونوں کو پڑھنے کا شوق ہی نہیں تھا۔ میں نے ان دونوں کو ایک مکینک کے پاس بٹھا دیا تھا۔ اب تو وہ دونوں بہت اچھے کاری گر بن گئے ہیں اور اپنا ورکشاپ کھول لیا ہے۔ تم بیٹھو، میں کسی بچے کو بھیج کر انہیں بلواتا ہوں۔"

شہلا نے اس دوران میں جھاڑ پونچھ کر ایک کرسی برآمدے میں رکھ دی تھی۔ میں اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تائی میرے نزدیک ہی ایک تخت پر بیٹھی تھیں۔

"احسان آج کل کیا کر رہا ہے؟" تائی نے پوچھا۔ "کیا ابھی تک آلو چھولے کا ٹھیلا ہی لگاتا ہے یا کوئی اور کام بھی کرتا ہے؟" تائی کے لہجے میں حقارت تھی۔ "اور تم لوگ آج کل رہ کہاں رہے ہو؟"

"ڈرگ کالونی میں ابو کی بہت بڑی کریانے کی دکان اور جنرل اسٹور ہے۔" میں نے اس میں جنرل اسٹور کا اضافہ بھی کر دیا۔ "اور ہم لوگ ڈرگ کالونی کے ایک بنگلے میں رہتے ہیں جو ابو نے شادی سے پہلے بنوایا تھا۔"

تائی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "بنگلے میں رہتے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں ان کی بات کا کوئی جواب دیتا۔ تایا کے ساتھ گھر میں دو لڑکے داخل ہوئے۔ دونوں کے کپڑوں اور ہاتھوں میں گریس کے داغ اور دھبے تھے۔

تایا نے تعارف کرایا۔ "اعجاز بیٹا! یہ تمہارا بڑا بھائی جاوید ہے اور یہ رشید!" انہوں نے دوسرے لڑکے کی طرف

اشارہ کیا۔ ”اور یہ تمہارے احسان چاچو کا بیٹا اعجاز ہے۔“ تایا نے میرا تعارف کرایا۔ ”جاوید! تمہیں تو احسان چاچو یاد ہوں گے؟“

”ہاں ابو! مجھے کچھ کچھ یاد تو ہے — ان کا آلو چھولوں اور دہی بڑوں کا ٹھیلا اور......“

”ارے وہ اب بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔“ تایا نے فخر سے کہا۔ ”ڈرگ کالونی میں اس کی بہت بڑی دکان ہے۔“

جاوید کا قد درمیانہ اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی مکارانہ چمک تھی۔ چہرے سے بھی وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس کے مقابلے میں رشید مجھے کچھ بہتر لگا۔ وہ لمبے قد کا لڑکا تھا، ہاتھ پیر خاصے مضبوط تھے اور چہرے کے نقوش بھی جاذب نظر تھے۔

تائی کا خشک رویّہ اچانک تبدیل ہوگیا۔ انہوں نے شمائلہ سے بلند آواز میں کہا۔ ”شمو! بھائی کے سامنے خالی چائے مت رکھ دینا، کچھ پکوڑے وغیرہ بنالے۔“

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی شمائلہ ایک ٹرے لے کر آگئی۔ اس میں چائے کے ساتھ ساتھ پکوڑے تھے، پاپڑ تھے اور حلوہ تھا۔

میں وہاں سے رخصت ہوا تو تائی نے بہت اپنائیت سے کہا۔ ”اعجاز بیٹا! آتے جاتے رہنا، یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔“ پھر وہ مسکرا کر بولیں۔ ”اپنی اماں کو میری طرف سے بہت دعا کہنا اور کسی دن انہیں بھی لے کر آؤ۔“

میں نے گھر پہنچ کر امی کو سارا واقعہ بتایا تو وہ چونک اٹھیں۔ ”تم وہاں کیوں گئے تھے؟“

”مجھے تو ابو نے بھیجا تھا۔“ میں نے کہا۔

”وہ تمہاری تائی ایک نمبر کی کائیاں ہے۔“ امی نے کہا۔ ”جب شادی کے بعد تمہارے ابو مجھے وہاں لے کر گئے تھے تو اس نے ہمیں ذلیل کرکے دروازے ہی سے واپس کردیا تھا۔ اس وقت تمہارے تایا بھی موجود تھے۔ اب ان کے دل میں اچانک بھائی کی محبت کیسے پھوٹ پڑی؟“

”امی، انسان کو کبھی نہ کبھی تو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تائی کو بھی شاید اپنی زیادتی کا احساس ہوگیا ہے۔“

”تو ان کی اتنی وکالت کیوں کررہا ہے؟“ امی نے چونک کر کہا۔ ”تو ان لوگوں کو نہیں جانتا ہے بیٹا! اور دوبارہ ان کے گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

یہ اس واقعے کے تقریباً ڈیڑھ ہفتے بعد کی بات ہے۔

میں بازار سے گزرتے وقت دکان کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں کاؤنٹر پر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تایا بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔

شکور چاچا گاہکوں میں مصروف تھے۔ میں موقع پاکر ان کے پاس پہنچا اور تایا کے بارے میں پوچھا تو وہ منہ بنا کر بولے۔ ”احسان میاں کے دل میں اچانک ہی بھائی کی محبت پھوٹ پڑی ہے۔ تمہارے تایا ریٹائرڈ ہوچکے ہیں۔ احسان میاں نے ان سے کہا کہ کہیں اور دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ یہاں دکان میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ وہ سیدھے کاؤنٹر پر جا بیٹھے۔“

اسی وقت ابو، جاوید کے ساتھ دکان میں داخل ہوئے اور مجھ سے بولے۔ ”جوزی! تیری بہت خواہش تھی ناکہ میں گاڑی لے لوں، جاوید بیٹے نے مجھے ایک بہت اچھی اور سستی گاڑی دلوادی ہے۔ اس کے ورک شاپ میں بکنے کے لیے آئی تھی۔“

میں خوشی خوشی باہر گیا۔ گاڑی واقعی بہت اچھی اور تقریباً نئی تھی۔ مارک ٹو کا گزشتہ سال کا ماڈل تھا۔

اسی دن سے ابو نے ڈرائیونگ سیکھنا شروع کردی۔ عارضی طور پر جاوید بھائی نے ایک ڈرائیور کا بندوبست کردیا۔

☆☆☆

ابو تو خیر ڈرائیونگ سیکھ ہی چکے تھے۔ میں بھی ڈرائیونگ میں مشاق ہوگیا تھا۔ ان ہی دنوں ایک اور واقعہ بھی رونما ہوا تھا۔ تایا سے حکومت نے مکان خالی کرالیا تھا اور ابو بھائی کی محبت میں ان کے خاندان کو اپنے گھر لے آئے تھے کہ اتنا بڑا گھر ہوتے ہوئے آپ کو کہیں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔

امی کو یہ بات بہت ناگوار گزری تھی لیکن وہ ابو کے کسی بھی فیصلے کی مخالفت نہیں کرتی تھیں۔

اکثر پھپو (میڈم خورشید) بھی ہمارے گھر آتی رہتی تھیں، ان کا بیٹا تو حصولِ علم کے لیے امریکا چلا گیا تھا، پھر وہ وہیں کا ہورہا۔ اس نے وہیں کسی امریکن لڑکی سے شادی کرلی۔ ان کی بیٹی منزہ عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ وہ بھی انتہائی حسین اور ذہین لڑکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے پسند بھی کرتی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چراغ سے جل اٹھتے تھے۔

اب تو میرے پاس گاڑی تھی، پھپو جب بھی آتی تھیں، میں منزہ کو لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا تھا لیکن اب میں چاہتا تھا کہ شہلا بھی ہمارے ساتھ ہو، شہلا بلاشبہ اس سے زیادہ حسین اور پُرکشش تھی، لیکن اس میں ایک ہی خامی تھی کہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ وہ جب بولتی تھی تو اس کے حسن کا سارا تاثر ماند پڑ جاتا تھا۔

اس دن پھپو آئیں تو منزہ اصرار کرکے مجھے لانگ ڈرائیو پر لے گئی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ گھر سے اپنی دوست کے لیے کچھ نوٹس بنا کر لائی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ نوٹس بھی اسے پہنچا دیے جائیں۔

اس کے کہنے پر میں نے گاڑی کا رخ واپس گھر کی طرف موڑ دیا۔

گھر پہنچ کر منزہ نے کہا۔ ”جوزی! تم جاکر وہ نوٹس لے آؤ۔ امی مجھے دیکھیں گی تو شاید آنے نہ دیں۔ نوٹس ڈرائنگ روم کی سینٹر ٹیبل پر رکھے ہیں۔“

میں گاڑی سے اتر کر اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی تائی کا کمرا تھا۔ اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی لیکن کھڑکی پہ پردہ تھا۔ اندر سے تائی کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ تائی کے منہ سے منزہ کا نام سن کر چونک اٹھا۔ ”وہ حرافہ منزہ اس اعجاز کے ساتھ دوڑی دوڑی پھرتی ہے۔ تجھ سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ جب وہ آیا کرے تو تو اعجاز کو اکیلا مت چھوڑا کر۔“

”اماں، اعجاز بھی کوئی دودھ پیتا بچہ ہے۔ وہ حرام زادہ تو اس حرافہ کے سامنے مجھے منہ ہی نہیں لگاتا۔“ دوسری آواز شہلا کی تھی۔ میں اس کی زبان سے ایسے گھٹیا اور عامیانہ الفاظ سن کر حیران بھی ہوا اور مجھے افسوس بھی ہوا۔

”وہ کمینی کیا ابلا پری ہے، تجھ سے زیادہ حسین ہے؟“ تائی کی کرخت آواز سنائی دی۔ ”ہزار دفعہ کہا ہے کہ تو اعجاز سے گھل مل کر رہنے کی کوشش کر، اس کے سامنے بن سنور کر رہا کر مگر تیری تو سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ کل کلاں کو وہ چڑیل منزہ اسے لے اڑی تو ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔ پھر رہنا کسی جنگل میں جاکر۔“

اچانک ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ تائی چاہتی تھیں کہ شہلا مجھے اپنے حُسن کے جال میں پھانس کر شادی کرلے اور بیٹی کے ساتھ ساتھ وہ بھی عیش کریں۔ ایک لمحے کو مجھے ان سے گھن سی محسوس ہوئی۔ وہ کیسی ماں تھیں جو اپنی بیٹی کو اس قسم کی ترغیب دے رہی تھیں۔

میں نے خاموشی سے منزہ کے نوٹس اٹھائے اور باہر آگیا۔ امی اور پھپو شاید اوپر تھیں۔ ابو نے بعد میں اوپر بھی تین کمرے تعمیر کرالیے تھے۔

میرا موڈ بہت خراب ہوگیا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے تیز رفتاری سے دوڑانے لگا۔ میرے مزاج کی اس تبدیلی کو منزہ نے بھی محسوس کرلیا۔ وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔ ”جوزی! کوئی پرابلم ہے، کوئی پریشانی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”پھر تمہارا موڈ کیوں آف ہے؟ کیا امی نے کچھ کہہ دیا ہے؟ میں جانتی ہوں کہ تمہارا موڈ خراب ہو تو تم گاڑی جیٹ فائٹر کی طرح دوڑاتے ہو۔“

میں ابھی تک منزہ اور شہلا کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھا۔ مجھے منزہ بھی اچھی لگتی تھی اور شہلا بھی! تائی نے میری یہ مشکل آسان کردی تھی۔ میں نے اچانک منزہ سے کہا۔ ”منزہ! مجھ سے شادی کروگی؟“

”کیا...... کیا...... کیا کہا تم نے؟“ منزہ سنجیدہ ہوکر بولی۔ ”اگر یہ مذاق ہے جوزی تو بہت ہول ناک مذاق ہے۔“

”میں سنجیدہ ہوں منزہ!“ میں نے کہا۔ ”اور پورے ہوش و حواس کے ساتھ پوچھ رہا ہوں کہ مجھ سے شادی کروگی؟“

”تمہیں یہ بات پوچھنے کی ضرورت ہے؟“ منزہ جذباتی ہوگئی۔ ”کیا تمہیں میری آنکھوں میں، میری باتوں میں میرا اقرار نظر نہیں آتا؟“

”اس کے باوجود میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے تیز رفتاری سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

منزہ جھٹکے سے مجھ پر آگری اور بولی۔ ”ہاں، ہاں، ہاں۔“ اس نے میرے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ”اب کہو تو یہی بات لکھ کر بھی دے دوں؟“

”نہیں، بس اتنا ہی کافی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں امی سے آج ہی بات کروں گا۔“

”اب ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“ منزہ شرما کر بولی۔

”جلدی ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر ہم لوگ دیر تک مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔

میں واپس پہنچا تو تائی نے قہر آلود نظروں سے منزہ کو گھورا اور مجھ سے بولیں۔ ”اعجاز میاں! مجھے کچھ کہنا تو نہیں چاہیے لیکن میں اس گھر کی بڑی ہوں۔ کسی جوان جہان لڑکی کو اتنی دیر تک ساتھ لے کر گھومنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“

میں نے دیکھا، ان کی بات سن کر پھپو کے چہرے کا

رنگ اڑ گیا۔ امی بھی کچھ نادم نادم سی نظر آنے لگیں۔

''کچھ دن پہلے شہلا میرے ساتھ گئی تھی تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''شہلا میں اور اس منزہ میں تمہارے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں ہے؟'' تائی کا لہجہ درشت تھا۔

''کیا فرق ہے؟'' میں نے کہا۔ ''دونوں ہی لڑکیاں ہیں اور بقول آپ کے دونوں جوان جہان ہیں۔''

''تمہاری زبان بہت چلنے لگی ہے جوزی!'' امی نے مجھے ڈانٹا۔ ''بڑوں سے ایسے بات کی جاتی ہے؟''

میں نے امی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''اچھا، تم ذرا اپنی پھپھو کو گھر چھوڑ آؤ۔'' امی نے کہا۔

''ارے نہیں حمیرا!'' پھپھو نے کہا۔ ''میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں پھپھو!'' میں نے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے آپ ٹیکسی سے جائیں گی؟''

میں انہیں لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں پھپھو کو چھوڑ کر واپس آیا تو شہلا بنی سنوری برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ اس نے جدید تراش کے چست کپڑے پہن رکھے تھے، پیروں میں خاصی اونچی پنسل ہیل کی چپل تھی۔ اسے اتنی اونچی ایڑی کی چپل پہننے کا تجربہ نہیں تھا اس لیے وہ بہت سنبھل سنبھل کر عجیب سے انداز میں چل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح لڑکھڑا گئی اور اس سے پہلے کہ وہ سینے کے بل زمین پر گرتی، میں نے اسے سنبھال لیا اور کہا۔ ''کیا تم کہیں جا رہی ہو یا پھر کہیں سے آئی ہو؟''

''نہیں تو۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''تمہاری تیاری دیکھ کر تو یہی لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا کوئی گھر میں اچھے کپڑے نہیں پہن سکتا؟'' وہ پھر مسکرائی۔

''ضرور پہنو بلکہ رات کو بھی اسی طرح بن سنور کر سویا کرو۔'' یہ کہہ کر میں اندر چلا گیا۔

میں اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھا امی کے کمرے میں پہنچا۔ ابو بیڈ پر بیٹھے دکان کا کچھ حساب کتاب کر رہے تھے اور امی ان کے نزدیک ہی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔

مجھے دیکھ کر وہ دونوں حیران ہو گئے۔ امی نے کہا۔ ''کیا بات ہے جوزی! خیریت تو ہے؟''

''امی، آپ ذرا میرے کمرے میں آئیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

ابو نے فائلوں سے سر اٹھایا اور بولے۔ ''پھر کوئی نئی فرمائش ہو گی صاحب زادے کی۔ جاؤ جا کر سن لو۔'' پھر وہ مجھ سے بولے۔ ''ایک بات میں تمہیں پہلے ہی بتا دوں جوزی! اگر تم اپنی ماں سے ہیوی بائیک کی سفارش کرانا چاہتے ہو تو فضول ہے۔ میں ابھی تمہیں وہ بائیک لے کر نہیں دوں گا۔''

''یہ بات نہیں ہے ابو!'' میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد امی بھی آ گئیں۔ اُن کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ ''خیریت تو ہے جوزی؟'' امی نے کہا۔ ''تم کچھ پریشان ہو؟''

''امی! آپ کو منزہ کیسی لگتی ہے؟'' میں نے کہا۔

امی نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولیں۔ ''تم نے اس وقت یہ پوچھنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟ منزہ بہت پیاری بچی ہے، پڑھی لکھی ہے، ذہین ہے، خوب صورت ہے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولیں۔ ''آخر بات کیا ہے؟''

''میں منزہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اچانک کہا۔

''کیا؟'' امی حیران رہ گئیں۔ ابھی تو تم نے اے لیول بھی نہیں کیا ہے۔ تمہیں ابھی سے شادی کی فکر پڑ گئی اور منزہ بھی تو ابھی میٹرک میں ہے۔''

''امی، میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ فوراً میری شادی کر دیں۔ آپ کم از کم منزہ سے میری منگنی تو کر ہی سکتی ہیں۔ شادی تو میں اس وقت کروں گا جب اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔''

''آخر بات کیا ہے؟'' امی بھی سنجیدہ ہو گئیں۔ ''کیا باجی نے کچھ کہا ہے یا وہ منزہ کی شادی کہیں اور کر رہی ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے امی!'' میں نے کہا۔ ''بس، میں چاہتا ہوں کہ منزہ سے میری منگنی ہو جائے۔''

''میں باجی سے بات کروں گی'' امی نے کہا۔ وہ میڈم خورشید کو باجی کہتی تھیں۔ ''پہلے وہ بھی اس منگنی پر راضی ہوں۔''

''آپ کل ہی پھپھو سے بات کر لیں۔'' میں نے کہا۔

''ایسی کیا آفت آ گئی ہے جوزی؟'' امی جھنجلا گئیں۔ ''منزہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہے۔ اور اس کا کوئی رشتہ آئے گا بھی تو باجی مجھ سے اور تمہارے ابو سے مشورہ ضرور کریں گی۔''

''امی، آپ سمجھتی کیوں نہیں۔'' میں جھنجلا گیا۔

''آخر بات کیا ہے جوزی؟'' امی پریشان ہو گئیں۔

''تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟''

''امی، مجھے تو بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

امی مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ ''جوزی! مجھے صاف صاف بتا۔ کہیں تو نے کوئی ایسی حرکت تو نہیں کر دی کہ......''

''مجھے غلط مت سمجھیں امی!'' میں نے کہا، پھر انہیں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

وہ حیرت سے گنگ میری باتیں سن رہی تھیں۔ پھر وہ پرتشویش لہجے میں بولیں۔ ''بھابی سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔ وہ اتنی گھٹیا سوچ کی مالک ہیں، میں کل ہی باجی سے منگنی کی بات کرتی ہوں۔ باقی تمہارے ابو کے کان میں ان باتوں کی بھنک نہ پڑے۔ وہ اپنے بھائی اور بھابی کے خلاف کچھ بھی سننا پسند نہیں کرتے ہیں۔''

دوسرے دن صبح ہی صبح شکور چاچا آ گئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ ہم لوگ اس وقت ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے۔ تایا جان اور تائی اپنے کمرے میں تھے۔ جاوید اور رشید ناشتے کے بعد ورک شاپ روانہ ہو چکے تھے۔

''کیا بات ہے شکور بھائی؟'' ابو نے پوچھا۔ ''آج صبح ہی صبح کیسے آ گئے۔ میں بس نکلنے ہی والا تھا۔''

''احسان میاں!'' چاچا شکور نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کل میں بینک میں کیش جمع کرانا بھول گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج صبح کیش جمع کرا دوں گا۔''

''ارے شکور بھائی تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' ابو نے مسکرا کر کہا۔ ''پہلے بھی تو کئی دفعہ ایسا ہو چکا ہے۔''

''پریشانی کی بات یہ ہے احسان میاں کہ گلے میں سے کیش غائب ہو گیا ہے۔'' شکور چاچا کا لہجہ مزید دھیما ہو گیا۔ ''ہزار دو ہزار کی بات ہوتی تو مجھے اتنی پریشانی نہیں ہوتی۔ کیش میں پورے بیس ہزار روپے کم ہیں۔''

''کیا؟'' ابو گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

''احسان میاں!'' شکور چاچا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''گلے کی چابیاں تو میرے ہی پاس ہوتی ہیں۔ تمہارا شک تو مجھ ہی پر جائے گا لیکن میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے آج تک ایک پیسے کا بھی ہیر پھیر نہیں کیا۔''

''میں جانتا ہوں بھائی شکور!'' ابو نے کہا۔ ''تم برسوں سے میرے ساتھ کام کر رہے ہو۔ تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ رقم تم نے اچھی طرح گن کر رکھی تھی؟''

''تم جانتے ہو احسان میاں کہ پیسوں کے معاملے میں مجھ سے بھول چوک نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی پورے بیس ہزار روپے کی۔''

ان دنوں بیس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی تھی۔ ہزار، بارہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پانے والے اس دور میں خوش نصیب سمجھے جاتے تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ یہ دکان کے کسی ملازم لڑکے کی حرکت ہو سکتی ہے؟''

''دکان کا کوئی ملازم تو گلے کے پاس آتا بھی نہیں ہے۔ کل تو بھائی امان بھی موجود نہیں تھے۔ وہ بھی شام کو دکان بند ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے۔''

''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ حرکت کون کر سکتا ہے؟'' ابو نے کہا۔ ''اگر میں پولیس میں رپورٹ لکھاؤں تو دکان کی بدنامی الگ ہو گی اور پولیس والے دکان کے ہر ملازم کو شبہے میں پکڑ کر لے جائیں گے۔''

''وہ سب سے پہلے تو مجھے الٹا لٹکا دیں گے۔'' شکور چاچا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ شکور نے رقم چرائی ہے۔'' چاچا شکور کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ارے ارے بھائی شکور!'' ابو نے کہا۔ ''لوگ کچھ بھی سمجھیں لیکن مجھے تم پر پورا بھروسا ہے، تم بیس سال سے میرے ساتھ کام کر رہے ہو۔ میں تو تمہارے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' پھر ابو مسکرا کر بولے۔ ''اب اس قصے کو بھول جاؤ۔ دوسرا کام یہ کرو کہ بازار سے کوئی اچھی سی تجوری خرید لو اور اسے کبھی کھلا مت چھوڑنا۔ ایک لمحے کے لیے بھی کہیں جاؤ تو تجوری بند کر کے چابیاں اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔''

مجھے شبہ کیا بلکہ یقین تھا کہ یہ کام تایا نے کیا ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ میں اس معاملے کی کھوج لگا کر رہوں گا۔

امی اس دن کی بجائے دوسرے دن پھپھو کے گھر گئیں۔ راستے میں انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے تمہارے ابو سے بات کر لی ہے۔ وہ تو سن کر ہی خوش ہو گئے۔ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ تم فوری طور پر اس منگنی پر زور دے رہے ہو۔

حسبِ توقع پھپھو نے اس رشتے کو قبول کر لیا۔

امی نے منگنی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تائی کو معلوم ہوا تو انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اے حمیرا! ابھی تو شمائلہ بیٹھی ہے۔ اعجاز کی منگنی کی ایسی جلدی کیا ہے؟''

”بھابی، میں کون سا شادی کرنے جا رہی ہوں۔ اصل میں منزہ کے ایک دو رشتے آ گئے ہیں۔ اگر میں نے ابھی منگنی نہ کی تو پھر اس کا رشتہ کہیں اور ہو جائے گا۔“

”اے تو کیا لڑکیوں کی کمی ہے ہمارے اعجاز کو؟“ تائی نے منہ بنا کر کہا۔ ”اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی مل جائے گی۔ منزہ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟“

”بھابی! یہ تو آپ اپنے بھتیجے سے پوچھیں۔ اس نے ضد پکڑلی ہے کہ میں منزہ ہی سے شادی کروں گا۔“

ایک ہفتے کے اندر اندر میری منگنی منزہ سے ہو گئی۔ طاہر صاحب بھی شاید اس منگنی کے انتظار میں تھے۔ منگنی کے تیسرے ہی دن انہیں دل کا شدید دورہ پڑا اور اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔

پھپھو اور منزہ پر تو گویا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ان کے بیٹے نے غیروں کی طرح ماں سے ٹیلی فون پر تعزیت کی اور کہا کہ میں فوری طور پر نہیں آ سکتا۔ ہاں فرصت ملتے ہی پاکستان آؤں گا یا آپ لوگوں کو بھی یہاں بلالوں گا۔

ابھی پھپھو اس صدمے سے سنبھل بھی نہ پائی تھیں کہ مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

اس دن ہمیں کسی شادی میں جانا تھا۔ گاڑی رات سے اسٹارٹ ہونے میں مسئلہ کر رہی تھی۔ ابو نے جاوید بھائی سے کہا کہ تم صبح ورک شاپ جانے سے پہلے گاڑی کا انجن دیکھ لینا۔ کل ہم لوگوں کو شادی میں جانا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گاڑی راستے میں کہیں کھڑی ہو جائے۔

جاوید بھائی نے کہا صبح تو نہیں، ہاں میں کل دوپہر تک گاڑی کی خرابی دور کرا دوں گا۔ آپ کو تو یوں بھی شام کو جانا ہے۔

سہ پہر کے وقت جاوید بھائی وعدے کے مطابق گھر آ گئے اور گاڑی کا بونٹ اٹھا کر کام میں مصروف ہو گئے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر انہوں نے خرابی دور کر دی۔ شام کو ہم لوگ تیار ہو کر شادی کے لیے نکلے۔ شادی نارتھ ناظم آباد میں تھی۔ اس دور میں وہاں کا راستہ خاصا طویل تھا۔ راشد منہاس روڈ موجود تو تھا لیکن لوگ اسے کم ہی استعمال کرتے تھے کیونکہ اس وقت تک وہاں گلستان جوہر کی آبادی کی بجائے جنگل تھا۔

ہم گھر سے نکلے تو ڈرائیونگ ابو ہی کر رہے تھے۔

مجھے اچانک خیال آیا کہ میرے کیمرے میں رول نہیں ہے۔ میں نے ابو سے کہا کہ کسی فوٹوگرافر کی دکان کے پاس گاڑی روک لیں۔

میں رول لینے کے لیے دکان میں داخل ہوا تو میرے اسکول کا ایک ساتھی اقبال وہاں مل گیا۔ وہ بھی اپنے کیمرے کے لیے رول لینے آیا تھا۔ دکان پر وہ رول نہیں تھا۔

اقبال بھی نارتھ ناظم آباد میں رہتا تھا اور اس کے پاس بھی گاڑی تھی۔ دکان والے نے بتایا کہ یہ رول آپ کو یہاں نہیں ملے گا بلکہ صدر میں ملے گا۔

ممکن ہے ڈھونڈنے پر وہ رول ہمیں وہیں کسی دکان پر مل جاتا۔ میں نے ابو سے کہا کہ آپ لوگ جائیں، میں رول لے کر اقبال کے ساتھ وہاں پہنچ جاؤں گا۔

اقبال مجھے گاڑی میں لے کر صدر روانہ ہو گیا اور ابو نارتھ ناظم آباد کی طرف چلے گئے۔

میں رول لے کر شادی ہال میں پہنچا تو ابو اس وقت تک وہاں نہیں پہنچے تھے۔

پھر برات آ گئی، نکاح ہو گیا اور کھانا شروع ہو گیا لیکن ابو وہاں نہیں پہنچے۔

میں عالمِ اضطراب میں ٹہل رہا تھا، کبھی میں ہال کے مرکزی دروازے تک جاتا تھا، کبھی مہمانوں پر نظر ڈالتا تھا کہ شاید وہ لوگ آ گئے ہوں۔ انکل جمشید جن کی بیٹی کی شادی تھی، وہ بھی کئی بار مجھ سے ابو کے بارے میں پوچھ چکے تھے۔ ان دنوں موبائل فون نہیں تھے کہ میں ٹیلی فون کر کے ہی کچھ معلوم کر لیتا۔

آخر رخصتی کا وقت آ گیا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ گاڑی کہیں راستے میں خراب نہ ہو گئی ہو۔ مجھے اقبال کا ٹیلی فون نمبر یاد تھا۔ میں نے شادی ہال سے اسی کو ٹیلی فون کیا اور اس سے کہا کہ فوراً یہاں پہنچو۔ ابو وغیرہ ابھی تک یہاں نہیں آئے ہیں۔

اقبال بے چارہ فوراً ہی گاڑی لے کر آ گیا۔ ہم اس امید پر واپسی کے راستے پر روانہ ہوئے کہ اگر گاڑی خراب بھی ہوئی ہو گی تو کہیں کھڑی ہوئی نظر آ جائے گی۔ ممکن ہے ابو ٹیکسی کے ذریعے واپس گھر چلے گئے ہوں۔ مجھے اپنی حماقت پر افسوس بھی ہوا کہ میں نے گھر ٹیلی فون کر کے ابو کے بارے میں معلوم کیوں نہیں کیا؟

کارساز سے شاہراہ فیصل پر آتے ہی مجھے سڑک کے ایک طرف ایک گاڑی تباہ شدہ حالت میں دکھائی دی۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کیونکہ وہ گاڑی

مارک ٹو تھی، میں نے اقبال سے گاڑی روکنے کو کہا اور دوڑ کر تباہ شدہ گاڑی تک پہنچا۔ گاڑی کا نمبر دیکھ کر مجھے زور کا چکر آیا کیونکہ وہ ہماری ہی گاڑی تھی۔ گاڑی کی سیٹوں اور سڑک پر اب بھی خون پھیلا ہوا تھا جو جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ پھر اچانک میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں جناح اسپتال میں تھا۔ اقبال نے مجھے بتایا کہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ گاڑی میں سوار کوئی شخص بھی نہ بچ سکا۔

میرا دل شدتِ غم سے گویا پھٹنے لگا۔ میرے ابو، امی اور میری پیاری بہن شمائلہ سب مجھے چھوڑ گئے۔

ڈاکٹروں نے مجھے ڈرپ لگا دی تھی۔ میں نے جنون کے عالم میں ڈرپ نکال کر پھینک دی اور اقبال سے کہا۔ ”امی ابو اور شہلا کہاں ہیں، مجھے ان کے پاس لے چلو۔“

”انہیں تمہارے تایا گھر لے جا چکے ہیں۔“ اقبال نے کہا۔

”تو پھر مجھے بھی گھر لے چلو۔“ میں اچانک بیڈ سے کھڑا ہو گیا۔

اقبال مجھے لے کر گھر پہنچا تو وہاں تین جنازے رکھے ہوئے تھے۔ محلے کے سب لوگ اور مارکیٹ کے دکان دار وہاں جمع تھے۔ تایا ہر آنے والے سے گلے مل مل کر رو رہے تھے، مجھے اچانک سامنے دیکھ کر ان کے چہرے پر شدید حیرانی کے تاثرات ظاہر ہوئے، پھر وہ فوراً ہی آگے بڑھے اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میں بھی اس دن اتنا رویا کہ نڈھال ہو گیا۔ حادثے کی اطلاع پھپھو کو بھی مل چکی تھی۔ وہ بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور سمجھایا کہ رونے کی بجائے ان لوگوں کی مغفرت کی دعا کرو۔

پھر جیسے سب کچھ خواب کے سے عالم میں ہوتا رہا۔ مجھے تو یہی لگ رہا تھا کہ میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔

اپنے پیاروں کو منوں مٹی کے نیچے دبا کر میں واپس آ گیا۔ مجھے پھر خود پتا نہیں کہ اس اندوہناک حادثے کے بعد میں زندہ کیسے رہا۔

پھر دن گویا پر لگا کر اُڑ گئے۔ میرے امی ابو اور بہن کا چالیسواں بھی ہو گیا۔

تایا اس دوران میں میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہ تو بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس میں بھی ان کی کوئی مصلحت تھی۔

ایک دن میں پھپھو کے گھر سے واپس آیا تو تائی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اعجاز میاں! تمہارے ماں باپ کے بعد ہم ہی تمہارے سرپرست ہیں، تمہاری ماں سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس نے منزہ جیسی آوارہ لڑکی سے تمہاری منگنی کر دی۔ ہم وہ منگنی توڑ رہے ہیں۔“

”آپ ہوتی کون ہیں منگنی توڑنے والی؟“ میں نے ترخ کر کہا۔

”مجھ سے زیادہ بکواس کرو گے تو ابھی کھڑے کھڑے گھر سے نکال دوں گی۔“ تائی نے کہا۔

”آپ مجھے میرے ہی گھر سے نکالیں گی۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”اعجاز میاں!“ تایا نے نرم لہجے میں کہا۔ ”یہ تو تم جانتے ہو کہ احسان پلاسٹک کا سامان اور تولیا بنانے کا کارخانہ لگا رہا تھا؟“

”جی ہاں، انہوں نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اتنے بڑے کاروبار کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے مرنے سے کچھ دن پہلے یہ مکان اور اپنی دکان مجھے فروخت کر دی تھی۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ”لیکن ابو نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔“ میں نے کہا۔

”اسے مہلت نہیں ملی، میرے پاس دکان اور مکان کے کاغذات موجود ہیں، تم تو پڑھے لکھے ہو، خود ہی دیکھ لو۔“

انہوں نے الماری سے کچھ فائلیں نکالیں اور مجھے دکھا دیں۔ ان کاغذات کی رُو سے ابو نے اپنا مکان، دکان سب کچھ تایا کو فروخت کر دیا تھا۔

”اب یہ مکان ہمارا ہے لیکن تم چاہو تو یہاں رہ سکتے ہو۔“ تایا نے کہا۔

”نہیں جی نہیں۔“ تائی نے کہا۔ ”یہ اسی شرط پہ یہاں رہ سکتا ہے جب یہ منزہ سے منگنی توڑ کر شہلا سے شادی کرے گا۔“

ان سے کچھ کہنا سنا فضول تھا۔ میں نے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں لیں اور خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ برسوں پہلے اسی طرح ابو کو بھی تایا نے گھر سے نکال دیا تھا۔ میں وہاں سے سیدھا پھپھو کے گھر پہنچا۔ انہیں ساری صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ سکتے میں رہ گئیں، پھر بولیں۔ ”احسان میاں کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔ تمہارے تایا نے مکان اور دکان کے جعلی کاغذات بنوائے ہیں۔“

”میں انہیں عدالت میں گھسیٹ لوں گا۔“ میں نے

چیخ کر کہا۔

''اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' پھپھو نے کہا۔ ''اس قسم کے مقدمات عدالتوں میں برسوں چلتے ہیں پھر اب تو تمہارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ تم مقدمہ لڑسکو۔''

ان کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ اب مجھے نئے سرے سے زندگی شروع کرنا تھی۔ میں پھر اسی مقام پر کھڑا تھا جہاں سے ابو نے سفر شروع کیا تھا۔

پھپھو مجھے لے کر دوسرے ہی دن اس اسکول میں پہنچیں جہاں وہ بھی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ وہاں ان ہی کی ماتحت ایک ٹیچر..... ہیڈ مسٹریس تھی۔ اس نے بہت عزت و احترام سے پھپھو کو بٹھایا۔ وہ اسکول اب بہت ترقی کر چکا تھا۔ وہاں اب باقاعدہ ایک کینٹین بھی بن چکی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اب تک اسکول والوں نے اس کا ٹھیکا کسی کو نہیں دیا تھا۔

پھپھو نے بھاگ دوڑ کر کے اپنے کچھ پرانے جاننے والوں اور کچھ شاگردوں کی مدد سے وہ ٹھیکا مجھے دلا دیا۔

ابو میں اور مجھ میں فرق یہ تھا کہ ابو اسکول کے باہر آلو چھولے کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ میں اسکول کی کینٹین میں سامان بیچتا تھا۔

پھر شکور چاچا بھی وہیں آگئے۔ تایا نے انہیں بھی دکان سے نکال دیا تھا۔

☆☆☆

میں نے اس اسکول کی کینٹین کے ٹھیکے کے بعد مختلف کمپنیوں میں کینٹین کے ٹھیکے لیے۔ محنت اور لگن سے کام کیا جائے اور نیت صاف ہو تو اللہ تعالیٰ بھی مدد کرتا ہے۔ اللہ نے میری ایسی مدد کی کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔ صرف چار سال کے عرصے میں ان ٹھیکوں سے میں نے اتنا کما لیا کہ نارتھ ناظم آباد میں اپنے مکان سے بھی زیادہ بڑا اور شان دار بنگلا تعمیر کرلیا۔ پھر میں اپنی دلہن کے ساتھ اس بنگلے میں منتقل ہوگیا لیکن اب پھپھو بھی میرے ساتھ تھیں۔

ابو پلاسٹک کا سامان اور تولیا بنانے کا کارخانہ لگانا چاہتے تھے۔

تین سال بعد میں نے وہ کارخانے بھی لگا لیے۔

☆☆☆

میں گزشتہ دنوں منزہ کے ساتھ ڈرگ کالونی کی طرف گھومنے نکل گیا۔ میرا بیٹا ارسلان اور بیٹی شمائلہ بھی ساتھ تھی۔ میں نے اپنی بیٹی کا نام بھی شمائلہ ہی رکھا تھا۔

اچانک ایک برقع پوش عورت میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور بولی۔ ''بابو! میں صبح سے بھوکی ہوں، تمہیں اپنے بچوں کا واسطہ، مجھے روٹی کھلا دو۔''

میں اس عورت کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آگیا کہ وہ آواز شہلا کی ہے۔

''شہلا! تم یہاں اور اس حال میں؟''

اس نے وہاں سے جانے کی کوشش کی لیکن منزہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

اس نے بتایا کہ تمہارے گھر چھوڑنے کے ایک سال بعد ہی ابو کا انتقال ہوگیا تھا۔ پھر اماں کو فالج ہوگیا اور دو سال بعد وہ بھی چل بسیں۔

دونوں بھائیوں کو جوئے کی لت لگ گئی تھی۔ انہوں نے پہلے تو جوئے میں دکان ہاری، پھر مکان بھی اونے پونے بیچ دیا۔

جوا کھیلتے ہوئے ہی ان کا کچھ بدمعاشوں سے جھگڑا ہوا۔ اس جھگڑے میں جاوید بھائی مارے گئے اور رشید بھائی کو پولیس نے گرفتار کرلیا۔ ان پر قتل کا الزام تھا۔ اسی الزام میں انہیں عمر قید ہوگئی۔

میں نے پہلے تو لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پونچھا اور برتن دھونے کی نوکری کی لیکن میری خوبصورتی کی وجہ سے کسی بھی مالکن نے مجھے زیادہ دن ٹکنے نہ دیا۔ پیٹ بھرنے کو آخر میں کیا کرتی۔ میرے پاس ایک عزت ہی تھی جسے بیچ کر میں اپنے پیٹ کا دوزخ بھر سکتی تھی لیکن یہ میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ ناچار ہو کر مجھے بھیک مانگنا پڑی۔ میں اپنا چہرہ برقع میں اس لیے چھپاتی ہوں کہ لوگوں کی ہوس زدہ نظروں سے بچی رہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

☆☆☆

اب شہلا بھی ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی عمر زیادہ ہو چکی ہے لیکن خوبصورتی اب بھی برقرار ہے۔ پھپھو اس کے لیے رشتے دیکھ رہی ہیں۔ میں نے سنا تو تھا، اب اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ میں تو اپنے تایا اور ان کے خاندان کے لیے بھی مغفرت کی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے کہ وہ میرا خون تھے، یہ الگ بات کہ ان کے خون کا رنگ سفید ہوگیا تھا۔ خیر، اب ان کا ذکر ہی کیا؟ اب تو وہ چہرے ہی خواب ہوئے۔

سبق آزما

جناب معراج رسول

آداب!

میں اپنی آپ بیتی روانہ کررہا ہوں گوکہ یہ نفسیاتی گتھیوں میں الجھی ہوئی ہے۔ لیکن قارئین کو پسند آئے گی اس لیے کہ آپ کے ہاں منفرد انداز کی آپ بیتیاں شائع ہوتی ہیں اور میری داستان سب سے الگ ہے۔

• مبشر فاروقی
(کراچی)

میرا تعلق ایک عجیب سے گھرانے سے ہے۔ عجیب ان معنوں میں کہ ہمارے ہاں تصورِ زندگی ہمارے معاشرے کے عام تصورِ زندگی سے مختلف ہے۔ یہ کس طرح سے مختلف ہے اس کی وضاحت میری سچ بیانی پڑھ کر آپ کو خود ہو جائے گا۔ میرے والدین دریا کے ایسے دو کنارے تھے جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتے رہے لیکن کبھی آپس میں مل نہ سکے۔ میری والدہ مذہبی خاتون ہیں جب کہ میرے والد شکیل احمد نہایت آزاد خیال شخص تھے۔ شاید میں نے غلط

کہہ دیا۔ صحیح لفظ عیش پسند ہوگا۔ وہ آغازِ جوانی سے عیش پسند تھے۔ میری والدہ سے شادی سے پہلے انہوں نے نہ جانے کتنی لڑکیوں سے چکر چلائے تھے اور نہ جانے کتنوں سے ان کے تعلقات رہے تھے۔ مگر میری والدہ کے گھر والوں کے سامنے ان کا تاثر نہایت شریف لڑکے کا تھا اس لیے انہوں نے بہ خوشی اپنی مذہبی خیالات رکھنے والی، نماز روزے اور پردے کی پابند بیٹی کی شادی میرے والد سے کر دی اور یہ تفتیش کرنے کی زحمت نہیں کی کہ ان کا اصل کردار کیا تھا۔

میرے والد نے میری والدہ سے شادی صرف ایک وجہ سے کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آزاد خیال اور عام لڑکیوں کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ شادی سے پہلے انہوں نے کتنے چکر چلائے ہیں اور وہ کنواری بھی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ والدہ کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ پاکیزہ کردار رکھتی ہیں اس لیے انہوں نے امی سے شادی کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ میری والدہ عام سی صورت کی ہیں، جبکہ میرے والد ان مردوں میں سے تھے جو بہت خوبرو ہوتے ہیں اور عورتیں خود ان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ بڑھاپے میں یہ حال تھا کہ راہ چلتی عورتیں اور لڑکیاں انہیں دیکھ کر ٹھٹک جاتی تھیں۔ جوانی کا آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ شاید قارئین کو تعجب ہو کہ میں اپنے باپ کا ذکر اس طرح سے کر رہا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے باپ کا کردار ایسا تھا کہ ہمیں کسی کو ان کے بارے بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ مجبوری یہ ہے کہ جو سچ بیانی میں آپ کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں اس کا تعلق میرے باپ کے کردار سے جڑا ہے۔

مجھ سے پہلے میری دو بہنیں دنیا میں آچکی تھیں۔ تیسری اولاد میں تھا۔ میرے بعد مزید ایک بہن اور ایک چھوٹا بھائی دنیا میں آئے۔ والد کا ایک چھوٹا ریڈی میڈ گارمنٹ کا کارخانہ تھا۔ جب تک میں بڑا ہوا یہ کاروبار بہت پھیل گیا تھا اور اس کی درجن سے بھی زیادہ شاخیں شہر کے متوسط طبقے کے علاقوں میں پھیل گئی تھیں۔ تیار مال زیادہ تر باہر جاتا تھا۔ ہم مالی لحاظ سے خوش حال تھے۔ میں جس گھر میں پیدا ہوا وہ بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن اچھے علاقے میں تھا۔ گھر میں گاڑی سمیت تمام آسائشیں موجود تھیں۔ پھر والد کے شوق بھی ایسے تھے جن کے لیے بہت ساری رقم درکار ہوتی ہے۔ وہ کھل کر عیاشی کے قائل تھے۔ اس کے باوجود میں نے گھر میں کبھی کوئی تنگی یا کمی نہیں دیکھی۔ بچپن سے ہم نے بہت پُرآسائش زندگی گزاری اور ہماری تمام خواہشیں پوری ہوئی تھیں۔ یہ سچ ہے میرے والد نے ہمیں کبھی کوئی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔

میری بہنیں مجھ سے بڑی تھیں اور پھر لڑکیاں ان معاملات میں زیادہ سمجھدار ہوتی ہیں اس لیے وہ شاید مجھ سے پہلے واقف ہو گئی تھیں۔ میں دس یا گیارہ سال کا تھا جب میرے والد کا اصل کردار میرے سامنے آیا۔ ہمارے گھر کے دو فلور تھے۔ گراؤنڈ فلور اتنا بڑا تھا کہ ہماری ضرورت کے لیے کافی تھا اس میں تین بڑے بیڈروم، بڑا سا لاؤنج اور بڑا سا ڈرائنگ و ڈائننگ روم تھا۔ سامنے والے حصے میں کار پورچ کے ساتھ چھوٹا سا لان بھی تھا۔ اوپر والے فلور پر ایک بڑا خوب صورت بیڈروم اور لاؤنج بنا ہوا تھا۔ اس بیڈروم میں ایسی روشنیاں لگی تھیں جو گھومتی تھیں اور بڑا سا گول بیڈ تھا۔ دائیں بائیں آئینے لگے تھے، چھت پر بھی آئینے تھے۔ دیواروں پر ایسی تصاویر لگی تھیں جن کو دیکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اس بیڈروم کی چابی والد کے پاس ہی ہوتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ہم بہن بھائیوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی کہ اکثر والد رات گئے آتے، خاموشی سے کار اندر لا کر دبے قدموں اوپر والے بیڈروم میں چلے جاتے تھے۔ جب ایسا ہوتا میری والدہ نچلے فلور کا دروازہ اندر سے بند کر لیتی تھیں اور ہمیں باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اگلی صبح جب وہ نیچے آتے تب ہمارے فلور کا دروازہ کھلتا تھا اور ہمیں باہر نکلنے کی اجازت ملتی تھی۔ اس روز اتفاق سے والد جلدی آگئے اور میں لان میں لگے جھولے پر بیٹھا تھا۔ کار کی آواز سن کر میں بنچ کے پیچھے دبک گیا کیونکہ ہمیں رات نو بجے کے بعد باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ والد نے خاموشی سے گیٹ کھولا اور کار اندر لے آئے۔ جیسے ہی کار رکی اس سے ایک عورت نکل کر تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے فلور پر چلی گئی۔ سیڑھیاں کار پورچ کے ساتھ ہی تھیں۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس وقت میں اسکول میں ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا اور میرے ساتھ کے اکثر لڑکے ڈیفنس سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ان کے گھروں کا ماحول بھی کوئی خاص مختلف نہیں تھا اور وہ سب جانتے تھے۔ جب لڑکے آپس میں ملتے تو ہر قسم کی گفتگو ہوتی تھی اس لیے میں گیارہ سال کی عمر میں ہی مرد عورت کے تعلق کے بارے میں جان گیا تھا اور یہ بھی جان گیا تھا کہ اس میں جائز کیا ہوتا ہے اور ناجائز کیا ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ عورت جو میرے باپ کے ساتھ آئی تھی کیوں آئی تھی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی سمجھ گیا کہ جب والد دیر سے آتے تھے تو والدہ کیوں دروازہ اندر سے بند کر لیتی تھیں اور ہمیں باہر جانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ میں دبے قدموں اپنے کمرے میں آگیا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ میرے باپ کا کردار مجھ پر کھلتا چلا گیا۔ اس وقت وہ خود چالیس برس سے اوپر کے ہو گئے تھے اور انہیں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ان کی بیٹیاں جوان ہو رہی تھیں اور وہ سولہ سترہ سال کی لڑکیوں کو گھر لے کر آتے تھے۔ ان کے ساتھ ڈیٹ پر جاتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کھلے عام انہیں لے کر گھومتے تھے۔ یہ عام گھرانوں کی لڑکیاں تھیں مگر ان کی آنکھوں پر میرے باپ کی وجاہت اور دولت کی پٹی بندھ جاتی تھی اور وہ بہ خوشی ان کے ساتھ چلی آتی تھیں۔ حسن، جوانی اور دولت کے کھیل میں دونوں فریق ایک دوسرے سے دل بھر کر فائدہ اٹھاتے تھے اور جب دل بھر جاتا تو دونوں اپنی اپنی راہ لیتے تھے۔ میرے باپ کو لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ ایک جاتی نہیں تھی کہ اس سے پہلے دوسری مل جاتی تھی۔

ایک طرف میرے والد کا یہ طرزِ زندگی تھا دوسری طرف میں نے اپنی ماں کو شدید بیماری کی حالت میں بھی کوئی نماز یا روزہ چھوڑتے نہیں دیکھا تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ شرعی پردہ کرتی تھیں اور والد کے گھر میں سوائے ان کے والد کے اور کسی کے سامنے بغیر نقاب کے نہیں جاتی تھیں۔ وہ میرے چچاؤں سے بھی پردہ کرتی تھیں۔ انہوں نے شادی کے بعد والد سے کہا۔ ”آپ میرے گھر کی حدود سے باہر جو چاہے کرتے رہیں لیکن یہاں میں کوئی غلط کام نہیں ہونے دوں گی دوسری صورت میں آپ مجھے طلاق دے دیں۔“

والد طلاق دینے کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ تو خود بھی ایسی ہی بیوی چاہتے تھے جس کے بارے میں ان کو مکمل اطمینان ہو کہ وہ گھر میں ان کی عزت محفوظ رکھے گی۔ اس لیے انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ گھر سے باہر کر لیا اور کچھ عرصے بعد مکان کا اوپری فلور بنا کر وہاں رہنے لگے۔ وہ نیچے بہت کم آتے تھے۔ نچلے فلور کے تمام معاملات میں امی خود مختار تھیں اور والد اس میں دخل نہیں دے سکتے تھے۔ جیسے امی نے فیصلہ کیا کہ ٹی وی گھر میں نہیں رہے گا۔ والد نے کہا۔ ”بچوں کی تفریح کی چیز ہے تم انہیں محروم نہ کرو۔“

”میرے گھر میں ٹی وی نہیں رہے گا۔“ امی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ صرف ٹی وی نہیں بلکہ امی نے کوئی میوزک چلانے والی چیز بھی رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہم بچوں پر کڑی نظر رکھتی تھیں کہ ہماری سرگرمیاں کیا ہیں اور ہم کیا سیکھ رہے ہیں۔ گھر میں اخبارات کے ساتھ رسائل بھی آتے تھے۔ امی نے انہیں چیک کر کے وہ تمام رسائل بند کرا دیے جن میں بچوں کے ذہن بگاڑنے والا مواد موجود ہوتا تھا اور ایسے رسائل لگوائے جن سے بچوں کی ذہنی تربیت ہو اور وہ اچھی باتیں سیکھیں۔ بیٹیوں پر وہ خاص نظر رکھتی تھیں۔ ہمارا اسکول گھر سے زیادہ دور نہیں تھا اور ہم آسانی سے پیدل آجا سکتے تھے۔ لیکن امی نے ہمارے لیے وین لگوا دی صرف اس لیے کہ ہم اسکول کے بعد کہیں اور نہ جا سکیں اور سیدھے گھر آیا کریں۔ گھر میں بھی ہمارا ٹائم ٹیبل طے شدہ تھا۔ دوپہر میں کھانا کھا کر ہم کچھ دیر آرام کرتے اس کے بعد قرآن شریف پڑھانے کے لیے مولوی صاحب آجاتے تھے۔ اس کے بعد عصر سے مغرب تک ہمیں کھیلنے کی اجازت تھی۔ لڑکیاں گھر کے لان تک جا سکتی تھیں اور مجھے گلی میں جا کر کھیلنے کی اجازت تھی لیکن گلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ اجازت اس وقت ملی جب میں نے میٹرک کر لیا تھا۔

مغرب کے بعد عشا تک ہمیں ہوم ورک کرنا ہوتا تھا۔ امی خود ہمیں پڑھاتی تھیں۔ وہ آدم جی کالج سے گریجویٹ تھیں اور ان کا تعلیمی معیار بہت اچھا تھا۔ عشا کے بعد ہم کھانا کھاتے اور اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ دس بجے کے بعد ہمیں لائٹ جلانے یا جاگنے کی اجازت نہیں تھی۔ امی کئی بار خود چیک کرتی تھیں کہ ہم سو رہے ہیں یا نہیں۔ یہ تو بتانا بھول گیا کہ ہمارے لیے نماز پڑھنا لازمی تھا۔ مجھے یاد ہے میں چھ سات سال کی عمر میں نماز کا پابند ہو گیا تھا اور پانچوں وقت نماز پڑھنے لگا تھا۔ امی ہر بچے کو خود تیار کرتی تھیں کہ وہ نماز پڑھے اور اپنے ساتھ ہی نماز پڑھواتی تھیں۔ اگر ہم میں سے کوئی کبھی الگ سے نماز پڑھ لیتا تو امی کو یقین نہیں آتا تھا اور وہ اپنے سامنے دوبارہ نماز پڑھواتی تھیں۔ اسی طرح انہوں نے سب بچوں کو آٹھ سال کی عمر سے روزے رکھوانے شروع کر دیے تھے اور ہم میں سے کوئی روزہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

ایک طرف تو والدہ کی طرف سے یہ ماحول

تھا۔ دوسری طرف جیسے جیسے ہم بڑے ہو رہے تھے ہمیں اپنے باپ کے ... کردار کا بھی علم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ چھپنے والی بات نہیں تھی۔ کیونکہ سارا محلّہ جانتا تھا۔ میرے ساتھ اسکول میں پڑھنے والے دوست جانتے تھے اسی طرح میری بہنوں کی سہیلیاں بھی جانتی تھیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ کوئی ہمارے گھر نہیں آتا تھا۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے برائی کو برائی ہی سمجھا جاتا تھا۔ آج اسے قبول کرلیا گیا ہے۔ گھر سے زیادہ ہمیں گھر سے باہر سے معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا باپ کس فطرت کا آدمی ہے۔ شروع میں مجھے شدید غصہ آتا تھا اور میں بولنے والے سے لڑ پڑتا تھا۔ پھر گھر آکر امی سے کہتا۔ ''امی سب ابو کے حوالے سے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔''

''صبر کرو بیٹا، کیونکہ تمہارا باپ خود کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے اور دنیا کی فطرت ہے وہ کسی کی کمزوری سے واقف ہو جائے تو اسے ممکن حد تک تنگ کرتی ہے۔''

اسکول کے آخری دنوں میں ایک سنگین جھگڑا ہو گیا۔ ایک لڑکے نے جو کلاس میں میری پوزیشن کی وجہ سے خار کھاتا تھا اس نے کلاس میں ہی سب کے سامنے مجھ سے کہا۔ ''اور سناؤ کتنی لڑکیوں سے چکر چل رہا ہے آج کل؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کیا، اپنے باپ کے بیٹے ہو وہ اس عمر میں بھی سولہ سترہ سال کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا ہے۔''

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی اور میں اس لڑکے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ اس ردِعمل کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے مار کھا گیا اور جب تک ٹیچرز اور دوسرے لوگ آکر ہمیں الگ کرتے میں نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ معاملہ سنگین تھا اور اسکول پرنسپل کے سامنے حاضری ہوئی۔ لڑکے کے ماں باپ آگئے اور وہ اسے غنڈا گردی قرار دے رہے تھے۔ مجھے اسکول سے نکالنے کا مطالبہ کر رہے تھے بہ صورت دیگر میرے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کی دھمکی دے رہے تھے۔ مگر پرنسپل نے دوسرے بچوں کی گواہی لی اور اصل صورتِ حال سامنے آئی تو انہوں نے لڑکے کے ماں باپ سے صاف کہا۔ ''غلطی آپ کے لڑکے کی بھی ہے اس نے مبشر کو اشتعال دلایا تھا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا۔''

لڑکے کے ماں باپ بہ ضد تھے کہ مجھے اسکول سے نکالا جائے۔ جب پرنسپل نے انہیں کہا کہ اس صورت میں دونوں لڑکوں کو اسکول سے نکالا جائے گا تب وہ ٹھنڈے پڑے۔ ہم دونوں کو وارننگ دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ جب امی کو پتا چلا تو انہوں نے مجھے سمجھایا۔ میں نے بے بسی سے کہا۔ ''تب میں کیا کروں؟''

''صبر میرے بچے صبر۔''

''آپ بس یہی کہتی رہتی ہیں۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''باہر تو مجھے لوگوں کی باتیں سننا پڑتی ہیں۔''

''کچھ عرصے کی بات ہے پھر تو میٹرک کر لے گا اور کسی دور کے کالج میں داخلہ لے لینا جہاں جاننے والے نہ ہوں۔''

''صرف کالج جانے سے لوگوں کی زبان چپ نہیں ہوگی ہم نے رہنا تو اسی محلے میں ہے اور یہاں ایک ایک شخص ابو کے بارے میں جانتا ہے۔''

میری بہنیں مجھ سے چار اور دو سال بڑی تھیں اور ظاہر ہے انہیں بھی باتیں سننا پڑتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ محلے میں کہیں آنے جانے سے گریز کرتی تھیں۔ کالج کی دوستوں کو گھر لانے سے گریز کرتی تھیں۔ میٹرک کے بعد میں نے ایک اچھے کالج میں داخلہ لیا اور شکر ہے وہاں میرا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ اس لیے میں سکون سے پڑھنے لگا۔ میری طرف سے امی کو اطمینان ہوا تو انہوں نے میری بڑی آپی کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ مگر جب ایک رشتے کی بات ہوئی تو آپی نے صاف انکار کر دیا۔ امی نے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ وہ کسی کو پسند کرتی ہیں اور صرف اسی سے شادی کریں گی۔ امی کے لیے یہ خبر بجلی گرنے جیسی تھی۔ انہوں نے آپی کو مارا اور رو رو کر کہنے لگیں۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا تو اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دے گی۔''

''میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔'' آپی نے تڑپ کر جواب دیا۔ ''کبھی اس سے گھر کے باہر بھی نہیں ملی، وہ میری سہیلی کا بھائی ہے۔''

''تب گھر میں تو جا کر ملی ہوگی۔'' امی کو یقین نہیں آرہا تھا۔ اس روز انہوں نے آپی کو بہت مارا اور الزامات لگاتی رہیں۔ میں نے اور باجی نے ان کو بچانے کی کوشش کی تو ہمیں بھی برا بھلا کہا تھا۔ انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ اب آپی اور باجی کالج نہیں جائیں گی۔ باجی یہ سن کر تڑپ گئیں۔

''مجھ پر کیوں پابندی لگا رہی ہیں؟''

''تاکہ کل کو تو بھی ایسا ہی کوئی گل نہ کھلائے۔'' امی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''امی اگر آپی کسی کو پسند کرتی ہیں تو یہ گناہ نہیں ہے، وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور شادی کرنا گناہ نہیں ہوتا ہے۔ گناہ تو وہ ہے جو ابو کرتے ہیں اور اس پر آپ خاموش رہتی ہیں۔''

میری اس بات پر امی خاموش ہو گئی تھیں۔ دو تین دن ہمارے گھر میں خاموشی رہی۔ والد کو ان معاملات سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والے شخص تھے۔ کئی دن بعد امی نے آپی اور باجی کو کالج جانے کی اجازت دے دی اور آپی سے کہا۔ ''اس لڑکے سے کہو دو مہینے کے اندر یہاں رشتہ بھیج دے ورنہ میں جہاں کہوں گی وہاں شادی کرنا ہوگی۔''

اصل میں امی آپی کی شادی اپنے کزن سے کرنا چاہ رہی تھیں جو سنگا پور میں ہوتے تھے اور وہ مذہبی آدمی تھے۔ اس کے دو ہفتے بعد ہی لڑکے کی والدہ کی طرف سے رابطہ ہوا اور انہوں نے آپی کے رشتے کی بات کی۔ امی نے بلوا لیا۔ یوں آپی کا رشتہ طے ہو گیا۔ وہ اچھے لوگ تھے۔ لڑکے کو ہمارے باپ کے کردار کے بارے میں علم تھا مگر وہ آپی سے شادی کے لیے تیار تھا کیونکہ اسے آپی کے کردار کا پتا تھا۔ امی کو بھی رشتہ اچھا لگا اور جیسے ہی آپی کا گریجویشن مکمل ہوا انہوں نے ان کی شادی کر دی۔ دراصل امی کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی بات لڑکے والوں کے گھر تک پہنچ جائے اور رشتے سے انکار نہ ہو جائے۔ مگر اللہ نے خیر رکھی اور شادی سکون سے ہو گئی بلکہ شادی کے بعد بھی سکون رہا تھا کیونکہ آپی کے سسر کینیڈین شہریت رکھتے تھے اور ایک سال کے اندر انہوں نے سب کو وہیں بلوا لیا اس طرح دور ہونے سے اس بات کا امکان کم رہ گیا تھا کہ ابو کے بارے میں کوئی خبر اُن تک پہنچے۔

☆☆☆

میں نے گریجویشن مکمل کیا تو والد نے مجھ سے کہا۔ ''اب تم فیکٹری میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

لیکن میں ایم بی اے کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا اور ایک نجی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میں لڑکوں کے کالج میں تھا اور وہاں کوئی لڑکی نہیں تھی لیکن اس نجی یونیورسٹی میں لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں تھیں اور انتہائی آزاد خیال قسم کی لڑکیاں تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شکیل احمد جیسے شخص کا بیٹا ہونے کے باوجود مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمارا معاشرہ کس طرف جا رہا ہے۔ اس کا درست اندازہ مجھے یونیورسٹی میں آکر ہوا تھا۔ بے راہ روی اتنی بڑھ چکی ہے کہ اب لڑکے، لڑکی کے میل ملاپ اور ان میں ناجائز تعلقات کو برا نہیں بس انجوائے منٹ سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیاں تعلیمی اداروں میں مختصر لباس پہن کر آتی ہیں۔ ان میں کئی ایسی ہیں جو گیٹ تک عبا پہن کر آتی ہیں اور گیٹ کے اندر آتے ہی ان کا عبا اتر جاتا ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والے ہر لڑکے کے لیے پاس ہونا لازمی نہیں ہوتا ہے لیکن کسی گرل فرینڈ کا ہونا لازمی ہے۔ واضح رہے کہ اس یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے آنے والے متوسط یا ذرا اونچے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے لڑکے اور لڑکیاں اب پڑھنے کے لیے باہر جاتے ہیں۔ کچھ لڑکے لڑکیاں تو نچلے طبقے سے بھی آتے ہیں۔ جن کے والدین کسی نہ کسی طرح یہاں کی بھاری فیسیں برداشت کر لیتے ہیں۔

مگر یونیورسٹی میں آکر یہ تمام طبقات ایک ہو جاتے ہیں۔ میں شروع میں تو کچھ حیران ہوا تھا۔ لڑکیوں سے کتراتا تھا لیکن رفتہ رفتہ میں بھی کھل گیا۔ سب سے پہلے میری دوستی صوفیہ شاہ سے ہوئی۔ اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا اور اس کے باپ کا تعلق اندرونِ سندھ سے تھا۔ وہ بھی عبا پہن کر آتی تھی کیونکہ اس کے گھر کا ماحول مذہبی تھا اور وہاں خاص طور سے لڑکیوں پر نظر رکھی جاتی ہے لیکن نظر رکھنے والوں نے صرف یونیورسٹی کی ریپوٹیشن دیکھی تھی اس کا ماحول نہیں دیکھا تھا۔ یہ ماحول ایسا تھا اور خاص طور سے تخلیق کیا گیا تھا تاکہ یہاں آنے والے خود کو کسی صورت اس سے نہ بچا سکیں اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ جو لڑکی شروع میں چھوئی موئی کی طرح کونے کھدروں میں سر جھکا کر بیٹھی ہوتی تھی کچھ عرصے بعد وہ لڑکوں کے درمیان بیٹھ کر قہقہے لگاتی تھی۔ یہی حال شرمیلے لڑکوں کا ہوتا تھا۔ پہلے سمسٹر سے بھی پہلے وہ گرل فرینڈ بنا چکے ہوتے تھے۔ ماحول ایسی چیز ہے جو آدمی کے اندر کو بدلے یا نہ بدلے اس کے ظاہر کو ضرور بدل دیتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ اور دوسرے طلبا کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

صوفیہ اچھی لڑکی تھی لیکن کھلا ماحول دیکھ کر بہک گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی ایم بی اے میں آئی تھی اور ہماری دوستی کا آغاز بھی ساتھ ساتھ ہوا تھا۔ میں اپنے باپ کی طرح بہت وجیہہ تو نہیں ہوں لیکن ان کی خوبروئی مجھ میں بھی آئی تھی اس لیے کسی لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شروع میں تو یہ عام قسم کی دوستی رہی تھی لیکن پھر اس نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ ہم گیدرنگ کے بجائے اکیلے میں

ملنے لگے اور اس کے لیے یونیورسٹی کا کوئی تنہا گوشہ تلاش کرتے تھے۔ صوفیہ کو یونیورسٹی سے کہیں اور جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے مجبوراً ہمیں یونیورسٹی میں ملنا پڑتا تھا حالانکہ میں نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ میرے ساتھ کہیں باہر چلے۔ میرے پاس بائیک تھی۔ گھر میں ایک گاڑی اور آ گئی تھی چاہتا تو وہ بھی لاسکتا تھا۔ مگر صوفیہ نہیں مانتی تھی۔

والد نے کلفٹن کے ساحل کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ کمپلکس میں چھوٹا فلیٹ خرید لیا تھا۔ ظاہر ہے اسی مقصد کے تحت خریدا تھا جس کے لیے وہ زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے اس کا پتا یوں چلا کہ فلیٹ میں مرمت کا کچھ کام تھا والد نے مجھے وہاں بھیج دیا۔ کام مجھے اپنی نگرانی میں کروانا تھا۔ یہ خاصا بڑا اور خوب صورت فلیٹ تھا۔ اس میں دو بیڈ روم اور کچن کے ساتھ لاؤنج تھا۔ اسے بہترین انداز میں فرنش کیا ہوا تھا اور جس پروجیکٹ میں تھا وہ بھی بہت مہنگا اور اعلیٰ درجے کا تھا۔ یہاں زیادہ تر ایسے لوگ رہتے تھے جنہیں اپنے پڑوسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جب میں کام کرا رہا تھا تو میں نے یہ کیا کہ اس کی چابیوں کی نقل بنوا کر اپنے پاس رکھ لی۔ اصل چابیاں والد کے پاس ہوتی تھیں۔ جب میں صوفیہ کو کہیں لے جانے کا سوچ رہا تھا تو میرے ذہن میں اس فلیٹ کا خیال آیا۔ مگر وہ کہیں باہر جانے کے لیے راضی نہیں ہوتی تھی فلیٹ کیسے جاتی۔

ایک دن ہم یونیورسٹی آئے تو اتفاق سے آس پاس شدید ہنگامے شروع ہو گئے اور بے تحاشا فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ انتظامیہ نے طلبا کو چھٹی دے دی کہ جیسے ہی حالات بہتر ہوں وہ گھر کو چلے جائیں۔ کچھ دیر میں فائرنگ رک گئی تو ہم باہر نکلے۔ لیکن بسیں اور پبلک ٹرانسپورٹ غائب تھی۔ جن کے پاس گاڑیاں تھیں وہ دوسروں کو بھی لے جا رہے تھے۔ میں نے صوفیہ سے کہا۔ ”آؤ تمہیں چھوڑ دوں۔“

صوفیہ کا گھر کلفٹن کے پاس تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اسے ڈیفنس سے لے جا کر چھوڑ دیتا ہوں کیونکہ باقی شہر کے حالات سنا تھا کہ خراب ہو رہے تھے۔ صوفیہ راضی ہو گئی۔ کلفٹن کے پاس پہنچ کر مجھے خیال آیا اور میں نے صوفیہ سے کہا۔ ”آج موقع ہے ہم ذرا باہر گھوم پھر لیں۔“

”نہیں۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”کسی نے دیکھ لیا تو؟“

”یہاں کون دیکھے گا۔ میرے گھر والے باہر نہیں نکلتے ہیں اور تمہارے گھر والے اس علاقے میں نہیں آتے ہیں۔“

صوفیہ مان گئی اور ہم ایک شاپنگ سینٹر کے اندر موجود چھوٹے سے ریستوران میں آ بیٹھے۔ صوفیہ گھبرائی ہوئی تھی لیکن میں بہت خوش تھا۔ آج پہلی بار وہ اس طرح میرے ساتھ نکلی تھی۔ دوسرا خیال مجھے آ رہا تھا کہ اگر وہ مان جائے تو میں اسے فلیٹ لے جاؤں مگر اس نے سنتے ہی انکار کر دیا۔ ”مبشر میں یہاں تک بھی نہ جانے کیسے آ گئی۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

مجھے مایوسی ہوئی۔ ہم نے وہاں کولڈ ڈرنک کے ساتھ کچھ چیزیں لیں اور پھر میں نے صوفیہ کے اصرار پر اسے اس کے گھر کے پاس چھوڑ دیا۔ مگر میرا موڈ آف ہو گیا تھا۔ گھر آیا تو پتا چلا کہ امی کی طبیعت خراب ہے۔ میں نے چھوٹی بہن سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے امی کو؟“

شمائلہ نے بتایا۔ ”پتا نہیں شاپنگ کے لیے گئی تھیں وہاں سے آئی ہیں تو طبیعت خراب ہے۔“

میں امی کے کمرے میں آیا تو وہ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ ”امی کیا ہوا آپ کی طبیعت خراب ہے؟“

امی نے آنکھیں نہیں کھولیں لیکن ان کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ میں بے قرار ہو گیا۔ ”امی کیا ہوا ہے کچھ تو بتائیں؟“

وہ اٹھ بیٹھیں اور گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کاش میری شادی شکیل احمد سے ہونے کے بجائے مجھے موت آ گئی ہوتی تو آج میں اس عذاب میں نہ ہوتی۔“

”امی کیا ہوا ہے، کیا ابو نے.....“

”نہیں تمہارے باپ نے جو کرنا تھا وہ کر رہا ہے لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ تم بھی اس کے نقشِ قدم پر چل نکلو گے۔“

میں چونکا۔ ”میں ابو کے نقشِ قدم پر؟“

”کسی لڑکی کے ساتھ ہوٹلنگ کرنا اور کیا کہلائے گا۔“ امی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اگر میں نے کسی سے سنا ہوتا تو مجھے کبھی یقین نہ آتا لیکن آج میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دیکھا ہے۔“

”لیکن امی.....“

”کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولیں۔ ”میں نہیں چاہتی کہ اب تم جھوٹ بھی بولو۔“

”آپ نے پہلے سوچ لیا ہے کہ میں جھوٹ بولوں گا۔“ میں نے دکھ سے کہا۔ ”آپ نہیں سننا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔“

امی دوبارہ لیٹ گئیں اور دوپٹا منہ پر لے لیا، یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب میری کوئی بات نہیں سننا چاہتیں اور میری صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ میں بوجھل قدموں سے ان کے کمرے سے نکل آیا۔ امی نے یقیناً مجھے صوفیہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اگلے روز یونیورسٹی میں صوفیہ سے سامنا ہوا تو میں نے منہ پھیر لیا۔ وہ بے قرار ہو کر میرے پاس آئی۔ ”مبشر کیا ہوا اس طرح منہ کیوں پھیر رہے ہو۔“

”تو کیا کروں، تم سے پہلے کی طرح بات کروں جبکہ تم میرے منہ پر پہلے ہی بے اعتمادی کا تھپڑ مار چکی ہو۔“

”تم کل والی بات پر ناراض ہو۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تم سے ناراض ہونے کی۔“..... میں نے کہا اور اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ پھر کلاس کا وقت ہو گیا تھا اس لیے وہ مجھے روک نہیں سکی۔ لیکن جیسے ہی وقفہ ملا وہ پھر مجھ سے ملی اس کی بے قراری دیکھنے والی تھی اور وہ رونے والی ہو رہی تھی۔ ”دیکھو مبشر اگر تم اس لیے ناراض ہو کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے فلیٹ پر نہیں گئی تو ٹھیک ہے میں اس کے لیے بھی تیار ہوں لیکن پلیز مجھ سے موڈ ٹھیک کر لو۔“

”تم اب راضی ہو گئی ہو تو کل کیوں انکار کیا تھا؟“

”یار سمجھا کرو نا، ہمارا اس طرح تنہائی میں ملنا ٹھیک نہیں ہے۔“

”یعنی تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“

”نہیں تم پر پورا اعتبار ہے۔“

”تب خود پر اعتبار نہیں ہے؟“

”ایسا نہیں ہے، لیکن انسان کو شیطان سے ڈرنا چاہیے۔“

”اس سے تو اس وقت بھی ڈرنا چاہیے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”کیا ہم اس طرح سے مل کر ٹھیک کر رہے ہیں۔“

وہ زچ ہو گئی۔ ”تب تم کیا چاہتے ہو جب میں تمہاری بات بھی مان رہی ہوں تب بھی تمہارا موڈ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں کسی دن تمہیں اپنے فلیٹ پر لے جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کب چلو گے؟ مجھے پہلے سے بتا دو تا کہ میں اپنے گھر میں کوئی بہانہ کر سکوں۔“

آنے والا منگل کیسا رہے گا؟“ میں نے کہا کیونکہ منگل کو والد اپنی تمام فیکٹریوں کا وزٹ کرتے تھے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ فلیٹ کا رخ کرتے۔ صوفیہ مان گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ کتنی آسانی سے مان گئی تھی۔ جب کہ مجھے توقع تھی کہ وہ مانی بھی تو بہت مشکل سے مانے گی۔ صوفیہ کے بارے میں مجھے شک نہیں تھا کہ وہ کردار کی مضبوط لڑکی ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی اور شریف لڑکیاں اپنی محبت کے ہاتھوں دھوکا کھاتی ہیں۔ صوفیہ بھی ایسی ہی لڑکی تھی اور میرا تجربہ ہے کہ اکثر لڑکیاں ایسی ہی شریف ہوتی ہیں۔ یہ لڑکے ہیں جو کہیں زیادہ خراب کردار رکھتے ہیں اور اپنی مطلب براری کے لیے لڑکیوں کو محبت اور شادی کا دھوکا دیتے ہیں۔ صوفیہ راضی ہوئی تو میں خوش ہو گیا تھا۔ صوفیہ سے دوستی کرتے وقت میں نے اپنا ایک مقصد سوچا تھا اور اب میں وہ مقصد حاصل کر سکتا تھا۔

منگل والے دن صوفیہ گھر میں کہہ کر آئی تھی کہ وہ چھٹی کے بعد اپنی ایک سہیلی کے گھر جائے گی۔ چھٹی کے بعد ہم یونیورسٹی سے نکلے اور میں اسے کلفٹن والے فلیٹ میں لایا۔ میں نے بتایا تھا کہ یہاں کا ماحول ایسا تھا کہ پڑوسی کو پڑوسی کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔ مین گیٹ کے گارڈز مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے اس لیے ہم آسانی سے اندر چلے آئے ورنہ گارڈز کسی اجنبی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ جیسے ہی ہم فلیٹ میں داخل ہوئے صوفیہ خوف زدہ نظر آنے لگی۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ ”یہاں تو بہت سناٹا ہے۔“

”ہاں یہاں فلیٹ اس طرح بنے ہیں کہ ایک فلیٹ کی آوازیں دوسرے فلیٹ میں نہیں جاتی ہیں، تم سمجھ لو کہ یہ ساؤنڈ پروف ہیں۔“

میرے جواب پر وہ مزید خوفزدہ ہو گئی تھی شاید اسے میرے چہرے کے تاثرات بھی بدلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری صورت دیکھنے کے لیے یہاں نہیں لایا ہوں، آگے تم خود سمجھدار ہو اگر خوشی خوشی مان جاؤ گی تو میں زحمت سے بچ جاؤں گا ورنہ مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔“

صوفیہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ”تت..... تم مذاق کر رہے ہو۔“

”اِدھر آؤ۔“ میں نے اسے ایک بیڈ روم کا دروازہ

کھول کر دکھایا۔ ”اسے دیکھو تمہیں خود پتا چل جائے گا کہ میں کتنا مذاق کررہا ہوں۔“

اس نے دور سے بیڈ روم میں جھانکا اور کانپنے لگی۔ ”مبشر تم ایسا نہیں کرسکتے، تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“

”محبت۔“ میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”کیسی محبت اور کہاں کی محبت یہ تو ایک کھیل ہے۔ جیسے یونیورسٹی لائف ہوتی ہے۔ کلاسز ہوتی ہیں، امتحان ہوتا ہے، ڈگری ملتی ہے اور معاملہ ختم، ایسے ہی یہاں کی محبت ہوتی ہے۔ ملے، تعلق بنا، قریب آئے، تمام فاصلے مٹ گئے اور پھر کرنے کو کچھ نہ رہا تو تعلق ختم۔“

صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ”مبشر مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنے ذلیل اور گھٹیا نکلو گے۔“

میں ہنسا۔ ”چلو اب معلوم ہوگیا تو کیا ارادہ ہے....“ میں کہتے ہوئے چونکا کیونکہ موبائل کی بیل بجی تھی۔ میں نے جیب سے موبائل فون نکالا۔ ”ایک منٹ میں ابھی کال سن کر آتا ہوں۔“ میں نے صوفیہ سے کہا اور کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے دن میں یونیورسٹی آیا تو صوفیہ نہیں آئی تھی۔ وہ مزید دو دن نہیں آئی اور جب آئی تو پہلے دن کی طرح عبا پہنے ہوئے تھی۔ اس نے مجھ سے یا کسی جاننے والے فیلو سے بات نہیں کی۔ اس کے بعد وہ جب یونیورسٹی آتی تو صرف کلاس میں جاتی اور جب کلاس نہیں ہوتی تو لائبریری یا کمپیوٹر سیکشن میں چلی جاتی تھی۔ میرے ساتھیوں کو حیرت ہوئی تھی کہ صوفیہ کو کیا ہوگیا ہے انہوں نے مجھے بھی کریدا لیکن میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ ”یارو... وہ اب مجھے بھی لفٹ نہیں کراتی ہے۔“

”تب معلوم کر کیا بات ہے؟“

”چھوڑو یار لڑکیوں کی کوئی کمی ہے جو آدمی ایک کے پیچھے وقت ضائع کرتا پھرے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

کچھ عرصے بعد میری ایک لڑکی سے دوستی ہوگئی۔ فضا کا تعلق بھی ایک متوسط گھرانے سے تھا اور وہ صوفیہ کی نسبت زیادہ ماڈرن تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کی وہی متوسط طبقے والی سوچ تھی کہ دوستی کو ایک حد میں رہنا چاہیے۔ جب کہ میں اسے فلیٹ تک لے جانا چاہتا تھا۔ وہ راضی نہیں تھی اور اس معاملے میں صوفیہ کی نسبت زیادہ ضدی ثابت ہوئی تھی لیکن میں کوشش کرتا رہا اور بالآخر چند مہینے بعد اپنے مقصد میں کامیاب رہا، لیکن اس سے پہلے میں نے پوری طرح اسے اپنی محبت کا یقین دلایا تھا۔ ظاہر ہے صوفیہ والی بات اس سے چھپی نہیں تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ صوفیہ سے میں سنجیدہ نہیں تھا اور یہ محبت نہیں بلکہ صرف دوستی تھی، مجھے اصل محبت تو اس سے ہے۔ میری کامیابی اسی میں تھی کہ میں فضا کو اپنی محبت کا پوری طرح یقین دلا دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے بعد فضا نے یونیورسٹی ہی چھوڑ دی تھی۔ مجھے صرف اتنا پتا چلا کہ اس نے کہیں اور داخلہ لے لیا تھا۔ فضا کے بعد شہناز، پھر مہرین، پھر سنبل، پھر عنبر، سب سے آخر میں سونیا تھی۔ اس دوران میں میرا ایم بی اے مکمل ہوگیا۔

☆☆☆

میں دفتر سے آیا تو امی نے بلا لیا۔ وہ پریشان لگ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ”خیریت؟“

امی نے گہری سانس لی۔ ”میں راحیلہ کے لیے پریشان ہوں۔“

”کیوں کیا ہوا باجی کو؟“

”مبشر تم بھی باپ کی طرح اپنی دنیا میں مگن ہوگئے ہو اس لیے تمہیں نظر نہیں آرہا کہ ایک جوان بہن گھر بیٹھی ہے اور اس کی عمر نکل رہی ہے جب کہ اس سے چھوٹی بھی جوان ہوچکی ہے۔“

باجی کی عمر ستائیس برس ہوچکی تھی۔ کئی رشتے آئے لیکن جب انہیں والد کے کردار کے بارے میں پتا چلتا تو وہ پلٹ کر نہیں آتے تھے۔ حالانکہ ان میں سے کئی گھرانے ایسے تھے جن کے بارے میں میں جانتا تھا اور وہاں مردوں کا کردار میرے باپ سے مختلف نہیں تھا لیکن وہ شریف بنتے تھے اور بہوئیں شریف گھرانوں سے لانا چاہتے تھے.... بہرحال بیٹی والے ہمارے معاشرے میں ہمیشہ سے مجبور ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر بہت سارے سکہ بند روایتی گھرانوں نے بھی اپنی بیٹیوں کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنا بر خود تلاش کرلیں۔ اس آزادی کے نتیجے میں بہت ساری لڑکیاں شادی کی منزل پا گئیں لیکن بہت ساری ایسی بھی تھیں جنہوں نے دھوکے کھائے اور اپنی عزت آبرو بھی گنوا بیٹھیں۔ یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے۔ یہ ایک زوال پذیر معاشرے کی نشانی ہے جو مجبوریوں کے سامنے اپنی اقدار کی قربانی دے دیتا ہے۔

”میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں امی؟“

امی نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں میرے بچے تو یا کوئی کچھ نہیں کرسکتا ہے بس اللہ ہی کرے تو کرے۔“

”آپ فکر نہ کریں اللہ باجی کو بھی اپنے گھر کا کرے گا۔“

”وہ کیسے؟“ امی عجیب سے انداز میں بولیں۔ ”جب میرا بیٹا اور میرا شوہر دوسروں کے گھر اجاڑ رہے ہوں اور لڑکیوں کو برباد کررہے ہوں تو میری بیٹی کا گھر کیسے بسے گا؟“

”امی اللہ گواہ ہے....“ میں نے دبی زبان میں کہنا چاہا۔

”اللہ کو درمیان میں مت لاؤ۔“ امی بولیں۔ ”وہ اتنا مہربان ہے کہ اس نے پھر بھی ہمیں پورا برباد نہیں ہونے دیا میری ایک بچی تو اپنے گھر میں خوش ہے۔ بیٹے تم یہ سوچو کہ آج تمہاری بہنوں کے رشتے نہیں آرہے ہیں کل کو تمہیں بھی کوئی بیٹی نہیں دے گا۔“

میں نے سرد آہ بھری۔ ”امی جو بات ابو نے کبھی نہیں سوچی وہ میں کیسے سوچ سکتا ہوں۔“

”تمہارے باپ کی تربیت میں نے نہیں کی لیکن تمہاری تربیت تو میں نے کی ہے۔“ امی نے ملامت سے کہا۔ ”اس کے باوجود تم اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہو۔“

”امی میں آپ کو جھٹلاؤں گا نہیں۔ میں صرف اپنے باپ کے کیے کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کررہا ہوں اگر آپ کہیں گی تو یہ سب بھی چھوڑ دوں گا لیکن کیا اس سے باجی اپنے گھر کی ہوجائیں گی؟“

امی نے سرد آہ بھری۔ ”میں تم سے کچھ نہیں کہہ رہی کیونکہ ہر انسان اپنے برے بھلے کا خود ذمے دار ہوتا۔ میں صرف تمہیں سمجھا سکتی ہوں۔“

”تب سمجھ لیں آپ نے اپنا فرض پورا کردیا ہے۔“

امی اچانک رونے لگیں۔ ”کہاں سے پورا کردیا کل تیرے باپ نے مجھے طعنہ دیا ہے کہ میں نے تیری تربیت کی اور تو لڑکیوں کو لے کر کلفٹن والے فلیٹ پر جاتا ہے۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ”یہ بات ابو نے کہی ہے؟“

”ہاں تو کیا سمجھتا ہے کہ چوری سے چابی بنوا لے گا تو تیرے باپ کو پتا نہیں چلے گا وہاں موجود گارڈز شکیل کو ایک ایک بات کی رپورٹ دیتے ہیں، اسے تیرے بارے میں سب معلوم ہے۔“

”لیکن ابو نے کبھی مجھے بتایا نہیں۔“

”وہ تو خوش ہے کہ بیٹا اس کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ میں نے کل اس سے راحیلہ کے سلسلے میں بات کی کہ اب تو اپنی حرکتیں چھوڑ دے اس کی وجہ سے بچی گھر بیٹھی رہ جائے گی تو اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی حرکتیں چھوڑ دے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ تو نے اس کی جگہ سنبھال لی ہے۔“

یہ والد کی چالاکی تھی۔ وہ میری آڑ لے رہے تھے حالانکہ بھائی بے راہ رو ہو تو بہن پر اتنا اثر نہیں پڑتا ہے لیکن باپ بے راہ رو ہو تو بیٹی اور اس کے مستقبل پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس وقت والد کی عمر ساٹھ سال ہوچکی تھی۔ مگر صحت اچھی تھی اور خوبروئی بھی برقرار تھی اس لیے لڑکیاں نہ صحیح عورتیں اب بھی ان کے چکر میں آجاتی تھیں۔ میں نے غصے سے کہا۔ ”وہ میری آڑ لے رہے ہیں۔“

”تو کیا غلط کہہ رہا ہے اب وہ سیدھے راستے پر آجائے تب بھی کیا فرق پڑے گا اس گھر کے ساتھ بدنامی تو وابستہ رہے گی۔“

والد نے کورنگی روڈ پر ڈیفنس کمرشل ایریا میں باقاعدہ دفتر بنا لیا تھا اور وہیں سے تمام کاروبار کی نگرانی کی جاتی تھی۔ میں وہیں بیٹھتا تھا اور میرا شعبہ مارکیٹنگ تھا۔ میں اگلے دن... سیدھے والد کے دفتر پہنچا اور بلا تمہید کہا۔ ”اگر آپ کو علم ہے کہ میں لڑکیاں لے کر کلفٹن والے فلیٹ پر جاتا ہوں تو یہ بات امی کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”اس عورت کو اپنی پارسائی اور تربیت پر کچھ زیادہ ہی گھمنڈ ہونے لگا تھا۔ میں نے آئینہ دکھا دیا۔“ وہ بے پروائی سے بولے۔ ”ویسے برخوردار میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے جو تم اتنا تلملا رہے ہو؟“

”آپ نے ظاہری سچ بولا ہے میں وہ سب نہیں کرتا ہوں جو آپ کرتے ہیں۔“

”اچھا۔“ انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ان لڑکیوں کو وہاں درس دینے کے لیے لے جاتے ہو۔“

”ابو....“ میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا لیکن پھر خاموش ہوکر ان کے کمرے سے نکل آیا۔ اپنے کمرے میں آکر میں نے سر تھام لیا تھا۔ کیا مجھے یہ سب چھوڑنا پڑے گا؟ میں نے سوچا۔ ان دنوں شاہین نامی لڑکی سے میری دوستی

تھی۔ وہ ہماری ایک فیکٹری میں سپروائزر تھی اور کورنگی روڈ پر واقع ایک کالونی میں رہتی تھی۔ وہ خوب صورت تھی۔ حیرت انگیز طور پر وہ خود میری طرف آئی تھی۔ اس سے تعلق کو ایک مہینا ہوا تھا اور ہم بہت احتیاط سے ملتے تھے فیکٹری میں کسی کو اس تعلق کا علم نہیں تھا۔ مگر وہ ہمیشہ مجھ سے کسی پبلک پلیس پر ملتی تھی۔ میں نے ایک دو بار اسے فلیٹ پر چلنے کے لیے کہا لیکن وہ ٹال گئی اور مجھے بھی جلدی نہیں تھی کیونکہ میں اندازہ کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کس حد تک محبت کرنے لگی ہے۔ جب تک لڑکی مجھ سے سچ مچ محبت نہیں کرتی تھی اسے فلیٹ تک لے جانا بیکار تھا۔ اس لیے میں صبر سے کام لے رہا تھا۔

شاہین کے بارے میں، میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ عام لڑکیوں سے کسی قدر مختلف اور ذہین ہے۔ مگر عورت کتنی ہی ذہین کیوں نہ ہو جب معاملہ ایک مرد سے محبت کا آتا ہے تو وہ کہیں نہ کہیں مار کھا جاتی ہے۔ شاہین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور سلائی کا ہنر جانتی تھی اس لیے اسے ورکر سے ترقی دے کر سپروائزر بنا دیا گیا تھا۔ وہ اپنے گروپ کے کام کی نگرانی کرتی تھی۔ میری اس سے ملاقات کام کے انسپکشن کے دوران ہوئی تھی اور پھر وہ جس طرح میری طرف آئی مجھے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ ایک دن میں فیکٹری کے باہر اس کا منتظر تھا وہ اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ میں نے کار لے جا کر اس کے پاس روکی۔ ”مس شاہین، میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں آیئے آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

وہ بلا جھجک بیٹھ گئی اور جب تک میں نے اسے اس کے گھر کے پاس والے اسٹاپ تک چھوڑا ہم خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔ میں نے اشارے میں کہیں باہر ملنے کو کہا تو وہ راضی ہو گئی۔ اس نے اپنا موبائل نمبر دے دیا۔ اس کے چند دن بعد ہم سی ویو پر ملے تھے۔ وہ فیکٹری سے آدھے دن کی چھٹی کر کے وہاں آ گئی تھی۔ شام کو میں نے اسے اس کے گھر کے پاس چھوڑ دیا۔ معاملہ رفتہ رفتہ محبت کی طرف جا رہا تھا۔ مگر مجھے ابھی تک یقین نہیں ہوا تھا۔ پھر امی کی طرف سے یہ مسئلہ سامنے آ گیا۔ والد نے ان تک فلیٹ والی بات پہنچا کر میرے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ فلیٹ کے لاک بدلوا دیتے اس طرح فلیٹ میری رسائی سے نکل جاتا جب کہ میں جو کرتا تھا اس میں یہ فلیٹ لازمی حیثیت رکھتا تھا دوسری صورت میں میرے پاس کوئی ایسا ٹھکانا نہیں رہتا جہاں میں کسی لڑکی کو لے جا سکتا۔ میں نے اسی روز شاہین کو کال کی۔ ”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں بہت ضروری بات ہے۔“

”ابھی دو دن پہلے تو ملے تھے۔“ اس نے کہا۔ ”میں بار بار چھٹی نہیں لے سکتی ہوں۔“

”بس آج لے لو پھر میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔“

وہ کھنک گئی۔ ”مبشر کیا بات ہے؟“

”ملاقات پر بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”کہاں آؤں؟“

میں نے اسے کلفٹن والے فلیٹ کے ایک نزدیکی ریستوان کا پتا بتایا۔ ہم پہلے بھی یہاں جا چکے تھے۔ ”ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں۔“

”کوشش نہیں لازمی آؤ، میں جا رہا ہوں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا اور اس کی بات سنے بغیر لائن کاٹ دی۔ میں دفتر سے اٹھ کر اس ریستوران کی طرف روانہ ہو گیا۔ مشکل سے دس منٹ کا راستہ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد شاہین بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ رکشے سے آئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شاہین نے پوچھا۔

”ایسی کیا بات ہے جو تم نے اتنی ایمرجنسی میں بلوا لیا۔“

”میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“

”اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”تو چلیں میں تیار ہوں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ہم باہر آئے اور میں اسے لے کر فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا جب میں کار مین گیٹ سے اندر لے گیا تو میرا خیال تھا کہ شاہین پوچھے گی ہم یہاں کیوں آئے ہیں مگر وہ خاموش رہی تھی۔ اس نے اوپر جاتے ہوئے لفٹ میں بھی کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی چپ رہی جب ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اس سے پوچھا۔ ”تم جانتی ہو میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیونکہ اب میں تم سے مزید دوری برداشت نہیں کر سکتا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب واضح ہے مس شاہین۔“ میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

”تب یہ سب کیا تھا؟“

”صرف جسم کی طلب۔“ میں نے منہ بنایا۔ ”محبت میرے نزدیک بکواس ہے۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور ہاں شور مچانے یا مزاحمت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا یہاں تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ اس لیے بہتر ہے شرافت سے مان جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں اس کے بعد تمہیں زحمت نہیں دوں گا۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں نے قہقہہ لگایا۔ ”کچھ دیر بعد تم یہ نہیں کہہ سکو گی۔“

اسی لمحے میرے موبائل کی بیل بجی۔ میں نے موبائل نکال کر دیکھا اور پھر بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”بس چند منٹ انتظار کرو تمہیں یقین آ جائے گا۔“

میں بیڈ روم میں گیا اور بلند آواز سے بات کرتا رہا، لیکن کچھ دیر بعد میں وہاں سے نکلا تو مجھے شدید جھٹکا لگا تھا۔ شاہین وہاں موجود تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ ”میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“

☆☆☆

ہماری زندگی میں سب سے بڑی تبدیلی والد کی اچانک وفات کی صورت میں آئی تھی۔ برسوں کی بے اعتدالیوں کا نتیجہ اب نکلا تھا۔ ہارٹ اٹیک ہوا اور اس سے پہلے کہ انہیں اسپتال لے جاتے اجل نے سانسوں کا کوٹا ختم کر دیا۔ ہم سب دکھی تھے کچھ بھی سہی وہ ہمارے باپ اور ہماری ماں کے شوہر تھے۔ مگر ساتھ ہی اطمینان تھا کہ ان کی ذات سے وابستہ ہماری بدنامی کا جو باب تھا وہ بھی ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ حیرت انگیز بات تھی کہ ساری عمر مذہب کی کسی بھی بات پر عمل نہ کرنے والے شخص نے اپنی وصیت شرعی طور پر کی تھی اور ہم سب بہن بھائیوں کو ان کا حصہ فوری اور شریعت کے مطابق دینے کی وصیت کی تھی۔ میرے شامل ہونے کے بعد فیکٹریوں کی تعداد پندرہ ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارا گھر تھا۔ کلفٹن والا فلیٹ تھا اور ڈیفنس میں ہی دو پلاٹ تھے۔

امی نے طے کیا کہ یہ مکان اور فلیٹ سیل کر کے ہم گلشن اقبال شفٹ ہو جائیں گے۔ وہاں امی کے حصے سے مکان لیا جائے گا۔ آپی کا حصہ کیش اور پلاٹ کی صورت میں ادا کر دیا جائے گا۔ جب کہ باقیوں کو فیکٹری اور دوسرے پلاٹ سے حصہ ملے گا اور کاروبار اسی طرح قائم رہے گا۔ اس کا نفع حصے داروں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ڈیفنس چھوڑ کر گلشن جانے کی وجہ تو واضح تھی کہ یہاں ہمیں سب جانتے تھے اور ظاہر ہے والد کے بارے میں بھی جانتے تھے۔ یہاں ہمارا رہنا اور دوسروں سے عمومی تعلقات قائم کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا البتہ نئی جگہ پر ہم نئے

سرے سے زندگی شروع کر سکتے تھے۔ آغا خان اسپتال کے نزدیک گلشن کے ایک اچھے علاقے میں ہمیں اتنا ہی بڑا مکان مل گیا جتنا بڑا یہاں والا تھا۔ راحیلہ باجی بھی میرے ساتھ بزنس دیکھنے لگی تھیں۔

جگہ تبدیل کرتے ہی سب سے پہلے مجھ سے چھوٹی شمائلہ کا رشتہ آ گیا۔ وہ لوگ اسی علاقے میں رہتے تھے۔ امی اور بہن کی اس فیملی سے ملاقات ایک درس قرآن کے موقع پر ہوئی تھی۔ لڑکے کی ماں اور بہنوں کو شمائلہ پسند آ گئی اور انہوں نے رشتے کی بات کر لی۔ بات طے ہوتے ہی تین مہینے بعد شادی کر دی گئی کیونکہ شمائلہ گریجویشن کر چکی تھی اور اب فارغ تھی۔ سب سے چھوٹا شبیر ان دنوں گریجویشن کر رہا تھا اور اس کا ارادہ بھی ایم بی اے کرنے کا تھا۔ والد کے بعد ہمارے گھر کا ماحول بالکل بدل گیا تھا۔ جہاں پہلے گھٹن اور کشیدگی رہا کرتی تھی اب وہاں ہم بہن بھائیوں کی ہنسی اور امی کی مسکراہٹ ہوتی تھی۔ امی کو میں نے اس سے پہلے کبھی اتنا مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ انہیں راحیلہ باجی اور میری فکر تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ ”آپ میری نہیں راحیلہ باجی کی فکر کریں۔“

”تیری فکر کیوں نہ کروں۔“ امی نے کہا۔ ”اللہ نے یہ دن دکھایا کہ تو سیدھے راستے پر آ گیا۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں سیدھے راستے پر آ گیا ہوں؟“

”ماں باپ کو اولاد کے بارے میں پتا ہوتا ہے۔ اب تم صرف دفتر جاتے ہو اور سیدھے گھر آتے ہو۔ ویسے بھی بہت بدل گئے ہو۔ اب تمہارے پاس لڑکیوں کی کالز نہیں آتی ہیں اور نہ ہی تم راتوں کو دیر سے آتے ہو۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”یعنی آپ کے ذہن میں اب بھی یہی خیال ہے کہ میں پہلے بے راہ رو تھا اور ابو کی راہ پر چل رہا تھا؟“

”اب سوچتی ہوں تو میرا خیال ڈول جاتا ہے میرا دل کہتا ہے تو وہ سب کچھ نہیں کر سکتا جو تیرا باپ کرتا تھا۔“

”یہ حقیقت ہے میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر میں اپنے ضمیر اور آپ کے سامنے شرمندہ ہوں۔“

”تب وہ سب کیا تھا؟“

”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں اپنے باپ کے کیے کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

امی سمجھ نہیں سکی تھیں لیکن یہ بھی بہت تھا کہ اب وہ مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان ہی دنوں راحیلہ باجی کے لیے ایک مناسب رشتہ آ گیا۔ لڑکا سعودی عرب میں پیٹرولیم انجینئر تھا۔ بہت اچھی تنخواہ اور دوسری مراعات تھیں یہاں بھی فیملی اچھی تھی۔ لڑکے کی عمر زیادہ تھی تقریباً چالیس برس لیکن راحیلہ باجی بھی اڑتیس کی ہو چکی تھیں اس لیے امی اور میں نے سب سے مشورہ کر کے ہاں کر دی۔ کچھ عرصے بعد ان کی شادی بھی ہو گئی۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں سناٹا سا چھا گیا اس سناٹے سے گھبرا کر امی نے مجھ پر شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ ان کی نظر میں کئی اچھے رشتے تھے لیکن میں انہیں ٹال رہا تھا۔ ایک دن امی نے پوچھ لیا۔ ”مبشر کیا بات ہے تو شادی کے لیے کیوں نہیں مان رہا ہے، کیا تجھے کوئی لڑکی پسند ہے اگر ایسا ہے تو میں اس سے تیری شادی کرا دیتی ہوں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

میں نے حیرت سے امی کو دیکھا ایک زمانے میں جو باتیں ان کے لیے قطعی ناقابل قبول ہوتی تھیں اب وہ مان رہی تھیں شاید وہ والد کے کردار کی وجہ سے اتنی سخت ہو گئی تھیں اور ہماری تربیت کے لیے لچک دکھانے کو تیار نہیں تھیں۔ آپی کی شادی انہوں نے کر دی تھی لیکن بہت عرصے تک وہ ان سے ناراض رہی تھیں۔ اب والد نہیں رہے تھے تو امی میں بھی نرمی آ گئی تھی۔ وہ اپنی اولاد کے لیے کشادہ دلی سے فیصلے کر رہی تھیں۔ امی کی بات سن کر مجھے شاہین کا خیال آیا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”جی امی ایک لڑکی ہے تو لیکن کئی سال سے میرا اس سے رابطہ نہیں ہے اور مجھے نہیں پتا کہ وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو گی یا نہیں۔“

”تو معلوم کر لو میرے بچے۔“ امی بولیں۔ ”اگر وہ راضی نہیں ہوتی ہے تو کئی اچھے رشتے ہیں، بیٹے شادی جتنی عورت کے لیے ضروری ہے اتنی ہی مرد کے لیے بھی ضروری ہے۔ اب اس میں دیر نہ کرو۔ مجھے بھی پوتے پوتیوں کا ارمان ہے۔“

کتنے عرصے بعد مجھے شاہین کا خیال آیا تھا اس دن فلیٹ میں میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا اس کے بعد وہ فیکٹری بھی نہیں آئی اور اس نے اپنا استعفا بھیج دیا تھا۔ اس کے واجبات بھی اس کے محلے میں رہنے والی ایک لڑکی نے لے جا کر دیے تھے۔ استعفے کی وجہ بیماری بتائی گئی تھی لیکن میں جانتا تھا یہ سچ نہیں تھا اس نے میری وجہ سے استعفا دیا تھا۔ وہ میرا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ مگر امی کی بات سے مجھے خیال آیا کہ میں ایک بار تو اس سے بات کر کے دیکھوں۔ اس کے سامنے اپنی صفائی پیش کروں شاید وہ مان جائے۔ بہت عرصے بعد میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا نمبر ملایا۔ بیل جانے لگی تو میں نے سکون کا پہلا سانس لیا کہ نمبر بند نہیں تھا اور جب اس نے کال ریسیو کی تو میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”شاہین۔“

”مبشر...!“ اس نے کچھ دیر بعد بے یقینی سے کہا۔

”ہاں میں مبشر ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”خیریت اتنے عرصے بعد میں کیسے یاد آ گئی۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”شاہین میں تم سے شرمندہ ہوں، لیکن میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تو کیا اسی فلیٹ میں آ جاؤں۔“ اس نے طنز جاری رکھا۔

”پلیز شاہین۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔ ”تم حق بہ جانب ہو لیکن مجھے بھی صفائی کا ایک موقع تو دو۔ رہا وہ فلیٹ تو وہ بک چکا ہے اور اب میرا صرف ایک گھر ہے جس میں میری ماں رہتی ہے۔“

وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا یہ ملاقات ضروری ہے؟“

”ہاں یوں سمجھ لو کہ میرے لیے زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے آ سکتی ہوں آج کل میں ایک اور جگہ جاب کر رہی ہوں اور وہاں مجھے اتنی آسانی سے چھٹی نہیں ملتی ہے۔“

”میں انتظار کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔

شاہین نے ایک کیفے کا بتایا جو کورنگی روڈ کے پاس تھا۔ ”میں یہاں پانچ بجے آؤں گی۔“

میں پانچ بجے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ شاہین ٹھیک پانچ بجے آئی۔ میں نے ایک کیبن لیا تھا تاکہ بغیر کسی کی مداخلت کے بات کر سکیں۔ شاہین دو سالوں میں کسی حد تک بدل گئی تھی۔ وہ دبلی ہو گئی تھی اور چہرے پر بھی پہلے جیسی تازگی نہیں رہی تھی۔ ”تم بہت بدل گئی ہو۔“

”تم بھی بدل گئے ہو۔“ اس نے چہرے پر موجود ہلکی شیو کی طرف اشارہ کیا اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ”کہو کس لیے بلایا ہے؟“

”پہلے تو میں اس رویے کی معافی چاہوں گا جو اس روز میں نے روا رکھا تھا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں نے تمہیں اسی دن معاف کر دیا تھا ورنہ آج میں تمہارے سامنے نہ ہوتی۔“

”میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”لیکن میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ تم نے وہ سب کیوں کیا تھا؟“

”آج میں نے تمہیں یہی سب بتانے کے لیے بلایا ہے۔“ میں نے کہا اور پھر شاہین کو اپنے گھر کی کہانی سنائی۔ والد کے بارے میں اسے بھی معلوم تھا کہ وہ رنگین مزاج آدمی تھے لیکن کس حد تک تھے یہ نہیں معلوم تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ والد نے کبھی اپنے دفتر کی کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ چکر نہیں چلایا تھا وہ ان معاملات کو اپنے کاروبار سے الگ ہی رکھتے تھے۔ شاہین حیران تھی اس نے کہا۔

”میرے خدا مجھے تو اندازہ نہیں تھا تم لوگ کس اذیت میں زندگی گزار رہے ہو گے۔“

”تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اگر ہمارے ماں باپ ایک جیسی فطرت کے ہوتے تو پھر ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا ہم بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتے۔ لیکن ماں باپ دونوں کسی سمندر کے بعید کناروں کی طرح تھے۔ شکر ہے ہماری ماں دین دار اور نیک عورت ہے اور اس نے ہمیں اور خاص طور سے مجھے بھٹکنے سے بچا لیا۔“

شاہین ہچکچائی۔ ”مبشر.... اگر تم بھٹکے نہیں تو پھر وہ سب کیا تھا؟“

”یہی بتانے کے لیے تو میں نے تمہیں بلایا۔ میں نے آج تک یہ بات کسی کو نہیں بتائی ہے جو تمہیں بتانے جا رہا ہوں۔ اپنے باپ کے کردار کو دیکھتے ہوئے مجھے اس بات سے اس سے نفرت ہو گئی تھی کہ میرا باپ معصوم لڑکیوں کو دھوکے دیتا رہا ہے۔“

”تو یہ کام تو تم بھی کرتے تھے۔“ شاہین بولی۔ ”میں ایسے ہی تمہاری طرف نہیں آئی تھی بلکہ مجھ سے پہلے میری ایک جاننے والی لڑکی بھی تمہارے بچھائے جال میں پھنس چکی تھی۔“

میں چونکا۔ ”تو کیا تم میری حقیقت جاننے کے لیے میری طرف آئی تھیں۔“

”ہاں شروع میں تو اسی لیے آئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور بعد میں؟“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور بولی۔ ”میں نے تم سے پوچھا ہے کہ تم یہ سب کیوں کرتے تھے کیونکہ اس لڑکی نے مجھے جو کہانی سنائی تھی تم نے ٹھیک وہی میرے ساتھ کیا۔“

”کیونکہ میں سب لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتا تھا۔ میں انہیں اپنی محبت کا یقین دلاتا اور پھر انہیں اپنے ساتھ اس فلیٹ تک جانے کے لیے آمادہ کرتا اور جب وہ وہاں پہنچ جاتیں تو میں ان کے ساتھ وہی ڈراما کرتا جو تمہارے ساتھ کیا تھا۔ میں ایسا ظاہر کرتا جیسے میں کوئی اوباش لڑکا ہوں اور وہاں انہیں اپنی مقصد براری کے لایا ہوں۔“

”لڑکیوں کو تمہارے اس روپ سے شاک لگتا ہو گا۔“

”بہت بڑا شاک لگتا تھا۔ وہ پہلے یقین نہیں کرتیں اور جب انہیں یقین آتا تو وہ رونے گڑگڑانے لگتی تھیں۔“

”پھر اچانک تمہیں کسی کی فون کال آجاتی اور تم اس سے بات کرنے کے لیے لڑکی کو وہیں چھوڑ کر اندر بیڈ روم میں چلے جاتے۔ لڑکی موقع غنیمت سمجھی اور وہاں سے نکل بھاگتی۔ ایسا ہی ہوتا تھا نا؟“

”ہاں۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا اور ہر لڑکی نے اس موقع سے اسی طرح فائدہ اٹھایا سوائے ایک لڑکی کے اور وہ لڑکی تم تھیں۔ جب میں بیڈ روم سے آیا تو تم وہیں موجود تھیں۔“

”اس کے باوجود تم نے مجھے چھوا بھی نہیں۔“

”اللہ گواہ ہے میں نے کبھی کسی لڑکی کو غلط نیت سے نہیں چھوا۔ اس لیے کہ میرا مقصد کبھی وہ نہیں رہا جو میں ظاہر کرتا تھا۔“

”تب تم یہ سب کیوں کرتے تھے؟“

”میرا خیال ہے تم سمجھ چکی ہو۔“

”ہاں لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔“

”دیکھو یہ ٹھیک ہے کہ قصور میرے باپ کی ذہنیت رکھنے والے مردوں کا زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ لڑکیاں بھی قصوروار ہوتی ہیں جو مردوں کے جال میں اتنی آسانی سے پھنس جاتی ہیں میرا مقصد ان لڑکیوں کو ایک سبق دینا ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہے یہ شاک ان کے لیے کافی ہوتا ہوگا اور اس کے بعد دوبارہ کبھی کسی لڑکے کے جال میں نہیں پھنستی ہوں گی۔“

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کوئی بہت ہی بے وقوف لڑکی ہوتی ہو گی جو اس کے بعد بھی کسی لڑکے سے محبت کا دھوکا کھائے۔“

”اس کا مطلب ہے تمہیں میری بات کا یقین آ گیا ہے۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”ہاں مجھے یقین آ گیا ہے۔ لیکن تم نے صرف اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟“

”نہیں اصل بات یہ ہے کہ میں نے کسی لڑکی سے سچ مچ محبت کی ہے تو وہ تم ہو۔ میری امی میری شادی کرنا چاہتی ہیں اور میں ان کو مزید انکار نہیں کر سکتا ..... اس لیے میں نے پہلے تم سے بات کی ہے۔“

”کیا میں اس لڑکے سے شادی پر آمادہ ہو جاؤں گی جس نے مجھے محبت کا دھوکا دیا تھا؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”اس وقت میں اسے دھوکا ہی سمجھ رہا تھا۔ لیکن مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے اصل میں خود کو دھوکا دیا ہے۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ لیکن پھر میں کس منہ سے تمہارے سامنے آتا۔ یہی سوچ کر اتنے عرصے سے رابطہ نہیں کیا۔“

”پھر اب کیوں کیا ہے؟“

”اس امید میں کہ شاید تمہیں میری محبت پر اعتبار آجائے۔“

شاہین کا چہرہ سپاٹ تھا میری بات پر بھی اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مایوس ہو کر سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہیں حق بہ جانب سمجھتا ہوں، بہرحال یہاں آنے، میری بات سننے اور میرا یقین کرنے کا شکریہ۔“

وہ اچانک ہنسی اور پھر اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولی۔ ”تم آج بھی ویسے ہی بدھو ہو۔ میرا جواب سنے بغیر ہی جا رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو ڈراما کرنا صرف تمہیں آتا ہے؟“

میں نے اسے دیکھا اور ہنس دیا کیونکہ اس کا جواب مجھے معلوم ہو گیا تھا۔

جناب ایڈیٹر ماہنا مہ سرگزشت

سلام شوق

میں پہلے ہی بتادوں کہ میں نہ تو ڈائجسٹ پڑھتی ہوں اور نہ اس سے پہلے کوئی کہانی لکھی۔ میری رائٹنگ دیکھ کر اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ یہ میری اپنی سرگزشت ہے اس لیے اسے لکھنا زیادہ مشکل نہ لگا۔ اب آپ کی مرضی کہ اسے شائع کریں یا ردی میں ڈال دیں۔ لیکن یہ بتادوں کہ اس کو اگر آپ نے شائع کیا تو بہت سے لوگ سبق حاصل کریں گے

سلطان شاہ
(لاہور)

راستے کا پتھر

میں نے چپ سادھ لی تھی۔ پولیس والے، وکیل اور جج مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں نے اس لڑکے کا خون کیوں کیا؟ کیا دشمنی تھی اس سے؛ لیکن میں نے کسی کی بات کا جواب نہیں دیا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلتی رہیں لیکن کوئی بات نہیں بتائی میں نے۔ جس وقت مجھے سزا سنائی جا رہی تھی اسس وقت عدالت کے کمرے میں اماں نرگس، پھوپی کامنی اور دوسری بھی سہیلیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ بھی مجھ

سے پچھلے دنوں معلوم کرتی رہی تھیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا لیکن میں نے چپ سادھ رکھی تھی۔

جس کو میں نے مارا تھا وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ زیادہ سے زیادہ اٹھارہ انیس برس کا۔ بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، چھریرا جسم، ہائے اس پر کتنی لڑکیاں مرتی ہوں گی لیکن میں نے خود اسی کو مار دیا تھا۔

بس میں نے اسے دیکھا اور مجھ پر ایک جنونی کیفیت سوار ہوگئی اور میں نے لوہے کی کرسی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔

چوٹ خطرناک ثابت ہوئی تھی۔ وہ چیخ کر گرا اور ٹھنڈا ہوگیا۔ مجھے تو اسی وقت پکڑ لیا گیا تھا۔ میں ویسے بھی کہاں بھاگ کر جاتی۔ اسی لیے سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔

اب اتنے برسوں کے بعد بتا رہی ہوں کہ میں نے اسے کیوں مارا۔

اس کے لیے بہت پیچھے جانا ہوگا۔ بہت پیچھے۔

ایک متوسط طبقے کی آبادی والا ایک محلہ، گلیاں چھوٹی، مکانات چھوٹے اور زندگی کے مسائل بہت بڑے بڑے۔

اس محلے کے ایک گھر کے ایک دروازے پر ڈھولک بجائی جارہی ہے، کچھ مخنث ڈانس کر رہے ہیں اور ساتھ میں زور زور سے گاتے جارہے ہیں۔

کچھ دیر بعد اس گھر میں رہنے والی ایک عورت دروازے پر آئی۔ اس کے ہاتھ میں دس کا ایک نوٹ تھا۔ اس نے وہ نوٹ گانے بجانے والی پارٹی کے سربراہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو... اور جاؤ یہاں سے۔“

”ہائے ہائے، ہم ایسے تو نہیں جائیں گے۔“ سربراہ تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔ ”ہم تو اپنی شہزادی کو لینے آئے ہیں۔ اسے ساتھ لے کر جانا ہے۔“

”کیا بکواس ہے۔ یہاں کوئی تمہاری شہزادی نہیں ہے۔“

”کیسے نہیں ہے۔ ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ کس گھر میں کیسا بچہ پیدا ہوا ہے۔ لاؤ، وہ بچہ ہمارے حوالے کردو۔ وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔ وہ شہزادی ہے ہماری۔“

”بھاگ جاؤ۔“ وہ عورت زور سے چیخی۔

اس دوران ایک اور آدمی بھی دروازے کے پاس آگیا تھا۔ ”کیا بات ہے زینو۔ کیا کہہ رہے ہیں یہ سب؟“

زینو نام کی اس عورت نے اس مرد کو بتا دیا کہ وہ لوگ کیا کہہ رہے تھے۔ وہ مرد بھی بھڑک اٹھا تھا۔ ”جاؤ نکلو یہاں سے۔ بھاگو۔“

”ہائے ہائے۔“ سربراہ تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔ ”ہم ابھی تو جارہے ہیں لیکن یاد رکھنا، ہماری شہزادی ہر حال میں ہمارے پاس آئے گی۔ اس کو تم لوگ روک نہیں سکو گے۔“

وہ گھر کرم داد کا تھا۔ کرم داد اور اس کی بیوی سلطانہ کے یہاں یہ پہلی خوشی تھی۔ ان کی شادی کو چار سال ہوچکے تھے اور چار سال کے بعد اولاد پیدا ہوئی تھی۔

یہ ڈلیوری اسپتال ہی میں ہوئی تھی اور اس وقت ڈاکٹر نے کرم داد کو اس بچے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ”دیکھیں جی، آپ کے یہاں جس بچے کی پیدائش ہوئی ہے وہ کچھ اور ہے۔“

”کچھ اور سے کیا مراد ہے؟“ کرم داد نے پوچھا۔

”مراد یہ ہے کہ وہ درمیان میں ہے۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”یعنی وہ قدرتی طور پر ایسا پیدا ہوا ہے یا ہوئی ہے۔“

”یہ... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔“ کرم داد یہ سن کر بوکھلا گیا تھا۔

”کرم داد صاحب، یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ آپ اور ہم اس میں کچھ نہیں کرسکتے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

دونوں میاں بیوی بچے کو لے کر آ تو گئے تھے لیکن ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔ اتنی دعاؤں کے بعد اولاد بھی ہوئی تو ایسی۔

گھر پہنچے تو خاندان والے بھی اس انوکھے بچے کو دیکھنے آگئے۔ ان کے پورے گھرانے میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

کرم داد اور اس کی بیوی سلطانہ سر تھامے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے آکر پوچھا۔ ”تمہارے بچے کے رشتے دار آئے تھے، اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے؟“

”ان کم بختوں کو یہ کیسے معلوم ہوجاتا ہے۔“ کرم داد نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اسپتال سے معلومات کرتے ہیں۔“ زینو کا شوہر بولا۔ ”یا ہوسکتا ہے کہ محلے والے بتا دیتے ہوں۔“

”کچھ بھی ہو، برادری میں ہماری ناک تو کٹ گئی نا۔“ کرم داد نے کہا۔

”کیسی بات کرتے ہو۔“ سلطانہ تڑپ اٹھی۔ ”اس میں اس معصوم کا کیا قصور! ہم نے جان بوجھ کر تو ایسی اولاد پیدا نہیں کی نا۔ یہ تو قدرت نے دے دی ہے۔ اب اس کو خود سے الگ بھی تو نہیں کرسکتے۔“

”تو کیا اس کو پالنے کا ارادہ ہے۔“ زینو نے کہا۔

”تو اور کیا کروں، پھینک دوں اس کو۔“

”ارے ان ہی کے حوالے کردو جو اسے لینے آئے تھے۔“

”خبردار زینو! آئندہ ایسی بات مت کرنا۔“ سلطانہ بپھر اٹھی تھی۔ ”یہ تمہاری اولاد نہیں ہے کہ تم اس کے لیے فیصلہ کرو۔ یہ میری اولاد ہے۔“

”اچھا اچھا... اب ہم کچھ نہیں کہہ رہے۔ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔“

وہ بچہ ایسے ہی ماحول میں پرورش پاتا رہا... اس کا نام سلطان رکھا گیا... سلطانہ سے سلطان۔ لیکن اس کی فطرت سلطان والی نہیں بلکہ سلطانہ والی تھی۔

اس کے حلیے اور باتیں کرنے کا انداز ہی یہ بتا دیتا کہ وہ کچھ اور ہے۔ محلے کے بچے بھی اسے چھیڑا کرتے اور وہ سلطانہ سے لپٹ کر رویا کرتا۔ ”اماں، میں کیا ہوں۔ کون ہوں میں؟“

”ارے۔ تم میری جان ہو۔ اولاد ہو میری۔“

”تو پھر میں دوسروں سے الگ کیوں ہوں۔“ وہ کہتا۔ ”محلے میں کوئی میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔ جب میں لڑکیوں کی طرف جاتا ہوں تو وہ کہتی ہیں لڑکوں میں جاؤ اور جب لڑکوں کی طرف جاتا ہوں تو وہ لڑکیوں میں بھیج دیتے ہیں۔ کہاں جاؤں میں؟“

سلطانہ سے اس کے آنسو نہیں دیکھے جاتے تھے۔ وہ اسے سینے سے لگا لیا کرتی۔

ایک بار پھر ایک شام ہیجڑوں کی ٹولی کا سردار ان کے گھر آگیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ اس نے سلطانہ سے کہا۔ ”دیکھو بیٹا۔ تیرے لیے یہی بہتر ہوگا کہ تو ہماری امانت ہمارے حوالے کردے کیونکہ خدا نے اسے تیرے گھر کے لیے نہیں بلکہ ہمارے گھر کے لیے پیدا کیا ہے۔ تو یقین کر یہ ہمارے پاس شہزادیوں کی طرح رہے گی۔ ہم اسے سینے سے لگا کر رکھیں گے۔ تجھ سے زیادہ پیار دیں گے اس کو۔“

”جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔“ سلطانہ غصے سے بولی۔ ”اور آئندہ سے اس طرف مت آنا۔“

”مرضی ہے تمہاری۔ لیکن جب ضرورت ہو تو یاد کرلینا مجھے۔ کسی سے بھی کہنا اماں نرگس سے ملنا ہے۔ وہ میرے پاس پہنچا دے گی۔“

نرگس کے جانے کے بعد سلطانہ پھر رونے لگی۔ بہت دیر تک اس کے آنسوؤں کا سلسلہ جاری رہا۔

اصل کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سلطان کو اسکول میں داخلہ دلایا گیا۔ سب سے پہلے تو جنس کے خانے میں کیا لکھا جائے۔ لڑکا یا لڑکی۔ اس کا نام چونکہ سلطان رکھا گیا تھا۔ اسی لیے لڑکا لکھ دیا گیا۔

لیکن پرابلم یہاں ختم نہیں ہوئی بلکہ یہاں سے ابتدا ہوئی تھی۔ ایک دن سلطان کے استاد نے کرم داد کو بلا کر کہا۔ ”بھائی، آپ کا یہ بچہ مجھے کچھ ابنارمل سا دکھائی دیتا ہے۔“

”میں نہیں سمجھا ماسٹر صاحب، کیا خرابی ہے اس میں۔“

”خرابی کیا بتاؤں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اس کی حرکتیں لڑکیوں والی ہیں۔“ استاد نے بتایا۔ ”ان ہی کی طرح باتیں کرنا۔ ان ہی کی طرح چہک چہک کر بولنا۔“

”تو پھر... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“

”کہنا یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے اسٹوڈنٹس کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔“ استاد نے کہا۔ ”وہ بھی اسی طرح کی حرکتوں میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔ اس لیے پلیز اسے اسکول سے اٹھا لیں۔“

کرم داد خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔

اسکول سے ہٹانے کے بعد سلطان کے مستقبل کا سوال اس کے سامنے آگیا تھا۔

اس دوران کرم داد کے ایک اور اولاد ہوچکی تھی۔ یہ بھی بیٹا تھا اور بالکل نارمل جس طرح دوسرے بچے ہوا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی خرابی نہیں تھی۔

سلطان اپنے چھوٹے بھائی کی آمد سے بہت خوش تھا۔ وہ اسے اپنی گود میں اٹھائے پھرتا۔ اس کو گانے سنایا کرتا۔ اس کے کپڑے دھوتا لیکن ان سب باتوں کے باوجود سوال وہی تھا کہ آخر اس کا کیا ہوگا۔

ایک دن نرگس پھر ان کے گھر آگئی۔

”اب تو امانت واپس کردو۔“ اس نے کہا۔ ”اب تو شہزادی دس برس کی ہوچکی ہے۔ میں دس برسوں سے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے۔ اسی کے لیے ہے۔“

اس بار انہوں نے نرگس سے انکار تو کیا لیکن ان کا لہجہ بہت کمزور تھا جیسے وہ رضا مند ہوتے جارہے ہیں۔ یہ تبدیلی بھی یوں آئی تھی کہ کسی نے کہہ دیا تھا کہ چھوٹا چاہے لاکھ نارمل ہو لیکن بڑے کے چھن دیکھ کر وہ بھی اس ہی جیسا ہو جائے گا... اور یہ بات دونوں کو گوارا نہیں تھی۔ اسی لیے انہوں نے بہت کمزور سا انکار کیا تھا۔

بالآخر ایک دن سلطان کو نرگس کے پاس پہنچا ہی دیا گیا۔ اور یہاں سے وہ کہانی شروع ہوتی ہے یعنی میری۔ یعنی سلطان کی۔ سلطان تو اس وقت کا نام تھا لیکن اب روزی تھا۔

میں اب روزی ہو چکا تھا یا ہو چکی تھی۔ اماں نرگس نے اپنے کہنے کے مطابق مجھے سینے سے لگالیا تھا۔ جس دن میں اماں کے گھر آئی اُس دن میرے آنے کی خوشی میں جو جشن رکھا گیا تھا اُس کی ذرا ذرا سی تفصیل یاد ہے۔

آنگن میں ایک تخت بچھا تھا جس پر سفید چاندنی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اماں نرگس کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے تھے۔ میں ان کے برابر میں تھی۔ دس سال کا ایک خوبصورت وجود۔

میری آنکھوں میں کاجل لگایا گیا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لالی تھی۔ میرے کپڑے بھی لڑکیوں والے تھے۔ میں بہت خوفزدہ تھی۔ بہت ڈر لگ رہا تھا مجھے۔ اماں یاد آرہی تھیں۔ ابا یاد آرہے تھے اور سب سے بڑھ کر چھوٹا بھائی۔ میں اس کو کیسے بھول سکتی تھی۔

میں روئے جارہی تھی۔ اماں نرگس مجھے دلاسے دے رہی تھیں۔ چپ کرانے کی کوشش کررہی تھیں۔ میرے لیے طرح طرح کی چیزیں لائی گئی تھیں۔ کھلونے، چوڑیاں، زیورات، رنگ برنگے جوڑے، سب کچھ تھا میرے لیے۔ پھر طرح طرح کے کھانے اور مٹھائیاں وغیرہ۔

اس آنگن میں اور بھی بہت سی اُن جیسی تھیں۔ وہ سب باری باری آتیں اور اماں نرگس اور میرے گلے میں ہار ڈالتیں۔ مٹھائی کا ڈبا ایک طرف رکھ دیتیں۔ مجھے پیار کرتیں، پھر سلیقے سے ایک طرف بیٹھ جاتیں۔

ڈھیروں ڈبے جمع ہو چکے تھے۔ پھر اگر بتیاں جلائی گئیں۔ لوبان کی خوشبو پھیلائی گئی اور میلاد شروع ہو گیا۔ یہ میلاد بہت احترام سے پڑھا گیا۔

سُریلی آوازوں والے ہیجڑوں نے میلاد پڑھا۔ میلاد کے بعد مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ سب سے پہلے مجھے مٹھائی کھلائی گئی۔ اس کے بعد دوسروں نے کھائی۔

پھر گانا بجانا شروع ہو گیا۔ سب ہی باری باری رقص کررہی تھیں۔ ایک طرف مجھے رونا بھی آرہا تھا اور دوسری طرف یہ تماشا مجھے اچھا بھی لگ رہا تھا۔ پھر ایک نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اٹھالیا۔ وہ مجھے بھی رقص کرنے کے لیے کہہ رہا تھا یا کہہ رہی تھی اور میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے ساتھ تھرکنے لگی۔

پھر سب نرگس کو مبارکباد دینے لگیں۔ ”اماں روزی بڑی ہو کر قیامت ڈھائے گی۔“

”ارے... اس کے بدن میں ابھی سے اتنا لوچ ہے۔“

”اماں، یہ غضب کی نکلے گی۔ یہ لکھ لو۔“

طرح طرح کے تبصرے ہورہے تھے۔ اماں نرگس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ یہی کہہ رہی تھیں کہ قدرت نے انہیں ایک ہیرا تحفے میں دے دیا ہے۔

وہ ہیرا ابھی تراشا بھی نہیں گیا تھا لیکن اس کی چمک دمک نے آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی میرے چرچے پھیلنے لگے۔ برادری والیاں تو جان چھڑکا کرتی تھیں۔

اماں نے مجھے تعلیم بھی دلوائی۔ گھر پر ہی ایک ٹیچر کا بندوبست کردیا جو مجھے آکر پڑھایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ناچ گانا بھی سکھایا گیا۔

کئی برس گزر گئے۔ اس دوران گھر والے بہت یاد آتے رہتے تھے۔ اماں، ابا اور چھوٹا بھائی۔ جب ان کی یاد آتی تو چھپ کر رولیا کرتی۔

نہ جانے قدرت نے مجھے ایسا کیوں بنادیا تھا۔ دنیا میں اور بھی تو بچے ہوتے ہیں۔ پھر میں ایسی کیوں بنادی گئی تھی۔ ایک بار جب میرا دل بہت گھبرانے لگا تو میں نے نرگس اماں سے کہا۔ ”اماں، میرا گھر جانے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”ارے... کیا اپنی نرگس ماں کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔“

”نہیں اماں، صرف کچھ دیر کے لیے۔“ میں نے کہا۔ ”بس ان لوگوں سے مل کر آجاؤں گی۔ چھوٹے بھائی کو دیکھنے کا دل چاہتا ہے۔“

”اچھا اچھا سمجھ گئی۔“ نرگس نے اپنی گردن ہلادی۔ ”جا چلی جا۔ میں جانتی ہوں کہ تو جہاں بھی جائے یہیں واپس آئے گی۔ تیرا اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔“

”جانتی ہوں اماں۔ تو اب میں جارہی ہوں۔“

اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں نے لڑکیوں والے کپڑے اتار دیے تھے۔ لڑکوں والا ایک جوڑا پہن لیا۔ اس میں بھی میری سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔

نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد اپنے گھر کی طرف جارہی تھی۔ ایک ایک قدم پر دل کی دھڑکن تیز ہورہی تھی۔ نہ جانے وہاں پہنچ کر میں خود کو سنبھال بھی سکوں گی یا نہیں۔ اماں کیسی ہو گئی ہوں گی۔ کیا مجھے یاد کرتی ہوں گی یا بھول گئی ہوں گی۔ بھائی تو شاید بدل ہی گیا ہو۔ جب میں بہت چھوٹی تھی تو اسے چھوڑ کر نرگس اماں کے پاس چلی گئی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ کسی نے اسے یہ بھی نہ بتایا ہو کہ کوئی اس کا بڑا بھائی بھی تھا یا تھی۔ لیکن اس نے محلے والوں سے تو ضرور سن لیا ہوگا۔

اپنا محلہ آ گیا۔ وہی محلہ جس کے ایک چھوٹے سے گھر میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ جو میرے ماں باپ اور بھائی کا گھر تھا۔ دل گھبرا رہا تھا اس لیے میں محلے کے کونے والے ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئی۔ سوچا کہ تھوڑی ہمت پیدا ہو جائے تو پھر گھر جاؤں گی۔

ہوٹل میں اور بھی لوگ تھے۔ وہ سب مجھے دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ مجھے پہچانتے تو نہیں ہوں گے۔ مجھ میں اب کتنی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔

میں...... جنہیں اپنے بچپن میں دیکھ چکی تھی... وہ بھی بدل چکے تھے۔

میں نے خود کو سنبھالا دینے کے لیے چائے منگوائی اور اب میں چائے کے گھونٹ لے ہی رہی تھی کہ ایک آدمی میرے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک نظر میں اسے پہچان لیا..... وہ فضلو تھا۔ محلے کا دھوبی۔

وہ بہت غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”تم سلطان ہو نا؟“

میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا ہو۔ میں نے انکار کرنا چاہا لیکن انکار نہیں کرسکی تھی۔ ”ہاں۔“ میں نے اپنی گردن ہلادی۔ ”میں نے بھی تم کو پہچان لیا ہے۔ تم فضلو چاچا ہو۔“

”کیوں آئے ہو یہاں۔“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”اپنے گھر والوں سے ملنے۔“ میں نے بتایا۔ ”بہت دن ہو گئے ان کو دیکھے ہوئے۔ اس لیے اس طرف چلی آئی ہوں۔“

”میری بات مانو تو ان سے نہ ملو۔“ اس نے کہا۔ ”اب وہ تمہیں بھول کر ایک اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ تمہارے بعد تین بچے ہوئے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ اب وہ جوان ہو رہی ہیں۔ خود سوچو اگر یہ بات مشہور ہو گئی کہ ان کا بڑا بھائی ہیجڑا ہے تو ان کی شادیاں نہیں ہوں گی۔ ان کے یہاں رشتے نہیں آئیں گے۔ اس لیے بھول جاؤ ان لوگوں کو۔“

میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”تمہارا بھائی کالج جانے لگا ہے۔ بڑا خوبصورت جوان نکلا ہے وہ۔ جب اس کے دوستوں کو تمہارے بارے میں پتا چلے گا تو پھر اس کی کیا حالت ہو گی۔ وہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔“

”فضلو چاچا۔ تو پھر...“ میری آواز جیسے حلق میں اٹک گئی تھی۔ ”تو پھر کیا کروں میں۔“

”جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔“ فضلو نے کہا۔ پھر اچانک اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”وہ دیکھو۔ وہ تمہارا چھوٹا بھائی جارہا ہے۔ عمران نام ہے اس کا۔“

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی ایک خوبصورت اور بانکا نوجوان تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں کچھ کتابیں لیے دوستوں کے ساتھ جارہا تھا۔ اس میں بہت حد تک میری شباہت تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں خود کتابیں لیے پڑھنے جارہا ہوں۔

”دیکھ لیا تم نے۔“ فضلو نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اب تم دونوں کی دنیا الگ الگ ہے۔ اس لیے اس کو اس کی دنیا میں رہنے دو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو فضلو چاچا۔“ میری آنکھوں میں اس وقت آنسو تھے۔

”ہاں، اب ایک بات اور۔“ فضلو مسکرا کر بولا۔

”وہ کیا ہے فضلو چاچا۔“

”تم اگر چاہو تو دو چار دن میرے پاس رہ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”تمہاری مزدوری دے دوں گا۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس کی ہوسناک نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میں نے اس شخص کو چاچا کہا تھا۔ بچپن میں

بھی یہی کہتا آیا تھا اور اب وہ مجھ سے ایسی بات کر رہا تھا۔ اس قسم کی تمام باتیں اماں نرگس نے مجھے سمجھا دی تھیں۔ اس لیے اس کا مقصد سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

میں جیسے شرم سے سرخ ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔ میں نے فضلو چاچا سے کہا۔ "چاچا، تمہیں مجھ سے ایسی بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

"ارے جا۔" فضلو بھڑک اٹھا۔ "کیوں پارسا بنتا ہے۔ تم لوگ اور ہوتے کس لیے ہو۔ میں نے بھی یہی کہہ دیا تو اس میں کیا برائی ہے۔"

میں اس ہوٹل میں نہیں بیٹھ سکی۔ اپنے مقدر پر روتی ہوئی اماں نرگس کے پاس واپس آ گئی۔ پھر ان سے لپٹ کر بہت دیر تک، بڑی دیر تک روتی رہی تھی۔

اماں نرگس بھی میرے آنسوؤں کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ان کے پوچھنے پر میں نے بتا دیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میری بات سن کر اماں نرگس بہت دیر تک سوچتی رہیں پھر دھیرے سے بولیں۔ "ہاں بیٹا، یہی ہمارا مقدر ہے۔ ہماری دنیا کچھ اور ہے۔ تو جس دنیا میں جانے کی بات کر رہی ہے وہ کچھ اور ہے۔ وہ لوگ ہم سے بہت مختلف ہیں۔ ان کی اپنی زندگی ہے اور ہماری اپنی۔ وہ ہماری طرف نہیں آتے اور ہم ان کی طرف نہیں جاتے۔ تو چلی گئی تھی۔ چل ٹھیک ہوا۔ واپس آ گئی اور یہ بھی ٹھیک ہوا۔ اب یہیں رہ۔ بھول جا سب کو۔ تیرا کوئی نہیں ہے سوائے میرے۔ اور ان کے جو تیرے آس پاس ہیں۔ پھوپی...... شہناز، تیری ساری سکھیاں، ان ہی کے ساتھ جیون گزارنا ہے تجھے۔ اس کے علاوہ کہیں نہیں جانا۔"

"ٹھیک کہتی ہو اماں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر ایک گیت یاد آ گیا اور میں وہ گنگنانے لگی۔ "اب ہے یہی دونوں جہاں۔ ان کے سوا جانا کہاں۔"

اماں بھی میری آواز میں آواز ملانے لگیں۔ دوسری سہیلیاں بھی آ گئیں۔ گلشن نے ڈھولک سنبھال لیا تھا۔ ذرا سی دیر میں سماں بندھ گیا تھا۔

سب کچھ تھا لیکن ایک بات بہت بڑی تھی۔ اماں نے تو خیر مجھے بچا کر رکھا تھا لیکن دوسری سہیلیاں کہیں نہ کہیں جایا کرتی تھیں۔ کبھی کسی کے پاس، کبھی کسی کے پاس۔ ہر ایک کے ساتھی تھے۔ محبوب تھے، وہ واپس آ کر جب ان کے بارے میں باتیں کیا کرتیں تو میں شرم سے دہری ہو جاتی تھی۔

میں رات کو بستر پر لیٹ کر یہی سوچا کرتی تھی کہ کیا یہی ہمارا مقدر ہے۔ ہماری زندگی ایسی ہی ذلت کی زندگی ہے۔ ہوسناک نگاہوں کے درمیان زندہ رہنا ہماری تقدیر ہے کیونکہ ہم کو شاید پیدا ہی اسی لیے کیا گیا ہے۔ کبھی کبھی بہت باغیانہ قسم کی سوچ بھی ابھرنے لگتی۔

آخر کیوں۔ جو کچھ بھی ہے اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ پھر ہمیں ایسا کیوں بنا دیا گیا۔ کیا ہماری تخلیق صرف اس لیے ہوئی ہے کہ ہم دوسروں کے دل بہلاتے رہیں۔ ہماری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

سب کچھ شاید ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ ایک دن اچانک ایک بم میرے سر پر آ گرا۔ میری قیمت لگا دی گئی تھی۔ یہ خبر مجھے شہناز نے دی تھی۔

"اے روزی، مبارک ہو۔ تیرے تو نصیب کھل گئے۔ اب تو تو راج کرے گی۔"

"کیوں ری، کیا ہوا ہے میرے ساتھ۔"

"ابھی تو کچھ نہیں ہوا... لیکن ہونے والا ہے۔" اس نے کہا۔ "پورے پانچ لاکھ ملیں گے، پانچ لاکھ۔ یہاں سے اتنی زیادہ بولی پر آج تک کوئی نہیں گئی ہوگی۔"

"شہناز... تو کیا کہہ رہی ہے۔ تیری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

پھر اس نے بتایا کہ مجھے کسی کے ساتھ بھیج دینے کی بات ہوئی تھی۔ باقاعدہ شادی کر کے۔ ناچ گانے کے ساتھ اور یہ سودا پانچ لاکھ میں طے ہوا تھا۔ کسی نے مجھے خریدنے کے لیے پانچ لاکھ کی آفر دی تھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہو گیا ہے ری۔ اس نے کسی جگہ تجھے ناچتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تو اسے پسند آ گئی اور اس نے اماں سے بات کر لی۔"

"اور اماں نے اس کی بات مان لی۔"

"اور کیا۔ ہم لوگ ہیں کس لیے۔ یہی تو ہماری اوقات ہے۔ جو تجھے لے جا رہا ہے۔ وہ بہت عیش سے رکھے گا۔ بہت مان اٹھائے گا تیرے۔"

"بکواس مت کر۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔"

میں اماں نرگس کے پاس پہنچ گئی۔ ہمیشہ کی طرح ان سے ضد کرنے۔ ان سے اپنی بات منوانے۔ اماں بہت دھیرج ہو کر میری باتیں سنتی رہیں۔ میں نے غصے میں آ کر نہ جانے کیا کیا بول دیا تھا۔

میرے خاموش ہو جانے کے بعد انہوں نے کہا۔ "بس اتنی سی بات پر ناراض ہو گئی شہزادی۔"

"یہ اتنی سی بات ہے اماں۔"

"ہاں بیٹا۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ "اور ہمیں کرنا کیا ہے۔ میں آج کل بیمار رہنے لگی ہوں۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں تو یہ تجھے کوڑیوں کے مول بیچ دیں گے۔ اس اڈے پر قبضہ ہو جائے گا۔ بہت سوں کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ بات سوچی تھی۔"

"اماں، ایک بات بتاؤ۔ کیا ہم جیسوں کا بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"ہاں بیٹا، بہت مشکل۔ اچھی صورت والیوں کو تو اور بھی دشواری ہوتی ہے۔ قدم قدم پر بولی لگانے والے ہوتے ہیں اور بہت سے کم بخت تو یوں ہی اٹھا لے جاتے ہیں، ہم کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ یہ معاشرہ ہمارا نہیں ہے۔ یہ ان کا ہے جو نارمل ہوتے ہیں۔ ہم تو بس ٹھوکروں والی مخلوق ہیں۔ ہمیں تو بس مذاق کی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ ہم صرف لطف دینے کے لیے ہیں۔"

بولتے بولتے اماں نرگس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں بھی رونے لگی۔ پھر میں نے اماں سے کہہ دیا۔ "ٹھیک ہے اماں۔ اگر تم نے یہی سوچا ہے تو یہی سہی۔ میں تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ اب چاہے میری بولی لگانے والا کوئی بھی ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

اور بولی لگانے والا ایک چودھری ٹائپ کا انسان تھا۔ یہ مونچھیں۔ یہ ہاتھ پاؤں۔ یہ چڑھی ہوئی آنکھیں۔ نہ جانے اس نے مجھے کہاں دیکھ لیا کہ اس طرح عشق کرنے لگا تھا۔

اماں نے سکندر سے میری ملاقات کروا دی تھی۔ سکندر شاہ نام تھا اس کا۔ شاہ جی شاہ جی کہلاتا تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔ "فکر کیوں کرتی ہے۔ میں تجھے رانی بنا کر رکھوں گا۔ تیرے اتنے ناز اٹھاؤں گا کہ تو بھی حیران رہ جائے گی۔"

"شاہ جی، ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہاری برادری، تمہارے دوستوں کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا کہ تم کس کو اٹھا کر لے آئے ہو۔"

"کیسی بات کر رہی ہے۔ کس بات کا اعتراض۔ یہ تو ہمارے یہاں کا رواج ہے۔ برسوں سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔ جس کے پاس جتنی خوبصورت چیز ہوتی ہے، وہ اتنا ہی گردن اٹھا کر چلتا ہے اور تُو تو لاکھوں میں ایک ہے۔"

اب اس کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے کیا رہا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ اماں نرگس کے اڈے سے مجھے شاہ جی کے ساتھ روانہ کر دیا گیا۔ باقاعدہ رخصتی جیسی چیز ہوئی تھی۔ جیسی لڑکیوں کی ہوا کرتی ہے۔ ناچ گانا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا کیا رسومات ادا ہوئی تھیں۔ سب رو رہی تھیں۔ کیونکہ میں پرائی ہونے جا رہی تھی۔

سکندر شاہ بڑی شان کے ساتھ مجھے اماں نرگس کے اڈے سے اپنی کوٹھی پر لے آیا تھا۔ اس کی کوٹھی شہر ہی میں تھی۔ یہاں اس کے کئی دوست شراب کی بوتلوں کے ساتھ اس کے انتظار میں تھے۔

مجھے دیکھ کر سب نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ ایک نے کہا۔ "ارے سکندر شاہ، یہ تو زبردست چیز ہے۔ سالی ہیجڑوں کی ملکہ حسن معلوم ہوتی ہے۔"

سب زور زور سے ہنسنے لگے تھے لیکن اس وقت میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہی تھی میری اوقات۔ دل بہلانے والی چیز۔

سکندر شاہ اور اس کے دوستوں کے کہنے پر مجھے ناچنا بھی پڑا تھا۔ بہت دیر تک وہ لوگ مجھے نچاتے رہے تھے۔ مجھ پر نوٹ بھی نچھاور کیے گئے۔

دوستوں کے جانے کے بعد میں اس کوٹھی میں سکندر شاہ کے ساتھ اکیلی رہ گئی اور وہ اپنی ہوس کی تلوار مجھ پر چلاتا رہا۔ میں نے ایسی بے عزتی اور ایسی توہین پہلے کبھی نہیں محسوس کی تھی۔

نہ جانے کیوں اس رات مجھے اپنا گھر یاد آتا رہا تھا۔ اماں نرگس والا نہیں بلکہ اپنا اصلی گھر، جہاں میں پیدا ہوئی تھی اور جہاں کے پڑوس کی خالہ بچوں کو شام کے وقت قرآن پڑھایا کرتی اور بچوں کی پاکیزہ آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ میں وہیں رہتی تھی۔ اپنی اماں، ابو اور بھائی کے ساتھ۔ پھر نہ جانے سب کچھ مجھ سے کیوں چھین لیا گیا تھا...... کیوں؟ کیا کسی کے پاس میرے اس سوال کا جواب ہے۔

میں نہیں بتا سکتی کہ اس سکندر شاہ کے ساتھ میرے شب و روز کیسے گزر رہے تھے۔ اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے اپنے آنسوؤں کے درمیان۔

یہاں مجھ سے ملنے کے لیے بھی کوئی نہیں آتا تھا۔ نہ اماں نرگس، نہ میری سہیلیاں، کوئی بھی نہیں۔ مجھے سکندر شاہ کے حوالے کردینے کے بعد سب مجھے بھول گئی تھیں۔

ایک شام سکندر شاہ نے مجھ سے کہا۔ ''چلو' ذرا سج دھج کر تیار ہو جاؤ۔ ایک جگہ چلنا ہے۔''

''کہاں جانا ہے۔''

''ارے' میرا چھوٹا بھائی ہے نا۔ وہی جو کالج میں پڑھتا ہے۔ آج اس کی شادی ہے۔'' سکندر شاہ نے بتایا۔

''شاہ صاحب' یہ کیسی بات ہوگی کہ آپ شادی میں مجھ جیسی کو لے کر جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کا تو مذاق اڑایا جائے گا۔''

''کس میں ہمت ہے مذاق اڑانے کی۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''پھر یہ تو ہمارے یہاں چلتا ہی ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔''

اس کے بعد انکار کی کیا گنجائش تھی۔ مجھے تو اس کے ساتھ جانا ہی تھا۔

میرے ہچکچانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں جانتی تھی کہ وہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ وہ مجھے اپنے بھائی کی شادی میں ڈانس کروانے کے لیے لے جا رہا تھا کیونکہ میں اس کے ہاتھ لگی ہوئی تھی۔ ایک ایسا تحفہ جس سے سارے کام لیے جاسکتے تھے۔

سکندر شاہ کا بھائی بھی اپنی الگ کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس کے اپنے ٹھاٹ ہوں گے۔ اپنی زندگی ہوگی۔ کچھ دستور تھے ان لوگوں کے۔ ہر ایک کے راستے الگ۔ ہر ایک کی زندگی الگ۔ ہماری طرح نہیں کہ ہم ایک ہی گھر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

کوٹھی روشنی میں نہا رہی تھی۔ بہت مہمان آئے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے سکندر شاہ کے بھائی کی شادی تھی۔ جو نہ ہوتا کم تھا۔ اندر انگریزی میوزک بج رہی تھی۔ تالیاں بجائی جا رہی تھیں۔ یقیناً جشن ہو رہا ہوگا۔

سکندر شاہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے کوٹھی میں لے آیا۔ نہ جانے وہ کیسا آدمی تھا۔ اسے کوئی شرم بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کے لیے جو کچھ بھی تھا سب ٹھیک ہی تھا۔

ایک طرف لان میں دور تک میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ وردی والے ویٹر شراب کی بوتلیں لیے میزوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔

ہر طرف بے فکری، ہر طرف دولت کی ریل پیل، میزوں کے درمیان خالی جگہ تھی اور وہاں رقص ہو رہا تھا۔ یہ رقص کالج کے لڑکے کر رہے تھے۔

سکندر شاہ نے مجھے ایک طرف بٹھا دیا۔ میں ان ڈانس کرنے والے لڑکوں کو دیکھنے لگی اور اسی لمحے وہ کچھ ہوگیا جو شاید نہیں ہونا تھا۔

کسی نے بھی ایسا نہیں سوچا ہوگا۔ یہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ جیسے ذرا سی دیر میں بجلی چمک کر رہ جائے۔ میں نے بجلی ہی کی سی تیزی کے ساتھ لوہے کی ایک کرسی اٹھائی اور ایک نوجوان کے سر پر دے ماری۔

شاید میں کچھ زیادہ جوش اور غصے میں تھی یا اس نوجوان کا سر ہی نازک تھا کہ وہ یہ چوٹ برداشت نہیں کرسکا تھا اور اسی وقت اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

کچھ دیر تک تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوگیا ہے۔ اس کے بعد میں گرفتار ہوگئی۔ سب پوچھتے رہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا لیکن میں چپ رہی۔

پولیس والوں کو بھی نہیں بتایا۔ عدالت میں بھی خاموش تھی۔ اماں نرگس نے بھی آکر پوچھا لیکن میں خاموش رہی۔ بالکل خاموش۔

مجھے طویل سزا سنادی گئی کیونکہ میری قسمت میں یہی تھا۔

اور اب اتنے برسوں کے بعد میں یہ راز اس لیے بتا رہی ہوں کہ اب میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں رہا۔ میں بیمار رہنے لگی ہوں اور جو کچھ مجھ پر گزری ہے وہ اس لیے لکھ رہی ہوں کہ لوگ ہماری برادری کا مذاق اڑانا چھوڑ دیں۔ ہماری توہین نہ کریں۔

ہم جیسی ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمیں جس نے پیدا کیا ہے اس نے ایسا ہی ہمارے لیے مناسب سمجھا ہوگا۔

اور جہاں تک اس نوجوان کی موت کا تعلق ہے تو وہ میرا بھائی تھا۔ ہاں' میرا چھوٹا بھائی۔ وہ ناچ رہا تھا۔ تھرک رہا تھا اور میں اس کے انداز میں اپنا انداز دیکھ رہی تھی۔ اس لیے میں نے مار دیا اسے کہ کہیں وہ بھی میری طرح نہ ہو جائے۔ کہیں اس کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ ہو جو میرے ساتھ ہوتا ہے۔

کہیں کوئی اور سکندر شاہ اس کی بھی بولی نہ لگا دے۔ اس لیے میں نے مار دیا اس کو۔

☹

چشمِ تماشا

محترم ایڈیٹر!
السلام علیکم
انسان اپنے مفاد کی خاطر اور کبھی دوسروں کے بہکاوے میں آکر کس حد تک گر جاتا ہے۔ آپ کو میری آپ بیتی سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ میں اپنے ضمیر کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے پرانی باتوں کو دہرا رہا ہوں۔

نوید خان
(کراچی)

میں دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''کہاں سے آرہے ہو؟'' ابو کی گرج دار آواز نے میرے پیر جکڑ لیے۔ میں یوں ساکت ہوگیا جیسے چلنا بھول گیا ہوں۔

''ابو...... وہ...... میں......''

''میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا نوید!'' ابو نے اس مرتبہ قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''راتوں کو آوارہ

گھومنا اچھے لڑکوں کا شیوہ نہیں۔ تم نے وقت دیکھا ہے، کیا بجا ہے؟" ابو خفگی سے بولے۔ "رات کا ایک بج رہا ہے اور تم......"

"ابو، میں سعید کے گھر تھا اور......"

"جھوٹ مت بولو نوید!" ابو نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ انہیں جھوٹ سے سخت چڑ تھی۔ "میں نے سعید کو فون کیا تھا، تم وہاں نہیں تھے۔ نہ جانے کہاں واہی تباہی پھرتے رہتے ہو۔ میرا کام تو صرف سمجھانا ہے۔ یہ وقت گزر گیا تو پھر زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ میٹرک میں اے ون گریڈ لا کر تم سمجھ رہے ہو کہ تم کہیں کے عالم فاضل ہو گئے ہو۔ یہاں، میٹرک پاس کو تو آج کل چپراسی کی ملازمت بھی نہیں ملتی۔"

ہر دو چار دن بعد یہی ہوتا تھا۔ میں رات گئے گھر لوٹتا تھا اور ابو کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا تھا۔ ابو بہت سلجھے ہوئے اور اصول پسند شخص تھے ورنہ ان کی جگہ کوئی اور باپ ہوتا تو اب تک مار پیٹ کر مجھے گھر...... سے نکال چکا ہوتا۔

میں نے بہترین اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور اب بھی شہر کے ایک معروف کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ابو مجھے انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ میری خواہش بھی یہی تھی لیکن کالج میں آنے کے بعد میری دوستی دو تین ایسے امیر زادوں سے ہو گئی جو کالج محض تفریح کے لیے آتے تھے۔

میں خاصا چرب زبان تھا، بہت لچھے دار گفتگو کرتا تھا، پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی مجھے آتا تھا اور شکل وصورت بھی اچھی تھی۔

جلد ہی ان لڑکوں سے میری دوستی ہو گئی اور کالج کے بعد میں ان کی گاڑیوں میں گھومنے لگا۔ کھانے پینے کا سارا خرچ بھی وہی اٹھاتے تھے، پھر بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں ان ہی کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔

سعید اسکول کے زمانے کا دوست تھا۔ وہ کالج میں بھی میرے ساتھ پڑھتا تھا لیکن ہم دونوں کے مضامین الگ تھے اس لیے اس سے کم ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بہت پڑھاکو قسم کا لڑکا تھا، بچپن سے ہمارے گھر آتا تھا اس لیے ابو بھی اس کی بہت قدر کرتے تھے۔ شروع شروع میں دو چار دفعہ میں نے سعید کا نام لیا تو ابو مطمئن ہو گئے لیکن آج انہوں نے سعید سے پوچھ ہی لیا تھا۔ اس بے چارے کو کیا پتا کہ میں نے خود کو بچانے کے لیے اس کا نام استعمال کیا ہے۔

ابو کی اس دن کی ڈانٹ ڈپٹ بھی بے کار ہو گئی۔ میں نے اس کا کوئی اثر ہی نہ لیا اور اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی، میں اپنے دوستوں راشد اور منیر کے ساتھ سی سائیڈ پر گیا تھا۔ ہم لوگ دیر تک ساحلِ سمندر پر ٹہلتے رہے، پھر راشد نے کہا۔ "یار، اب یہاں سے چلو، مجھے بہت شدید بھوک لگ رہی ہے۔"

"ہاں یار!" منیر نے کہا۔ "آج سی فوڈ کھانے کا موڈ ہے۔"

وہاں سے کچھ فاصلے پر راشد کی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی منیر کے پاس بھی تھی لیکن عموماً ہم ایک ہی گاڑی استعمال کرتے تھے۔

ہم گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ مجھے کچھ فاصلے پر ایک لڑکی دکھائی دی۔ اس نے جدید طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ الیکٹرک پول کی مدھم روشنی میں مجھے اس لڑکی کے خدوخال تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن اس کے شانوں تک ترشے ہوئے بال تیز ہوا میں اڑ رہے تھے۔ ابھی رات اتنی زیادہ نہیں گزری تھی اس کے باوجود وہاں ایک تنہا لڑکی کو دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا۔

راشد نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ایڈونچر!"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"یار اس لڑکی کا پرس چھین کر بھاگ جاتے ہیں، کیسا تھرل محسوس ہوگا۔"

"نہیں یار!" میں نے کہا۔ "تم لوگ لڑکیوں کو چھیڑتے ہو، ان پر آوازے کستے ہو، وہی بہت ہے۔ یہ تو سراسر جرم ہے۔ پکڑے گئے تو پولیس کی مار الگ پڑے گی اور بے عزتی بھی ہوگی۔"

"ابے یار، تو ہمیشہ کا بزدل ہے۔" منیر نے ہنس کر کہا۔ "کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ لڑکی ہمارا پیچھا کرنے سے رہی۔ پھر اگر وہ چیخے چلائے گی بھی تو اس وقت تک ہم کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔"

میں کہنے ہی والا تھا کہ تم لوگ اپنا شوق پورا کرو، مجھے یہیں اتار دو لیکن اس سے پہلے ہی راشد نے زناٹے سے گاڑی آگے بڑھائی اور اس لڑکی کے عین سامنے روک دی۔ وہ لڑکی اچھل کر پیچھے ہٹی، گاڑی سے اتر کر منیر نے اس کے شانے سے لٹکا ہوا بیگ چھیننے کی کوشش کی۔ لڑکی نے منیر کو دھکا دے دیا۔ جوش میں آ کر راشد بھی اس کی مدد کو پہنچ گیا اور لڑکی کو گاڑی کی طرف دھکیلنے لگا۔ اس نے گھبرا کے اپنا پرس چھوڑ دیا۔

وہ دونوں فوراً گاڑی میں بیٹھے اور راشد نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

لڑکی نے چیخ کر کچھ کہا بھی تھا لیکن مجھے سنائی نہ دے سکا۔

راشد نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "نوید کی تو جان نکلی جا رہی تھی۔ بتا کچھ ہوا؟ آج کل کراچی میں اس قسم کی وارداتیں عام ہیں اس لیے لوگ پولیس کے پاس بھی نہیں جاتے، پولیس والے الٹا ان ہی کو پریشان کرتے ہیں۔"

"یار! بس یہ افسوس ہے کہ اب ہم سی فوڈ نہیں کھا سکیں گے۔" منیر نے کہا۔

"سی فوڈ بھی کھائیں گے۔" راشد ہنس کر بولا۔ "میں آگے سے لمبا چکر کاٹ کر ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچوں گا۔ اس لڑکی نے اندھیرے میں ہماری شکلیں کیا دیکھی ہوں گی، پھر کسی کی جرات ہے کہ محض شبے میں ہمیں پریشان کرے۔" وہ منیر سے مخاطب ہوا۔ "یار، ذرا دیکھو تو اس بیگ میں ہے کیا۔"

راشد نے ایک جگہ گاڑی روک کر اندر کی لائٹ جلائی اور بیگ کھول لیا۔ اس نے بیگ کے اندر جھانکا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یار! ہمارا اندازہ غلط تھا لڑکی کسی اونچی فیملی کی معلوم ہوتی ہے۔" اس نے ہاتھ ڈال کر اس میں سے رقم نکالی اور گن کر بولا۔ "یہ بارہ ہزار روپے ہیں، اتنی رقم کوئی غریب لڑکی لے کر نہیں پھر سکتی۔ یہ دیکھ، یہ سیل فون بھی بہت قیمتی ہے...... اور...... یہ...... ایک چین ہے۔ یہ بھی مجھے سونے کی لگ رہی ہے۔ پرفیوم بھی بہت قیمتی ہے۔"

اس کا سامان نکال کر پرس یہیں پھینک دے۔" منیر نے کہا۔

"یار اتنا خوبصورت اور قیمتی پرس ہے، خالص چمڑے کا ہے۔"

"اسے فوراً پھینک دو راشد" میں نے پہلی دفعہ ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

"او بھائی! مارکیٹ میں ایسے پرس عام ملتے ہیں۔ اس پر اس حسینہ کا نام نہیں لکھا ہے۔" راشد ہنس کر بولا۔ "البتہ میں اس کا سیل فون آف کر دیتا ہوں۔" اس نے سیل فون آف کر کے نقدی اور تمام چیزیں دوبارہ پرس میں بھر دیں اور گاڑی ایک مرتبہ پھر آگے بڑھا دی۔

وہ انتہائی تیز رفتاری سے جا رہا تھا کہ اچانک اسے بریک لگانا پڑے۔ ٹائروں کی رگڑ سے مخصوص قسم کی آواز پیدا ہوئی۔ منیر بری طرح ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔ میں بھی ڈرائیونگ سیٹ کی پشت سے بری طرح ٹکرایا تو مجھے منیر کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یہ تو کیسے پاگلوں کی طرح گاڑی چلا رہا ہے۔"

راشد نے آہستہ سے کہا۔ "سامنے دیکھو!"

اس کے کہنے پر میں نے بھی سامنے دیکھا تو مجھے پولیس کی ایک موبائل وین دکھائی دی جو پوری سڑک گھیر کے کھڑی تھی۔

"یہ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔" راشد جھنجلا گیا۔ "یہ بھی کوئی گاڑی کھڑی کرنے کا طریقہ ہے۔ اگر مجھے وین کی چھت پر نیلی لائٹ گھومتی نظر نہ آتی تو میں تو اس وین کو اڑا دیتا۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ پولیس وین ہمارے ہی انتظار میں کھڑی ہے۔

گاڑی رکتے ہی پولیس وین کے سامنے کھڑے ہوئے دو سپاہی ہماری طرف بڑھے۔

راشد نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور درشت لہجے میں بولا۔ "یہ گاڑی کھڑی کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟ اگر میری گاڑی میں ہائیڈرولک بریک نہ ہوتے تو تمہاری گاڑی تو اڑ گئی ہوتی۔ ساتھ میں تمہارا ابھی کچومر نکل گیا ہوتا۔ اپنے جنگلی ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی راستے سے ہٹائے۔"

"زیادہ بک بک مت کراوئے!" پولیس کا ایک سپاہی بولا۔ "تم سب نیچے اترو ہمارا صاحب بلا رہا ہے۔"

"اپنے صاحب کو یہیں بھیج!" منیر بھی درشت لہجے میں بولا۔ "ہم کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں سمجھا۔"

پولیس والوں نے اچانک ہم پر رائفلیں تان لیں اور ان میں سے ایک بپھر کر بولا۔ "گاڑی سے نیچے اترو۔"

راشد اور منیر بکتے جھکتے نیچے اترے۔ ان دونوں کو اپنی دولت کا غرور تھا، اپنے باپ کے رسوخ کا گھمنڈ تھا۔ انہیں یقین تھا کہ پولیس والے ابھی تھوڑی دیر میں معذرت کر کے انہیں چھوڑ دیں گے۔

میں بھی خاموشی سے نیچے اتر آیا لیکن میں ان دونوں کی طرح بکواس نہیں کر رہا تھا۔

پولیس والے ہمیں گویا ہانکتے ہوئے اپنے افسر کے پاس لے گئے۔ وہ چالیس بیالیس سال کا صحت مند، دراز قد اور خوب رُو شخص تھا۔ اس کے شانوں پر لگے ہوئے اسٹارز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ انسپکٹر ہے۔ میں نے انسپکٹر اور سب انسپکٹر رینک کے افسران میں بہت کم ایسے افسر دیکھے تھے جو اتنے اسمارٹ ہوں۔ اس انسپکٹر کا نہ تو پیٹ باہر نکلا ہوا تھا، نہ اس کی یونیفارم بے ڈھب تھی۔

"کیا بات ہے انسپکٹر؟" راشد درشت لہجے میں بولا۔ "تم نے ہمیں کیوں روکا ہے؟"

"آرام سے بات کرو۔" انسپکٹر نے کہا۔ میں نے اس کی جیب پہ لگی ہوئی نام کی پٹی پڑھی۔ اس پہ اورنگ زیب خان لکھا تھا۔

"تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو۔" راشد اس کے نرم لہجے کو اس کی کمزوری سمجھا۔ "میں ایسی جگہ تمہارا تبادلہ کراؤں گا کہ تمہاری زندگی عذاب ہو جائے گی۔"

اورنگ زیب بہت اطمینان سے آگے بڑھا اور راشد کے چہرے پر اچانک اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ چٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی اس کا منہ گھوم گیا۔

"احمد علی!" اس نے ایک سپاہی کو مخاطب کیا "پہلے ان لوگوں کی تلاشی لو، پھر گاڑی کی تلاشی لو۔ یہ میرا تبادلہ کرائے گا۔ میں تیرا اس دنیا ہی سے تبادلہ کر دوں گا۔ تو بھی شاید مجھے نہیں جانتا ہے۔ مجھے لوگ اورنگ زیب ان کاؤنٹر کہتے ہیں۔ اِن کاؤنٹر کرنا میرا مشغلہ ہے ورنہ عدالت تو بہت سے مجرموں کو ثبوت نہ ملنے پر یا شک کا فائدہ دے کر رہا کر دیتی ہے۔

اس دوران میں ایک سپاہی نے ہماری تلاشی لے کر ہماری جیبوں سے نقدی اور سیل فون سب کچھ نکال لیا تھا۔

گاڑی کی تلاشی میں انہیں وہ مسروقہ پرس بھی مل گیا، اس کے علاوہ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں ایک پستل بھی تھا۔ اس سے تو میں بھی لاعلم تھا۔

"یہ پرس کس کا ہے؟" اس نے راشد سے پوچھا۔

"ضروری نہیں ہے کہ تمہارے ہر سوال کا جواب دیا جائے۔" راشد نے تڑخ کر جواب دیا۔

اس کے جواب پہ انسپکٹر روایتی پولیس والا بن گیا۔ اس نے پہلے تو ہمیں انتہائی غلیظ گالیاں دیں، پھر راشد کی گدی پر ایک زور دار ہاتھ مارا اور ایک سپاہی سے بولا۔ "ان تینوں...... کو تھانے لے چلو۔" اس نے پھر ایک ناقابلِ اشاعت گالی دیتے ہوئے کہا۔ "میں اس کی گاڑی لے کر آتا ہوں۔"

پولیس والوں نے ہمیں تھپڑ اور ٹھڈے مار کے موبائل وین میں سوار کر دیا۔

میں دل ہی دل میں آنے والے طوفان سے لرز رہا تھا۔ ان دونوں کے باپ تو کسی نہ کسی طرح انہیں چھڑا کر لے جاتے۔ ابو تو مجھے چھڑانے کی بجائے پولیس والوں سے یہ کہہ دیتے کہ بند کروا دو اسے، یہ میری اولاد نہیں ہے۔ میرا بیٹا ہوتا تو یوں سرِ راہ لڑکیوں کے پرس نہ چھینتا پھرتا۔

گاڑی رکی تو میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ پولیس اسٹیشن تھا اور وہاں رات کے اس پہر بھی گویا دن نکلا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے ہمیں ٹھوکریں مار کے موبائل وین سے اتارا اور اندر لے جا کر لاک اپ میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

"میں اس انسپکٹر کی وردی نہ اتروا دوں تو میرا نام بھی راشد نہیں۔" راشد بہت زیادہ غصے میں تھا۔

"یار! میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ حرکت مت کرو لیکن......"

"تُو تو خاموش ہی رہ۔" راشد نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "ہم میں سے پولیس کو کوئی بھی یہ نہیں بتائے گا کہ پرس ہم نے اس لڑکی سے چھینا ہے۔ پھر ان حرام زادوں نے ہمیں اس وجہ سے پکڑا ابھی نہیں ہے، یہ کمینے کسی اور کے لیے وہاں گھات لگائے کھڑے تھے۔ ہم لوگ ہاتھ آ گئے تو ہمیں ہی پکڑ لائے۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے کہا۔

"ان کا خیال ہے کہ ہم لوگوں سے انہیں اچھی خاصی تگڑی رقم مل جائے گی لیکن مجھے ایک دفعہ ٹیلی فون کرنے کا موقع مل جائے، پھر دیکھنا میں ان لوگوں کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

اس وقت ایک سنتری آیا اور بولا۔ "تم میں سے اس گاڑی کا مالک کون ہے؟"

"میں ہوں۔" راشد نے اکڑ کر کہا۔

"چلو، تمہیں انچارج صاحب بلا رہے ہیں۔" سپاہی نے دروازہ کھولا اور اندر آ کر انتہائی مہارت سے راشد کے دائیں ہاتھ میں اسٹیل کی ہلکی پھلکی ہتھکڑی ڈال دی اور راشد کو گھسیٹتا ہوا وہاں سے لے گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد راشد واپس آ گیا اور سنتری منیر کو لے گیا۔

"کیا تم نے گھر ٹیلی فون کر دیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو انسپکٹر سے کہتا رہا لیکن اس...... نے مجھے ٹیلی فون نہیں کرنے دیا۔" راشد نے پھر انسپکٹر کو غلیظ گالیاں دیں، پھر وہ مجھ سے بولا "ہاں، تمہیں اس پرس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔

اسی وقت سنتری منیر کو بھی واپس لے آیا۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ الو کا پٹھا انسپکٹر؟" راشد نے دانت پیس کر پوچھا۔

"یار، وہی بکواس کر رہا تھا کہ سچ سچ بتا دو، تم نے کہاں واردات کی ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے ایک ٹیلی فون کرنے دو، پھر میں سب وارداتوں کے بارے میں بتا دوں گا۔"

سنتری ایک مرتبہ پھر آیا اور مجھ سے بولا۔ "چل، تجھے صاحب بلا رہے ہیں۔"

اس نے حوالات کا آہنی سلاخوں والا دروازہ کھولا اور مجھے گردن سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔

"کچھ الٹی سیدھی بکواس نہ کر دینا۔" راشد نے کہا۔ "بزدلی بالکل مت دکھانا سمجھا ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" میں نے سنتری کی پروا کیے بغیر چیخ کر پوچھا۔

"ورنہ تو جانتا ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟" راشد کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

اس کے اس انداز پر میری ہڈیاں تک سلگ گئیں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن سنتری مجھے گھسیٹ کر وہاں سے لے گیا۔

کمرے میں وہی انسپکٹر اس وقت فرعون بنا بیٹھا تھا۔ تھانے میں پہنچ کر اس کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔

"کیا نام ہے تیرا؟" اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میرا نام نوید ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"باپ کا نام؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"باپ کا نام نہیں بتاؤں گا۔" میں نے بھی سرد لہجے میں جواب دیا۔

"تجھے کہیں ٹیلی فون نہیں کرنا ہے؟" انسپکٹر کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"ٹیلی فون کر کے کیا بتاؤں گا کہ ہم نے ایک لڑکی کا پرس چھینا ہے۔" میں نے اعتماد سے جواب دیا۔

انسپکٹر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "میں نے پہلا اُچکا دیکھا ہے جو اتنی سچائی سے اپنے جرم کا اعتراف کر رہا ہے۔"

"میں اُچکا نہیں ہوں انسپکٹر صاحب!" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میں نے اس لڑکی کا پرس بھی نہیں چھینا بلکہ میں تو ان لوگوں کو بھی منع کر رہا تھا لیکن جرم کی اعانت کرنا بھی تو جرم ہے، اور میں نے یہ جرم کیا ہے۔ میں بھی ان لوگوں کے ساتھ پکڑا گیا ہوں اس لیے قانون کی نظروں میں تو میں بھی مجرم ہوں۔ میں اپنی کوئی صفائی پیش نہیں کروں گا۔" انسپکٹر نے غور سے مجھے دیکھا، پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "بیٹھ جاؤ، تم تو بہت سچے اور کھرے لڑکے ہو۔"

میں ڈرتے ڈرتے بیٹھ گیا۔

"ہاں، اب بتاؤ، تم ان لڑکوں کو کب سے جانتے ہو؟"

میں نے اسے بتا دیا کہ میں ان لڑکوں کو کب سے جانتا ہوں اور ان لوگوں کی سرگرمیاں کیا ہیں؟

"تم جانتے ہو کہ راشد کا باپ کون ہے؟"

"جی ہاں، میں جانتا ہوں کہ وہ شہر کے ایک ارب پتی بزنس مین سیٹھ ہاشم سوٹ والا کا بیٹا ہے اور منیر بھی ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔"

"دیکھو نوید!" انسپکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ "سیٹھ ہاشم کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے بہت ذلیل کیا تھا اور میری نوکری کے لالے پڑ گئے تھے۔ تم اگر وعدہ معاف گواہ بن جاؤ تو میں اس کمینے سیٹھ سے اپنا پچھلا حساب بھی بے باق کر سکتا ہوں۔ وہ لڑکی بھی ایک بزنس مین کی بیٹی ہے اور وہ بھی معمولی آدمی نہیں ہے۔"

"پھر تو آپ کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔ راشد کا باپ ایک طرف تو اپنا اثر رسوخ استعمال کرے گا اور دوسری طرف اس لڑکی کے باپ سے صلح صفائی کر لے گا۔"

"تم تو ضرورت سے زیادہ ذہین ہو۔" انسپکٹر اورنگزیب خان مسکرا کر بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے۔"

"میں آپ کا ساتھ کیسے دے سکتا ہوں؟ میں تو خود ان کے ساتھ تھا۔"

"میں تمہیں صاف بچا لوں گا۔ بس تم ان لوگوں کے خلاف گواہی دے دینا۔" پھر وہ دیر تک مجھے سمجھاتا رہا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟

میں اس کی بتائی ہوئی باتیں ذہن نشین کرتا رہا، پھر اس نے سنتری کو بلا کر کہا۔ "چائے اور بسکٹ وغیرہ لے کر آؤ۔"

میں اس کی عنایت پر حیران تھا۔ پولیس والے ملزمان کے ساتھ اتنی سخاوت کا مظاہرہ کرتے نہیں ہیں۔

"آپ کو علم کیسے ہوا کہ ہم لوگ اس طرف سے آرہے ہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

اورنگزیب مسکرایا۔ "اس لڑکی کی چیخ پکار پر وہاں کچھ لوگ آگئے۔ لڑکی نے کسی کے سیل فون سے ون فائیو پر ٹیلی فون کر دیا۔ اس نے تم لوگوں کی گاڑی کا نمبر تو نہیں دیکھا تھا لیکن اسے گاڑی کا ماڈل اور رنگ یاد تھا۔ ون فائیو نے وائرلیس پر مجھے اطلاع دی۔ سی سائیڈ کے اس علاقے سے ایک ہی سڑک سیدھی سیدھی آتی ہے۔ بس میں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یقین تو نہیں تھا کہ تم لوگ مل ہی جاؤ گے۔ میرا خیال تھا کہ وہ گاڑی تیز رفتاری سے نکل گئی ہوگی۔" پھر اس نے وہ مسروقہ پرس اپنے سامنے میز پر رکھا جو راشد نے لڑکی سے چھینا تھا۔ اس نے پرس میں سے لڑکی کا سیل فون نکال کر آن کیا اور کسی کو کال کرنے ہی والا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انسپکٹر نے اسکرین پر نظر ڈالی، پھر سیل فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔ "ہیلو! میں ...... پولیس اسٹیشن سے انسپکٹر اورنگزیب بول رہا ہوں۔ جی ہاں سر...... میں نے ان اُچکوں کو پکڑ لیا ہے...... ہاں ہاں، پرس کی ایک ایک چیز موجود ہے...... آپ کو تھوڑی زحمت کرنا ہوگی۔ آپ کو ان خاتون کے ساتھ پولیس اسٹیشن آکر رپورٹ درج کرانا ہوگی...... ارے نہیں سر، آپ پریشان نہ ہوں۔ ان خاتون کو...... کیا نام بتایا آپ؟ جی مس روبی کو ایک درخواست پر دستخط کرنا ہوں گے۔ بس پھر، ہم جانیں اور ہمارا کام......! او کے، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

سنتری چائے اور بسکٹ، پیسٹری وغیرہ لے آیا تھا۔ میں دوپہر سے بھوکا تھا اس لیے تکلف کیے بغیر کھانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد باوقار سا ایک آدمی اورنگزیب کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بہترین تراش کا قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ساتھ وہی شعلہ جوالہ لڑکی تھی جو راشد کے ہاتھوں لٹ چکی تھی۔

لڑکی نے اپنا پرس، نقدی اور سیل فون چھینے جانے کی درخواست لکھی، اس نے راشد اور منیر کا حلیہ تک لکھوا دیا۔

اس دوران میں اس نے دو چار بار مجھ پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک محسوس ہوئی۔

رپورٹ لکھوانے کے بعد انسپکٹر نے لڑکی کا پرس اسے واپس کر دیا اور وہ دونوں باپ بیٹی چلے گئے۔

"اب میں دیکھتا ہوں اس سیٹھ ہاشم کو!" اورنگزیب نے میز پر گھونسا مارا تو میز پہ رکھی ہوئی چائے کی ٹرے اچھل گئی۔

اس نے اسی وقت ہیڈ محرر کو بلایا اور بولا۔ "ان لڑکوں کے خلاف ایف آئی آر کاٹو، پھر وہ ہیڈ محرر کو قانونی دفعات بتا کر راشد کی گاڑی سے برآمد ہونے والے سامان کی تفصیل بتانے لگا۔

میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ راشد کی گاڑی سے نہ صرف ایک ریوالور برآمد ہوا تھا بلکہ ایک رائفل، روبی کا چھینا ہوا سامان اور نقدی اور تقریباً آدھا کلو کے قریب ہیروئن برآمد ہوئی۔

"انسپکٹر صاحب!" میں نے ہمت کر کے کہا۔ "ہم نے صرف لڑکی کا پرس چھینا تھا۔ راشد کے پاس ایک ریوالور بھی تھا لیکن یہ رائفل اور ہیروئن کہاں سے آگئی؟"

انسپکٹر نے گھور کے مجھے دیکھا اور بولا۔ "ابھی تمہارے سامنے تو برآمد ہوئی ہے۔"

"نہیں سر!" میں نے کہا۔ "راشد کے پاس رائفل تھی نہ ہیروئن۔"

"تجھے میں نے کیا سمجھایا تھا؟" اورنگزیب خان گرج کر بولا۔ "بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟"

"جو کچھ سچ تھا میں نے بغیر کسی حیل و حجت کے آپ کو بتا دیا لیکن جو سچ نہیں ہے، وہ میں کیسے مان لوں؟"

"اوئے، تجھے بھی اس کیس میں ڈال دوں؟" انسپکٹر نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

"میں اس صورت میں آپ کا ساتھ بھی نہیں دے سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"اوئے، تو کیا سمجھتا ہے، ہم تیرے بیان کے محتاج ہیں؟"

"تو کیا آپ میرا بیان نہیں لیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"تُو تو اسی بیان پر دستخط کرے گا، جو ہم لکھائیں گے۔" انسپکٹر نے کہا۔ پھر سنتری سے کہا۔ "لے جاؤ اس تیس مار خان کو! اس سے تو میں ابھی تھوڑی دیر میں نمٹوں گا۔"

سنتری مجھے دھکیلتا ہوا حوالات کی طرف لے چلا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "سنتری بادشاہ! ہمارا تعلق عرب پتی خاندانوں سے ہے۔ تم اگر ہمارا ایک کام کرو تو تمہیں اس کے پانچ ہزار روپے مل سکتے ہیں۔"

سنتری چلتے چلتے رک گیا۔ "پانچ ہزار! اوئے، تم لوگوں کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ تمہارا سارا سامان تو صاحب نے رکھ لیا ہے۔"

اس کے باوجود تمہیں رقم مل سکتی ہے۔ میں تمہیں ایک ٹیلی فون نمبر بتا رہا ہوں۔ تم اس پر ٹیلی فون کر کے صرف اتنا بتا دو کہ آپ کا بیٹا راشد اس وقت درخشاں پولیس اسٹیشن میں ہے اور پولیس اس پر بہت زیادہ تشدد کر رہی ہے۔"

"لیکن مجھے پیسے کون دے گا؟" سنتری کو ابھی تک پیسوں کی فکر تھی۔ مچھلی نے چارے پر منہ مار دیا تھا، بس کانٹا پھنسنے کی دیر تھی۔ "لیکن اگر انچارج صاحب کو معلوم ہو گیا تو......"

"او بھائی کیسے معلوم ہوگا۔ تم کیا ٹیلی فون کر کے اپنا نام اور ولدیت بتاؤ گے، تم تو صرف ایک گمنام کال کرنا اور بس!"

"میں نمبر لکھنے کے لیے کوئی کاغذ لے کر آتا ہوں۔" سنتری نے کہا۔

اس دوران میں ہم لاک اپ تک پہنچ گئے تھے۔ اس مرتبہ اس نے مجھے دھکیلا نہیں بلکہ بہت آرام سے لاک اپ میں چھوڑ گیا۔

"کیا ہوا؟" راشد نے پوچھا۔

"سنتری ابھی آئے گا، اسے اپنے ڈیڈی کا ٹیلی فون نمبر لکھ دینا۔ وہ باہر جا کر ابھی ٹیلی فون کر دے گا، پولیس والے تو ہمیں بری طرح پھنسانے کا بندوبست کیے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے تمہاری گاڑی سے ایک سیون ایم ایم رائفل، بہت سا کیش اور تقریباً آدھا کلو یا ایک کلو ہیروئن بھی برآمد کر لی ہے۔"

"یہ حرام زادے، کُتے!" منیر چیختے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں اس انسپکٹر کو کشمور نہ بھجوا دوں تو میرا نام بھی منیر نہیں۔"

"لیکن یار! وہ سنتری بھلا کیوں ٹیلی فون کرے گا؟"

"میں نے اسے پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"پانچ کیا میں اسے دس ہزار دے دوں گا۔ بس ڈیڈی کو ایک دفعہ اطلاع مل جائے، پھر دیکھنا میں اس انسپکٹر کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔"

"تھوڑی دیر بعد وہی سنتری آیا اور آہستہ سے بولا۔ "لو جی، آپ خود ہی بات کر لو، میں سامنے کے ہوٹل والے سے یہ موبائل لے آیا ہوں لیکن اپنے باپ سے کہنا کہ اسے اطلاع کہیں باہر سے ملی ہے، تم نے نہیں دی، ورنہ میرے ساتھ ساتھ دوسرے سنتری بھی پھنس جائیں گے۔"

"اس کی آپ فکر مت کرو سنتری بادشاہ!" میں نے کہا اور اس کے ہاتھ سے سیل فون لے کر راشد کے حوالے کر دیا۔

راشد نے جلدی سے اپنے ڈیڈی کا نمبر ملایا اور آہستہ سے بولا۔ "ڈیڈی! میں رشو بول رہا ہوں...... میرا سیل...... وہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ہمیں پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ وہ ہم پر ناجائز اسلحہ رکھنے، منشیات فروشی اور اسمگلنگ کے نہ جانے کون کون سے کیس بنا رہے ہیں۔ پولیس والوں نے ہم پہ بہت تشدد کیا ہے ڈیڈی!...... میں تھانے میں ہوں...... میری گاڑی بھی ان ہی لوگ کے قبضے میں ہے...... جلدی کریں ڈیڈی ورنہ تشدد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہونے والا ہے...... ہاں آپ نہیں بتائیے گا کہ آپ کو یہ اطلاع میں نے دی ہے...... آپ کو یہ انفارمیشن کسی ایسے شناسا سے ملی ہے جو مجھے آپ کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانتا ہے۔ او کے ڈیڈی، وہ لوگ آنے والے ہیں، آئی ایم ویٹنگ!" اس نے مسکراتے ہوئے سیل فون سنتری کو واپس کر دیا اور آہستہ سے بولا۔ "تمہارے پانچ ہزار تو پکے ہیں۔"

"سر! بس میرا نام کہیں نہ آئے ورنہ میں بے موت مارا جاؤں گا۔"

"تم فکر مت کرو سنتری بادشاہ!" منیر نے کہا۔ "اس اورنگزیب خان کو تو ایسی جگہ بھجواؤں گا کہ یہ پولیس کی نوکری چھوڑ کر بھاگ جائے گا اور کوشش کروں گا کہ تمہارا پروموشن ہو جائے۔"

سنتری نے سیل فون آف کر کے جیب میں ڈال لیا اور وہاں سے پلٹ گیا۔

"اب میں دیکھتا ہوں اس اورنگزیب خان اِن

کاؤنٹر کو!'' منیر نے کہا۔

''آ، دیکھیں ذرا، تجھ میں کتنا ہے دم؟'' راشد گنگنانے لگا۔ پھر اس نے میری پیٹھ پر ایک دھپ مارا اور بولا۔ ''تو خاموش کیوں ہے میرے یار! آج کے آپریشن کا ہیرو تو تُو ہے۔''

''یار! ویسے تو نے کمال کر دیا۔'' منیر نے کہا۔ ''اس سنتری کو کیسے پٹا لیا؟''

''پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے یار!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ پولیس کے چھوٹے اہل کار تو بے چارے یوں بھی غربت میں زندگی گزارتے ہیں۔ رشوت کا سارا پیسا تو ان کے افسران ہڑپ کر جاتے ہیں۔''

اچانک برآمدے میں بھاری بوٹوں کی آواز گونجی، پھر مکروہ چہرے والا ایک دوسرا سنتری نمودار ہوا۔ ''چلیں، آپ لوگوں کو صاحب بلا رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

''کیا ہمیں ہتھکڑی نہیں لگاؤ گے سنتری بادشاہ؟'' راشد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ڈیڈی تھانے پہنچ چکے ہیں ورنہ یہ مکروہ صورت سنتری اتنی انسانیت سے بات نہ کرتا۔

''ارے صاحب! ہتھکڑی کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

''چلو بھئی۔'' راشد ہم دونوں سے مخاطب ہوا۔ پھر باہر نکلتے ہوئے سنتری سے بولا۔ ''لیکن پہلے تو تم ہی ہمیں ہتھکڑی لگا کر یہاں سے لے گئے تھے۔ بچو! تمہیں بھی دیکھ لوں گا اور تمہارے اس اِن کاؤنٹر کو بھی!''

لاک اپ سے باہر نکلتے ہی راشد نے کراہنا شروع کر دیا۔ اسے دیکھ کر منیر بھی یوں لنگڑا کر چلنے لگا جیسے اس کی ٹانگوں میں شدید چوٹ آئی ہو۔

ہم جب انچارج کے کمرے میں داخل ہوئے تو میں نے راشد کے ڈیڈی کو دیکھا۔ اخباروں اور ٹی وی چینلز پر تو انہیں اکثر دیکھا تھا لیکن کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ خاصے بارعب اور بھاری بھرکم آدمی تھے۔ ان کے ساتھ ہی دو آدمی اور بھی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے ایک تو بہت خوش شکل اور نازک تھا، دوسرا آدمی چہرے سے خرانٹ لگ رہا تھا۔

راشد کے ڈیڈی اسے دیکھ کر جلدی سے کھڑے ہوئے اور بے اختیار راشد کو سینے سے لگا لیا۔ راشد اُن کے سینے سے لگ کر رونے لگا یا پھر رونے کی اداکاری کرنے لگا۔

''کیا ہوا رشو......؟ کیا ہوا بیٹا؟''

''ڈیڈی! ان لوگوں نے ہم لوگوں کو بہت مارا ہے۔'' راشد نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو سی ویو سے ڈنر کے بعد واپس آ رہے تھے کہ اس باسٹرڈ نے ہمیں پکڑ لیا۔'' اس نے اورنگزیب خان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا کہ راشد کی بات سن کر اورنگزیب کا سرخ اور سفید چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

''تم کیا کہتے ہو انسپکٹر؟'' راشد کے ڈیڈی بپھر کر انسپکٹر کی طرف گھومے۔ ''کس جرم میں تم نے گرفتار کیا ہے میرے بیٹے اور اس کے دوستوں کو؟''

''میں آپ کو بتا تو چکا ہوں کہ ان لوگوں نے ایک لڑکی کا پرس چھینا، اس کے ساتھ بدسلوکی کی اور فرار ہو گئے۔''

''اور تم کسی مستعد افسر کی طرح ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے؟''

''لڑکی نے ان کی گاڑی کا نمبر، رنگ، اور ماڈل سب کچھ بتایا تھا۔'' انسپکٹر کے لہجے میں عیاری تھی۔

''کہاں ہے وہ پرس؟'' اچانک سیٹھ ہاشم کے ساتھ آیا ہوا باوقار شخص بولا۔

''وہ ...... پرس پولیس کی تحویل میں ہے بیرسٹر صاحب!'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

انسپکٹر کے طرزِ تخاطب پر مجھے علم ہوا کہ آنے والا بیرسٹر ہے، یقیناً دوسرا آدمی بھی وکیل ہی ہو گا کیونکہ اس نے بھی کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔

''وہاٹ؟'' بیرسٹر دہاڑا۔ ''تم نے محض اتنی سی بات پر شہر کے بلکہ ملک کے ایک معزز ترین شخص سیٹھ ہاشم سوٹ والا کے بیٹے کو نہ صرف گرفتار کیا ہے بلکہ اس پر تشدد بھی کیا ہے، جانتے ہو سیٹھ ہاشم حکومت کو کتنا انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ تمہاری دس سال کی تنخواہ سے بھی دس گنا انکم ٹیکس ہر سال سرکاری خزانے میں جمع کراتے ہیں۔''

''اس لڑکی سے پرس چھیننے کا اعتراف تو ان کے اس دوست نے بھی کیا ہے۔'' انسپکٹر نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

''میں نے؟'' میں نے آنکھیں پھاڑیں۔ ''انسپکٹر

صاحب! آپ نے تو راشد کی گاڑی سے ایک ریوالور، ایک رائفل، ایک کلو ہیروئن اور لاکھوں روپے نقد بھی برآمد کیا ہے۔ یہ بھی بتائیں کہ آپ مجھے ...... اپنے ہی دوستوں کے خلاف بیان دینے کی ترغیب دے رہے تھے۔''

''بس بہت ہو گیا۔'' سیٹھ صاحب بپھر کر بولے۔ ''سیکریٹری!'' انہوں نے مکار نظر آنے والے شخص کو مخاطب کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص وکیل نہیں بلکہ سیٹھ صاحب کا سیکریٹری تھا۔

''یس سر!'' وہ جلدی سے بولا۔

''آئی جی اور ہوم سیکریٹری سے میری بات کراؤ۔'' وہ انسپکٹر کو گھورتے ہوئے بولے۔ ''اس دو ٹکے کے افسر کی اتنی جرأت کہ یہ سیٹھ ہاشم کے بیٹے پر اتنے گھناؤنے الزامات لگا سکے یا اسے بغیر کسی وجہ کے گرفتار کرے اور اس پر تشدد کرے؟''

''انسپکٹر!'' بیرسٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے اس واقعے کی ایف آئی آر تو درج کر ہی لی ہو گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم قانونی طور پر مجھے ایف آئی آر کی کاپی دینے کے مجاز نہیں ہو لیکن مجھے وہ قانونی دفعات تو بتا سکتے ہو جو تم نے ملزمان پر عائد کی ہیں؟''

''سر! میں نے انہیں گرفتار کیا ہے تو ایف آئی آر بھی ضرور ہو گی۔'' پھر اس نے تعزیراتِ پاکستان کی کئی دفعات گنوا دیں جن کے تحت ایف آئی آر درج تھی۔

پولیس اور سیٹھ ہاشم کی اس جنگ میں مجھے اپنی تباہی نظر آ رہی تھی۔ میرا تو کوئی پُرسانِ حال بھی نہیں تھا۔ انسپکٹر کو شاید یقین تھا کہ میں ان لوگوں کے خلاف گواہی دوں گا۔ عدالت میری گواہی کو ہی معتبر سمجھتی لیکن یہاں تو پانسا ہی پلٹ گیا تھا۔

''آئی جی صاحب لائن پر ہیں۔'' مکار صورت سیکریٹری نے سیل فون سیٹھ صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ صاحب...... آپ میری بات تو سنیں...... میں......'' انسپکٹر نے کچھ کہنا چاہا۔

سیٹھ صاحب نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے سیل فون لے لیا اور بولے۔ ''ہیلو!...... وعلیکم السلام...... جیم خانہ!'' سیٹھ صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''احتشام! میں اس وقت پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں...... کیوں؟ ...... تمہارے ایک فرض شناس انسپکٹر نے......'' انہوں نے انسپکٹر کی جیب پر لگی ہوئی نام کی پٹی پڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... انسپکٹر اورنگزیب خان نے میرے بیٹے اور اس کے دوستوں کو ناجائز اسلحہ رکھنے، منشیات فروشی اور ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کیا ہے...... ہاں ہاں، رشو...... وہ معصوم...... وہ تو تمہارے اس افسر کی نظروں میں بہت بڑا ڈکیت اور جرائم پیشہ ہے۔'' سیٹھ صاحب کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''ہاں، جب آئی جی جیسے بے اختیار انسان میرے دوست ہوں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کل یہ لوگ مجھے بھی اغوا برائے تاوان اور اسلحے کی اسمگلنگ میں گرفتار کر سکتے ہیں آئی جی احتشام الدین صاحب......! میں ابھی پولیس اسٹیشن میں ہی ہوں...... اچھا جیسے آپ کا حکم!'' انہوں نے تلخ لہجے میں کہا اور سیل فون انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ ''آئی جی صاحب سے بات کر لو۔''

اس دوران میں انسپکٹر طنزیہ انداز میں سیٹھ صاحب کو دیکھتا رہا تھا۔

اس نے سیل فون سیٹھ صاحب کے ہاتھ سے لے لیا اور پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''سر!...... یس سر...... میں نے اریسٹ کیا ہے۔ ان کی گاڑی سے جو سامان برآمد ہوا ہے، اس کی لسٹ میرے پاس موجود ہے...... یس سر...... میں بالکل ہوش میں ہوں...... نہیں سر، میں ڈیوٹی کے دوران میں شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا...... سوری...... سر آواز نہیں آ رہی...... ذرا اونچا بولیں پلیز...... جی سر!...... شاید نیٹ ورک پرابلم کر رہا ہے، میں آپ کو کال کرتا ہوں۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون سیٹھ صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

اسی وقت باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی اور وہی شعلۂ جوالہ اپنے باپ کے ساتھ پھر انچارج کے کمرے میں داخل ہوئی۔

لڑکی کا باپ سیٹھ ہاشم کو دیکھ کر چونکا۔ سیٹھ ہاشم بھی اسے دیکھ کر چونک اٹھا اور بولا۔ ''اکبر موتی والا صاحب! آپ...... آپ یہاں کیسے؟''

''کچھ اُچکوں نے میری بیٹی کا پرس چھین لیا تھا۔ میں نے اس کی رپورٹ بھی درج کرا دی تھی۔ پھر انسپکٹر نے مجھے اطلاع دی کہ انہوں نے اُچکوں کو پکڑ لیا ہے اور ان کے قبضے سے پرس بھی برآمد ہو گیا ہے۔''

''یہ وہی اُچکے ہیں ڈیڈی!'' روبی نے راشد اور منیر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس کمینے نے میرے ہاتھ سے پرس چھینا تھا۔'' اس نے راشد کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ کمینہ

مجھے بھی گاڑی میں گھسیٹنے کی کوشش کررہا تھا۔" اس نے منیر کی طرف اشارہ کیا۔

"جی سیٹھ صاحب...... اب کیا فرماتے ہیں آپ؟" انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اب مجھے اس کے پُراعتماد ہونے کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اپنے کسی آدمی سے اکبر صاحب کو ٹیلی فون کرادیا تھا۔ وہ فوراً ہی آگئے تھے۔ میں یہ تو نہیں جانتا تھا کہ سیٹھ ہاشم اور اکبر سیٹھ کے درمیان کوئی مخاصمت تھی لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ ان میں ابھی کوئی خاص دوستی بھی نہیں تھی صرف شناسائی تھی۔

"انسپکٹر صاحب!" اکبر صاحب نے کہا۔ "میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔ آپ روبی بیٹی کا پرس واپس کردیں، میں اپنی رپورٹ واپس لے لوں گا۔"

"اب یہ مشکل ہے سر!" انسپکٹر نے کہا۔ "میں ایف آئی آر درج کرچکا ہوں، اب وہ چیزیں آپ کو کورٹ سے ملیں گی۔"

"نو پرابلم!" اکبر نے ہنس کر کہا۔ "اب مجھے کورٹ کے چکر بھی لگانا پڑیں گے؟"

"نو سر! روبی کو صرف ایک بار ملزمان کی شناخت کے لیے کورٹ جانا ہوگا۔"

میں حیران تھا کہ انسپکٹر نے اچانک یہ ساری کارروائی کیسے کرلی؟ شاید اکبر صاحب سے اس کی پہلے ہی بات ہوچکی تھی۔ اور اب اس نے اپنے کسی آدمی سے انہیں ٹیلی فون کرادیا تھا۔ میں نے پولیس کے ہتھکنڈوں کا نام ضرور سنا تھا لیکن آج پہلی مرتبہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رہا تھا۔

"او کے انسپکٹر!" اکبر صاحب نے کہا۔ "آپ اپنی کارروائی کریں اور مجھے اجازت دیں۔"

وہ جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ باہر دو تین گاڑیاں رکنے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے سوٹ میں ملبوس ایک شخص دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ آنے والا دراز قامت اور ورزشی جسم کا مالک تھا، اس کا رنگ گندمی تھا۔ اس کے چہرے پر بہت گھنی مونچھیں تھیں جن سے اس کا نچلا ہونٹ بھی تقریباً چھپ گیا تھا۔

انسپکٹر نے اٹھ کر اسے سلیوٹ کیا۔

اس نے بپھر کر کہا۔ "اورنگزیب خان! لگتا ہے اب پولیس کی ملازمت سے تمہارا دل بھر گیا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں سر؟" انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میں بار بار کہہ رہا تھا کہ ان لڑکوں کو چھوڑ دو تمہیں آواز نہیں آرہی تھی؟"

"سر! آواز تو واقعی نہیں آرہی تھی۔ میں ابھی آپ کو کال کرنے ہی والا تھا کہ آپ خود آگئے۔"

"ان لڑکوں کو ابھی اور اسی وقت چھوڑ دو۔" آئی جی کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

"سوری سر!" انسپکٹر نے کہا۔ "ایف آئی آر درج ہوچکی ہے۔ اگر آپ انہیں چھوڑنا چاہتے ہیں تو مجھے تحریری طور پر حکم دے دیں، میں ابھی اور اسی وقت انہیں چھوڑ دوں گا۔"

"لیکن انسپکٹر ان اُچکوں کو کیوں چھوڑ دے!" اکبر صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اور آپ ہوتے کون ہیں انہیں چھڑوانے والے؟"

"آپ شاید مجھے پہچانے نہیں، میں آئی جی ہوں۔"

"اچھا اچھا!" اکبر صاحب کا لہجہ طنزیہ تھا۔ "انسپکٹر جنرل آف پولیس اُچکوں اور اٹھائی گیروں کو چھڑانے کے لیے بہ نفسِ نفیس پولیس اسٹیشن دوڑا چلا آیا ہے، واہ!"

"مجھ سے اس لہجے میں بات مت کریں" آئی جی بھنا کر بولا۔

"ورنہ آپ مجھے بھی لاک اپ میں بند کردیں گے؟" اکبر صاحب نے طنزیہ انداز میں ہنس کر کہا۔ "ان اُچکوں نے نہ صرف میری بیٹی کا پرس چھینا ہے بلکہ اسے اغوا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ آپ بھی شاید مجھ سے واقف نہیں ہیں۔" پھر وہ انسپکٹر کی طرف مڑے اور بولے۔ "اپنے آئی جی کو بتاؤ انسپکٹر کہ......"

"سر، یہ اکبر موتی والا صاحب ہیں، آپ نے ان کا نام تو سنا ہوگا؟"

"اچھا...... اچھا...... اکبر موتی والا صاحب!...... جناب! آپ سے کون واقف نہیں ہے۔" آئی جی نے کہا، پھر وہ سیٹھ ہاشم سے بولا۔ "ہاشم! معاملہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ اب تو یہ لوگ عدالت ہی سے رہا ہوں گے۔"

"آپ نے بتایا نہیں کہ وہ مسروقہ سامان کہاں ہے؟" بیرسٹر صاحب نے ٹھہرے ہوئے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"میں نے بتایا تو تھا کہ وہ سب پولیس کی تحویل میں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کل جب میں ان لوگوں کو عدالت میں پیش کروں گا تو ایف آئی آر کی ایک کاپی آپ کو بھی مل جائے گی۔"

"لیکن ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ ایف آئی آر درج ہی نہیں ہوئی؟" بیرسٹر صاحب بھی وکیلوں والے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔

"میں نے کہا تھا؟" انسپکٹر انتہائی حیرت سے بولا۔ "میں پندرہ سال سے پولیس ڈپارٹمنٹ میں کام کررہا ہوں، بیرسٹر صاحب کیا آپ مجھے اتنا ہی احمق سمجھتے ہیں کہ میں ایف آئی آر درج کیے بغیر ان لوگوں کو لاک اپ میں رکھوں گا؟"

"وہاٹ؟" سیٹھ ہاشم نے بپھر کر کہا۔ "تم میرے بیٹے کو کل تک لاک اپ میں رکھو گے؟"

"سیٹھ صاحب کل تک نہیں بلکہ کل کے بعد بھی۔" انسپکٹر کا لہجہ سرد تھا۔ "کل تو میں عدالت سے ان لوگوں کا ریمانڈ لوں گا۔ پھر جب تک ضمانت نہ ہو یہ لوگ لاک اپ میں رہیں گے یا پھر جیل کسٹڈی میں۔"

"کیا شخصی ضمانت نہیں ہوسکتی انسپکٹر؟" سیٹھ ہاشم نے کہا۔

ان کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ آئی جی کے رویّے نے ان کی انا کے بلند غبارے کی ساری ہوا نکال دی تھی۔

"میں ایک ٹیلی فون کرسکتا ہوں؟" منیر نے پوچھا۔

حالات کا رخ دیکھ کر وہ بھی حواس باختہ ہوگیا تھا۔

"ضرور کرو۔" انسپکٹر نے کہا۔ "تم بھی شاید اپنے باپ کو ٹیلی فون کرو گے؟"

"ہاں، میں پاپا کو انفارم تو کردوں کہ میں اس وقت کہاں ہوں؟"

سیٹھ ہاشم کے سیکریٹری نے اپنے باس کے اشارے پر منیر کو سیل فون دے دیا۔

منیر نے نمبر ملایا اور بولا۔ "پاپا! میں منیر بول رہا ہوں...... گھر کیسے پہنچتا؟ میں اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہوں۔"

پھر اس نے بھی گلوگیر لہجے میں اپنے پاپا کو بتایا کہ پولیس نے کس طرح بے قصور اسے گرفتار کیا ہے۔

رابطہ منقطع کرکے اس نے سیل فون سیٹھ ہاشم کو واپس کردیا اور بولا۔ "میرے پاپا دس منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

اسی وقت ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجنے لگی۔

انسپکٹر نے گھنٹی بجنے دی، پھر شاید کسی نے ریسیور اٹھالیا۔ فوراً ہی ایک ہیڈ کانسٹیبل کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "سر ڈپٹی سیکریٹری صاحب لائن پر ہیں۔"

منیر کی آنکھیں چمکنے لگیں، میں بھی جانتا تھا کہ اس کے پاپا ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔

اورنگزیب خان نے ریسیور اٹھالیا اور بولا۔ "یس سر! انسپکٹر اورنگزیب خان اسپیکنگ...... جی سر...... آپ کا بیٹا منیر ہماری حراست میں ہے...... سوری سر...... ایف آئی آر درج ہوچکی ہے اور...... نہیں سر، یہ ممکن نہیں ہے۔"

دوسری طرف سے شاید رابطہ منقطع کردیا گیا تھا۔ انسپکٹر چند لمحے ریسیور کو گھورتا رہا، پھر اسے کریڈل پر رکھ دیا اور بلند آواز میں بولا۔ "غلام رسول! ان لوگوں کو لاک اپ میں لے جاؤ۔"

"مائنڈ اٹ انسپکٹر!" سیٹھ ہاشم نے درشت لہجے میں کہا۔ "ان بچوں پر ذرا بھی تشدد ہوا تو میں پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو الٹ پلٹ کر رکھ دوں گا۔"

"میں ان لڑکوں کا وکیل ہوں اور ان سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں؟" بیرسٹر صاحب نے کہا۔

"ضرور کریں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "میں انہیں لاک اپ میں بھجوا رہا ہوں۔ آپ وہیں ان لوگوں سے بات کرلیں۔"

"تھینک یو۔" وکیل نے کہا۔

ہم لوگ باہر نکلنے ہی والے تھے کہ ایک صاحب افتاں و خیزاں کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے بھی بہترین تراش کا سوٹ پہن رکھا تھا، کلین شیو تھے اور آنکھوں پر انتہائی نفیس فریم کا چشمہ تھا۔

منیر اُن سے پاپا کہہ کر لپٹ گیا اور بری طرح رونے لگا۔ اب وہ اداکاری نہیں کررہا تھا۔ وہ واقعی رو رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹے؟"

"پاپا! ان لوگوں نے ہمیں بہت مارا ہے۔" راشد کی طرح اس نے بھی انتہائی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تک پولیس نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے، سوائے ان تھپڑوں کے جو انسپکٹر نے گرفتار کرنے سے پہلے مارے تھے۔ ممکن ہے ایک آدھ تھپڑ اس نے مزید مار دیا ہو لیکن وہ جس تشدد کی دہائی دے رہے تھے، شاید وہ اب ہونے والا تھا۔

"میں ابھی ہوم سیکریٹری سے بات کرتا ہوں۔" منیر کے پاپا نے کہا۔

"آپ براہِ راست پرائم منسٹر سے بات کیوں نہیں

کرلیتے۔'' اکبر صاحب نے کہا۔ ''یا پھر صدر پاکستان سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ہاٹ لائن پر آپ کی بات کرادوں؟''

''جی......!'' ڈپٹی سیکریٹری صاحب نے کہا۔ ''میں مناسب سمجھوں گا تو خود ہی بات کرلوں گا۔''

''ایک بات ذہن میں رکھیے گا۔'' اکبر صاحب نے کہا۔ ''آپ کسی سے بھی بات کرلیں لیکن ان لڑکوں کو چھوڑا نہیں جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو میں خود صدر پاکستان، پرائم منسٹر اور ہوم منسٹر سے بات کروں گا۔'' ان کا لہجہ فیصلہ کن تھا، پھر وہ روبی سے بولے۔ ''آؤ بیٹا، اب چلیں۔''

روبی نے پھر مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ مجھے اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی یا شاید یہ میرا وہم رہا ہو، پھر وہ کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

اب مجھے اپنی فکر ہو رہی تھی۔ میں نے انسپکٹر کی بات ماننے سے تو انکار کیا ہی تھا، اس سے درشت انداز میں بات بھی کی تھی۔ راشد اور منیر کا تو جو حشر ہوتا سو ہوتا لیکن مجھے اپنا انجام نیک نظر نہیں آرہا تھا، اب ایک ہی صورت تھی کہ انسپکٹر کو اپنے تعاون کا یقین دلا دوں لیکن میرا ضمیر نہیں مان رہا تھا کہ عدالت میں جھوٹی گواہی دوں۔

غلام رسول ایک مرتبہ پھر ہمیں دھکیلتا ہوا لاک اپ کی طرف لے چلا۔

ہمارے پیچھے پیچھے وہ بیرسٹر بھی آگیا۔ سنتری نے اس کے لیے لاک اپ کا دروازہ کھول دیا۔

اس نے پہلے تو انتہائی خاموشی سے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ راشد کو اور اتنے ہی منیر کو دیے اور بولا۔ ''یہ پیسے چھپا کر رکھ لو۔ ان سے بہت سے کام نکل سکتے ہیں۔ باقی کل تم لوگ کورٹ میں پولیس کے ہر الزام سے انکار کر دینا۔ کسی بھی قیمت پر مت ماننا کہ انسپکٹر جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ سچ ہے۔ ابھی وہ تم سے بیان پر بھی دستخط لینا چاہے تو کر دینا، عدالت میں اس بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔'' پھر وہ ان لوگوں کو تسلیاں، دلاسے دینے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ مجھ سے اس نے کوئی بات نہیں کی، نہ راشد اور منیر کی طرح مجھے نقد روپے دیے، نہ تسلی دی۔

بیرسٹر کے اس رویے سے میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔ بیرسٹر یقینی طور پر یہ رقم ان لوگوں کو اپنی جیب سے نہیں دے رہا تھا۔ اس کی ہدایت سیٹھ ہاشم ہی نے دی ہوگی۔ تو کیا ان کی نظروں میں میری کوئی اہمیت اور وقعت نہیں تھی؟

لاک اپ میں اس وقت ہمارے علاوہ تین آدمی اور بھی تھے۔ وہ تینوں اپنی شکلوں اور حلیوں ہی سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے اور وہ جس اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاک اپ ان کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے۔ وہ لاک اپ کے دوسرے سرے پر تھے۔ یوں بھی انہیں ہماری بات چیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اچانک دروازے پر وہی سنتری نمودار ہوا جس نے سیل فون دے کر راشد کی بات کرائی تھی۔ اس نے مجھے دروازے کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر سلاخوں والے دروازے کے پاس چلا گیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صاب جی! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ......''

''اچھا اچھا!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں ابھی تمہیں پیسے دلواتا ہوں۔'' میں وہاں سے راشد کے پاس آیا اور بولا۔ ''راشد یار! وہ سنتری اپنے پیسے مانگ رہا ہے۔''

''کون سے پیسے؟'' راشد نے ناگواری سے پوچھا۔

''میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ......''

''تم نے وعدہ کیا تھا تو تم ہی اسے پورا بھی کرو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ''سیل فون پر بات میں نے کی تھی یا تم نے؟''

''اس سے فائدہ کیا ہوا؟'' راشد نے کہا۔ ''ہم تو اب بھی لاک اپ میں ہیں۔''

''اس میں سنتری بے چارے کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب یہاں تمہارے باپ کی نہ چلی تو وہ کیا کرے؟''

''نوید! دماغ خراب مت کر!'' راشد نے حقارت سے کہا۔ ''تو میرے باپ تک کیوں جا رہا ہے؟''

''تو پھر اس کے پیسے دے دو۔'' میں نے بھی ناگواری سے کہا۔

''تو نے پانچ ہزار کا وعدہ کیا تھا نا!'' منیر نے کہا۔ ''تجھے اپنی اوقات دیکھ کر بات کرنا چاہیے تھی۔ تیری اوقات تو پانچ سو روپے کی بھی نہیں ہے۔ ہم نے اب تک تجھ پر ہزاروں خرچ کیا ہے۔ تو نے اس سے پہلے کبھی گاڑی دیکھی تھی؟ تیرے پھٹیچر باپ کے پاس تو سائیکل تک نہیں ہے اور چلا ہے......''

میں نے اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی آواز سے لاک اپ کے دوسرے سرے پر اونگھتے ہوئے قیدی بھی چونک پڑے۔ دروازے پر کھڑا ہوا سنتری بھی بوکھلا گیا۔

''تو نے میرے منہ پر تھپڑ مارا؟'' نوید نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو صرف تھپڑ مارا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب اگر تو نے میرے باپ کے بارے میں کچھ کہا تو زبان کھینچ لوں گا۔''

''بیک ورڈ کنگلے! تیری یہ جرأت؟'' راشد بھنّا کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے مجھے تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جواب میں اس کے پیٹ میں اتنا زوردار گھونسا مارا کہ تکلیف کی شدت سے وہ دوہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر کہنی سے وار کیا تو وہ میرے قدموں میں گر پڑا۔

منیر نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے شانے پر زوردار لات رسید کر کے اسے بھی فرش چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے رویے کی وجہ سے میں پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔

میرے باپ کو گالی دے کر انہوں نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان دونوں کی گردنیں دبا دوں، میں نے راشد اور منیر کے جسم پر پے در پے کئی ٹھوکریں رسید کر دیں، اس وقت میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں حوالات میں ہوں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اورنگزیب خان جیسے پولیس انسپکٹر کی بات نہ مان کر اسے بھی اپنے خلاف کر چکا ہوں۔

برآمدے میں اچانک بہت سے بھاگتے ہوئے جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ پھر برآمدے میں انتہائی ہائی پاور کا بلب روشن ہو گیا۔

حوالات کے باہر کئی سنتری کھڑے تھے۔ ان کی رائفلوں کا رخ میری جانب تھا۔

ان میں سے ایک چیخ کر بولا۔ ''کیا ہو رہا ہے یہاں؟''

''سنتری صاحب!'' راشد نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''اس گنوار اور گھٹیا آدمی نے اچانک ہم پر حملہ کر دیا اور ہمیں بہت بے دردی سے مارنے لگا۔''

برآمدے کی تیز روشنی اندر تک آرہی تھی۔ میں نے دیکھا، راشد کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ منیر کے چہرے پر بھی نیل تھے۔ شاید میری کوئی لات راشد کے منہ پر پڑ گئی تھی۔

اسی وقت اورنگزیب خان بھی وہاں آگیا اور بولا۔ ''عبدالرحیم! اس لڑکے کو باہر نکالو۔ میں اس کی بدمعاشی نکالتا ہوں۔''

فوراً ہی حوالات کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی اور مجھے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ حوالات کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔

''اسے کمرے میں لے آؤ۔'' اورنگزیب خان نے کہا۔

سنتری نے ہتھکڑی میں پڑی ہوئی زنجیر کا دوسرا سرا اپنے بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے میرے بال پکڑے اور مجھے جانوروں کی طرح گھسیٹتا ہوا ایک جانب بڑھ گیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ انسپکٹر نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا ہے لیکن یہ کوئی اور ہی کمرا تھا۔ وہاں عجیب عجیب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ پانی کی بالٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک بالٹی میں پانی بھی بھرا ہوا تھا۔ لکڑی کا ایک عجیب و غریب فریم تھا، چھوٹے بڑے کئی قسم کے ڈنڈے تھے، رسیاں تھیں اور پتلے اور موٹے سریے تھے۔

مجھے مزید جائزہ لینے کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ میری پشت پر زوردار لات پڑی تھی اور میں اوندھے منہ فرش پر گر پڑا تھا۔ لات اتنی شدید تھی کہ مجھے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ دوسری لات پڑتی، اورنگزیب خان کی آواز آئی۔ ''اسے باندھ دو۔'' مجھے وہاں لانے والے سنتری نے میرا گریبان پکڑ کر کھڑا کیا۔ میرے ہاتھ سے ہتھکڑی نکالی اور چھت سے لٹکے ہوئے ایک رسّے کے ذریعے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیے۔ رسّے کا دوسرا سرا کمرے میں لگے ہوئے ایک ہک میں بندھا ہوا تھا۔ سنتری نے دوسرا سرا کھینچا تو میرے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھنے لگے۔ پھر میں خود بھی زمین سے اوپر اٹھ گیا اور زمین سے تین چار فٹ کی بلندی پر جھولنے لگا۔

دو منٹ بعد ہی میرے بازوؤں اور کندھوں میں شدید تکلیف ہونے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دونوں بازو اکھڑ کر علیحدہ ہو جائیں گے۔

مجھے باندھنے والا سنتری وہاں سے جا چکا تھا، اب کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے تکلیف ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ ہی دیر بعد میری کراہیں نکلنے لگیں۔

اچانک اورنگزیب خان کمرے میں داخل ہوا۔ اب وہ صرف بنیان اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ اس وقت وہ کسی بھی طرف سے پولیس والا نہیں لگ رہا تھا بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی جاگنگ کے لیے گھر سے نکلا ہو۔

کمرے میں ایک ہی کرسی تھی، وہ اس پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”اوئے، میرے لیے چائے لے کر آؤ۔“

پھر اس نے سگریٹ سلگائی اور بہت ہی بے نیازی سے اس کے کش لینے لگا۔

ان دنوں موسم معتدل تھا لیکن اس کے باوجود میرا جسم نہ صرف پسینے میں تر ہو گیا تھا بلکہ پسینا پانی کی طرح فرش پہ ٹپک رہا تھا۔

فوراً ہی ایک سنتری، انسپکٹر کے لیے چائے لے آیا۔ اس نے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے مجھے دلچسپی سے دیکھا، پھر بولا۔ ”ہاں بھئی، اب بتا، تو نے ان لوگوں کو کیوں مارا؟“

”انہوں نے میرے باپ کو گالی دی تھی۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”اوئے ابھی تو صرف انہوں نے گالی دی ہے تیرے باپ کو، کل ساری دنیا اسے گالیاں دے گی، اس پر تھوکے گی کہ وہ تجھ جیسے جرائم پیشہ بیٹے کا باپ ہے، پھر کیا کرے گا تو؟“

”میں جرائم پیشہ نہیں ہوں انسپکٹر صاحب! میں ان لوگوں کی دوستی میں مارا گیا۔“

”اوئے، تیرے تو وہ جگری یار ہیں۔“ انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”پھر تو بھی کتنا بااصول ہے، ان کے خلاف حوالات میں بیان بھی نہیں دے گا۔“

انسپکٹر صاحب! بات دوستی کی نہیں بلکہ ضمیر کی ہے۔“ میں نے کراہ کر کہا۔

”انسپکٹر اچانک اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے وہاں پڑا ہوا ایک سریا اٹھایا اور زور سے میری کمر پر رسید کر دیا۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں جسے سریا سمجھ رہا تھا، وہ ٹھوس ربر کا ٹکڑا تھا۔

انسپکٹر نے دوسری ضرب میرے کولہوں پر ماری، میری چیخ نکل گئی۔

”اس وقت تیرا ضمیر کہاں مرا ہوا تھا، جب انہوں نے ایک لڑکی سے پرس چھینا تھا، اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی؟“ اس نے میری پنڈلیوں پر زوردار ضرب لگائی۔ ”اس وقت تیرا ضمیر کہاں مرا ہوا تھا جب تو ان لوگوں کے ساتھ گھومتا تھا، عیاشی کرتا تھا؟“ اس نے میری کمر پر زوردار ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب تجھے ضمیر یاد آ رہا ہے؟“

”اس وقت واقعی میں نے کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔“ میں نے تکلیف کی شدت سے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے واسطے! آپ مجھے نیچے تو اتاریں۔“

”بس، ہوش ٹھکانے آ گئے؟“ اورنگزیب خان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اب تو نے اگر ضمیر کا نام بھی لیا تو میں تجھے الٹا لٹکا دوں گا۔“ پھر اس نے بلند آواز میں پکارا۔ ”عبدالرحیم!“

کمرے میں وہی لمبا تڑنگا سپاہی داخل ہوا جو مجھے یہاں تک لایا تھا۔ اس وقت وہ بھی دھوتی اور سینڈو کٹ بنیان میں تھا۔

”اسے کھول دو۔“ اورنگزیب خان نے کہا۔

سپاہی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ شاید وہ مجھ پر مزید تشدد کرنے آیا تھا۔ اس کی حیرت سے تو یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اپنے افسر کا حکم پسند نہیں آیا۔ اس نے پہلے مجھے زمین پر اتارا، پھر میرے دونوں ہاتھ کھول دیے۔

میں دھپ سے زمین پر گر پڑا، میں نے دوپہر کے وقت صرف ایک برگر کھایا تھا، اس کے بعد تو ایک کھیل بھی اڑ کر میرے منہ میں نہیں گئی تھی۔ تکلیف کی شدت، انسپکٹر کے تشدد اور نقاہت کی وجہ سے میں تقریباً بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ میں نے بہ مشکل تمام انسپکٹر سے پانی مانگا۔ میرے حلق سے بہت ہی نحیف سی آواز نکلی اور میں نے سر زمین پر ٹکا دیا۔

پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا یا سو گیا تھا، مجھے ہوش آیا تو ایک سنتری میرے سامنے پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔ مجھے اپنے چہرے پر نمی کا بھی احساس ہوا۔ شاید اس نے میرے منہ پر پانی کے چھینٹے بھی مارے تھے۔

اس نے جھک کر میرا سر تھوڑا سا اٹھایا اور پانی کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

پانی نے گویا آبِ حیات کا کام کیا اور مجھے توانائی کا احساس ہوا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا...... میرے جسم میں خصوصاً کندھوں میں اب بھی شدید تکلیف تھی۔

اورنگزیب خان اب بھی میرے سامنے اس کرسی پر بیٹھا تھا۔

”ہاں بھئی ضمیر علی!“ اس نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ”اب کیا حال ہے تیرے ضمیر کا؟ اوئے، وہ دونوں تو بڑے باپوں کے بیٹے ہیں، ان کا تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا، تو ایک معمولی پروفیسر کا بیٹا ہے، تیرا مستقبل تو تباہ ہو گا ہی، تیرے عزت دار باپ کی عزت کا بھی جنازہ نکل جائے گا۔“ وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”تو ایسے خودغرض لوگوں کے لیے ضمیر کی بات کرتا ہے؟ اس میں سے کسی نے بھی تجھے یہاں سے چھڑانے کی کوشش کی؟ سیٹھ ہاشم کا وکیل تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ سارا الزام تجھ پر ڈال دیا جائے۔ میں ایسا بھی کر سکتا ہوں لیکن میں کروں گا نہیں کیونکہ..... جس ضمیر کی بات تو کر رہا ہے، وہی ضمیر میرے پاس بھی ہے، ان لڑکوں کو بھی میں بے گناہ نہیں پھانس رہا ہوں، میں دو مہینے سے ان کی نگرانی کر رہا ہوں۔ یہ دونوں کالج میں اور کالج کے باہر کوچنگ سینٹروں میں ہیروئن سپلائی کرتے ہیں، تو ان لوگوں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے لیکن تجھے تو شاید اندازہ بھی نہیں ہوا ہو گا کہ یہ دونوں شہر کے مختلف کالج ہوسٹلوں پر کیوں جاتے ہیں؟“

انسپکٹر کی بات پر مجھے یاد آیا کہ راشد اور منیر روزانہ مختلف ہوسٹلوں میں جاتے تھے۔ کبھی کسی سے ملنے کے بہانے، کبھی کسی کو کتاب دینے کے بہانے، کبھی کسی اور بہانے سے۔ ہر دفعہ ان کے ہاتھ میں ایک شاپر ہوتا تھا۔ وہ لوگ مجھے گاڑی ہی میں چھوڑ جاتے تھے۔ پندرہ بیس منٹ بعد پھر وہ واپس آتے تھے تو ان کے ہاتھ خالی ہوتے تھے۔

”کچھ یاد آیا؟“ انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، مجھے یاد آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ لوگ تو اکثر گرلز ہوسٹلوں کی طرف بھی جاتے تھے۔ وہاں یہ اندر نہیں جاتے تھے بلکہ لڑکیوں سے باہر ہی ملاقات کرتے تھے اور مجھ سے یہ بھی کہتے تھے کہ یہ ہماری گرل فرینڈز ہیں۔“

”ایک بات اور سن لو۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”میں نے ابھی ایف آئی آر بھی درج نہیں کی ہے۔“ میں اچھل پڑا۔

”آپ نے ابھی تک......“

”میں نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔“ انسپکٹر بولا۔ ”لیکن اکبر موتی والا صاحب میرے ساتھ ہیں۔ ان کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ صدر پاکستان اور وزیراعظم سے ان کی دوستی ہے ورنہ مجھ جیسا معمولی افسر ایک آئی جی اور ڈپٹی سیکریٹری کے سامنے کبھی ٹک سکتا ہے لیکن میں نے بھی سوچ لیا ہے، نوکری رہے یا جائے، اکبر صاحب میرا ساتھ دیں یا نہ دیں، میں ان حرام زادوں کو عدالت سے

ہی سزا دلا کر رہوں گا۔" وہ لمحے بھر کو رکا، پھر بولا۔ "اب میری بات غور سے سنو۔ تم ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھے، تم نے ان سے صرف لفٹ لی تھی لیکن تم اس واقعے کے چشم دید گواہ ہو۔ یہاں لاک اپ میں جو لڑائی جھگڑا ہوا، وہ بھی اسی بات پر ہوا تھا کہ وہ دونوں تمہیں اپنے حق میں بیان دینے کو کہہ رہے تھے۔ جہاں تک منشیات فروشی کا تعلق ہے، وہ میں ابھی ان دونوں سے اگلوا لوں گا۔ ان دونوں سے ان تمام لوگوں کے نام اور پتے معلوم کرلوں گا جنہیں یہ لوگ منشیات سپلائی کرتے تھے، جو لوگ انہیں منشیات دیتے تھے، وہ بھی آج ہی گرفتار ہوں گے، تم فکر مت کرو، میں تمہیں صاف بچالوں گا۔"

"لیکن آپ ایسا کیوں کریں گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں تمہارے والد کا شاگرد رہ چکا ہوں، میں جانتا ہوں کہ وہ کتنے دیانت دار آدمی ہیں اور کتنی محنت سے پڑھاتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تمہیں انجینئر بنانا چاہتے ہیں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تم اگر اب بھی محنت سے پڑھو تو اچھے نمبر لا سکتے ہو، تمہارے والد، ماں اور بہنوں سب کی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔ ان لوگوں کے چکر میں پڑ کر تمہارا مستقبل تو تاریک ہوگا ہی، تمہارے بھائی بہنوں کا مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔ پروفیسر صاحب تو شاید یہ صدمہ برداشت بھی نہ کریں۔ یہ دو بھینسوں کی لڑائی ہے، اس میں تم خوامخواہ پس کر رہ جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے، انسپکٹر صاحب! آپ جیسا کہیں گے، میں کروں گا۔"

"ویری گڈ!" اس نے ہنس کر کہا۔ "اب واقعی تمہارا ضمیر جاگ چکا ہے۔"

پھر انسپکٹر نے مجھے حلیہ درست کرنے کو کہا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا، بال سنوارے اور انسپکٹر کے ساتھ اس کے آفس میں چلا گیا۔ انسپکٹر نے اسی سنتری سے کھانا لانے کو کہا جس نے راشد کو سیل فون دیا تھا۔

وہ سنتری کھانا لے کر آیا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ "سنتری صاحب! ان دونوں کے پاس اس وقت کم سے کم بیس پچیس ہزار روپے ہوں گے۔ جا کر ان سے چھین لو۔"

انسپکٹر اس وقت ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

سنتری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "آپ کو یقین ہے؟"

"اس وکیل نے میرے سامنے ان دونوں کو پیسے دیے تھے۔" میں نے کہا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اس وقت نہاری اور نان بھی مجھے دنیا کی سب سے بہترین ڈش لگ رہی تھی۔

انسپکٹر ٹیلی فون سے فارغ ہوا تو سنتری سے بولا۔ "ان دونوں حرامزادوں میں سے ایک کو تفتیشی کمرے میں لے آؤ۔"

"جی سر!" سنتری نے جلدی سے کہا اور باہر نکل گیا۔

سنتری واپس آیا تو خوشی اس کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ اس نے انسپکٹر کو بتایا "ان میں سے ایک کو تفتیشی کمرے میں پہنچا دیا ہے۔ عبدالرحیم اسے باندھ رہا ہے۔"

انسپکٹر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم نوید صاحب کو گرما گرم چائے اور ڈسپرین کی دو گولیاں بھی لا دینا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

"ان لوگوں کے پاس تو جی چالیس ہزار روپے تھے، بیس ہزار میں نے لیے اور دس دس ہزار باقی دو سپاہیوں نے۔"

"ٹھیک ہے، جاؤ عیش کرو اور اچھی سی چائے لے آؤ۔"

"میں ابھی آپ کے لیے بہترین دودھ پتی چائے لے کر آتا ہوں۔"

میں ساری رات انسپکٹر کے دفتر سے ملحقہ کمرے میں اونگھتا رہا، انسپکٹر اور اس کی ٹیم کے لوگ رات بھر بھاگ دوڑ میں مصروف رہے۔ یہ تو مجھے صبح معلوم ہوا کہ راشد اور منیر کی نشاندہی پر پولیس نے تقریباً بارہ افراد کو حراست میں لے لیا ہے۔ ان میں سے دو راشد اور منیر کو منشیات سپلائی کرتے تھے، باقی لوگ وہ منشیات راشد اور منیر سے لے کر اپنے کالج میں پھیلاتے تھے۔

گرفتار ہونے والوں میں ہمارے کالج کا ایک لڑکا رئیس بھی تھا۔ وہ بھی بڑے باپ کا بیٹا تھا اور میں کسی حد تک یہ بھی جانتا تھا کہ رئیس نہ صرف خود ہیروئن پیتا ہے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی پلاتا ہے۔

انسپکٹر نے تمام الزام راشد اور منیر پر لگا کر مجھے صاف بچا لیا تھا۔ اس نے ابو کو بھی سمجھا دیا کہ نوید محض حادثاتی طور پر ان کے ساتھ تھا۔ اسے میں نے صاف بچا لیا ہے لیکن بس ایک مجبوری ہے، اس کیس کی سماعت جب بھی ہوگی، نوید کو عدالت آنا پڑے گا۔

اس دن کے بعد سے میں نے بھی دل لگا کر پڑھنا

شروع کر دیا، یہ ٹھوکر میرے لیے بہت سبق آموز تھی۔

راشد اور منیر کی ضمانت بھی ہو گئی تھی لیکن انہیں کالج سے نکال دیا گیا تھا۔

کیس دو سال تک چلتا رہا، اس دوران میں ہمارے انٹرمیڈیٹ کے امتحانات بھی ہو گئے۔

توقع کے مطابق میرے نمبر بہت اچھے تھے۔ میرا داخلہ بغیر کسی سفارش کے انجینئرنگ یونیورسٹی میں ہو گیا۔

راشد، منیر اور ان کے ایک ساتھی کو تین تین سال کی سزا ہو گئی۔ باقی لوگوں کو دو دو سال کی قید بامشقت کی سزا ملی۔

میں انسپکٹر اورنگزیب خان کا احسان مند تھا کہ اس نے مجھے اس کیس سے صاف بچا لیا ورنہ مجھے بھی تین سال کی قید بامشقت تو ہوتی ہی، میرا مستقبل تباہ ہو جاتا۔

مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ راشد اور منیر جرائم پیشہ ہیں، ان کی ضمانت ہوئی تو انسپکٹر نے میری حفاظت کا بندوبست بھی کر دیا۔ وہ اکثر ابو سے ملنے گھر میں آ جاتا تھا۔

ایک روز وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ڈیفنس کے ایک محل نما بنگلے پر پہنچ گیا۔

وہاں لان میں اکبر موتی والا کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اورنگزیب نے بتایا کہ یہ اکبر صاحب کا بنگلا ہے۔ میں تمہیں ان سے ملوانے لایا ہوں۔ اکبر صاحب بہت رسوخ والے آدمی ہیں، یہ تمہارے بہت کام آئیں گے۔

اکبر صاحب بہت خندہ پیشانی سے ملے، انہوں نے ایک ملازم سے ہمارے لیے چائے منگوائی اور مجھ سے بولے۔ "انسپکٹر صاحب تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں۔ تم ان لڑکوں کی صحبت میں کیسے پڑ گئے تھے بیٹا؟"

"بس انکل!" میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ "یہ میری بدقسمتی ہی تھی لیکن مجھے جلد ہی ہوش آ گیا۔"

اچانک مجھے روبی نظر آئی۔ وہ ہماری ہی طرف آ رہی تھی۔

"آؤ بیٹی!" اکبر صاحب نے کہا۔ "یہ نوید ہے، تم تو شاید نہ پہچان سکو۔"

"میں پہچان گئی ہوں ڈیڈی!" روبی نے کہا۔ "انہیں میں نے دو دفعہ پولیس اسٹیشن میں دیکھا تھا، ایک دفعہ کورٹ میں دیکھا تھا۔ میں انہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے اس وقت بھی نہ جانے کیوں یقین تھا کہ نوید صاحب، ان لوگوں کی حرکتوں میں شامل نہیں ہیں۔"

ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ روبی نے مجھ سے کہا۔ "آئیے میں آپ کو اپنا اسٹڈی روم دکھاؤں۔"

اس کا اسٹڈی روم واقعی بہت شان دار تھا۔ کمرے میں چاروں طرف دیواروں کے ساتھ زمین سے لے کر چھت تک بک شیلف لگے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ شیشے کے دروازے والی دو الماریاں بھی تھیں۔ ان میں ایسی ایسی نایاب کتابیں تھیں کہ میں نے یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ مجھے روبی پہ رشک بھی آیا کہ وہ اتنے بہترین ذوق کی مالک ہے۔

پھر اس سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور پھر ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے۔

میں اس وقت انجینئرنگ کے سیکنڈ ایئر میں تھا کہ ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا۔

دو دن بعد ایک اندوہناک اور ناقابلِ یقین خبر سننے کو ملی۔ معروف بزنس مین اکبر موتی والا، حماد علی اور سیٹھ ہاشم پر منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ کا الزام تھا۔ سیٹھ ہاشم تو روپوش ہو گیا تھا، پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ دوسرے معروف بزنس مین حماد علی کو گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اکبر موتی والا نے بدنامی کے خوف سے اپنی خواب گاہ میں خودکشی کر لی تھی۔

میں دیوانہ وار اکبر صاحب کے گھر پہنچا تو پولیس وین وہاں کھڑی تھی اور ان کی ڈیڈ باڈی پولیس نے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی تھی۔

روبی ان کی اکلوتی بیٹی تھی، ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس طویل و عریض گھر میں اکبر صاحب اور روبی ملازمین کی فوج کے ساتھ رہتے تھے۔

"ان کی فیملی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس والے نے گھور کر مجھے دیکھا، پھر ہنس کر بولا۔ "ارے صاحب! آپ...... آپ نے مجھے پہچانا؟"

میں نے غور سے اسے دیکھا اور فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی سنتری تھا جس نے میرے کہنے پر راشد کو سیل فون لا کر دیا تھا۔

"کیسے ہو سنتری بادشاہ؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"اب تو میں حوالدار ہوں صاحب!" وہ ہنس کر بولا۔

"اکبر صاحب کی بیٹی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنے ایک ماموں کے گھر چلی گئی ہے۔"

پھر ایڈریس لے کر میں اس کے ماموں کے گھر پہنچا لیکن روبی نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ میں بوجھل قدموں

سے گھر لوٹ آیا۔

اب سارا کھیل میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ سیٹھ ہاشم اور اکبر موتی والا بزنس مین تھے ہی، وہ منشیات فروشی اور اسلحے کی اسمگلنگ میں بھی مصروف تھے۔

مارشل لا لگتے ہی ان کے سارے ہمدرد اقتدار سے ہٹا دیے گئے۔ مارشل لا کی حکومت نے ان لوگوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔

مجھے افسوس تو اورنگزیب کے کردار پر ہو رہا تھا۔ میں تو اسے بہت نیک اور ایمان دار پولیس افسر سمجھتا تھا۔ لیکن درپردہ وہ بھی منشیات فروشوں اور اسمگلروں کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے راشد اور منیر کو شاید اکبر صاحب ہی کے کہنے پر گرفتار کیا ہوگا کہ وہ سیٹھ ہاشم کو بلیک میل کرنا چاہتا ہوگا۔ اسی لیے اورنگزیب نے آخری وقت تک راشد اور منیر کی ایف آئی آر بھی درج نہیں کی تھی۔ جب ان دونوں کے درمیان بات نہ بن سکی تو مجبوراً اسے ایف آئی آر درج کرنا پڑی لیکن وہ چونکہ ابو کا شاگرد بھی تھا اس لیے اس نے مجھے بچا لیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کرپشن میں تو کئی ایسے لوگ بھی ملوث ہیں جن کی شرافت کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔

سب سے زیادہ دل خراش اطلاع یہ تھی کہ روبی بھی اسمگلنگ میں ملوث تھی۔ وہ بھی کیریئر کی حیثیت سے متعدد بار غیر ممالک جا چکی تھی۔ پولیس اسے بھی گرفتار کر چکی تھی۔

میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ راشد اور منیر واقعی مجرم تھے یا انہیں اورنگ زیب خان نے مجرم بنا کر پیش کر دیا تھا۔

اس دوران میں منیر مجھے کئی مرتبہ ملا تھا۔ وہ ہر مرتبہ یہی کہتا تھا کہ ہم دونوں نے آج تک بھی اسمگلنگ نہیں کی، پھر بھی نہ جانے ہمیں کیوں اور کس کے کہنے پر پھنسوا دیا۔

اورنگزیب خان اب انسپکٹر نہیں بلکہ ڈی ایس پی ہے، میں اس سے بھی ملا اور اس سے کہا کہ اب تو مجھے حقیقت بتا دو کہ اس رات کیا ہوا تھا؟

”سیٹھ ہاشم اور اکبر موتی والا کی جنگ تھی وہ۔“ اورنگزیب نے کہا۔ ”راشد کو تو میں نے اکبر صاحب کے کہنے پر گرفتار کیا تھا۔ روبی کو بھی اکبر موتی والا نے بھیجا تھا۔ اگر راشد اس سے پرس نہ چھینتا یا اسے نہ چھیڑتا تب بھی پولیس اسے گرفتار کر لیتی۔ اس رات ہر صورت میں اسے گرفتار کرنا تھا۔ اب یہ منیر کی بدقسمتی تھی کہ وہ بھی اس وقت راشد کے ساتھ تھا اور تم بھی!“

”اس کا مطلب ہے کہ راشد اور منیر بے گناہ تھے؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”ہاں، وہ بے گناہ تھے۔“ اورنگزیب نے کہا۔ ”اور مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو۔“

”میں تم سے کسی بھی لہجے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ تم نے تو مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ جیتے جی مجھے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ بس ایک آخری احسان مجھ پر اور کر دو۔ مجھے روبی سے ملوا دو۔“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ روبی اکبر صاحب کی بیٹی ہے؟“ اورنگزیب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ ان کی سیکریٹری تھی اور......“

”بس کرو۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے کہنے سے سچائی بدل نہیں جائے گی۔ ایک زمانہ جانتا ہے کہ اکبر موتی والا اور روبی کا کیا رشتہ تھا؟“

یہ آخری انکشاف تو گویا میرے درد کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ میں آج تک پچھتاوے کی آگ میں سلگ رہا ہوں کہ محض میری وجہ سے دو بے گناہ نوجوانوں کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ میں اگر کورٹ میں ان کے خلاف گواہی نہ دیتا تو انہیں کبھی سزا نہ ہوتی۔ آپ جانتے ہیں، میں نے ان کے خلاف کیا گواہی دی تھی؟ میں نے کہا تھا کہ میں نے راشد اور منیر کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے ہیروئن فروخت کرتے دیکھا ہے بلکہ جہاں سے پولیس نے ہمیں گرفتار کیا تھا، اس دن راشد نے کسی سے ہیروئن کی ڈلیوری بھی لی تھی۔

اب اگر میں چاہوں تو اپنے اس جھوٹ کی تلافی نہیں کر سکتا۔ میں پچھتاوے کی آگ میں جل رہا ہوں اور نہ جانے کب تک جلتا رہوں گا۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ پچھتاوا میری جان لے کر جائے گا۔

اورنگزیب شروع سے لے کر آخر تک جھوٹ بولتا رہا تھا۔ میں نے کئی ماہ کی محنت کے بعد اس کے ایک جھوٹ کو جھوٹ ثابت کر ہی دیا۔ اس نے بھی تسلیم کیا کہ واقعی اس نے جھوٹ بولا تھا۔

اس لیے تو روبی آج میری بیوی ہے۔ اگر روبی نہ ہوتی تو شاید ان پچھتاؤں سے تنگ آ کر میں بھی اکبر صاحب کی طرح خودکشی کر لیتا، کوئی ہے جو مجھے اس پچھتاوے سے نجات دلا دے؟

وہ بری طرح رو رہا تھا۔ اپنے گالوں پر تھپڑ مار رہا تھا۔ اپنے بال نوچ رہا تھا۔

لیکن میں اس شخص کے لیے پتھر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ اس پر کسی قسم کا رحم کیا جاتا۔ اس کے ساتھ کوئی مروت ہوتی، وہ ایک جعلی پیر تھا۔ نہ جانے اس نے کتنوں کو برباد کیا ہوگا۔

اس کے ہاتھوں برباد ہونے والے عام طور پر خاموش رہ جاتے تھے۔ اپنی بدنامی کے خوف سے اپنی زبانوں پر مہریں لگا لیتے تھے لیکن اس لڑکی کے ساتھ برائی اس کی برائی بن گئی تھی۔

میں اس وقت تھانے ہی میں تھا کہ میرے ماتحت نے آ کر بتایا۔ ”سر کوئی لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہے؟“

”مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا اسے آپ ہی سے ملنا ہے جناب۔ ویسے پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی معلوم ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے بھیج دو اس کو۔“

میں جب سے اس تھانے میں آیا تھا اس قسم کے چھوٹے چھوٹے کیسز آیا کرتے تھے۔ میاں بیوی کا جھگڑا، ساس بہو یا چوری چکاری کی وارداتیں۔ شاید یہ پورا علاقہ امن پسندوں کا تھا۔

بہرحال اس لڑکی کو دیکھنا تھا کہ وہ کیا شکایت لے کر آئی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی تھی اور ماتحت کے اندازے کے مطابق پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی تھی۔ وہ شاید اب تک پُراعتماد رہی تھی لیکن میرے کمرے میں آ کر کچھ نروس سی ہو گئی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی...... وہ اپنی انگلیوں کو گردش دے رہی تھی اور کبھی کبھی ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتی جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہے لیکن اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے۔ بالآخر اس نے اپنی خاموشی توڑی۔ ”سر میں آپ کے پاس ایک

جعلی عامل

محترم معراج رسول

السلام علیکم!

یہ واقعہ جو خود میں ایک مکمل کہانی ہے۔ میرے اس دور کا ہے جب میں فیصل آباد میں تعینات تھا اور تب فیصل آباد لائل پور کہلاتا تھا۔ ریٹائر منٹ کے اتنے دنوں بعد بھی مجھے نادر اور فیاض یاد آتے ہیں۔ پتا نہیں کہاں ہوں گے۔ ان کی یاد آتے ہی میں زمان پر لعنت بھیجنا شروع کر دیتا ہوں۔ یقیناً فیاض بھی اپنے باپ کے لیے یہی امر انجام دے رہا ہوگا۔

انسپکٹر (ریٹائرڈ) نواز شاہ

(سیالکوٹ)

شریف آدمی کی شکایت لے کر آئی ہوں۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ تلخی تھی۔

''شریف آدمی...!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں! نام نہاد شریف۔'' اس نے کہا۔ ''بہت عزت ہے اس کمینے کی، بہت شہرت ہے اس کی۔ ہوسکتا ہے کہ خود آپ لوگ بھی اس کے دباؤ میں ہوں۔''

''نہیں بی بی ایسی کوئی بات نہیں ہے، اگر وہ شریف آدمی مجرم ہے تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے کھینچ لاؤں گا۔ تم مجھے بتاؤ کون ہے وہ؟''

''پیر زمان شاہ۔'' اس نے بتایا۔

''کیا!'' میں واقعی چونک اٹھا تھا۔ ''پیر زمان شاہ۔''

''جی ہاں، چونک گئے نا آپ؟''

''نہیں بلکہ میں اس شخص کے لیے ایسے ہی کسی موقعے کے انتظار میں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں دوسروں سے ذرا مختلف ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں پہلے بھی ایک دو شکایات مل چکی ہیں لیکن ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ تم بتاؤ اس نے کیا کیا ہے تمہارے ساتھ؟''

اس نے جو کچھ بتایا اس نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ زمان شاہ ایک عیاش انسان تھا۔ اس نے بہت سی لڑکیوں کو برباد کیا تھا۔ کمزور عقیدے کے والدین اپنی جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو روحانی علاج کے لیے اس کے پاس لے جایا کرتے اور وہ انہیں اپنے ہتھکنڈوں سے برباد کر کے رکھ دیتا۔

یہاں میں اس کے ہتھکنڈوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ آپ میں سے ہر شخص ایسی باتوں سے واقف ہے۔ اخبارات میں آئے دن ایسی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ٹی وی چینل رات دن ان کے بخیے ادھیڑتے رہتے ہیں پھر بھی یہ سلسلہ اپنے عروج پر ہے۔ لوگ بے وقوف بن رہے ہیں۔ برباد ہو رہے ہیں اور شاید ہوتے رہیں گے۔

نادرہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی تھی۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی جو کمزور عقیدے کا تھا۔ یہ لوگ توہمات پر بہت یقین رکھتے تھے۔ نادرہ کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس نے ایک لڑکے سے محبت کی تھی۔

یہ ایک عام سی بات تھی لیکن اس گھرانے کے لیے عام نہیں تھی کیونکہ انہوں نے نادرہ کا رشتہ خاندان میں طے کر رکھا تھا۔ اسی لیے جب انہیں یہ پتا چلا کہ نادرہ ایک لڑکے میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید اس لڑکے نے نادرہ پر سفلی عمل کروا دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اتنی پاگل ہو رہی ہے۔

''سر، فیاض بہت اچھا نوجوان ہے۔'' اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''بہت پڑھا لکھا، بہت مہذب، ہم نے ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کی ہے۔ میں نے یہی بات اپنے گھر والوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ فیاض نے مجھ پر کوئی عمل کرایا ہے اور اس عمل کا توڑ ہونا ضروری ہے۔''

''کیسی جہالت ہے تمہارے گھر والوں کی۔'' میں نے کہا۔

''یس سر۔'' نادرہ نے اپنی گردن ہلائی۔ ''میں سمجھا سمجھا کر تھک گئی، پھر جانتے ہیں انہوں نے کیا کہا۔ گھر والوں نے یہ کہا کہ وہ آزمائش کے طور پر سفلی عمل کا توڑ کروائیں گے۔ اس توڑ کے باوجود میں فیاض سے محبت کرتی رہی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے درمیان واقعی محبت ہے اور کوئی عمل وغیرہ نہیں ہے۔ پھر وہ مجھے فیاض سے شادی کی اجازت دے دیں گے۔''

''انتہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہ تمہیں پیر زمان کے پاس لے گئے۔''

''جی جناب۔ زبردستی۔ میں شور کرتی رہی، چیختی رہی لیکن میری کون سنتا ہے۔ میرے تین بھائی ہیں جناب۔ ان تینوں نے امی کے ساتھ مل کر مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھایا اور اس کمینے پیر کے پاس پہنچا دیا۔''

اس کے بعد کی کہانی... وہی عام کہانی تھی یعنی اس قسم کے جعلی پیر جس قسم کی حرکتیں کیا کرتے ہیں۔ اس نے بھی وہی کیں اور نادرہ کی زندگی برباد کر کے رکھ دی۔

نادرہ اتنا بتا کر رونے لگی تھی۔ ''سر... میں تو اس کمینے کے ہاتھوں تباہ ہوگئی ہوں لیکن میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ میں خاموش بیٹھ جانے والی لڑکی نہیں ہوں۔ اسی لیے میں اس کے خلاف رپورٹ لکھوانے آپ کے پاس آئی ہوں۔''

''یہ تم نے واقعی بہت اچھا کیا۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے اپنے گھر والوں کو بتایا۔''

''ہاں بتایا۔'' اس نے نفرت سے منہ بنالیا۔ ''اور یہ بھی اس کہانی کا گھناؤنا پہلو ہے، گھر والوں نے پیر زمان کے خلاف کچھ سننے سے انکار کر دیا، ان کا خیال ہے کہ میں اس پر الزام لگا رہی ہوں اور میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ

میرے عاشق فیاض نے کیا ہے۔''

''اوہ گاڈ! یہ تو اور برا پہلو ہے۔''

''یس سر، اب بتائیں میں کیا کروں؟''

''میں تمہاری رپورٹ لکھ لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے بعد تم دیکھ لینا میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔''

''میں تو برباد ہوگئی ہوں سر لیکن اس کم بخت کو بچنا نہیں چاہیے۔''

''بے فکر رہو وہ میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔ میں اس سے تمہاری توہین کا ایسا بدلہ لوں گا کہ زندگی بھر اپنے زخموں کو سینکتا رہے گا۔''

میں نے ایک مفصل رپورٹ اس شخص کے خلاف تیار کی۔ نادرہ کے دستخط لیے اور پیر زمان شاہ پر چھاپا مار دیا۔ اگر نادرہ کی رپورٹ نہ بھی ہوتی تو بھی اس کے حجرے سے اس کے خلاف بہت کچھ برآمد ہوا تھا۔

شراب کی بوتلیں۔ لڑکیوں کی عریاں تصویریں۔ سی ڈیز اور نہ جانے کیسی کیسی دوائیں جنہیں وہ بدبخت عیاشی کے لیے استعمال کرتا ہوگا۔ میں نے اخبار والوں کے سامنے اس کے چہرے سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ سب کے سب اس کی تصویر شائع کریں تاکہ پورا ملک اس کی گھناؤنی حرکتوں سے باخبر ہو جائے۔''

سبھی اس پر لعنتیں بھیج رہے تھے، اسے برا بھلا کہہ رہے تھے اور وہ روئے جا رہا تھا۔ اس نے اپنی گردن جھکا رکھی تھی۔ ویسے وہ ایک سرخ و سفید آدمی تھا لیکن اس کے گناہوں نے اس کے چہرے پر سیاہی لگا دی تھی۔

میں جب اسے کمرے میں لایا تو اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''خدا کے لیے مجھے معاف کردیں صاحب، میں شیطان کے بہکانے میں آگیا تھا۔''

''معاف کرنا عدالت کا کام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تو اپنی ذمے داری پوری کی ہے اور یاد رکھو کہ تم جیسوں کے لیے ایک عدالت اور بھی ہے، وہ ہے اوپر کی عدالت جہاں تم کو اپنے ایک ایک گناہ کا حساب دینا ہوگا۔''

وہ روتا رہا لیکن مجھے اس شخص پر رحم نہیں آرہا تھا۔

بالآخر عدالت نے اسے جیل روانہ کر دیا جب کہ اس کا مقدمہ چلتا رہا تھا پھر عدالت نے اسے ایک لمبی سزا سنا دی تھی۔ اس شخص کی زندگی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

بظاہر تو یہ کہانی ختم ہوگئی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ کہانی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اور بھی بہت کچھ آگے تھا۔

ایک دن نادرہ میرے پاس آگئی وہی لڑکی جس کی رپورٹ پر وہ شخص گرفتار ہوا تھا۔ وہ اس وقت بھی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

''سر!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ کہانی تو بظاہر ختم ہوگئی ہے لیکن شاید یہ ابتدا ہے۔ پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یعنی میں اپنی زندگی کس طرح گزاروں۔''

''تم یہ بتاؤ کہ کیا اب بھی اس لڑکے سے تمہاری ملاقات ہوتی ہے جس نے تم سے محبت کی ہے۔''

''جی ہاں۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ''ملاقات ہوتی ہے اور وہ اب بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے بلکہ شاید پہلے سے کہیں زیادہ۔''

''تو پھر بات تو آسان ہے تم اس سے شادی کرلو۔''

''یہ کہنے کو آسان ہے لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''اور میں اس کا جواب صرف آپ سے نہیں بلکہ پورے معاشرے سے لینے آئی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''میں آپ کو یہ بتا دوں کہ فیاض نفسیاتی مریض بن گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ دوبار خودکشی کی کوشش کر چکا ہے۔ یہ میں ہوں جو کسی نہ کسی طرح اسے زندگی کی طرف لے آتی ہوں۔''

''ظاہر ہے تم پر گزرنے والے سانحے کا اس نے اثر لیا ہوگا۔''

''وہ بھی ہے لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ پیر زمان شاہ کا بیٹا ہے۔''

''کیا......!'' میں تقریباً اچھل پڑا تھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''جی ہاں، یہ بالکل درست ہے۔ وہ کمینہ شخص اس اچھے انسان کا باپ ہے۔'' نادرہ نے بتایا۔ ''اب بتائیں میرے اس مسئلے کا کوئی حل ہے۔ کیا کہتا ہے قانون، کیا کہتی ہے شرع۔ کیا کوئی لڑکی کسی ایسے نوجوان سے شادی کرسکتی ہے جس کے باپ نے اس لڑکی کو برباد کیا ہو، بتائیں مجھے۔''

''خدا کے لیے چپ ہو جاؤ نادرہ۔'' میں جیسے کانپنے لگا تھا۔ ''یہ تو ایسی بات ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

''فیاض نے بھی پہلے مجھے اپنے باپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔'' نادرہ نے کہا۔ ''اور اب وہ پاگل ہو رہا ہے۔ خود میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔ کوئی راستہ ہے میرے پاس۔''

''ٹھہرو، کوئی جلد بازی مت کرنا۔'' میں نے کہا۔

"مجھے معلوم کرنے دو شاید کوئی راستہ نکل آئے۔"
"خدا جانے ایسا کیوں ہوا ہے میرے ساتھ۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔
میں خود چکرا کر رہ گیا تھا۔ شاید یہ میری زندگی کا سب سے عجیب کیس تھا۔
میں نے ایک مولانا سے رجوع کیا۔ جب انہیں ساری کہانی سنائی تو وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ "توبہ توبہ! یہ تو بہت برا ہوا ہے اس بے چاری کے ساتھ۔ اس کی زندگی برباد کردی اس کمینے نے۔"
"آپ یہ فرمائیں کہ اس کا نکاح اس لڑکی سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟"
"نہیں کیونکہ باپ اس لڑکی پر اپنا تصرف کر چکا ہے چاہے جائز ہو یا ناجائز اس لیے وہ لڑکی اس کے لیے حرام ہے۔"
"وہ بے چاری تو بے موت ماری گئی۔" میں نے کہا "کیا آپ کوئی اور راستہ نہیں بتا سکتے۔"
"نہیں اور کوئی راستہ نہیں ہے۔" مولانا نے انکار میں گردن ہلا دی۔
اس کمینے شخص کی وجہ سے کتنی بڑی تباہی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کے لیے اور اس لڑکے کے لیے۔ میرا خیال ہے کہ خود اس جعلی پیر کے لیے مرجانے کا مقام تھا۔
اگر اسے کوئی اور سزا نہ بھی ملتی تو بھی اس کے لیے یہ سزا کم نہیں تھی کہ اس نے اپنے بیٹے کی محبت کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا۔
قدرت کے کھیل نرالے ہوا کرتے ہیں۔ انسان مسئلے کے حل کے لیے سوچتا رہ جاتا ہے اور اس کے پاس گویا ہر مسئلے کا ایسا حل ہوتا ہے کہ جہاں تک ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔
ایک دن نادرہ پھر میرے پاس آئی۔ وہ بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ "سر ہماری کہانی میں ایک نیا موڑ آ گیا ہے۔"
"خدا مبارک... کرے۔" میں نے کہا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے کوئی راستہ نکل آیا ہے۔"
"جی ہاں اور راستہ بھی ایسا کہ ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔" اس نے بتایا۔ "فیاض اس شخص کا بیٹا نہیں ہے۔"
"کیا.....!" میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔
پھر اس نے بتایا کہ پیر زمان نے بالآخر اعتراف کرلیا تھا کہ فیاض کی اس نے صرف پرورش کی تھی اور وہ اس کے ایک دوست کا بیٹا تھا، وہ گہرے دوست تھے۔ اکرام اللہ نیازی اور زمان علی۔ اکرام تو ایک شریف النفس اور لکھنے پڑھنے والا شخص تھا اس کی بیوی بیٹے یعنی فیاض کو جنم دینے کے بعد مرگئی تھی۔ (بعد میں اسپتال کے ریکارڈ سے عورت کی موت اور فیاض کی پیدائش کی تصدیق ہوگئی تھی)
اکرام اللہ نیازی نے پرورش کے لیے اس بچے یعنی فیاض کو زمان علی کی بیوی کے حوالے کردیا تھا۔ زمان علی میں چاہے لاکھ برائیاں ہوں لیکن اس نے بھلائی کا صرف ایک کام ضرور کیا کہ فیاض کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کی۔ کیونکہ دو سال کے بعد اکرام اللہ نیازی کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔
زمان علی نے نہ جانے کس طرح اپنی پٹڑی بدلی اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا لیکن یہ ہوا کہ زمان شاہ نے جرم اور مکاری کی راہ اپنالی جب کہ فیاض اس کی ان حرکتوں سے ہمیشہ نالاں رہا۔ اسی لیے اس نے نادرہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ زمان علی سے اس کا کیا رشتہ ہے پھر وہ حادثہ پیش آ گیا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔
اب اس شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔
باپ اور بیٹے کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا جو حل ہماری سمجھ سے باہر تھا قدرت نے اسے ذرا سی دیر میں حل کردیا تھا۔
فیاض واقعی ایک شریف باپ کا شریف بیٹا ثابت ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر نادرہ کو اپنا لیا تھا بلکہ اس کے سینے سے یہ بوجھ اتر گیا تھا کہ وہ زمان علی جیسے آدمی کا بیٹا ہے۔
اب وہ اکرام اللہ نیازی کا بیٹا تھا۔
اس کہانی میں ایک موڑ اس وقت آیا جب زمان علی نے جیل میں خودکشی کرلی۔ اس نے کہیں سے ایک بلیڈ حاصل کرلیا تھا جس سے اپنی کلائی کاٹ لی اور ایک اذیت ناک موت سے ہم کنار ہوگیا۔
اگرچہ اس واقعہ کو کئی برس گزر چکے ہیں لیکن آج بھی ہمارے یہاں وہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہ جانے کتنے پیر زمان علی شاہ بے معصوموں کو برباد کیے جا رہے ہیں اور لوگوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں کہ انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر لڑکی کا مقدر نادرہ جیسا ہو یا فیاض کسی اور کا بیٹا نکل آئے اس لیے بہتر ہے کہ ایسا کوئی المیہ ہونے ہی نہ دیا جائے۔

کہانی قسمت کی

قابلِ احترام عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ میں پہلی بار آپ کی محفل میں حاضر ہورہا ہوں، ایک کبھی نہ بھولنے والی سرگزشت کے ساتھ۔ یہ سرگزشت میری ہے مگر اصل کردار ماثرہ ہے۔ اس بے چاری نے کس طرح زندگی گزاری اسے میں قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ لوگ جان لیں کہ عورت انتقام پر اتر آئے تو مجسّم قہر بن جاتی ہے۔
خورشید احمد خان
(لاہور)

سردیوں کی رات تھی۔
جب میں نے اسے اپنے مکان کی سیڑھیوں کے پاس دیکھا۔ وہ گٹھری بنی ہوئی ایک سیڑھی پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا وہ ایک پاگل تھی۔
اس کو کئی بار اپنے محلے میں دیکھ چکا تھا۔ بالوں پر کیچڑ، کپڑے پھٹے ہوئے۔ چہرے پر دنیا بھر کی مٹی چپکی ہوئی۔ پھٹے ہوئے کپڑوں پر بھی گندگی لگی رہتی تھی۔ وہ جب کسی کے قریب جا کر کھڑی ہو جاتی تو بدبوؤں کے بھبکے اس

کا استقبال کرتے اور وہ وہاں سے کھسک لیتا۔
اس کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک ایسی جھاڑی ہوتی جس میں کانٹے لگے ہوتے۔ اس خوف سے بچے اس کے قریب نہیں جاتے تھے کہ زخمی نہ کر دے۔

نہ جانے کون تھی۔ کہاں سے آتی تھی، کہاں رہتی تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کے حلیے سے اس کی عمر کا بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ خدا جانے وہ جوان تھی، بوڑھی تھی یا کیا تھی۔

میرا مکان کچھ اس قسم کا ہے کہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بنا ہوا ہے۔ اسی لیے آنے جانے کے لیے پتھروں کی سات... آٹھ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ وہ سب سے آخری سیڑھی پر تھی۔

اس وقت میں کہیں سے واپس آ رہا تھا۔ اچھی خاصی رات ہو چکی تھی اور سردیوں کی راتیں تو ویسے ہی ویران ہوا کرتی ہیں۔

وہ مجھے گاڑی کی روشنی میں دکھائی دے گئی تھی۔ میں نے کچھ فاصلے پر گاڑی روک لی تھی۔ سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید یہ کوئی لاش ہے کسی نے کسی کا مرڈر کر کے اس کی لاش یہاں پھینک دی ہے۔ شہر میں اس قسم کے واقعات تو ہوتے رہتے تھے۔

میں بہت ڈرتا ڈرتا گاڑی سے اتر کر اس کے قریب پہنچا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی پاگل تھی۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ یہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔

اور یہاں کیوں آئی ہے۔ پاگل کا کیا بھروسا وہ کس وقت کیا کر بیٹھے۔ میرا ایک اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ وہ زندہ تھی۔ میرے قریب آنے پر وہ کسمسا کر بیٹھ گئی تھی۔

گاڑی کی روشنی میں اس کا حلیہ اور بھی بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ ”جاؤ...... جاؤ یہاں سے بھاگو۔“ میں نے کہا۔ میں اس سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔

وہ کچھ نہیں بولی، وہ سردی سے کانپتی ہی رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس پاگل پر مجھے افسوس ہونے لگا۔ کچھ بھی ہو وہ انسان بھی تو تھی اور اس طرح سردی میں باہر پڑی رہتی تو یقیناً اکڑ جاتی۔

میں نے سوچا کہ اس پاگل کو کسی طرف بٹھا دوں گا۔ کم از کم سردی سے تو محفوظ ہو جائے گی۔ میں اپنے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ ایک شخص کے لیے جہاں آزادیاں ہوتی ہیں وہاں اس پر پابندیاں بھی ہوتی ہیں۔ لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز رہتی ہیں۔ اس کی ہر حرکت کی نگرانی کی جاتی ہے۔ لیکن انسانی ہمدردی کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ میں نے دروازہ کھول کر اشارہ کیا۔ ”جاؤ اندر، باہر مر جاؤ گی۔“

میں جانتا تھا کہ وہ پاگل میری کوئی بات نہیں سمجھ رہی ہو گی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب وہ ٹھٹھرتی ہوئی اپنی پوری غلاظت کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہو گئی۔ یہ دروازہ ایک چھوٹے صحن کا تھا۔ صحن کے بعد کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ پرانی طرز کا مکان تھا۔

میں نے صحن کا بلب جلا دیا تھا۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے لیے کھانا گرم کر رہا تھا کہ اس کا خیال آ گیا، وہ بھی تو بھوکی ہو گی۔

اب پتا نہیں پاگل کھانا کس طرح کھاتے ہیں۔ کیا رویہ ہوتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا پرابلم ہوتی۔ میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کچن میں داخل ہو گئی۔

شاید دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ اسے کچن میں دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولی۔ ”سنیں میں پاگل نہیں ہوں۔“

”کیا...!“ مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ کیا کہہ رہی تھی وہ۔ اس نے یہ بات بالکل نارمل ہو کر کی تھی۔ ”اچھا اچھا میں سمجھ گیا تم پاگل نہیں ہو۔“

”آپ یقین کریں کہ میں پاگل نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں ذہنی طور پر بالکل صحیح ہوں۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ”میں ایک رات کے لیے اپنا حلیہ change کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پاس کپڑے ہوں تو دے دیں، مجھے نہانا ہے۔“

بالکل صحیح، بالکل نارمل، میری حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میں نے اسی عالم میں اپنا ایک جوڑا نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”میرے پاس زنانہ کپڑے نہیں ہیں۔ یہ میری شلوار قمیص ہے۔“

”ٹھیک ہے آپ مجھے باتھ روم بتا دیں۔“ اس نے کہا۔

میرے خدا کیا تھا یہ؟ اس کی ہر بات نارمل تھی، جس طرح کوئی عام انسان باتیں کرتا ہے۔ وہ اسی طرح باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اسے غسل خانہ بتا دیا۔ وہ غسل خانے میں داخل ہو گئی۔

یا خدا! کیا تھا یہ سب۔ اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پڑھی لکھی بھی ہے۔ بہت شائستہ انداز میں اس نے باتیں کی تھیں۔

میں جیسے جیسے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے غسل خانے سے باہر آنے میں آدھ گھنٹا لگا دیا اور جب وہ باہر آئی تو میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ تو ایک لڑکی تھی اور وہ بھی اچھی خاصی قبول صورت! مردانہ جوڑا اس پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے بالوں کے گرد تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ وہ بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

”کئی مہینوں کے بعد میں کسی کے سامنے اس طرح آئی ہوں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے کپڑے لپیٹ کر رکھ دیے ہیں کیونکہ کل صبح سے مجھے پھر اسی حلیے میں رہنا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے پاگل کا روپ بنا رکھا ہے۔“

”ہاں“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں ایک پڑھی لکھی مہذب لڑکی ہوں۔“

”پھر یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟“

”میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔“ اس نے کہا۔ ”کیونکہ آپ پر بھروسا کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اس وقت مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”میں کھانا گرم ہی کر رہا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”آپ مجھے بتا دیں میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔ آپ گھبرائیں نہیں میں پاگل نہیں ہوں اسی لیے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

ہم پھر کچن میں آ گئے۔ اس نے کھانا گرم کرنا شروع کر دیا۔ بالکل سلیقہ مند لڑکی کی طرح۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی پاگل ہے جو یہاں کی سڑکوں پر ماری ماری پھرتی ہے اور کوئی اس کے قریب نہیں جاتا۔

اس نے بڑے سلیقے کے ساتھ کھانا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ کھانے کے دوران ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر چائے بھی بنائی گئی۔

اس کے بعد اس نے کہا۔ ”میں نے آپ کو ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔ میرا نام مائرہ ہے۔ میں نے گریجویشن کر رکھی ہے۔“

”اور میں خورشید ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”چلو سب سے پہلے تو یہ کلیئر کرو کہ تم نے اتنی جلدی میرے سامنے اپنے آپ کو کیوں ظاہر کر دیا۔“

”اس لیے کہ میں آپ کو جانتی ہوں۔“

”کیا! تم مجھے جانتی ہو۔“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم مجھے کیسے جانتی ہو۔“

”اس لیے کہ ہم پہلے بھی کئی بار ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پاگل کے روپ میں تو آپ نے مجھے نہ جانے کتنی بار دیکھا ہو گا۔ لیکن میں نارمل حالت کی بات کر رہی ہوں۔“

”مائرہ... مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

”آپ نے میرے ابو سے پڑھا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو سر نفیس تو یاد ہوں گے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، وہ تو میرے استاد تھے۔“

”میں ان ہی کی بیٹی ہوں۔“

”او خدایا تم...!“ مجھے جیسے اچانک سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ میں نفیس صاحب کے پاس اکاؤنٹس کی تیاری کے لیے جایا کرتا تھا کیونکہ پورے شہر میں ان جیسا اکاؤنٹس پڑھانے والا دوسرا مشکل ہی سے ہو گا اور وہیں یہ لڑکی مجھ سے ملا کرتی تھی۔ اس کے خد و خال اب یاد آتے جا رہے تھے۔ یہ وہی تھی، سر نفیس کی بیٹی۔

ایم بی اے کرنے کے بعد ان سے پھر میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اس واقعے کو پانچ چھ سال گزر چکے تھے اور اب اچانک ان کی بیٹی اس طرح میرے سامنے آ گئی تھی۔

”میں چونکہ اس محلے میں گھومتی رہتی تھی۔ اس لیے میں نے آپ کو پہچان لیا تھا۔“ مائرہ بتا رہی تھی۔ ”لیکن میں چونکہ پاگل تھی۔ اس لیے آپ کے سامنے خود کو ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔“

”لیکن کیوں، تم نے پاگل پن کا روپ کیوں اختیار کیا ہوا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”مرڈر کرنے کے لیے۔“ اس نے بتایا۔

”مرڈر کرنے کے لیے...!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی خورشید صاحب۔'' اس کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ''اور میں یہ بات اپنے پاگل پن میں نہیں کہہ رہی ہوں۔ یہ سچائی ہے اور آپ کو اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں نے آپ پر بھروسا کرلیا ہے۔''

''مائرہ، تم آنکھیں بند کرکے مجھ پر بھروسا کرسکتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ تمہارے ابو کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ انہوں نے مجھے علم دیا ہے۔ استاد ہیں میرے۔ لیکن یہ سب کیا ہے۔ تم ایسا کیوں کررہی ہو۔ اور نفیس صاحب کہاں ہیں۔ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟''

''بہت لمبی کہانی ہے خورشید صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں آپ کو ضرور سناؤں گی۔ ابو کا تو انتقال ہوچکا ہے۔ وہ صدمے کی وجہ سے مرگئے بلکہ یہ کہیں کہ ان کو قتل کیا گیا ہے۔''

''کس نے کیا ہے قتل؟''

''ٹھہریں۔ میں آپ کو پوری کہانی سناتی ہوں۔'' وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''اس نے نہ جانے کہاں سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ رضوان نام ہے اس کا۔ ایک امیر باپ کی بگڑی ہوئی اولاد۔ وہ طالب علم تھا۔ لیکن ایسا کہ جس کو شاید اس کے باپ کی دولت اور طاقت اس مقام تک لے آئی تھی۔ ورنہ وہ کسی بھی قابل نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ابو کے پاس کاپیاں جانچ ہونے کے لیے آیا کرتی تھیں اور ابو میرٹ کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے۔''

''ہاں، میں یہ جانتا ہوں کہ نفیس صاحب کا معیار کیسا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تو اس بدنیت کی کاپی بھی ابو کے پاس آئی تھی اور وہ ابو کو خریدنے کے لیے ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے ابو کو رشوت کی پیشکش کی تھی۔ ابو نے اسے بہت نرمی سے سمجھا دیا تھا کہ دیکھو، یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ میں کسی اور کا حق مار کر تمہارے مارکس اچھے کردوں۔ تم نے جیسے پیپرز دیے ہوں گے ویسے ہی نمبرز ملیں گے۔

اس نے ابو کے سامنے اس وقت کچھ نہیں کہا لیکن ایک دن اچانک اس کے باپ کا فون آگیا۔ وہ ابو سے یہی کہہ رہا تھا۔ ''نفیس صاحب، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آپ نے میرے بیٹے کو مایوس لوٹا دیا ہے۔ آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ میں نے کتنے پیار سے اس کی پرورش کی ہے۔

''میرا خیال ہے کہ دنیا کا ہر باپ اپنی اولاد کی پرورش اتنے ہی پیار سے کرتا ہے۔''

''لیکن رضوان کی بات اور ہے جناب۔ وہ ایک دولت مند اور بااختیار باپ کا بیٹا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں کسی طرح بھی اسے اداس نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے آپ سے جو کہا گیا ہے اس پر عمل کریں۔ یہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔''

''ابو کو اس کی بات سن کر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے فون بند کردیا تھا۔ وہ شخص ابو کو کھلی دھمکی دے رہا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ اس شخص نے ابو سے انتقام لے لیا۔''

''وہ کس طرح۔'' میں نے پوچھا۔

''مجھے پامال کرکے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کمینے نے مجھے اغوا کیا تھا۔ اس حرکت میں اسے اپنے ذلیل باپ کی حمایت بھی حاصل تھی۔ شاید اسی نے سارا انتظام کیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہوگا... آپ اس کے بارے میں اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ میں جیتے جی مرگئی۔ صرف میں نہیں بلکہ ابو بھی۔ جب میں کچھ دنوں کے بعد سنبھلی تو اس شخص پر کیس کردیا۔ کیونکہ ہم پڑھے لکھے بزدل قسم کے لوگ اس کے علاوہ اور کیا کرسکتے ہیں۔ ہم قانونی راستے ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔ بہرحال ہم نے اس پر کیس کردیا۔ اس شخص نے بھی اپنے باپ کی حمایت سے ایک وکیل کرلیا۔ انتہائی مہنگے داموں۔ میں آپ کو اپنی کہانی مختصر کرکے سنا رہی ہوں کیونکہ زیادہ تفصیل میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

''مائرہ، میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم یقیناً ذہنی اذیت کی انتہا پر ہوگی۔''

مائرہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولنا شروع کیا۔ ''ہمیں یہ پتا چل گیا تھا کہ اس کی طرف سے کون وکیل پیروی کررہا ہے۔ نہ جانے کیوں ابو کو اس بات کی غلط فہمی کیوں ہوگئی تھی کہ وہ جب اس وکیل سے جاکر ملیں گے اور ساری صورت حال بتائیں گے تو وہ شاید اس کیس سے ہاتھ اٹھالے گا۔''

خیر تو ہم دونوں باپ بیٹی اس وکیل کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے ہماری کہانی سنی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دونوں کس توقع پر میرے پاس چلے آئے ہیں۔''

''اس امید پر کہ شاید آپ یہ کیس حق اور انصاف کی خاطر لڑنے سے انکار کردیں۔'' ابو نے کہا۔

''ارے جناب، آدمی اگر حق اور انصاف کے چکر میں رہے تو بھوکا مرجائے۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے یہ حرکت کی ہے کیونکہ وہ اسی قماش کا لڑکا ہے۔ پہلے بھی کئی وارداتیں کرچکا ہے۔''

''تو پھر... پھر آپ اس کی طرف سے کیوں لڑ رہے ہیں۔''

''اس لیے کہ انہوں نے مجھے پورے پانچ لاکھ دیے ہیں۔'' وکیل نے کہا۔ ''اور پانچ لاکھ کے لیے تو میں شیطان کو بھی بے گناہ ثابت کرسکتا ہوں۔ وہ تو صرف ایک بگڑا ہوا نوجوان ہے۔''

''اوہ... یہ تو انتہائی گھٹیا بات کی تھی اس نے۔''

''جی ہاں۔ اس کے بعد تو ہم بالکل ہی مایوس ہوگئے۔ ہمیں انصاف کی توقع ہی نہیں رہی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس وکیل نے مجھے آوارہ اور بدچلن بھی ثابت کردیا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے میرے خلاف گواہ آگئے تھے۔ کیونکہ پیسا بول رہا تھا۔ پیسے نے مجھے آوارہ ثابت کردیا تھا۔ پیسا اس کمینے کو بے گناہ ثابت کررہا تھا اور جیت ان ہی لوگوں کی ہوئی۔ ہم یہ کیس ہار گئے۔ اس صدمے سے ابو بھی زندگی کی بازی ہار گئے۔ وہ دل کے مریض بن گئے اور ہمارا چھوٹا سا مکان ان کے علاج میں فروخت ہوگیا۔ لیکن وہ زندہ نہیں رہ سکے اور ان کی کہانی ختم ہوگئی۔''

اس کے بعد پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ مائرہ چپکے چپکے روئے جارہی تھی۔ اس کے آنسو بہت آہستگی بہت نرمی سے رواں تھے۔ وہ اب زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ صرف رو رہی تھی۔

بہت دیر کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا۔''

''اس کے بعد یہ ہوا کہ خدا نے اس شخص کو تو سزا دے دی۔'' مائرہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ ''وہ ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ وہ نشے میں دھت گاڑی چلا رہا تھا کہ اس کی گاڑی کسی ٹرالر سے جاٹکرائی اور اس کا وہیں انتقال ہوگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنی اس توہین کا انتقام لوں گی لیکن میری حسرت میرے دل میں ہی رہ گئی۔''

''تو پھر تم نے یہ روپ کس کے لیے اختیار کررکھا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''اس وکیل کے لیے۔'' سارہ نے جواب دیا۔ ''وہ تو ابھی زندہ ہے نا اور عیش کررہا ہے۔ دیکھا جائے تو وہ بھی برابر کا مجرم ہے، بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ وہ شخص میرے ابو کا قاتل ہے۔ اسی کی وجہ سے میرے ابو کی جان گئی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''اس وکیل نے جان بوجھ کر صرف پیسوں کے لیے ایسی کمینگی کی ہے۔ لیکن وہ ہے کون؟''

''ممتاز نام ہے اس کا۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ۔ تم ممتاز چوہدری کی بات کررہی ہو۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، میں اسی کی بات کررہی ہوں۔ وہ اسی محلے میں رہتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اسی لیے میں اس محلے میں دکھائی دینے لگی ہوں۔ بس ایک موقع ملنے کی دیر ہے۔ پھر میں اسے اس کے انجام تک پہنچادوں گی۔''

''لیکن مائرہ، یہ تو جرم ہوگا۔''

''کیسا جرم۔'' وہ تلخی سے ہنس پڑی۔ ''جرم تو عقل مند لوگ کیا کرتے ہیں۔ کسی پاگل پر جرم کا الزام نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہے کہ اسے خطرناک قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیتے ہیں۔ اتنا قانون تو میں نے بھی پڑھ رکھا ہے۔ اس شخص نے قانون ہی کی جنگ سے ہمیں مارا ہے نا۔ تو اب میں بھی قانون کے دائرے میں ہی رہ کر اسے ماروں گی۔'' اس کے چہرے پر اس کا ارادہ چمک رہا تھا۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ ''پلیز آپ مجھے کوئی نصیحت نہیں کیجیے گا۔''

''نہیں، میں کچھ نہیں کہوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ایسے لوگوں کو تو عبرتناک سزا ہی ملنی چاہیے۔''

''میں نے بہت پلاننگ کی ہے۔ بہت سوچا ہے۔'' وہ بتارہی تھی۔ ''میں اس پر کوئی کیس تو نہیں کرسکتی کیونکہ کسی

(Cika) سیکا

علاقائی تنظیم، جس کا پورا نام (Conference on Interaction and Confidence building measures in Asia) ہے۔ اس کا قیام اکتوبر 1992ء میں قازقستان کے صدر نور سلطان نذر بانیوف کی تجویز پر عمل میں آیا۔ اس کا مقصد رکن ممالک کے مابین پائے جانے والے تنازعات کو باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل کرنا ہے۔

مرسلہ: ضمیر الحسن، خانیوال

کیس کا جواز ہی نہیں بنتا۔ ویسے مار نہیں سکتی کیونکہ قانون مجھے پکڑ لے گا۔ دولت میرے پاس ہے نہیں کہ میں اس کے لیے کرائے کا کوئی قاتل ڈھونڈوں۔ بس یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔''

''لیکن کس طرح ہوگا یہ سب۔'' میں نے پوچھا۔

''ہو جائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''کل صبح میں پھر اپنے پرانے حلیے میں آجاؤں گی۔ گلیوں میں بھٹکنے والی ایک پاگل۔ جس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ جس کے بدن پر غلاظت ہوتی ہے اور جس کے قریب کوئی نہیں جاتا۔ جو اپنی عزت کو اس طرح بچا کر رکھتی ہے۔''

''مائرہ، میں نہیں جانتا کہ اس وقت مجھے کیا کہنا چاہیے۔'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے لیے میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔''

''یہ بھی بہت ہے کہ کسی نے آج میری کہانی سن لی۔ کسی کو میرے دکھ کا احساس ہوا۔'' اس نے کہا۔

اس بدنصیب لڑکی کو تسلی دینے کے لیے میرے پاس الفاظ بھی نہیں تھے۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ''بس آپ سے ایک درخواست اور ہے۔ میں بہت دنوں سے ڈھنگ کی نیند نہیں سوئی ہوں۔''

''ہاں، ہاں۔ وہ سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ۔ وہ میں نے مہمانوں کے لیے رکھا ہوا ہے۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے جب جانے لگی تو میں نے اسے آواز دی۔ ''مائرہ، میری بات سنو۔''

''جی فرمائیں۔''

''کیا کبھی میری تمہاری ملاقات ہو سکتی ہے۔''

''نہیں خورشید صاحب۔ کسی پاگل سے ملنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔''

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس لڑکی نے مجھ پر انتہائی گہرا تاثر قائم کیا تھا۔ میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ پھر صبح ہوتے ہوتے مجھے نیند آ گئی تھی۔

صبح اٹھتے ہی اس کا خیال آیا۔ میں نے اپنے کمرے سے باہر نکل کر اسے آوازیں دیں۔ اس کا کمرا دیکھا لیکن وہ جا چکی تھی۔ وہ جنونی لڑکی اپنے مشن پر روانہ ہو گئی تھی۔

میرا دیا ہوا جوڑا اس نے اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اپنے وہی کپڑے پہن لیے تھے۔ یقیناً اس نے اپنے چہرے پر مٹی تھوپ لی ہوگی۔ اپنا وہی حلیہ بنا لیا ہوگا۔

میں سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کسی طرح اس لڑکی کو باز رکھوں یا خاموش رہوں۔

ایک نئی بات یہ ہوئی کہ اب وہ محلے میں دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ نہ جانے کہاں نکل گئی تھی جبکہ میں اس وکیل کو اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اب اس نے ایک شاندار گاڑی بھی خرید لی تھی۔ وہ اپنی گردن اکڑائے بڑی شان کے ساتھ گاڑی چلاتا ہوا سامنے سے نکل جاتا۔

میں مائرہ کی طرف سے پریشان تھا۔ وہ اب کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ خدا جانے کہاں چلی گئی تھی۔ ایک خیال یہ بھی آرہا تھا کہ ایسا تو نہیں کہ اس بے چاری کو پاگل خانے کا عملہ اٹھا کر لے گیا ہو اور پاگل خانے لے جا کر بند کر دیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پھر بہت ہی برا ہوگا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک دن وکیل کی موت کی خبر آگئی تھی۔ کسی نے اس کا مرڈر کر دیا تھا۔ اس کو گولی مار دی گئی تھی۔

اس کی موت سے محلے میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ کون ہو سکتا تھا یہ۔ کس نے مارا ہوگا۔ پولیس کس رخ پر سوچ رہی ہوگی۔ کیا مائرہ خون کر کے سامنے آگئی ہوگی یا پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہوگا۔ کیا اس کی سچائی سامنے آگئی ہوگی۔

اس قسم کے بے شمار سوالات تھے مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

ایک دن ایک خبر یہ آئی کہ وکیل کا قاتل گرفتار ہو گیا۔ وہ ایک عادی مجرم تھا اور وکیل کے ساتھ اس کی برسوں کی دشمنی چل رہی تھی۔ اس نے وکیل سے اپنی کسی بات کا بدلہ لے لیا تھا۔

میں نے نہ جانے کیوں ایک بار پھر مائرہ کی تلاش شروع کر دی۔ آخر وہ کہاں چلی گئی تھی۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ حالانکہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ عجیب و غریب حالات میں میرے گھر تک آئی تھی اور اپنی کہانی سنا کر غائب ہو گئی تھی لیکن اس ایک رات کی ملاقات نے ذہنی طور پر مجھے اس کے بہت قریب کر دیا تھا۔

میں اس کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ کیا اسے معلوم تھا کہ اس کا دشمن اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔

اور اچانک ایک رات وہ پھر میرے پاس آ گئی۔ پاگل بن کر نہیں بلکہ نارمل بن کر۔ سلیقے کے لباس میں۔ جس طرح دوسری لڑکیاں ہوتی ہیں۔ میں اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ ''مائرہ! یہ۔ تم ہو۔''

''خورشید صاحب، آپ کو میرا نام یاد رہ گیا۔'' اس نے پوچھا۔

''تم نے بھی تو میرا نام یاد رکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آؤ اندر آؤ۔''

میں اسے کمرے میں لے آیا۔ اب اور قسم کے سوالات میرے ذہن میں آرہے تھے۔ اس نے کیا پاگل پن کا روپ ترک کر دیا تھا یا اس نے ضرورت نہیں محسوس کی تھی کیونکہ دشمن تو مر ہی چکا تھا۔

''آپ مجھے نارمل دیکھ کر حیران ہو رہے ہوں گے۔'' اس نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ اس وقت تم سے نہ جانے کتنے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''سب سے پہلا سوال یہی ہے کہ کیا تمہیں یہ معلوم ہوا کہ تمہارے دشمن وکیل کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔''

''کیوں نہیں معلوم ہوگا۔'' وہ مسکرا دی۔ ''کیونکہ اس کا مرڈر بھی تو میں نے ہی کیا ہے۔''

''کیا...!'' میں نے تشویش بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں سمجھ گئی۔ شاید آپ مجھے واقعی پاگل سمجھ رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن یہ سچ ہے۔'' اس نے مزید کہا۔ ''میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ پکڑا گیا ہے اور اس کا نام ثاقب ہے۔ ایک عادی مجرم۔ عدالت اس کو سزا بھی سنانے والی ہے۔''

''تو پھر تم یہ کس طرح کہہ رہی ہو۔''

''اس لیے کہ اس سے یہ مرڈر خود میں نے کروایا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس نے میرے کہنے پر وکیل کا خون کیا تھا۔''

''مائرہ، تم بہت الجھی ہوئی باتیں کر رہی ہو۔''

''نہیں، میں سیدھی سادی کہانی سنا رہی ہوں آپ کو۔'' اس نے کہا۔ ''اس رات جب میں آپ کے یہاں رکی اور صبح اٹھتے ہی چلی گئی تو یہ کہانی اسی وقت سے شروع ہوتی ہے۔ میں نے آپ کے گھر ہی میں اپنا حلیہ بدلا۔ یعنی دوبارہ پاگل بنی۔ اس وقت آپ گہری نیند سو رہے تھے۔ پھر میں آپ کے گھر سے باہر نکل گئی اور دوسرے علاقے میں

چلی گئی۔ میں کچھ دنوں تک وہاں رہی کیونکہ مجھے آپ کی طرف سے خطرہ تھا کہ آپ مجھے پکڑلیں گے یا میری طرف سے وکیل کو ہوشیار کردیں گے کیونکہ میں آپ کو ساری کہانی سنا چکی تھی۔"

"اس لیے تم اس علاقے میں دکھائی نہیں دیں۔"

"ہاں، میں کہیں اور بھٹکتی رہی پاگلوں کی طرح۔ پھر مجھے ایک دن ثاقب دکھائی دے گیا۔ وہ ایک مکان سے باہر آرہا تھا۔ میں نے فوراً اسے پہچان لیا۔ ثاقب اس کمینے کا ساتھی تھا۔ اس کمینے نے ثاقب کی مدد سے مجھے اغوا کیا تھا۔ میں نے اسی وقت سوچا کہ اس شخص کو کیوں چھوڑا جائے۔ میں نے اس کا گھر تو دیکھ ہی لیا تھا حالانکہ میں اس کے برابر سے گزری تھی لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرے اندر کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے یہ سوچ لیا کہ میں اس کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔"

میں ایک بار پھر حیرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس کی کہانی جذبۂ انتقام کی کہانی تھی۔ جو احساس دلا رہی تھی کہ عورت اپنی توہین کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتی۔

"میری ایک دوست ہے۔" اس نے پھر بتانا شروع کیا۔ "میں اس کا نام نہیں لوں گی۔ لیکن وہ بھی مردوں کے معاشرے کی ستائی ہوئی لڑکی ہے۔ میں نے جب اپنے ذہن میں اپنی پلاننگ مکمل کرلی تو پھر میں اس کے گھر پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔"

"جس طرح مجھے یقین نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں اسی طرح۔ بہرحال اس کے یہاں جاکر جب میں نے اپنے آپ کو دوبارہ change کیا تو پھر اس کی سمجھ میں آگیا۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ یہ بھی نہیں کہ اب میرے ذہن میں کیا ہے۔ میں کس لائن پر کام کررہی ہوں پھر میں اسی کے ساتھ اس کے گھر میں رہنے لگی۔"

"اوہ، اس لیے تم اچانک غائب ہوگئی تھیں۔"

"ہاں۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" اس نے کہا۔ "بہرحال اس دوران میں ثاقب کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ کیا کرتا ہے۔ یہ تو اندازہ تھا کہ وہ ایک عادی مجرم ہے لیکن اس کے شب و روز کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

اپنی دوست کے گھر رہ کر یہ بھی معلوم ہوگیا۔ وہ اپنے گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس نے ابھی شادی نہیں کی تھی اور اس کے ماں باپ نہ جانے کہاں تھے۔ بہرحال ایک شام میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اس وقت مجھے شاندار قسم کی اداکاری کا مظاہرہ کرنا پڑا تھا۔"

"اور یہ تمہارے لیے کوئی نئی بات اس لیے نہیں تھی کہ تم پاگل پن کی ایکٹنگ کرچکی تھیں۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔" وہ مسکرا دی۔ "اس لیے مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ غنڈے میرا پیچھا کررہے ہیں۔ میں نے پناہ کے لیے اس کے دروازے پر دستک دی ہے۔ ایک جوان خوبصورت لڑکی کو دروازے پر دیکھ کر اس کی مردانگی جاگ اٹھی اور لطف یہ ہے کہ وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ نہ تو پاگل کے روپ میں اور نہ ہی اس لڑکی کے بطور جس کو اس کمینے نے اغوا کیا تھا کیونکہ اس نے صرف ایک ہی جھلک دیکھی ہوگی پھر وہ مجھے اور اسے ایک مکان میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اس لیے اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ جیسے وہ واقعات کے تانے بانے ملا رہی ہو کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ "تو اس نے مجھے نہیں پہچانا اور مجھے اپنے گھر میں بٹھا کر ان غنڈوں سے نمٹنے چلا گیا جو میرے ذہن کی پیداوار تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے واپس آکر بتایا کہ وہ غنڈے اب دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔ "میں اب چلی جاؤں گی۔ گھر والے انتظار کررہے ہوں گے۔"

وہ یہ چاہتا تھا میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ جاؤں لیکن میں نے اس کو کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس کے گھر سے باہر آگئی۔ ویسے میں یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اب مجھے بھلا نہیں سکے گا۔ میں نے اس کے دل میں اپنی آگ لگادی تھی۔

دو چار دنوں کے بعد میں پھر کسی بہانے اس کے سامنے پہنچ گئی۔

میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے میں اسے اس دور کا سب سے مقدس فرشتہ سمجھنے لگی ہوں اور وہ بھی میرے سامنے خود کو مہذب ظاہر کرنے کے چکر میں مرا جا رہا تھا۔

مجھے اسے شیشے میں اتارنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ عورت چاہے تو پتھر کو بھی موم بنا سکتی

ہے۔ وہ تو ایک انسان ہی تھا۔ میں نے اسے اپنی محبت کے جال میں پھانس لیا اور وہ بھی الجھتا چلا گیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ میں اس پر دل و جان سے مرنے لگی ہوں حالانکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کون ہوں اور میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔"

"تم نے اپنے بارے میں کیا بتایا تھا اس کو۔" میں نے پوچھا۔

"میں نے اپنا نام شبانہ بتایا تھا۔ شبانہ اور رضوانہ دو بہنیں، بڑی بہن رضوانہ کی طلاق کا کیس چل رہا تھا اور یہ کیس اسی وکیل کے پاس تھا۔"

"اوہ، یعنی تم نے بہت گھما پھرا کر بات کی تھی۔"

"ہاں میں نے اس کو یہی کہانی سنائی تھی اور اسے یہ بتایا تھا کہ ہفتے میں ایک بار مجھے اپنی بہن کے کیس کے سلسلے میں اس وکیل کے پاس جانا پڑتا ہے پھر جب میں نے دیکھا کہ لوہا گرم ہوگیا ہے تو میں نے اس پر آخری چوٹ لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے کپڑے پھاڑے، بال الجھائے اور روتی ہوئی ثاقب کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ وکیل نے مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آگ بگولا ہوگیا۔ میں چونکہ بہت اچھی طرح اس کی نیچر سمجھ گئی تھی اسی لیے اس سے یہی کہتی رہی کہ دیکھو تمہیں میری جان کی قسم تم اس سے کچھ مت کہنا۔ بھول جاؤ اس کو میں جانتی تھی کہ وہ بھولے گا نہیں اور میرا بدلہ ضرور لے گا۔ اور یہی ہوا۔ اس نے وکیل کو گولی مار کر اس کا قصہ ہی ختم کردیا۔"

سچ تو یہ ہے کہ میں کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس لڑکی نے بڑی ہوشیاری اور ذہانت سے کام لیتے ہوئے اپنے ایک دشمن کو دوسرے دشمن کے ہاتھوں ہلاک کروا دیا تھا۔ کتنی گہری پلاننگ تھی اس کی۔

"مائرہ، پھر وہ ثاقب کس طرح پکڑا گیا؟"

"ظاہر ہے میں اسے تو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ مجھے تو ایک تیر سے دو شکار کرنے تھے۔ میں نے ہی اس کے بارے میں پولیس کو بتا دیا تھا۔"

"اوہ گاڈ! میں واقعی اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا اس نے ٹھیک ہی کہا تھا ایک تیر سے دو شکار۔ اس نے ایک طرف تو وکیل کو ہلاک کروایا اور دوسری طرف ایک اور دشمن کو بھی گرفتار کروا دیا۔

"مائرہ تم واقعی بہت خطرناک لڑکی ہو۔" میں نے کہا۔

"خورشید صاحب، دنیا کی ہر لڑکی میری طرح خطرناک ہوسکتی ہے اگر وہ اپنے دل میں ٹھان لے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے تو اسی دن ٹھان لی تھی جس دن مجھے بے عزت کیا گیا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ کمینہ حادثے میں مارا گیا۔ ورنہ میں اس کا بھی بہت برا حشر کرتی۔ اصل دشمن تو وہی تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تمہیں سکون مل جانا چاہیے کیونکہ اب تمہارا کوئی دشمن نہیں رہا۔"

"یہ بات تو ہے۔ اب میرا کوئی دشمن نہیں رہا۔ میرے لیے اب سکون ہی سکون ہے۔"

"تم کہاں رہ رہی ہو؟"

"اپنی اسی سہیلی کے پاس جس کے بارے میں بتا چکی ہوں۔" اس نے کہا۔ "اچھا خورشید صاحب اب مجھے اجازت دیں، میں نے آپ کو سب کچھ بتا کر خود کو ہلکا کرلیا ہے۔"

"مائرہ تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے آئندہ کے لیے کیا پلاننگ ہے تمہارے ذہن میں۔"

"ہاں ایک پلاننگ ہے۔" اس نے کہا۔ "اب تو میں کوئی کام بغیر پلاننگ کے نہیں کرتی۔ عادت سی پڑ گئی ہے۔"

"تم اس وقت جارہی ہو تو میں تم سے پھر وہی سوال کروں گا۔"

"کون سا سوال؟"

"یہی کہ کیا میری تم سے دوبارہ ملاقات ہوسکتی ہے۔"

وہ کچھ سوچنے لگی تھی میں اس کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھے جارہا تھا پھر اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔ "نہیں خورشید صاحب، اب ہم شاید کبھی نہیں مل سکیں گے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس سوال کا جواب آپ کو دو چار دنوں کے بعد مل جائے گا۔"

وہ چلی گئی اور میں اس کے بارے میں سوچتا ہی رہ گیا اور دو چار دنوں کے بعد مجھے اپنے سوال کا جواب بھی مل گیا تھا۔ اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر تھی۔ "مرحوم پروفیسر نفیس کی بیٹی مائرہ کی لاش ایک پارک میں پائی گئی ہے۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق مرنے والی نے خودکشی کرلی تھی۔

یہ انجام ہوا اس لڑکی کا۔ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں آکر ختم ہوئی۔

کالے میاں

مکرمی مدیراعلیٰ
السلام علیکم!
زندگی ہنگامہ پرور ہے۔ نت نئے ہنگامے برپا کرتی ہے اور ہر ہنگامہ ایک نئی کہانی کو جنم دیتا ہے۔ کالے میاں کی کہانی بھی ایک ایسی کہانی ہے جسے ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔ اب اس عمر میں جب بچے بھی جوان ہوچکے ہیں، میں اور کالے میاں دونوں کے پھر بھی میں ان کی باتیں یاد کرتا رہتا ہوں۔

شاہد حسن
(سیالکوٹ)

کالے میاں چونکہ مجھے عقل مند بھی سمجھتے تھے اس لیے مجھ پر بہت بھروسا بھی کرتے تھے۔ اسی لیے ہر پریشانی کے موقع پر وہ میرے پاس ہی آیا کرتے۔ اس بار وہ بہت عجیب الجھن لے کر آئے تھے۔ ''بھائی جان' یہ شیر کی چربی کہاں سے ملے گی؟''

''ظاہر ہے شیر ہی سے مل سکتی ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ شیر کہاں سے ملے گا۔''

''ہاں یہ ایک ٹیڑھا معاملہ ہے کالے میاں لیکن تمہیں شیر کی چربی کیوں چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''رنگ گورا کرنے کے لیے۔'' کالے میاں نے کچھ شرماتے ہوئے بتایا۔

میں حیران ہوکر ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پتا نہیں کس کم بخت نے انہیں رنگ گورا کرنے کا یہ نسخہ بتا دیا تھا، میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کالا رنگ کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری بن کر رہ گیا ہے۔

کالے میاں میں اور کوئی کمی نہیں تھی سوائے کالے ہونے کے۔ وہ ضرورت سے زیادہ کالے تھے، بالکل کوئلے کی طرح نہ جانے وہ ایسے کیوں ہو گئے تھے، حالانکہ ان کے علاوہ گھر میں اور کوئی ایسا نہیں تھا۔

ان کے دو بھائی تھے۔ بالکل نارمل کلر تھے ان کے لیکن کالے میاں نہ جانے کس پر چلے گئے تھے۔ ویسے وہ ایک ذہین نوجوان تھے۔ ان کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار تھا۔ شاید اپنے اسی احساس کو چھپانے کے لیے انہوں نے تعلیم میں جان لڑا دی تھی۔ جس کا رزلٹ شاندار آیا تھا۔

پورے محلے میں ان کی قابلیت کی دھوم تھی لیکن وہی کالا رنگ انہیں نڈھال کر کے رکھ دیتا۔

ایک بار انہوں نے بڑی حسرت سے کہا تھا۔ ''بھائی جان۔'' وہ مجھے بھائی جان کہا کرتے تھے۔ ''بھائی جان میں بھی بڑا بدنصیب انسان ہوں۔ اگر اس کلر میں تھوڑا سا سفیدہ ملا دیا جاتا تو اس میں کیا نقصان تھا۔''

''کالے میاں یہ تو اوپر والے کی صناعی ہے۔ ہم اس پر شکوے کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو دیکھیں کہ آپ میں کیا کمی ہے۔ شاندار کیریئر ہے آپ کا، آپ مقابلے کے امتحان میں شریک ہونے جا رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو کامیابی حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ آپ کی صحت اچھی ہے۔ آپ کے نقش و نگار خوبصورت ہیں، اب اور کیا چاہیے۔''

''لیکن دنیا کی سب سے بڑی خوشی تو میرے پاس نہیں ہے۔''

''اور وہ کیا ہے کالے میاں؟''

''کسی کی خوبصورت مسکراہٹ، کسی کی آنکھوں میں میرے لیے محبت کا پیغام۔ یہ اتنی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ساری خوشیاں بے کار ہیں۔''

اب میرے پاس ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کالے میاں سے کسی لڑکی نے محبت نہیں کی ہوگی۔ محبت تو دور کی بات ہے، کسی نے لفٹ بھی نہیں دی ہوگی۔ جی بھر کر ان کی طرف دیکھا بھی نہیں ہوگا۔

وہ بے چارے اس محرومی کی آگ میں سلگتے چلے جا رہے تھے۔

''اب یہی دیکھ لیں بھائی جان کہ میرے دونوں بھائیوں تک کی دوست لڑکیاں ہیں اور جب وہ کم بخت ہنس ہنس کر مجھے اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہیں تو میرے سینے پر چھریاں چلنے لگتی ہیں۔''

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ اس وقت کالے میاں ایک عام سے انسان ہو گئے تھے۔ وہ بھول گئے تھے کہ ان کی علمی پوزیشن کیا ہے۔ وہ کس مقام پر ہیں۔ کسی سے محبت کی طلب نے انہیں ایک عام سا نوجوان بنا دیا تھا۔

بہرحال تو اس دن کالے میاں میرے پاس شیر کی چربی کا معلوم کرنے آئے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا۔ ''کالے میاں کسی نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔ شیر کی چربی سے بھی رنگ گورا نہیں ہوتا۔''

''تو پھر اس نے ایسا کیوں کہا؟''

''وہ اس لیے کہا کہ وہ یہ جانتا ہے کہ نہ آپ کو شیر کی چربی ملے گی اور نہ آپ کا رنگ گورا ہوگا۔''

کالے میاں نے اداس ہو کر اپنی گردن جھکا لی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بھائی جان تو پھر آپ ہی بتائیں کہ میں اپنے آپ کو تبدیل کرنے کے لیے کیا کروں۔''

''سب سے پہلے تو اپنا نام بدلیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کیسا نام ہوا؟ اس نام نے آپ کی پوری۔ ۔ ۔ شخصیت کو مسخ کر دیا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میرا یہ نام نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا نام ہے آپ کا؟''

''احمد۔ احمد حسین۔ میرے دونوں بھائی اکبر حسین اور انور حسین ہیں اور میں احمد حسین ہوں۔''

''خدا کی پناہ! اتنا خوبصورت نام ہے آپ کا اور آپ کالے میاں بنے ہوئے ہیں۔ کس نے رکھا تھا یہ نام؟''

میری پیدائش کے کچھ دنوں کے بعد میرے رشتے کی ایک پھوپی ہندوستان سے آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ ارے یہ تو کالے میاں ہیں، بس اس دن سے کالے میاں ہوگیا۔''

”خدا ہی سمجھے آپ کی اس پھوپی سے۔ انہوں نے تو آپ کو برباد کر کے رکھ دیا۔ بہرحال آج سے آپ کالے میاں نہیں احمد حسین ہیں۔ اس سے آپ کی شخصیت میں تبدیلی آنی شروع ہو جائے گی۔“

”لیکن کون پکارے گا مجھے۔“

”میں پکاروں گا۔“ میں نے کہا ”اور میرے جاننے والے پکارا کریں گے۔“

کالے میاں میرا مطلب ہے احمد حسین خوش ہو کر چلے گئے تھے لیکن میری کوششوں اور ان کی خواہشوں کے باوجود کچھ نہیں ہوا۔ وہ کالے میاں ہی رہے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”بھائی جان اگر میں آپ سے ایک بات کہوں تو آپ کسی کو بتائیں گے تو نہیں؟“

”ارے نہیں بھئی، تمہاری بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“

”تو پھر میرے ساتھ کسی جنگل کی طرف چلیں۔ میں نے سارا انتظام کر رکھا ہے۔“

”کیسا انتظام؟“

”جنگل میں ایک بوٹی ملتی ہے۔“ کالے میاں نے اس کی پہچان بتائی۔ ”میں خود بھی یہ بوٹی دیکھ چکا ہوں۔“

”تم نے کہاں سے دیکھ لی یہ بوٹی۔“

”ایک صاحب نے بتائی تھی۔ ان کے پاس یہ بوٹی تھی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس سے رنگ گورا ہو جاتا ہے۔“

”احمد حسین کیا ہو گیا ہے تمہیں، کن چکروں میں پڑے ہو۔ دنیا میں کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے جو انسان کی اور یجنل رنگت کو تبدیل کر دے۔“

کالے میاں بولے تو کچھ نہیں لیکن انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں میری یہ بات پسند نہیں آئی ہو۔ اس کے بعد کالے میاں غائب ہو گئے۔

ایک دن، دو دن پورے پندرہ بیس دنوں کے بعد وہ دکھائی دیے۔ وہ میرے پاس ہی آئے تھے۔ ”ارے بھئی کہاں غائب ہو گئے تھے۔“ میں نے پوچھا۔ ”اتنے دنوں کی غیر حاضری۔“

”کیا بتاؤں بھائی جان، میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔“

”کیوں ایسی کیا بات ہوئی تھی۔“

میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی نا اسی لیے یہ سب ہوا۔ میں ایک ساتھی کو لے کر اس بوٹی کی تلاش میں جنگل کی طرف چلا گیا تھا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”بوٹی مل گئی۔ میں نے اس کا لیپ بنا کر چہرے پر لگا لیا۔ رنگ کیا گورا ہوتا پورے چہرے پر دانے نکل آئے۔ یہ بڑے بڑے دانے۔ خدا نے فضل کیا کہ ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر کے علاج سے ٹھیک ہوا۔ ورنہ اس کم بخت نے تو رہی سہی کمی پوری کروا دی تھی۔“

”تم نے اس کو جا کر پکڑا کیوں نہیں؟“

”وہ کم بخت تو بھاگا ہوا ہے بھائی جان۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میرے سینے میں اب دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ہے۔ میں نے پہلی بار ایسی کیفیت محسوس کی ہے میں اب رہ نہیں سکتا۔“

”خدا کے بندے آخر ہوا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے محبت ہو گئی ہے بھائی جان۔“ اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

”محبت ہو گئی ہے کس سے؟“

”یاسمین سے۔“ اس نے بتایا۔

”کون یاسمین، وہ رضوی صاحب کی بیٹی؟“

”جی ہاں۔ اس پورے شہر میں بس وہی ایک یاسمین ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے علاوہ اور کون ہو سکتی ہے۔“

میں اپنا سر تھام کر رہ گیا۔

یاسمین نہ صرف اس محلے کی بلکہ پورے علاقے کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا خاندانی بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا تھا۔ رضوی صاحب خود ایک بڑے سرکاری آفیسر تھے۔ نہ جانے یاسمین کو دیکھ کر کتنوں کے دل دھڑک جاتے ہوں گے اور کالے میاں یاسمین سے محبت کا دعویٰ کر رہے تھے۔

”احمد حسین بھائی یہ بتاؤ کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنی ایسی قسمت کہاں؟“ کالے میاں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس کو تو پتا بھی نہیں ہو گا کہ کوئی اس کا دیوانہ ہو گیا ہے۔“

”احمد حسین۔ بہتر یہی ہے کہ تم یک طرفہ ہی اس کے دیوانے بنے رہو۔ اس کو اپنی محبت کا احساس مت دلاؤ۔“

کالے میاں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سر جھکائے سوچتے رہے تھے۔ میں نے دو چار نصیحتیں کر کے انہیں

رخصت کر دیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پھر نازل ہو گئے۔ اس بار وہ ایک نئی کہانی لے کر آئے تھے۔ ”بھائی جان آپ کو میرے ساتھ قبرستان تک چلنا ہے۔“

”کیوں خیریت؟“ میں نے پوچھا۔ ”قبرستان جا کر کیا کرنا ہے؟“

”بابا نے بتایا ہے کہ قبرستان کی چیونٹیوں کا سفوف رنگ گورا کرنے کا بے مثال نسخہ ہے۔“

”خدا! کیا ہو گیا ہے تم کو اور یہ بابا کون صاحب ہیں؟“

”بہت بڑے بزرگ ہیں اور اس قسم کا ٹوٹکا بھی بتایا کرتے ہیں۔“ کالے میاں نے بتایا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارا اب کوئی علاج نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے اندازے کے مطابق تمہارا صرف رنگ ہی خراب نہیں ہے بلکہ تمہارا دماغ بھی خراب ہو چکا ہے۔ جب میں تمہیں یہ بتا چکا ہوں کہ تمہیں ان سب چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے اسی رنگ کے ساتھ بہت بہتر ہو تو پھر کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”بھائی جان رنگ گورا کرنا تو اب میری مجبوری بن گیا ہے۔“

”کس بات کی مجبوری۔“

”یاسمین جو اتنی گوری ہے میں اس کے ساتھ چلتا ہوا کیسا لگوں گا۔ اسی لیے اب میرے لیے بہت ضروری ہے۔“

”خدا تمہیں عقل دے احمد حسین، تم اس چکر میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤ۔“

مجھے نہیں معلوم کہ کالے میاں نے قبرستان کی چیونٹیوں والا ٹوٹکا آزمایا یا نہیں ..... لیکن ایک شام جب وہ میرے پاس آئے تو خلاف معمول بہت خوش تھے۔ میں نے انہیں اتنا خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔

”بھائی جان میری عبادت رنگ لے آئی۔“ کالے میاں نے بتایا۔

”عبادت، کیسی عبادت؟“

”بھائی جان میں نے یاسمین سے اس طرح محبت کی تھی جس طرح ایک پجاری اپنی دیوی سے کرتا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

”تو پھر کیا ہوا؟“

”یاسمین نے محبت کا جواب محبت سے دیا ہے۔“

”کیا!“ میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا مطلب ہے کہ وہ کیسے تمہاری طرف متوجہ ہوئی تم نے کیا کہا تھا اس سے۔ پھر اس نے کیا کہا؟“

”ایک بار راستے میں اس سے ملاقات ہو گئی اور میں نے ہمت کر کے اپنے دل کی بات اس سے کہہ دی۔“ کالے میاں نے بتانا شروع کیا۔ ”وہ راستے میں مل گئی تھی اور نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ بھائی جان آپ یقین کریں کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی ویسی حرکت نہیں کی۔“

”یہ بات تو ہے۔ میں تمہیں جانتا ہوں، تم بہت مہذب انسان ہو۔“

”لیکن میں اسے دیکھ کر بے بس ہو گیا تھا۔“ کالے میاں نے کہا۔ ”مجھے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ اسی لیے میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ میں نے اس سے کہا بات سنیں، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ آپ شاید مجھے نہ جانتی ہوں، میں بھی اسی محلے میں رہتا ہوں اور ایک شریف انسان ہوں۔“

”ہاں میں جانتی ہوں آپ کو لوگ آپ کو کالے میاں کہتے ہیں۔“

”لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے جب کہ میرا نام احمد حسین ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اچھا بھلا نام ہے آپ کا۔ خیر یہ بتائیں آپ نے کیوں روکا ہے۔ کیا چاہتے ہیں مجھ سے۔“

”مجھے آپ سے کسی جواب کسی ردِ عمل کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ یہ سمجھ لیں کہ قدرت نے میرے لیے ایک ڈیوٹی مقرر کر دی ہے اور میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہوں۔ مجھے آپ کی طرف سے کوئی رسپانس بھی نہیں چاہیے۔“

”بتائیں تو سہی آپ کو مجھ سے کیا چاہیے؟“

”مجھے آپ سے محبت ہے۔ بس میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں نے اپنی بات آپ تک پہنچا دی ہے۔ آپ نے اطمینان سے سن لی ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“ وہ بولتے بولتے رکا پھر ایک گہری سانس لی اور سلسلہ کلام جوڑا۔ ”بھائی جان بس اتنا کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ وہ حیرت سے کھڑی رہ گئی تھی جیسے اس کی سمجھ میں نہیں

آرہا ہو کہ یہ اچانک کیا ہو گیا ہے۔''
''لیکن یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' میں نے کہا ''تم نے اظہار کر دیا اور وہ کھڑی رہ گئی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔''
''آگے بھی تو سن لیں بھائی جان۔'' کالے میاں مسکرا دیے۔ ''دو دنوں کے بعد اس سے پھر ملاقات ہو گئی اور اس بار اس نے میری محبت کا جواب محبت سے دیا۔''
''اچھا وہ کس طرح۔'' میں نے پوچھا۔ مجھے کالے میاں کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔
''آپ شاید مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔'' کالے میاں ناراض ہونے لگے تھے۔ ''اب میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ہمارے درمیان اتنی دوستی ہو گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔''
''کہاں ملتے رہتے ہیں۔''
''مختلف مقامات پر۔ کبھی پارک، کبھی سمندر کنارے، کبھی کسی ہوٹل میں۔'' کالے میاں نے بتایا۔
کالے میاں جو کچھ کہہ رہے تھے اگر وہ درست تھا تو سوائے حیرت کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ یاسمین جیسی لڑکی نے کالے میاں سے دوستی کر لی تھی اور دونوں چھپ چھپ کر ملتے بھی رہتے تھے۔ یہ ایک انہونی سی بات تھی۔
''احمد حسین کیا میں یہ ان ہونی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔
''مجھے افسوس ہے بھائی جان کہ آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''بہرحال اتفاق سے کل ہی ہماری ملاقات ہونی ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو بلیو مون میں آجائیے گا۔''
مجھ پر سنک تو سوار ہو ہی چکی تھی۔ اسی لیے میں مقررہ وقت پر ہوٹل پہنچ گیا اور کالے میاں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ دونوں ہوٹل میں موجود تھے۔ یاسمین ہنس ہنس کر کالے میاں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے انداز میں بے پناہ پیار تھا۔
آس پاس کے لوگ اس جوڑے کو دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ شاید وہ بلیک اینڈ وائٹ کے اس امتزاج کا مذاق اڑا رہے ہوں لیکن یاسمین کے رویے سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اسے پروا ہی نہ ہو۔ خود میرے سینے پر سانپ لوٹنے لگے تھے۔
کچھ دیر بعد دونوں ہوٹل سے باہر نکل گئے جب کہ میں ایک طرف کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا تھا۔ ایک اور ان ہونی یہ ہوئی کہ ہوٹل سے باہر جاتے ہوئے یاسمین نے کالے میاں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
دوسرے دن جب کالے میاں میرے پاس آئے تو میں نے کہا۔ ''احمد تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔''
''شکریہ بھائی جان۔'' کالے میاں شرما گئے تھے۔
''اب یہ بتائیں کہ اگلا مرحلہ کیا ہو؟''
''کیا مطلب!''
''مطلب یہ کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' کالے میاں نے کہا۔ ''اور یہ خواہش یک طرفہ نہیں ہے بلکہ وہ خود بھی یہی چاہتی ہے۔''
میرے خدا! میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔
''احمد میاں اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم نے تو کمال کر دکھایا ہے اگر وہ خود بھی شادی کے لیے رضامند ہے تو پھر کون روک سکتا ہے۔''
''لیکن یہ مرحلہ کیسے طے ہو۔'' کالے میاں نے پوچھا۔ ''میں نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا لیکن ستم دیکھیں کہ خود وہ بھی میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہے۔''
''اور خود یاسمین کیا کہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ یہ کہتی ہے کہ میں کسی کو اس کے گھر والوں سے بات کرنے بھیج دوں۔'' کالے میاں نے کہا۔ ''اب گھر والے تو جائیں گے نہیں اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ میری طرف سے آپ چلے جائیں۔''
''اور اگر اس کے گھر والوں نے مار کر بھگا دیا تو؟''
''نہیں بھائی جان۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' انہوں نے کہا۔ ''یاسمین نے اپنے گھر والوں سے بات کر رکھی ہے، وہ بھی ہمارے انتظار ہی میں ہوں گے۔ آپ جائیں گے نا پلیز۔''
''ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔'' میں نے کالے میاں سے وعدہ کر لیا۔
میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔ کیسی بات تھی کالے میاں جیسے شخص کا رشتہ لے کر یاسمین جیسی لڑکی کے گھر جانے والا تھا۔
پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اس کے گھر جانے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ کیوں نہ خود یاسمین سے بات کر کے پوچھ لوں۔ محلے میں رہنے کی حیثیت سے وہ بھی مجھے

جانتی تھی۔ میں اس سے بہ آسانی کالے میاں کے بارے میں پوچھ سکتا تھا۔
میں نے کالے میاں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں پہلے یاسمین سے بات کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ ورنہ شاید وہ منع کر دیتے۔
میں موقع کی تاک میں رہا اور ایک دن میں نے یاسمین سے راستے میں بات کر لی۔ ویسے وہ خاصی آزاد خیال تھی، اس سے راستے میں بات کر لینا کوئی اتنا مشکل مرحلہ بھی نہیں تھا۔
''یاسمین میں آپ سے کالے میاں کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس سے کہا۔
''ان کے بارے میں کیا بات کرنی ہے آپ کو؟''
''ان کا یہ کہنا ہے کہ میں ان کا رشتہ لے کر آپ کے گھر جاؤں۔'' میں نے بتایا۔
''اوہ میری تو ساری اسکیم ہی فیل ہو گئی۔'' اس نے کہا۔
''کیسی اسکیم؟''
''وہ بے وقوف یہی سمجھ رہا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں اس پر جان دے رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''مسٹر کان کھول کر سن لیں۔ میری اسکیم یہ تھی کہ جب اس کے گھر والے رشتہ لے کر میرے گھر آتے تو میں صرف اتنا کرتی کہ ایک آئینہ اس کے گھر والوں کو دے دیتی کہ جا کر صاحبزادے کو دکھا دیں۔''
مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اسے بے وقوف بناتی رہی ہو۔''
''اور کیا، ایڈیوٹ سمجھ لیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''آپ خود ایک سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ یہ بتائیں کیا کوئی آنکھوں والی لڑکی ایسے شخص سے شادی کرنا پسند کرے گی۔ میں نے تو تفریح کی تھی اس کے ساتھ اور وہ بے چارہ واقعی سیریس ہو گیا۔ بہرحال اسے بتا دیجیے گا کہ یہ کہانی ختم ہو گئی ہے اب وہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔''
سچ یہ ہے کہ مجھے یہ سب سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔
اب میں کالے میاں کو کیا بتاتا کہ اس نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا وہ صرف ایک خواب تھا۔ وہ بھول جائے اس لڑکی کو؟ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے یہ سب کالے میاں کو بتا دیا تو وہ بے چارہ برداشت نہیں کر سکے گا۔
میں نے کالے میاں سے صرف اتنا کہا۔ ''احمد حسین، میری بات مانو تو بھول جاؤ اس لڑکی کو۔''

خصوصیت

اچھے دوست آنکھ اور ہاتھ کے مانند ہوتے ہیں۔
جب ہاتھ کو تکلیف ہوتی ہے تو آنکھ روتی ہے اور
جب آنکھ روتی ہے تو ہاتھ آنسو پونچھتے ہیں۔
مرسلہ: راحیل نواب، ملتان

''یہ آپ کیا مشورہ دے رہے ہیں۔'' کالے میاں ناراض ہونے لگے تھے۔ ''جب سارے معاملات طے ہو چکے ہیں تو پھر ایسا مشورہ کیوں؟''
''اب میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ تم پیچھا چھوڑ دو اس لڑکی کا تمہارے لیے اور بھی چانسز ہیں۔''
''یہ کہیں کہ آپ میرا رشتہ لے کر جانا نہیں چاہتے۔'' کالے میاں ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ پھر کچھ دنوں تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔
کچھ دنوں کے بعد آئے تو بہت افسردہ تھے۔ ان کی آنکھیں یہ بتا رہی تھیں کہ کچھ دیر پہلے تک روتے رہے ہوں۔
''بھائی جان آپ نے بالکل صحیح مشورہ دیا تھا۔'' کالے میاں نے دھیرے سے کہا۔ ''میں کبھی بھی اس کے قابل نہیں تھا۔ نہ جانے مجھ پر کیسا جنون سوار ہو گیا تھا۔ خیر اپنی اپنی قسمت۔''
میں ان سے یہ معلوم کرنے کی بھی ہمت نہیں کر سکا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔
وہ لوگ محلہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ شاید انہوں نے اپنا مکان فروخت کر دیا تھا۔ خود میرے ساتھ یہ ہوا تھا کہ میں بھی سات آٹھ مہینوں کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔
زندگی تو اسی کا نام ہے۔ انسان سفر میں رہتا ہے اور جہاں بھی جاتا ہے کئی کہانیاں اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ کچھ کہانیاں بھلا دی جاتی ہیں اور کچھ زندگی بھر کے لیے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جیسے کالے میاں کی کہانی جسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا کیونکہ میں نے ان کی زندگی کے سارے نشیب و فراز دیکھ لیے تھے۔ بہرحال تو میں یہ بتا رہا تھا کہ اپنا پرانا محلہ چھوڑنے کے بعد وہ کہیں اور شفٹ ہو گئے

تھے، میں بھی بیرون ملک چلا گیا۔

اس دوران میں کالے میاں کی یاد آتی رہی تھی پھر رفتہ رفتہ زندگی کے دوسرے ہنگامے اس یاد پر غالب آتے چلے گئے۔

میری واپسی ہوئی، زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ وہی شب و روز جو پہلے ہوا کرتے تھے۔

ایک دن اچانک میں نے ایک مارکیٹ میں ان دونوں کو دیکھ لیا۔ جی ہاں وہی دونوں۔ کالے میاں اور یاسمین دونوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دوسرے کی پسند سے خریداری کی جا رہی تھی۔

میں حیران رہ گیا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا کھا رہی تھیں یا کوئی اور بات تھی یا کالے میاں ایک بار پھر بے وقوف بن رہے تھے۔

اتفاق یہ ہوا کہ ان دونوں نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ کالے میاں دوڑتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ ''ارے بھائی جان خدا کی پناہ آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو گیا۔ بس اتنا افسوس ہوا کہ بتا نہیں سکتا کہ آپ ہماری شادی میں شریک نہیں ہوئے۔''

''شادی۔'' میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

''ہاں بھائی جان، یاسمین سے میری شادی ہو چکی ہے۔ اب یہ میری بیگم ہیں۔''

اس دوران یاسمین بھی پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کوئی تناؤ نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ بہت خوش اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

''احمد میاں تم نے شاید مجھے پاگل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔''

''ارے نہیں بھائی جان، آپ یاسمین سے پوچھ لیں۔'' پھر انہوں نے یاسمین کی طرف دیکھا۔ ''تم ہی بتا دو بھائی کو ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے؟''

''جی ہاں ہماری شادی ہو چکی ہے۔'' یاسمین نے بتایا۔

''کیا تمہارے گھر والوں کی پسند سے؟''

''ہاں ہاں میری پسند سے بھی اور گھر والوں کی پسند سے بھی۔'' اس نے کہا۔

''خدا کے لیے تم دونوں مجھے پاگل کرنے کے بجائے یہ بتا دو کہ یہ سب کیسے ہوا تو شاید میری سمجھ میں بھی آ جائے۔''

''یہ اس طرح ہوا کہ خون کا رنگ جو ایک ہوتا ہے۔'' کالے میاں نے کہا۔

''میں نہیں سمجھا۔''

''میں سمجھا دیتی ہوں۔ ایک حادثہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔'' یاسمین نے بتایا۔ ''ابو کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بہت زبردست ایکسیڈنٹ، ان کا بلڈ گروپ ایک خاص قسم کا ہے جو عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ خدا کی پناہ! میں نے اپنے رشتے داروں، عزیزوں کی کتنی خوشامدیں کیں ان کو آزمایا جو مجھ پر جان دینے کے دعوے کرتے تھے پھر یہ احمد اسپتال پہنچ گئے۔ اور اتفاق سے ان کا بلڈ گروپ میچ کر گیا تھا۔'' یاسمین نے کہا۔

''اور اس دن میں نے یہ جان لیا کہ جلد کی رنگت چاہے جیسی بھی ہو لہو کا رنگ ایک ہوتا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اپنی بد دماغی کی وجہ سے احمد کو مایوس کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔''

''بھائی جان میرا کیا ہے۔ میں تو اپنا فرض ادا کر کے واپس چلا گیا تھا پھر یہ لوگ خود مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے گھر پہنچ گئے اور پھر جو کچھ ہوا وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔''

''احمد۔'' میں نے کالے میاں کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم ایک بڑے آدمی ہو۔ تمہاری محبت سچی تھی۔ تمہارا جذبہ سچا تھا۔ اسی لیے محبت کی منزل خود تمہیں تلاش کرتی ہوئی تمہارے پاس پہنچ گئی۔''

''یہ بات تو ہے بھائی جان۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دے دیا ہے۔''

''آپ کبھی ہمارے گھر آئیں۔'' یاسمین نے دعوت دی۔

''کیوں نہیں ضرور آؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''بس اسی طرح ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے رہنا۔ اصل رنگ لہو کا ہوتا ہے وہ کالا یا گورا نہیں ہوتا۔''

وہ دونوں اجازت لے کر چلے گئے اور میں سوچتا رہ گیا کہ محبت کے کتنے رنگ ہوتے ہیں۔ یہ کیسے کیسے کرشمے دکھاتی رہتی ہے۔

اب میں نے بھی شادی کر لی ہے۔ میں اور میری بیوی اکثر ان دونوں کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ دونوں بہت پُرسکون اور پیار بھری زندگی گزار رہے ہیں۔

قصوروار

مکری معراج رسول صاحب

السلام علیکم:

شادی سے پہلے عشق و عاشقی کا کھیل بہت سے لوگ کھیلتے ہیں۔ میں نے بھی کھیلا تھا مگر اس کی قیمت میں نے کیسے چکائی یہ آپ کو میری سرگزشت پڑھ کر پتا چلے گا۔ اگر پسند آجائے تو شاملِ اشاعت کر لیجئے گا۔

شاہد انجم
(کراچی)

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب بلدیہ کراچی نے ہر علاقے میں سرکاری لائبریریاں قائم کر رکھی تھیں۔ میں ان دنوں ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ علاقے کے بی ڈی ممبر سے میری جان پہچان تھی۔ انہوں نے مجھے لائبریرین کی نوکری دلوا دی۔ میں پارٹ ٹائم کے طور پر لائبریری میں بیٹھنے لگا۔

کتابیں... پڑھنے کا شوق لوگوں کو اس دور میں بھی کم ہی تھا۔ میں وقت پر لائبریری کھول کر بیٹھ جاتا۔

لائبریری کا ٹائم ختم ہوجاتا تو ایک آدھ کتاب یا کوئی فلمی رسالہ رات کے پڑھنے کے لیے اٹھالیتا اور گھر چلا آتا۔ یہی میرا معمول تھا۔ یعنی صبح دفتر جاتا اور شام کو لائبریری۔ ایک روز محلے کی ایک لڑکی جس کا نام تسنیم تھا میرے کمرے میں آئی۔ وہ میرے گھر آتی ضرور تھی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میرے کمرے میں چلی آئی ہو۔ مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگا تھا کیونکہ وہ جوان تھی اور میری والدہ اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔

"تسنیم، تم یہاں میرے کمرے میں کیوں چلی آئیں؟"

"مجھے تو کوئی کام نہیں ہے۔ کسی اور کو ہے۔"

"کس کو ہے اور کیا کام ہے؟"

"میری ایک سہیلی ہے نازو۔ اسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارا شاہد کے گھر آنا جانا ہے۔ وہ لائبریری میں ہیں۔ ان سے کہنا کوئی فلمی رسالہ پڑھنے کے لیے دے دیں وہی لینے آئی تھی۔"

"عجیب بے ہودہ ہے تمہاری سہیلی۔ اس سے کہنا رسالہ چاہیے تو لائبریری آکر لے اور تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ اماں نے دیکھ لیا تو تمہاری خیر نہیں۔"

"اگر مجھے یہاں سے بھیجنا ہے تو رسالہ دے دو ورنہ میں یہیں بیٹھی رہوں گی۔"

"رسالے لائبریری میں ہیں۔"

"تو لائبریری کھول کر لادو۔"

"دماغ خراب ہوگیا ہے۔ چابی چوکیدار کے پاس ہوتی ہے۔ وہ کل کھولے گا لائبریری۔"

"تو پھر میں کل تک یہیں بیٹھی رہوں گی۔"

میں عجیب مشکل میں گرفتار ہوگیا تھا۔ رسالہ لیے بغیر وہ ٹلنے والی نہیں تھی۔ مجھے ایک اور بھی خیال آیا۔ میں نے ایک فلم میں دیکھا تھا کہ ہیروئن ایک کتاب ہیرو سے لیتی ہے اور اس میں خط رکھ کر واپس کرتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ تو ہونے والا نہیں ہے۔ میں جھٹ اٹھا اور ایک رسالہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اس سے کہنا یہ رسالہ کل واپس کردے۔"

"اسے واپس کرنے بھی میں ہی آؤں گی۔ وہ نہیں آسکتی۔"

"کیوں کیا وہ چل پھر نہیں سکتی؟"

"اس کے گھر میں بہت سختی ہے۔"

"وہ رہتی کہاں ہے؟"

"پچھلی گلی کے کسی گھر میں۔" تسنیم نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اماں میرے کمرے میں آئیں۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھ سے باز پرس کے لیے آئی ہوں گی کہ تسنیم میرے کمرے میں کیوں آئی تھی لیکن معلوم ہوا تسنیم ان کی اجازت ہی سے آئی تھی۔

"تسنیم کو رسالہ دے دیا۔"

"دے دیا۔ پتا نہیں کس کے لیے مانگنے آئی تھی۔"

"اس کی کوئی سہیلی ہے۔ اسے پڑھنے کا شوق ہے۔ اس کے لیے لائبریری سے رسالہ لے آیا کرو۔ خوش ہوجائے گی بے چاری۔"

"جی اماں، لے آیا کروں گا۔"

دوسرے دن وہ آئی اور رسالہ واپس کرکے دوسرا لے گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے رسالے کو الٹ پلٹ کر دیکھا کہ شاید کوئی خط رکھا ہو لیکن مجھے مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ صرف ایک جگہ ایک عبارت کو انڈر لائن کیا ہوا تھا۔ عبارت تھی۔ "مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔" میں نازو کی ہوشیاری کا قائل ہوگیا۔ اس نے کس خوبصورتی سے پیغام دے دیا تھا۔

دوسرے دن جو رسالہ واپس آیا اس میں بھی ایسی ہی ایک عبارت کو انڈر لائن کیا گیا تھا۔ مجھے خوشی تو ہوئی لیکن دل یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ کر بھیجے۔

رسالے جاتے رہے اور آتے رہے لیکن اس نے کوئی خط نہیں لکھا۔ کئی مرتبہ میں نے سوچا کہ میں خط لکھ کر رسالے میں رکھ دوں لیکن ہمت نہیں ہوئی۔

ایک دن تسنیم رسالہ لینے آئی تو میں نے نازو کا ذکر اس سے چھیڑ دیا۔ "تمہاری یہ سہیلی ویسے شکل صورت کی کیسی ہیں۔"

"ارے ابھی تک آپ دیدار سے محروم ہیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی آپ نے چھت پر جاکر دیکھ لیا ہوگا۔"

"شام کے وقت چھتوں پر تو کئی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جب میں نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے تو پہچانوں گا کیسے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ ٹرائی کرچکے ہیں۔ ویسے آپ فکر نہ کریں، میں کرتی ہوں کوئی بندوبست۔"

دوسرے دن وہ رسالہ لائی تو اس میں ایک پرچہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ باتیں لکھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ کالج میں پڑھتی ہے۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا تھا۔ وہ مجھے کئی مرتبہ دیکھ چکی ہے اور مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ سب سے اہم بات یہ لکھی تھی کہ وہ شام پانچ بجے اپنی چھت پر آئے گی۔ سرخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوں گے اور بالوں میں ایک پھول لگا ہوگا۔"

میری مراد پوری ہوگئی تھی۔ مجھے لائبریری چھ بجے جانا ہوتا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے مجھے پانچ بجے کا وقت دیا تھا۔

دوسرے دن پانچ بجے تو میں چھت پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے نظر آگئی لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ چہرہ بھی صاف نظر نہیں آرہا تھا کوئی بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صرف اشاروں سے کام چل سکتا تھا۔ میں نے بالوں تک ہاتھ لے جاکر سلام کیا۔ اس نے بھی اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر سلام کا جواب دیا۔ دو چار اور الٹے سیدھے اشارے کیے اور نیچے اتر آیا۔ مجھے اس سے زیادہ تسنیم پر غصہ آرہا تھا۔ چھت پر ملنے کا اہتمام تو اس طرح کیا تھا جیسے چھت سے چھت ملی ہوئی ہے۔

لائبریری جاتے ہوئے میں جان بوجھ کر اس کی گلی سے گزرا کہ شاید وہ نظر آجائے۔

مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کالج جاتی ہے۔ لہٰذا میں نے سوچ لیا تھا کہ صبح ایسی جگہ کھڑا ہوجاؤں گا جہاں سے وہ گزر سکتی ہے لیکن یہ ارمان بھی پورا نہیں ہوا۔ دوسرے دن جو رسالہ آیا اس میں پرچہ رکھا ہوا تھا۔

"اگر میں آپ کو کالج جاتی ہوئی نظر آجاؤں تو ہرگز بات کرنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ میری نگرانی ہورہی ہوتی ہے۔"

بات نہ کروں میں اسے قریب سے دیکھ تو لوں گا۔ یہی سوچ کر میں اس کی گلی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ گلی سے ایک لڑکی نکلی مگر وہ برقع میں تھی۔ دل نے کہا یہی ہوگی لیکن اس کے اور میرے درمیان نقاب حائل تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا کہ اگر میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا تو وہ تو مجھے پہچانتی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے نقاب اٹھا کر مسکرا دیتی۔ ہونہ ہو یہ لڑکی مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ رسالے پڑھ لیتی ہے۔ جھوٹی موٹی محبت بھی جتاتی ہے لیکن سامنے نہیں آرہی ہے۔ میں نے اس وقت سوچ لیا کہ اب اسے کوئی رسالہ نہیں دوں گا۔ اس طرف سے ناکام ہونے کے بعد ہی دفتر چلا گیا۔ دوپہر کو گھر واپس آیا تو اماں کے پاس تسنیم کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ لگ رہا تھا اسے کہیں دیکھا ہے لیکن یاد نہیں آرہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔ مجھے حیران دیکھ کر یہ مشکل اماں نے حل کردی۔ "تسنیم کی سہیلی نازو ہے یہیں پچھلی گلی میں رہتی ہے۔"

میں اماں پر اپنی دلچسپی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نازو کو قریب سے دیکھ لیا تھا اور یہ بات بھی سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ میری خاطر ہی اماں کے پاس آئی ہے۔ میری توقع سے بڑھ کر خوبصورت بھی تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ کمرے میں آتے ہی مجھے ایک ترکیب سوجھی میں نے جلدی جلدی پرچے پر دو سطریں لکھیں اور پرچہ مٹھی میں دبا کر باہر آگیا۔

"اماں، میں یہاں اپنی کتاب تو نہیں چھوڑ گیا۔"

"دیکھ لے بیٹا! اگر رکھی ہوگی تو یہیں ہوگی۔"

اماں اِدھر اُدھر کتاب دیکھنے لگیں اور میں نے وہ پرچہ نازو کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے وہ پرچہ فوراً اپنی مٹھی میں دبا لیا۔

اس پرچے میں، میں نے ایک جگہ ملنے کے لیے لکھا تھا۔ میں یہ پرچہ کسی رسالے میں رکھ کر بھی اسے دے سکتا تھا لیکن اس طرح یہ پرچہ تسنیم کے ہاتھ لگ سکتا تھا کیونکہ رسالہ وہی لے کر جاتی تھی۔ دوسرے میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ یہ پرچہ لیتی بھی ہے یا نہیں۔

میں پرچہ اس کے ہاتھ میں دے کر واپس کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر بعد تسنیم کی آواز آئی۔ اس نے زور سے اماں سے کہا تھا۔ اماں ہم جارہے ہیں۔ وہ دراصل مجھے بتانا چاہتی تھی۔ میں فوراً اپنے کمرے کے دروازے پر آگیا کیونکہ انہیں کمرے کے سامنے ہی سے گزرنا تھا۔ تسنیم آگے تھی اور نازو اس کے پیچھے میرے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ہلکے سے کہا۔ "میں پہنچ جاؤں گی۔" اس نے پرچہ پڑھ لیا تھا۔

دوسرے دن کالج کے بعد کا وقت طے ہوا تھا۔ میں نے دفتر سے چھٹی کی اور اس کے کالج کے قریب ایک پارک میں جاکر بیٹھ گیا۔ کالج کی چھٹی ہوئی تو وہ بھی پارک میں آگئی۔

"آپ نے مجھے کیوں بلایا، کالج قریب ہے کوئی بھی آسکتا ہے۔"

"ہمیں یہاں بیٹھنا تھوڑی ہے۔ یہاں تو میں نے تمہیں ملنے کے لیے بلایا ہے۔ چلو وہاں چلتے ہیں جہاں بیٹھنا ہے۔"

"کہاں بیٹھنا ہے۔"

"اگر تمہیں مجھ پر بھروسا ہے تو پوچھے بغیر چلو۔"

”بھروسا نہ ہوتا تو چلی کیوں آتی۔“
”تو پھر چلو۔“
میں اسے پارک سے باہر لے آیا۔ ”ہم ساتھ نہیں چلیں گے۔ تم میرے پیچھے پیچھے چلتی رہو۔“
دراصل اس پارک کے قریب میرا ایک دوست اختر رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کے گھر والے دو تین مہینے کے لیے سعودی عرب گئے ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے بات کرلی تھی اور اس نے خوش دلی سے اجازت دے دی تھی۔
میں جب اختر کے دروازے کے سامنے جا کر رکا تو نازو بجا طور پر پریشان ہوگئی۔ ”یہ مجھے آپ کس کے گھر لے آئے ہیں؟“
”میرے ایک دوست کا گھر ہے۔“
”میں کسی کے گھر نہیں جاؤں گی۔ باتیں ہی کرنی ہیں تو کسی ہوٹل میں چل سکتے ہیں یا وہ پارک ہی ٹھیک تھا۔ وہیں چلتے ہیں۔“
اتنی دیر میں اختر نے دروازہ کھول دیا تھا۔ نازو کا انکار ادھورا رہ گیا اور اسے اندر آنا پڑا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ بری طرح کانپ رہی ہے۔
”جلدی بتایئے' آپ مجھے کیا کہنے کے لیے یہاں لائے ہیں۔“
”یہ کہنے کے لیے کہ تم بہت خوبصورت ہو اور مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔“
”میں نے سن لیا اور میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتی ہوں۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ”اب چلیں؟“
میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ ”تم مجھے ایسا ویسا نوجوان کیوں سمجھ رہی ہو۔ ہم یہاں بیٹھ کر دل کی باتیں کریں گے اور بس۔“
”وہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ جو کہنا ہے جلدی کہیں۔“
”دیکھو اب درمیان سے تسنیم کو ہٹ جانا چاہیے۔ وہ کسی بھی وقت ہمارے راز کو دوسروں پر ظاہر کرسکتی ہے۔“
”ارے نہیں۔ وہ ایسی نہیں ہے۔“
”اب ہمیں براہ راست ملنا چاہیے بلکہ اس پر تو یہ ظاہر کرو کہ جیسے اب یہ قصہ ختم ہوگیا۔ رسالے منگانے کا سلسلہ بھی بند ہی کردو۔“
”اس بہانے آپ سے ایک تعلق تو رہتا ہے۔“
”ہم دوسرے تیسرے دن اسی جگہ مل لیا کریں گے۔ اختر کے گھر والے آجائیں گے تو کوئی اور ٹھکانہ تلاش کرلیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک ہماری شادی ہوجائے۔ میں اماں کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کروں گا۔“
شادی کے نام پر وہ خوش ہوگئی۔ اس نے بڑی بے باکی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم دونوں بڑی دیر تک ہاتھوں میں ہاتھ دیے بیٹھے رہے۔ اسے گھر جانے کی جلدی تھی لہٰذا مجھے بھی اٹھنا پڑا لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ ہر دوسرے دن وہ اختر کے گھر آجایا کرے گی۔
اس دن کے بعد سے ہماری ملاقاتیں تسلسل سے ہونے لگی تھیں۔ وہ ہر ملاقات میں شادی کا ذکر چھیڑ دیتی تھی اور میں سچے جھوٹے بہانے کر کے اسے ٹالتا رہتا تھا۔
ان ملاقاتوں کے زمانے ہی میں مجھے تسنیم کے رویے میں تبدیلی محسوس ہونے لگی تھی۔ اب تک وہ بڑی معصومیت سے پیش آتی تھی۔ مجھے شاہد بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھی لیکن اب شاہد کہنے پر اتر آئی تھی۔ میں نظر انداز کرتا رہا تھا لیکن اس روز شاید اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔
”میں اتنی محبت سے آتی ہوں اور آپ مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔“
”بات کرتا تو ہوں اور کیا بات کروں۔“
”وہی باتیں کریں جو آپ نازو سے کرتے ہیں۔“
”نازو سے تو میں ملتا ہی نہیں باتیں کیا کروں گا۔ اور اب تو وہ رسالے بھی نہیں منگواتی۔ معاملہ ختم ہی سمجھو۔“
”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ اب تو میں ہی میں ہوں۔ مجھ سے باتیں کریں۔“
”جن باتوں کا تم کہہ رہی ہو وہ میں تم سے نہیں کرسکتا۔ اماں کو معلوم ہوگیا تو قیامت آجائے گی۔ میرے کمرے میں نہ آیا کرو۔ میں خود باہر آکر تم سے باتیں کرلیا کروں گا۔ تم اماں کے پاس ہی اچھی لگتی ہو۔“
”شاہد یہ سن لو نازو نے جتنے خط تمہیں لکھے ہیں ان میں سے آدھے میرے پاس ہیں۔ ابھی اماں کے حوالے کردوں گی۔“
”جھوٹ مت بولو۔ میں اس کا ہر خط پڑھنے کے بعد پھاڑتا رہا ہوں۔“
”تم نے تو وہ خط پھاڑے ہوں گے جو تم تک پہنچے ہوں گے۔ میرے پاس تو وہ خط ہیں جو میں نے راستے ہی سے غائب کرلیے تھے۔“

”یہ مت بھولو کہ وہ خط نازو نے مجھے لکھے تھے میں نے نہیں۔ میں نہیں پھنسوں گا۔“
”آپ بہت محتاط تھے لیکن دو چار خط تو آپ نے بھی لکھے تھے۔ وہ میرے پاس ہیں۔“
”مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ جاؤ جسے دکھانا ہے دکھا دو۔“
”ابھی جاتی ہوں۔“
وہ ابھی کمرے کے دروازے پر ہی تھی کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اگر یہ لڑکی بے وقوفی کر رہی ہے تو مجھے تو ذہانت سے کام لینا چاہیے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم سنجیدہ ہوگئیں۔“
”ابھی جو کہہ رہے تھے!“
”میں تو تمہارا امتحان لے رہا تھا۔“
”ٹھیک ہے' آپ رات کو چھت پر آجایئے گا۔ میں دیوار کود کر آجاؤں گی۔“
”کسی نے دیکھ لیا تو؟“
”زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہمیں شادی کرنی پڑ جائے گی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔
سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے ڈر گیا تھا۔ میں نے اس کے چلے جانے کے بعد ایک مرتبہ سوچا ضرور تھا کہ اماں سے اس کی شکایت کروں لیکن اس کی دھمکی میرے سامنے تھی۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتی تھی۔ پھر یہی سوچا کہ جب تک ہوسکے اسے بے وقوف بناتا رہوں۔ جھوٹا پیار جتاتا رہوں تاکہ اس کا منہ بند رہے۔ میں آنکھ بند کر کے اس آگ میں کود گیا۔ رات ہوئی تو چھت پر چلا گیا۔ وہ بھی آ[illegible]۔ وہ کوئی کرسی وغیرہ رکھ کر دیوار پر چڑھی ہوگی اور دوسری طرف سے میں نے اسے اپنی چھت پر اتار لیا۔ ویسے دیوار کچھ زیادہ اونچی بھی نہیں تھی۔ وہ میری بانہوں میں آکر سسکنے لگی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ واقعی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیکن اس کی محبت بغاوت سے ہم کنار تھی۔ وہ پہلے ہی رات میرے اتنے قریب آگئی کہ اس کی جسارت پر مجھے حیرت ہوئی۔ کوئی لڑکی جب خود اپنے آپ کو پیش کرے تو نظروں سے گر جاتی ہے۔ یہی حال تسنیم نے اپنا کرلیا تھا۔
دوسرے دن جب میں نازو سے ملا تو مجھے تسنیم کی یاد آگئی۔ نازو بھی میری طرف خود بڑھی تھی اور میرے کہنے پر اکیلے گھر میں ملاقاتیں بھی کر رہی تھی۔ میں نے سوچا، وہ بھی یہی کچھ چاہتی ہوگی جو تسنیم نے چاہا تھا۔ میری آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ایسی وحشت ابھر آئی تھی کہ وہ چونکے بغیر نہ رہ سکی۔
”شاہد تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے۔“
”کیا ہوا ہے میری آنکھوں کو؟“ میں نے اس کی زلفوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
”کوئی دیکھے تو یہی کہے کہ تم پاگل ہونے کے قریب ہو۔ آج تک میں نے تمہاری آنکھوں کا یہ رنگ نہیں دیکھا تھا۔“
”کیا اب بھی تم یہ نہیں مانو گی کہ تمہارے حسن نے مجھے پاگل کردیا ہے۔“
میں اس وقت واقعی پاگل ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اختر دوسرے کمرے میں موجود ہے نازو پر جھپٹ پڑا۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ ”شاہد ہوش میں آؤ۔ ہم عنقریب شادی کرنے والے ہیں۔“ اس کی چیخوں نے مجھ پر مطلق اثر نہیں کیا۔ وہ تقریباً بے بس ہوگئی تھی کہ دروازے کی بیل نے شور مچایا۔ میں گھبرا کر اس سے الگ ہوگیا۔ اختر بھی کمرے سے نکل آیا تھا۔
”میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے تک گیا اور پھر بھاگتا ہوا آیا۔ ”ممی، ڈیڈی آگئے ہیں۔ تم لوگ جلدی سے پچھلے دروازے سے نکل جاؤ۔“
نازو نے جلدی جلدی کپڑے درست کیے۔ برقع اوڑھا اور ہم دونوں پچھلے دروازے سے نکل گئے۔ اب نازو سے زیادہ میری حالت بری ہوگئی۔ اگر اس وقت پکڑے جاتے تو کیا ہوتا۔ بہرحال اس وقت تو بچ گئے تھے۔
کچھ دور چلنے کے بعد نازو نے مجھ سے کہا۔ ”دیکھا کسی غیب سے مدد ہوئی۔ تمہاری آنکھوں میں [illegible] ناچ رہی تھی لیکن خدا نے میری مدد کی۔“
اب میرے پاس بات سنبھالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
”مجھے معاف کردو نازو۔ مجھے تمہاری قربت نے بہکا دیا تھا۔“
”تم مجھ سے محبت نہیں کرتے شاہد۔“
”یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔“
”اگر تم مجھ سے محبت کرتے تو یوں مجھے پامال کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ آج تو مجھے اللہ نے بچا لیا لیکن تم سے ملتے رہنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ محبت کرنے والوں کی آنکھوں میں وہ ہوس نہیں ہوتی جو تمہاری آنکھوں میں رہتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اب تم مجھ سے نہیں ملو گی۔“
”اب مجھے سوچنا پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم والدین سے بات کرو تاکہ ہماری شادی ہو سکے۔“
میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں اماں سے بات کروں گا۔
”مجھے تسنیم پر بھروسا نہیں ہے۔ اگر کبھی تم سے ملنے کو جی چاہے گا تو تمہیں کیسے خبر کروں گا۔“
”میں اتنا کر سکتی ہوں کہ ہفتے میں صرف ایک مرتبہ کالج کی چھٹی کے بعد تمہارے ساتھ کسی محفوظ مقام پر مل لیا کروں گی ۔ وہ بھی صرف دو مہینے تک ۔ اس عرصے میں تم اپنی والدہ سے بات کر لو۔“
اس کی پارسائی میری راہ میں حائل تھی۔ میں نے محبت کا یقین دلانے کے لیے ملنے پر اصرار کیا تھا۔ ورنہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس کی نہیں اس کے جسم کی ضرورت ہے۔
رات کو تسنیم سے ملاقات ہوئی تو نازو کو بالکل بھول گیا۔
”آپ کی سہیلی نازو کے کیا حال ہیں۔“ میں نے تسنیم سے پوچھا۔
”آپ کے دل میں اب بھی اس کی محبت ہے۔ آپ فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے کہ کسے اپنا بنانا ہے۔“
”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ نازو سے مجھے محبت ہے۔ میری محبت تو تم ہو۔“
”سچ!“ وہ خوشی سے جھوم اٹھی ”پھر خالہ سے بات کرو نا۔ ہم یوں کب تک چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے۔“
”بس موقع ملتے ہی بات کروں گا۔“
تسنیم ہر رات چھت پر آجاتی تھی۔ ہفتے میں ایک مرتبہ نازو سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی ۔ وہ ہر ملاقات میں شادی کے لیے اصرار کر رہی تھی اور میں ٹالے جا رہا تھا۔
تسنیم کی طرف سے بھی اصرار بڑھتا جا رہا تھا بلکہ اس کے اصرار میں تو دھمکی بھی شامل ہو گئی تھی ۔ ایک رات تو اس نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔
”شاہد، تم نے مجھے کسی اور کے لائق نہیں چھوڑا ہے۔ یہ راز کسی وقت بھی کھل سکتا ہے۔“
میں اس دھمکی سے ڈر گیا۔ وہ ایسی بے باک تھی کہ اماں کو سب کچھ بتا سکتی تھی ۔ میں یہ سوچنے لگا تھا کہ جس لڑکی نے خود کو میرے حوالے کر دیا اس سے شادی کرنا۔ یہ بھی سوچتا تھا کہ اگر اس کے حق میں فیصلہ کرتا ہوں تو نازو کا ردعمل کیا ہو گا اور اگر نازو کے حق میں فیصلہ کرتا ہوں تو تسنیم کیا طوفان کھڑا کر سکتی ہے۔
میں چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پس رہا تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ تسنیم اب کھل کر کہنے لگی تھی کہ وہ خالہ کو ساری باتیں بتا دے گی اور کہے گی شاہد سے میری شادی کراؤ۔ میں بڑی ہوشیاری سے اسے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیے ہوئے تھا۔
میں دونوں لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر خاموش کرائے ہوئے تھا لیکن کب تک ۔ ان سے پیچھا چھڑانے کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ غیب سے ایک صورت نکل آئی۔ میں اس دن دفتر گیا تو میرے تبادلے کے احکامات آئے رکھے تھے۔ میرا تبادلہ کراچی کر دیا گیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں تبادلہ رکوانے کی کوشش کرتا لیکن اس وقت تو جیسے میری مراد بر آئی تھی۔ مجھے دونوں لڑکیوں سے دور بھاگنے کا موقع مل رہا تھا۔ یہ موقع میں کبھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ میں فوراً اپنے افسر کے پاس گیا اور اس حکم کی قبولیت کی ہامی بھر لی۔ گھر آکر میں نے اماں اور ابو کو بھی اس خبر سے آگاہ کر دیا۔ اماں کو تاکید کر دی کہ ابھی وہ کسی کو نہ بتائیں کہ میں کراچی جا رہا ہوں۔ میں نے خاص طور پر تسنیم کا نام لیا تھا کہ اسے تو بالکل خبر نہ ہو۔
”تو کیا چوری کر کے بھاگ رہا ہے کہ کسی کو نہ بتاؤں۔“
”یہ بات نہیں ہے بلکہ کئی لوگ ہیں جو کراچی کے لیے تبادلہ کرانا چاہتے تھے۔ انہیں اگر معلوم ہوا تو میری مخالفت شروع ہو جائے گی۔ مجھے افسر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ یہ موقع مجھ سے چھن جائے گا۔“
”تسنیم کون سا تیرے دفتر جا کر بتا رہی ہے۔“
”اماں، اس کا ایک رشتے دار میرے دفتر میں کام کرتا ہے۔ تسنیم نے اگر اسے بتا دیا تو میرا کراچی جانا گیا۔“
انہوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں بتائیں گی جب تک میں کراچی چلا نہیں جاتا۔
اماں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں کراچی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت ضرور کر رہا تھا لیکن اپنی جان بچانے کا یہی ایک راستہ تھا۔
اماں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور میں کراچی روانہ ہو گیا۔ ٹرین میں بیٹھا سوچ ضرور رہا تھا کہ تسنیم مجھ سے ملنے کے لیے چھت پر آئی ضرور ہو گی لیکن مجھے نہ پا کر مایوس ہوئی ہو گی۔ صبح وہ اماں کے پاس

آئے گی اور یہ خبر سنے گی کہ میں کراچی چلا گیا ہوں ۔ اس کے بعد وہ جو بھی کہے جو بھی کرے۔ نازو بھی رو دھو کر چپ ہو جائے گی۔
انہی خیالوں میں سرگرداں میں کراچی کے کینٹ اسٹیشن پر اتر گیا۔ یہ شہر میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میری سگی خالہ یہاں رہتی تھیں۔ کئی برس پہلے میں ان سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس وقت بھی انہی کے گھر جا رہا تھا۔ جب تک اپنے رہنے کا الگ بندوبست نہیں کر لیتا مجھے انہی کے ساتھ رہنا تھا۔
دن کا وقت تھا۔ مجھے مکان ڈھونڈنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ آنے سے پہلے انہیں بذریعہ تار خبر کر دی تھی لہٰذا میرا آنا ان کے لیے اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھیں۔ خالو آفس گئے ہوئے تھے۔ ان کی بیٹی صاعقہ کالج گئی ہوئی تھی لیکن میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی وہ آگئی۔ میں اسے کئی سال بعد دیکھ رہا تھا۔ اب وہ بالکل بدل چکی تھی۔ میری سوچ سے زیادہ خوبصورت تھی بلکہ جب میں نے دل ہی دل میں تسنیم اور نازو سے اس کا مقابلہ کیا تو وہ ان دونوں سے زیادہ خوبصورت نظر آئی۔
میں خالہ کے یہاں رہ رہا تھا۔ لیکن دو ایسے تجربوں سے گزرا تھا کہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اتنا موقع ہی نہیں دے رہا تھا کہ صاعقہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرے۔ وہ بے چاری مجھے اپنا خالہ زاد سمجھ کر چاہتی تھی کہ میں اس سے باتیں کروں۔ اس کے ساتھ گھومنے جاؤں اور میرا حال یہ تھا کہ میں آفس سے آنے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔ شام ہوتی تو چپکے سے باہر نکل جاتا۔ واپس آکر سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاتا۔ جب تک سب بیٹھے رہتے میں باتیں کرتا رہتا لیکن جونہی خالہ اور خالو ادھر ادھر ہوتے مجھے محسوس ہوتا کہ صاعقہ ابھی مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔ میں بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔ میری اس کیفیت کو صرف صاعقہ نے ہی نہیں خالہ نے بھی بھانپ لیا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے عجیب انداز میں بات کی۔ ”بیٹا، کیا تم کچھ بیمار ہو؟“
”نہیں تو خالہ جان ۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ میں تو اچھا بھلا ہوں۔“
”پھر ہم بیمار ہوں گے۔“
”میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“
”بیٹا جب سے آئے ہوں کمرے میں بند پڑے رہتے ہو۔ کوئی کرایہ دار بھی ہوتا ہے تو بیٹھ کر دکھ سکھ کی دو باتیں کر لیتا ہے۔ صاعقہ تمہاری ہم عمر ہے۔ تم نے اس سے یہ تک نہیں پوچھا کہ کہاں پڑھتی ہو کس کلاس میں ہو۔“
”اوہ خالہ جان، میں اب سمجھا۔ اماں بھی میری اس عادت سے پریشان رہتی ہیں۔ لڑکیوں کو دیکھ کر مجھ پر ایسی شرم طاری ہو جاتی ہے کہ میں کوئی بات نہیں کر پاتا۔“
”یہ بیماری ہی تو ہے بیٹا۔ اسے دور کر۔ لڑکوں کو اتنی شرم زیب نہیں دیتی۔ صاعقہ تو یہ سمجھنے لگی ہے کہ تم ہم لوگوں

گیلیلیو، نیٹ ورک

یورپی خلائی سیاروں کا عالمی نیٹ ورک۔ یہ منصوبہ 2007ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور اس پر یورپی یونین کا ۱۰ء۱ ارب یورو خرچ ہوا۔ اس میں تیس سیارے شامل ہیں اور منصوبے کی تکمیل پر یورپی یونین کی خلائی صنعت کو فروغ حاصل ہوا اس منصوبہ کی منظوری مارچ 2002ء میں دی گئی تھی۔

شہاب 3
(Shahab-III)

ایران کے براعظمی میزائلوں کا ایک سلسلہ اس سلسلے کا شہاب 3 میزائل مئی 2002ء میں چھوڑا گیا یہ اسرائیل کے علاوہ سعودی عرب، ترکی اور افغانستان میں تعینات امریکی فوج کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ 810 میل کی دوری پر مار کر سکتا ہے۔
ایران نے اگست 2004ء میں درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے شہاب تھری میزائل کا کامیاب تجربہ کیا۔ میزائل کی رینج 2500 میٹر تھی۔ جب کہ یہ اپنے ساتھ ایک ہزار کلو گرام وار ہیڈ لے جانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ 2012ء میں شہاب 7 کا تجربہ کیا گیا جس نے امریکی ٹیکنولوجی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

مرسلہ: ارباز خان، سیالکوٹ

کو اچھا نہیں سمجھتے۔"

"کمال کرتی ہیں آپ بھی اگر اچھا نہیں سمجھتا تو میں یہاں آ کر ٹھہرتا ہی کیوں۔"

اس دن صاعقہ کالج سے آئی تو میں بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر وہ کچھ خفا کچھ حیران سی تھی اور پھر ایسی شیشے میں اتری کہ شام ہوگئی اور وہ میرے کمرے میں تھی۔

"کب تک کمرے میں بند بیٹھے رہیں گے کہیں باہر گھومنے چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور وہ خوش ہوگئی۔ خالہ جان سے اجازت لی اور ہم باہر چلے گئے۔

بہت آسان لڑکی تھی لیکن میں پچھلی کہانیوں کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس نئی کہانی کو صرف گھومنے پھرنے تک محدود رکھا۔ ایک ہی گھر میں تھے لہٰذا باتیں کرنے کا موقع خوب مل جاتا تھا۔

روز کا معمول ہوگیا تھا کہ ہم کہیں نہ کہیں گھومنے نکل جاتے تھے۔ اس رات واپس آئے تو معلوم ہوا اماں اور ابو لاہور سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کا اس طرح اچانک آجانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ بات میں نظر انداز نہیں کرسکتا تھا کہ میرے آنے کے بعد لاہور میں کیا ہوا ہوگا۔ میں نہایت مودب بن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن ان کے چہرے پر خفگی کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ ابو تو شاید اتنے ناراض تھے کہ مجھے دیکھتے ہی باہر نکل گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب یہ لوگ اتنے ناراض ہیں تو یہاں آئے ہی کیوں ہیں۔ میں اس انتظار میں تھا کہ موقع ملے تو میں اماں سے معلوم کروں کہ بات کیا ہے۔ صاعقہ بھی حیران تھی کہ بات کیا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی اور میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ نہ اس کے پاس جواب تھا نہ میرے پاس۔

خالہ جان اور اماں کمرے میں بند ہوگئی تھیں۔ نہ جانے کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے دل میں چور تھا لہٰذا میرا خیال تسنیم اور نازو کی طرف گیا تھا۔

دوسرے دن میں سو کر اٹھا تو پورا گھر سو رہا تھا۔ صاعقہ کالج جانے کی تیاری کررہی تھی کہ میں اس کے پاس چلا گیا۔ "صاعقہ یہ تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔"

"ہمارے گھر میں تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تمہاری اماں غالباً کوئی ایسی خبر لائی ہیں جس نے پورے گھر کو پریشان کردیا ہے۔"

"تم خالہ جان سے پوچھتیں تو۔"

"تم کیوں نہیں پوچھ لیتے۔"

"ان دونوں کو باتوں سے فرصت ملے تو کچھ پوچھوں۔ ابو ہیں، وہ بالکل چپ ہیں۔"

"تو پھر انتظار کرو۔ میں تو چلی کالج۔"

وہ چلی گئی۔ پہلے میں نے سوچا کہ چھٹی کرلوں لیکن پھر یہ سوچ کر دفتر چلا گیا کہ گھر میں رہا تو نہ جانے کیا بات نکل آئے۔

دفتر سے واپس آیا تو اماں اور خالہ جان پھر سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسی کیا باتیں ہیں جو ختم ہونے میں نہیں آرہی ہیں۔ جی تو یہی چاہا کہ اسی وقت اماں سے پوچھوں کہ میرے خلاف کیا سازشیں ہو رہی ہیں لیکن میں کچھ بھی نہ پوچھ سکا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ صاعقہ بھی نظر نہیں آرہی تھی کہ اس سے کچھ پوچھتا۔ ابھی مجھے کمرے میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میرے کمرے کے سامنے کچھ آہٹ محسوس ہوئی۔ پھر کچھ آوازیں آئیں۔ اماں کی آواز صاف پہچانی جارہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ میں بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے خالہ جان بھی آگئیں۔

"بیٹا، تمہیں معلوم ہے میں لاہور سے کراچی کیوں آئی ہوں۔"

"آپ کی بہن کا گھر ہے۔ آئی ہوں گی ان سے ملنے یا پھر مجھے دیکھنے۔"

"آئی تو میں تم سے بات کرنے تھی لیکن یہاں آکر ایک اور ہی بات سوجھی ہے۔ ہم تمہاری شادی کررہے ہیں۔"

"ارے اماں اتنی سی بات تھی جس کے لیے آپ تین دن سے پریشان ہیں۔ میں تو آپ سے بات کرنے کے لیے ترس گیا ہوں۔"

"سوچنا تو پڑتا ہے اور پھر تمہاری خالہ سے بھی بات کرنی ضروری تھی۔"

"اماں مجھے شادی سے انکار نہیں ہے۔ لیکن ابھی مجھے کراچی آئے ہوئے صرف دو مہینے ہوئے ہیں۔ کچھ دن اور یہاں گزار لوں۔ اس کے بعد لاہور ٹرانسفر کرالوں گا۔ پھر آپ آرام سے شادی کردیجیے گا۔"

"شادی کے لیے لاہور آنے کی کیا ضرورت ہے جب لڑکی یہیں اسی گھر میں موجود ہے۔ میں نے تمہاری خالہ سے بات کرلی ہے۔ صاعقہ سے بھی پوچھ لیا ہے۔

اور سن لو یہ کام مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر کرنا ہے۔"

میں خالہ کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکا تھا لیکن بعد میں اماں سے ضرور پوچھا تھا کہ انہیں آخر ایسی جلدی کیا ہے۔

اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا اسے سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میرے آنے کے بعد محلے میں خوب شور مچا تھا۔ تسنیم نے اماں کو سب کچھ بتادیا تھا۔ اس نے اماں کو وہ خط بھی دکھا دیے تھے جو میں نے کبھی نازو کو لکھے تھے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ایک طرف میں نے اس سے وعدے کیے دوسری طرف نازو کو دھوکے میں رکھا اور دونوں کو دھوکا دے کر کراچی چلا گیا۔ اماں تو اس پر بھی تیار ہوگئی تھیں کہ تسنیم سے میری شادی کرادیں لیکن ابو تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا ایسی لڑکیاں بہو بنا کر گھر میں لانے کے لائق نہیں ہوتیں۔ وہ اماں ... کو لے کر نہایت غصے میں کراچی آئے تھے تاکہ میری سرزنش کرکے میری کہیں شادی کرادیں تاکہ دونوں لڑکیوں کا خیال میرے دل سے نکل جائے یا وہ لڑکیاں مایوس ہوجائیں۔ یہاں آکر انہوں نے صاعقہ کو دیکھا اور میرے لیے پسند کرلیا۔

اپنے گناہ کی داستان سننے کے بعد میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ شادی سے انکار کرتا۔ مجھے نہ تسنیم سے محبت تھی نہ نازو سے بلکہ اب تو صاعقہ میرے دل میں اتر چکی تھی اور بغیر مانگے مل رہی تھی۔ میں فوراً تیار ہوگیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میری شادی صاعقہ سے ہوگئی۔

میری شادی کو چھ مہینے اور مجھے کراچی آئے آٹھ مہینے ہوئے تھے کہ میرا ٹرانسفر ایک مرتبہ پھر لاہور کردیا گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ٹرانسفر رکوالوں لیکن مجھے کامیابی نہ ہوسکی۔ میں لاہور جاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تسنیم کی شادی محلے کے ایک لڑکے کے ساتھ ہوگئی ہے۔ وہ محلے میں ہی تھی لیکن ظاہر ہے شادی کے بعد اس کی زبان بند ہوجانی تھی۔ نازو تو رو دھو کر چپ رہ جانے والی لڑکی تھی۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اب صاعقہ کے ساتھ لاہور جا کر رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اماں اور ابو بھی وہاں اکیلے تھے۔ لہٰذا میں نے سامان سفر باندھ لیا۔

لاہور پہنچ کر میں جیسے ہی اپنے گھر پہنچا محلے میں شور مچ گیا کہ شاہد کی دلہن آئی ہے۔ محلے کی عورتیں دیکھنے کے لیے آنے لگیں۔ میری آنکھیں تسنیم کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ نظر نہیں آئی۔

ایک روز میں صاعقہ کے پاس بیٹھا تھا کہ اماں کمرے میں آئیں۔ "نازو اور اس کی اماں آئی ہیں۔ تم ذرا دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔"

نازو کا نام سنتے ہی میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ کیوں آئی ہے۔ کہیں صاعقہ کو سب کچھ بتا ہی نہ دے مگر یہ سوچ کر اطمینان ہوگیا کہ اس کی ماں بھی اس کے ساتھ ہے۔

میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تنہائی ملی تو نازو کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات یاد آنے لگے۔ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے مجھے اس سے محبت ہے۔ ایسی محبت جس سے میں خود بے خبر تھا۔ اور آج اچانک یہ جذبہ بے دار ہوگیا ہے۔ کتنے دن ہوگئے تھے اسے دیکھے ہوئے۔ میں ایسی جگہ بیٹھ گیا کہ نازو کمرے سے نکلے تو میں اسے دیکھ سکوں۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ باہر آئی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی لیکن میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھ سے جدا ہونے کا دکھ تھا یا صاعقہ کے آنے کا ملال؟

وہ چلی گئی اور مجھے یوں لگا جیسے گھر کے تمام لوگ چلے گئے ہیں۔ میں صاعقہ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ دل میں سوچ رہا تھا اب نہ جانے کب نازو کا دیدار نصیب ہو۔

دوسرے دن میں دفتر سے آیا تو صاعقہ نے مجھے بتایا کہ نازو آئی تھی۔ "بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے تو اس نے بہن بنالیا ہے۔ کہتی تھی وہ روز مجھ سے ملنے آیا کرے گی۔"

مجھے معلوم ہوتا رہا کہ نازو آئی تھی۔ وہ ایسے وقت آتی تھی جب اسے معلوم ہوتا تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں گا۔ ایک دن میں جان بوجھ کر دفتر سے جلدی آگیا۔ وہ صاعقہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی لیکن مجھے سلام کرکے سر جھکا لیا۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر وہاں سے اٹھ گیا لیکن باہر ٹہلتا رہا کہ نازو نکلے گی تو اس سے بات کروں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے آنے کے بعد وہ جلدی جانے کا سوچے گی۔ وہی ہوا، فوراً باہر آئی لیکن مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"نازو میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اب بات کرنے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔"

"میں شادی پر مجبور کردیا گیا تھا۔ اتنی فرصت بھی نہ مل سکی کہ تمہیں بتاتا۔"

"مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہ سب تو قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ میں نے صاعقہ کو بہن بنالیا ہے۔ اس کے بہانے آپ کو دیکھنے کے لیے آتی رہوں گی۔

اس سے زیادہ مجھ سے امید نہ رکھنا۔'' اس نے کہا اور آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گئی۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس بھی ہوا تھا اور یہ فخر بھی ہوا تھا کہ وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میری خاطر صاعقہ کو خوش رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اب وہ روز آنے لگی تھی۔ میری موجودگی میں بھی اور میری غیر حاضری میں بھی۔ تسنیم بھی اسی محلے میں تھی لیکن وہ اب تک نہیں آئی تھی۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہی آئی کہ اس کی شادی ہو گئی تھی اور خفا تو وہ یقیناً ہوگی۔ یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ اس کی خاموشی کہیں کوئی بڑا طوفان نہ کھڑا کر دے۔ ایک دن میری یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ ایک دن میں اماں کے پاس بیٹھا تھا کہ وہ آگئی۔ وہ مجھ سے پردہ تو کرتی ہی نہیں تھی اس لیے میں بیٹھا رہا۔ اماں کو بھی اسے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

''اری بے وفا، تو اب آئی ہے۔ مجھے مبارک باد دینے بھی نہیں آئی۔''

''اماں سچی بات یہ ہے کہ میں خفا تھی کہ آپ نے کراچی جا کر شاہد بھائی کی شادی کر دی۔ شادی اگر یہاں ہوتی تو میں شریک تو ہو جاتی مگر سچی بات یہ بھی ہے کہ میں زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتی میری اچھی خالہ اب میں آتی رہوں گی۔''

''تیرا گھر ہے روز آجایا کر۔''

''بس شاہد بھائی کی دلہن سے ڈر لگتا ہے۔ وہ نہ جانے کیا سمجھیں۔''

''کیا سمجھے گی۔ آ میں تجھے اس سے ملواؤں۔'' تسنیم تو تھی ہی باتوں کی جادوگرنی۔ ایک مرتبہ صاعقہ سے ملی تو اسے اپنا گرویدہ کر لیا۔

تسنیم کے آجانے کے بعد میرے کمرے میں بہار آگئی۔ اب اکثر نازو اور وہ ساتھ آتی تھیں۔ صاعقہ کو بیٹھے بٹھائے دو اچھی بہنیں نصیب ہو گئی تھیں۔ وہ میرے ماضی سے بے خبر ان دونوں کی آؤ بھگت میں لگی رہتی تھی۔ میں نے بھی ہنسی مذاق پھر سے شروع کر دیا تھا۔

میرے کمرے میں ہر وقت قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ پھر یہ قہقہے آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگے۔ صاعقہ بیمار رہنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ چند قدم چلتی تو سانس پھولنے لگتی۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن کسی کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نازو اور تسنیم برابر اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھیں۔ میں ان کا شکر گزار تھا۔

جب ڈاکٹروں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اماں کو شک ہوا کہ کسی نے کچھ کرا دیا ہے۔ مختلف عاملوں کے پاس جانا پڑا۔ جھاڑ پھونک ہوتی رہی۔ تعویذ گھول گھول کر پلائے جاتے رہے۔ جس کی جو سمجھ میں آرہا تھا وہ کر رہا تھا لیکن صاعقہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔

اس رات صاعقہ کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ ہم دونوں برابر برابر چارپائیاں بچھائے لیٹے ہوئے تھے کہ اس نے نحیف آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ''شاہد، ایک بات کہوں۔''

''کہو۔''

''آپ مجھے کراچی لے جائیں۔''

''وہ کیوں؟''

''وہاں کم از کم میرا علاج تو ہو جائے گا۔''

''علاج کیا یہاں نہیں ہو سکتا اور ہو ہی رہا ہے۔''

''شاہد میرا علاج کوئی نہیں ہے۔ میں اپنوں میں مرنا چاہتی ہوں۔''

''یہاں کیا اپنے نہیں ہیں۔''

''اگر آپ نہیں جا سکتے تو مجھے ٹرین میں بٹھا دیں۔ میں پہنچ جاؤں گی۔''

''اچھا سوچوں گا، ابھی تو سو جاؤ۔''

''شاہد اب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ آپ سوچتے رہیں۔''

''دفتر سے چھٹی لینی پڑے گی۔ کل جا کر درخواست دیتا ہوں۔''

دوسرے دن میں یہی سوچ کر دفتر گیا تھا کہ چھٹی کی درخواست دوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میرا تبادلہ ایک مرتبہ پھر کراچی ہو گیا تھا۔ احکامات آئے رکھے تھے۔ یہ کیسا اتفاق تھا۔ آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میں ایک مرتبہ پھر اپنی روانگی کی خبر کو صیغہ راز میں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے صاعقہ اور اماں کو یہ بتایا کہ میں چھٹی لے کر کراچی جا رہا ہوں اور صاعقہ کو چھوڑ کر واپس آجاؤں گا صاعقہ یہ خبر سنتے ہی خوش ہو گئی کہ وہ کراچی جا رہی ہے۔ نازو اور تسنیم آئیں تو ان تک بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ انہیں غالباً یہ خوشی ہو رہی تھی کہ میں صاعقہ کو چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔ تسنیم نے تو منہ بھر کے کہہ بھی دیا تھا کہ شاہد، تم فکر مت کرو، صاعقہ یہاں نہیں ہوگی تو تمہاری دیکھ بھال میں کروں گی۔ نازو البتہ اداس تھی کہ اب وہ کس بہانے سے یہاں آیا کرے گی۔

میں ان دونوں کو دم دلاسے دے کر کراچی چلا آیا۔ ہم کراچی پہنچے۔ صاعقہ کی حالت دیکھ کر خالہ جان حیران رہ گئیں۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے اندر سے گھل گئی ہو۔ اس کے لیے چند منٹ بیٹھنا دشوار تھا۔ ہلکی ہلکی حرارت ہر وقت رہتی تھی۔

یہ بڑا شہر تھا۔ علاج کے وسائل بہت تھے۔ علاج پر اٹھنے والی رقم کے لیے خالہ کا سہارا بھی تھا۔ میں صاعقہ کو ایک بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ مختلف قسم کے ٹیسٹ ہوئے۔ رپورٹس آئیں تو ڈاکٹر نے مجھ سے کچھ سوال کرنے ضروری سمجھے۔ ''مسٹر شاہد، اس کیس کی تہ تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ مجھ سے تعاون کریں۔''

''میں حاضر ہوں ڈاکٹر صاحب، میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح میری بیوی ٹھیک ہو جائے۔''

''شادی آپ کی مرضی سے ہوئی تھی۔''

''جی نہیں، والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ مجھ سے پوچھا ضرور گیا تھا۔''

''آپ کے اپنی بیوی سے تعلقات کیسے ہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی ناچاقی تو نہیں رہتی۔''

''ڈاکٹر صاحب، بیوی مجھے ایسی ملی ہے کہ ناچاقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''پھر کمال ہے۔'' ڈاکٹر نے اپنا چشمہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور کچھ سوچنے لگا۔

''کیا ہوا ڈاکٹر صاحب، خیریت تو ہے۔ رپورٹس میں کیا آیا ہے۔''

''آپ یہ بتائیے۔'' ڈاکٹر نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے عزیزوں میں کوئی شخص ایسا ہے جو اس شادی کا مخالف ہو۔''

''میرے خیال میں تو کوئی ایسا نہیں، سب لوگ خوش ہونے والے ہیں لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

''اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کی بیوی کو سلو پائزن دیا جا رہا ہے۔ کون دے رہا ہے یہ جاننا آپ کا کام ہے۔''

''سلو پائزن...!'' میں تقریباً چیخ اٹھا تھا۔

''جی ہاں... اور اگر یہ سلسلہ نہیں رکا تو آپ کی بیوی زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہیں گی۔''

''اس کا کوئی علاج؟ ڈاکٹر صاحب میری بیوی کو بچا لیجے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے، میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

''حوصلہ رکھیے۔ علاج ممکن ہے لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی اب ان کی غذا میں زہر نہ ملائے۔ آپ انہیں فوری طور پر داخل کرا دیں۔ ان کا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے اور کوشش کریں کہ ان سے ملنے آپ کے سوا کوئی نہ آئے۔''

میرے ذہن میں تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ کون ہو سکتا ہے جو صاعقہ کو زہر دے رہا ہے۔ اچانک دو نام میرے ذہن میں گونجے۔ نازو اور تسنیم یا پھر دونوں مل کر۔

میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ لیکن میں ان ناموں کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے صاعقہ کو ڈاکٹر کی ہدایت کا مطابق اسپتال میں داخل کرا دیا۔

اس کا علاج ہوتا رہا اور صرف ایک ماہ بعد وہ صحت یاب ہو کر گھر آگئی البتہ کمزوری دور ہونے میں چند ماہ اور لگ گئے۔ وہ اپنے ماں باپ کی چھاؤں میں تھی۔ اس تبدیلی نے بھی اس کی صحت پر بہت اچھا اثر ڈالا۔

اب مجھے صاعقہ کو بیماری سے نہیں تسنیم اور نازو سے بچانا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کراچی میں مستقل رہائش اختیار کر لوں گا۔ میں نے ابو کو لکھ دیا کہ وہ لاہور کا مکان بیچ کر کراچی آجائیں۔ ہم ان پیسوں سے یہاں کوئی چھوٹا سا مکان خرید لیں گے۔

ابو اس پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں کراچی بلوایا اور تمام باتیں بتائیں۔ وہ بضد تھے کہ نازو اور تسنیم کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرائیں گے لیکن میں نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

''عدالت ثبوت مانگتی ہے۔ ہمارے پاس ثبوت کوئی نہیں ہوگا۔ الٹے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

یہ بات ابو کی سمجھ میں آگئی۔ وہ لاہور گئے اور مکان بیچ کر کراچی آگئے۔ کچھ رقم خالہ نے ملائی اور میں نے ایک مکان خرید لیا۔

اس واقعے کو تیس سال گزر چکے ہیں۔ میری بیوی میرے ساتھ صحت مند زندگی گزار رہی ہے۔ میرے بچے جوان ہو چکے ہیں اور برسر روزگار ہیں۔

نازو اور تسنیم کبھی کبھی یاد ضرور آتی ہیں۔ لیکن اب یہ یادیں نفرت کے زہر میں ڈوب چکی ہیں۔

میں نے ان دونوں کو دل سے معاف کر دیا ہے کیونکہ قصوروار تو میں بھی تھا۔

☐

خواب عذاب

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم،
میں نے اپنا نام مخفی رکھ کر ایک ایک بات لکھ دی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ دیگر قارئین بھی سبق حاصل کریں اور سمجھ لیں کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور کچھ لوگ استاد کے معزز پیشے پر بھی کالک پھیرنے کے لیے کالی بھیڑ بننے میں کوشاں ہیں۔
فوزیہ
(کراچی)

یونیورسٹی میں پڑھنا میرا پرانا خواب تھا۔ اتنا پرانا کہ جب میں اسکول میں تھی اور شاید ساتویں یا آٹھویں میں تھی جب میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یونیورسٹی میں ضرور پڑھوں گی اور میں نے اپنے ارادے کا سرعام اعلان بھی کر دیا۔ سرعام سے مراد امی اور دادی امی کے سامنے اعلان کر دیا تھا۔ بہ قول ثریا آپا کے امی اور دادی کے سامنے کوئی بات کرنے کا مطلب ہے سرعام بات کرنا کیونکہ وہ اس میں کوئی نہ کوئی مین میخ نکال کر اسے سارے گھر کے سامنے الم نشرح کر دیتی ہیں۔ بھی ماشاءاللہ خاصا بڑا ہے۔ یعنی کوئی ڈیڑھ درجن افراد پر مشتمل ہے اور اسی تناسب سے بے عزتی بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ابو دادا دادی کے اکلوتے بیٹے ہیں اور امی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ نانا نانی تو امی ابو کی شادی کے پانچ سال بعد ہی یکے بعد دیگرے گزر گئے تھے۔ اس کا دکھ امی کو تیس سال گزر جانے کے بعد کم نہیں ہوا تھا اور آج بھی وہ کبھی دکھی ہوتیں تو آہیں بھر بھر کر میکے کو یاد کرتی تھیں۔ سوائے مہینے کی پہلی دو تاریخوں کے، کیونکہ ان دنوں دادا اور دادی امی کے ماں باپ بن جاتے ہیں۔ ہے تو ہنسنے والی بات۔ ہوا یوں کہ جب نانا بھی اس دنیا سے گزر گئے اور امی اپنا میکہ نہ رہنے پر تڑپ تڑپ کر روئیں تو دادا اور دادی کو اپنی اکلوتی بہو کا غم ایسا لگا کہ انہوں نے امی سے کہا۔ ”تم ہمیں اپنے ماں باپ سمجھو۔“

”کیسے سمجھوں۔“ امی نے روتے ہوئے کہا۔ ”آپ دونوں تو ساس سسر ہیں۔“

اس پر دادی امی نے تجویز پیش کی۔ ”اچھا ایسا کرو تم ہر مہینے کے دو دن یوں سمجھا کرو کہ اپنے میکے میں آئی ہو اور اس دن ہم تمہارے ماں باپ ہوں گے۔“

پتا نہیں کیا بات تھی امی کے دل کو یہ تجویز بھا گئی اور یوں طے ہوا کہ ہر مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کو امی دادی اور دادا والے حصے میں چلی جائیں گی اور اس دن ان کو بہو نہیں بلکہ بیٹی سمجھا جائے گا۔ اس بات کو تیس سال ہونے کو آئے ہیں۔ اب تو امی بھی ساٹھ کی ہونے والی ہیں لیکن دادا دادی اللہ ان کو ہمارے سروں پر قائم رکھے اسی طرح یہ دو دن مناتے ہیں اور مزے کی بات ہے کہ امی بالکل بیٹیوں کی طرح جا کر ان کے پاس رہتی ہیں۔ ان سے سسرال کے شکوے اور شکایتیں بھی کر لیتی ہیں۔ شروع میں ابو تو اسے

مذاق ہی سمجھے تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ قائل ہو گئے کہ امی، دادی اور دادا اس معاملے میں بالکل سنجیدہ ہیں۔

ہر ساس بہو کی طرح شادی کے شروع دنوں میں امی اور دادی امی میں کچھ کھٹ پٹ ہوئی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اور پھر اس معاہدے کی وجہ سے یہ کھٹ پٹ اب باہمی الفت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بہ قول عاصم بھائی کے بھارت اور چین کا امریکا کے خلاف اتحاد ہو گیا تھا۔ امریکا سے ان کی مراد امی اور ابو کی آل اولاد تھی۔ امی ابو نے شاید شادی کے شروع دن ہی تہیہ کر لیا تھا کہ ان کی اولاد کو بہن بھائیوں کے حوالے سے کبھی کوئی محرومی برداشت نہیں کرنا پڑے گی اور اکلوتے پن کا عذاب سہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے شادی کے چار سال میں پہلے تین بیٹے عاصم، محسن اور صمیم پیدا ہوئے۔ کہاں تو دادی جان شادی سے پہلے پوتے کھلانے کے لیے تڑپ رہی تھیں اور جب تین عدد پوتے ملے تو بوکھلا گئیں کیونکہ آدھے ان کو سنبھالنے پڑتے تھے۔

دو سال کے وقفے کے بعد امی نے کمر ہمت باندھی اور اس بار لگاتار تین بیٹیاں ہوئیں۔ ثریا آپا، ماریا باجی اور مونا آپی کی پیدائش کے وقت تک سب عادی ہو چکے تھے اس لیے پہلے والی ہڑبونگ نہیں مچی۔ البتہ گھر مچھلی بازار کا منظر پیش کرتا تھا۔ بہ قول عاصم بھائی میرا بچپن تو تم بہن بھائیوں کا واویلا سنتے ہوئے گزرا ہے۔ مجال ہے جو سکون کا ایک لمحہ بھی مل جاتا ہو۔

دادی امی نے امی سے صاف کہہ دیا کہ بی بی بس کرو اب ان کی بوڑھی ہڈیوں میں دم نہیں رہا ہے۔ ان کے مطالبے پر امی بادل ناخواستہ کچھ مانی تھیں لیکن جیسے ہی مونا آپی اسکول میں داخل ہوئیں تو ہمارے گھر میں نئی بہاریں آنے لگیں۔ پہلے صمد پیدا ہوا، پھر شازیہ، اس کے بعد مزمل اور سب سے آخر میں مابدولت کی تشریف آوری ہوئی۔ سنا ہے مجھے دیکھ کر دادی جان بلبلا گئی تھیں کہ ان کے اکلوتے بیٹے کو اب پانچ پانچ بیٹیاں رخصت کرنا پڑیں گی۔ لیکن اس سے پہلے وہ امی کو کچھ کہتیں۔ قدرت کی طرف سے فل اسٹاپ لگا دیا گیا۔ میرے بعد ڈاکٹر نے امی سے کہہ دیا کہ بعض وجوہات کی بنا پر وہ اب ماں نہیں بن سکیں گی۔ یہ سن کر امی نے بھی سکون کا سانس لیا تھا کیونکہ دس بچے (بہ قول دادی امی کے وہ بھی ہم جیسے) پیدا کرنا یقیناً آسان کام نہیں تھا۔

ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میں نے یونیورسٹی میں پڑھنے

کا اعلان کن میں سبزی کاٹتی امی اور دادی امی کے سامنے کر دیا۔ اس وقت میں بارہ سال کی تھی۔ امی نے مجھے گھورا۔ ”پہلے اسکول تو پڑھ لو۔“

”اس کے بعد بھی کوئی ضرورت نہیں یونیورسٹی جانے کی۔“ دادی امی نے ٹکڑا لگایا۔ ”پتا ہے وہاں کا ماحول۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے روز یونیورسٹی جاتی ہیں۔“ میں نے تڑخ کر کہا تو دادی امی نے جھک کر جوتی اٹھالی۔

”اور تُو تو جیسے پیدا وہیں ہوئی ہے۔“

پریکٹس کے دادی امی کا ہاتھ رواں ہو گیا تھا اس لیے فرار کی کوشش کے باوجود جوتی ٹھیک کمر سے نیچے لگی۔ اس معاملے میں دادی امی بہت احتیاط کرتی تھیں کہ ان کی فائر کی ہوئی جوتی لڑکیوں کو کسی ایسی جگہ نہ لگ جائے کہ نشان پڑ جائے اور بیٹھے بٹھائے ان کی رخصتی میں ایک رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ البتہ لڑکوں کی باری میں وہ اتنی دیکھ بھال نہیں کرتی تھیں۔ کیونکہ ایک جوتی مار کر ہی دادی کا غصہ اتر جاتا تھا اس لیے جوتی کھانے والا خود ان کی جوتی واپس کرنے کا پابند بھی تھا۔ میں نے جوتی واپس کرتے ہوئے منہ بسور کر کہا۔

”کاش آپ جیسے ظالموں کے ہاں پیدا ہونے کے بجائے یونیورسٹی میں ہی پیدا ہو جاتی۔“

”بک بک کرنے کے بجائے یہ کچرا پھینکو۔“ امی نے سبزی کا کچرا مجھے تھما دیا۔ اس شام تک سب کو پتا چل گیا تھا کہ میں یونیورسٹی جانے کے لیے تیار بیٹھی ہوں اور دادی اور امی نے گربہ کشتن روزِ اول کے مصداق انکار بھی کر دیا ہے۔ اس کے باوجود میں مس یونیورسٹی مشہور ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس لقب پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ شاید خوشی ہوتی تھی لیکن جب مجھے دادی یا امی کے سامنے مس یونیورسٹی کہا جاتا تو ان کا غیظ و غضب دیکھنے والا ہوتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مس یونیورس کے کمپیٹیشن میں شامل ہونے کی بات کر رہی ہوں۔ اس کا پتا مجھے یوں چلا کہ ان دنوں نیا نیا کیبل ٹی وی آیا تھا اور عاصم بھائی نے کیبل لگوا لیا۔ اس پر ایک دن ہم سب بہنوں نے چھپ کر مس یونیورس کا مقابلہ دیکھا تھا اور ہماری آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ میں درمیان میں بھاگ گئی۔ اس لیے نہیں کہ شرم آ رہی تھی ان بے حیاؤں کو دیکھ کر بلکہ اس لیے کہ امی یا دادی میں سے کسی نے چھاپا مارا تو سب سے زیادہ شامت میری ہی آئے گی۔

میٹرک کرنے کے وقت تک یونیورسٹی کے لیے میری آرزو میں جتنی شدت آئی تھی، امی اور...... دادی کے انکار میں اس سے زیادہ ہی شدت آ گئی تھی۔ ثریا آپا ان ہی دنوں گریجویشن اور تین سال گھریلو زندگی بسر کر کے پیا دیس سدھار گئی تھیں۔ اس لیے امی اور دادی اٹھتے بیٹھتے ان کی مثالیں دیتی تھیں کہ لڑکی اور بیٹی ہو تو ایسی کہ تین سال گھر میں بیٹھی رہی اور مجال ہے جو یونیورسٹی یا آگے پڑھنے کا نام لیا ہو۔ ثریا آپا کو پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا وہ تو ابو نے وارننگ دے رکھی تھی کہ ان کے تمام بچے گریجویشن سے نیچے مت سوچیں۔ اس لیے مارے باندھے انہوں نے گریجویشن کر لیا تھا اور اس کے بعد تین سال تک انتظار کیا تب کہیں جا کر دل کی مراد بر آئی۔ اصل میں ان کو شادی کا شوق تھا لیکن یہ بات امی یا دادی کو کہنے کا مطلب گالیاں کھانا بھی ہو سکتا تھا۔

ماریا باجی کو گریجویشن کیے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ ان کا رشتہ بھی طے کر دیا گیا تھا لیکن ابھی ایک شادی ہوئی تھی اور حالات ایسے نہیں تھے کہ دوسری بھی فوراً کرتے اس لیے ان کے سسرال والوں سے ایک سال کی مہلت مانگ لی تھی اور ارادہ تھا کہ اس دوران میں مونا آپی کے لیے بھی کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر دونوں بہنوں کو ایک ساتھ ہی رخصت کر دیا جائے۔ اس کے بعد بھائیوں کی باری آئی۔ الحمدللہ میرے انٹر کرتے ہوئے یہ دونوں بھی رخصت ہوئیں اور ساتھ ہی میری شامت آ گئی۔ کیونکہ اب شازیہ کے ساتھ مجھے بھی گھر کے کاموں میں برابر کا حصہ لینا پڑتا تھا۔ کام کرنے میں مسئلہ نہیں تھا لیکن کام اور بہت ہی کام میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ شکر ہے دونوں بہنوں کی شادیاں میرے سیکنڈ ایئر کے پیپرز کے بعد ہوئی تھیں ورنہ میں تو پاگل ہو جاتی کیونکہ کام اتنا تھا کہ مجھے شازیہ نے ہوش دلایا۔ ”بی بی کیا بی اے میں داخلے کا ارادہ نہیں ہے۔“

کالج کھل چکے تھے اور میں نے نفسیات کا مضمون لیا تھا۔ اگرچہ اسے سب سے چھپانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن جیسے ہی دوسروں کو پتا چلا کہ میں نے نفسیات منتخب کیا ہے تو سب نے پیچھا لے لیا۔ نہ جانے ہمارے ہاں پبلک کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ اگر کوئی نفسیات پڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اسے ہی نفسیاتی مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا اور سب نے نفسیات کو میری چڑ بنانے کی کوشش کی لیکن میں نے ہوشیاری سے معاملے کو نظر انداز کر کے پبلک کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور جب کوئی اس حوالے سے طنز کرنے کی کوشش کرتا تو یوں بن جاتی جیسے کہا ہوا سر سے گزر گیا ہو۔ اس پر صمد نے پیش گوئی کی تھی کہ میں ڈھٹائی کے مضمون میں یقیناً کوئی مقام حاصل کر لوں گی اور شازیہ کا کہنا تھا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ امی ابو کے لیے مٹی کا جو کوٹا مخصوص تھا وہ میری باری آنے تک تقریباً ختم ہو گیا تھا اور فرشتوں کو مقدار پوری کرنے کے لیے چکنی مٹی شامل کرنا پڑی تھی۔ مجھے جواب تو سب کو دینا آتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سب سے چھوٹی تھی اور اگر جھگڑا صرف ایک سال بڑے مزمل سے بھی ہوتا تو قصور وار ہمیشہ اسی بندی کو ٹھہرایا جاتا تھا۔

میرے انٹر میں اتنے اچھے نمبر آئے کہ میں نے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔ اس پر ابو نے خوش ہو کر مجھ سے کہا۔ ”کہو بیٹا آپ کو کیا چاہیے؟“

اس وقت میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ابو میں یونیورسٹی جانا چاہتی ہوں۔“

یہ سن کر ابو سوچ میں پڑ گئے تھے کیونکہ گھر میں مالی وسائل محدود تھے اور مسائل ان سے زیادہ ہی تھے۔ عاصم بھائی اور ان کے بعد محسن بھائی بالترتیب گریجویشن اور ماسٹر کر کے ملازم ہو گئے تھے لیکن ان کی تنخواہیں ابھی اتنی نہیں تھیں۔ وہ بس ایک طرح سے اپنا خرچ ہی پورا کر رہے تھے۔ بہنوں کی شادی کا سارا بوجھ ابو نے اٹھایا تھا اور اب صمیم بھائی آئی بی اے سے ایم بی اے کر رہے تھے۔ اس کا خرچ بھی خاصا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابو کا ہاتھ تنگ تھا اور یونیورسٹی کی تعلیم خرچ مانگتی ہے۔ لیکن میں نے اس کا حل بھی پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ شام کے وقت میں محلے کے کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی اور اس سے جو رقم ملتی تھی وہ میں جمع کرتی جا رہی تھی اس لیے مجھے یونیورسٹی کے دوسرے اخراجات کی کوئی فکر نہیں تھی ابو کو بس فیس جمع کرانی تھی۔ لیکن میں نے یہ بات ابو سے نہیں کہی کہ ان کو برا نہ لگے۔ اگر وہ اجازت دے دیتے تو میں بعد میں خود ان سے سوائے فیس کے اور کچھ نہ لیتی۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد ابو نے سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے میری بچی لیکن ایک شرط ہے تمہیں بی اے میں بھی اسی طرح ٹاپ کرنا ہوگا۔“

میں خوش ہو گئی تھی۔ ”ٹھیک ہے ابو میں اپنی جان لڑا دوں گی۔“

”بیٹے انسان کے لیے سب سے اہم چیز جان ہوتی ہے کیونکہ دوسری چیزیں ہوں یا نہ ہوں انسان کو اتنا فرق نہیں پڑتا ہے لیکن جان اور صحت نہ ہو تو بہت فرق پڑ جاتا ہے۔“

”اس کی تو آپ فکر ہی مت کریں ابو۔“ میں نے مستعدی سے کہا۔ ”مجھے اپنی صحت کی کتنی فکر ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آج کل دادی اور امی کا زیادہ وقت میری نگرانی میں گزرتا ہے کہ میں چھپ کر کچھ کھا تو نہیں رہی۔“

ابو مسکرا دیے تھے۔ میں ان دنوں واقعی کسی قدر موٹی اور اپنی عمر سے بڑی لگنے لگی تھی۔ امی اور دادی اس وجہ سے بھی ہول جاتی تھیں کیونکہ ابھی تو ابو بڑی بہنوں کی شادیوں پر لیا ہوا قرض اتار رہے تھے۔ میری شادی کا ابھی پانچ سال تک کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت تک صمیم بھائی ایم بی اے مکمل کر کے کہیں اچھی ملازمت حاصل کر سکتے تھے۔ عاصم بھائی اور محسن بھائی کی تنخواہیں بھی ٹھیک ہو جاتیں۔ مگر فی الحال مالی حالات ٹائٹ چل رہے تھے۔

ابو سے اجازت ملنے کی خوشی اپنی جگہ تھی لیکن ابھی امی اور دادی کا مرحلہ باقی تھا۔ حسب توقع جیسے ہی یہ معاملہ ان کے علم میں آیا انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ امی نے ابو سے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کتنی مشکل سے گھر کا خرچ چل رہا ہے اور آپ نے اسے یونیورسٹی میں پڑھنے کی اجازت دے دی۔ پتا ہے یونیورسٹی میں پڑھائی کے کتنے خرچ ہوتے ہیں۔“

”معلوم ہے لیکن اس سے میں نے خود انعام دینے کو کہا تھا اور اب اس نے یونیورسٹی میں پڑھنے کی اجازت مانگی ہے تو میں انکار کر دوں اور جہاں تک اخراجات کی بات ہے تو جیسے دوسروں بچوں پر ہو رہے ہیں اسی طرح اس پر ہوں جائیں گے۔ دینے والا اللہ ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں بھی تو اپنے حالات دیکھنے چاہئیں۔“

”آپ کو حالات صرف فوزیہ کی باری میں یاد آ رہے ہیں۔ یہ بات آپ نے صمیم کے لیے تو نہیں کہی جب اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلایا تھا اس کے لیے تو آپ اپنا زیور بیچنے کو تیار ہو گئی تھیں۔“ ابو کو غصہ آ گیا تھا۔

”وہ لڑکا ہے پڑھے گا تو کمائے گا۔“

”فوزیہ لڑکی ہے پڑھے گی تو اپنا گھر اچھے طریقے سے چلائے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ ابھی اس کے یونیورسٹی جانے میں کم سے کم دو سال ہیں۔ یہ قبل از مرگ واویلا کیوں؟“

”مرضی آپ کی۔“ امی نے جل کر کہا۔ ”مجھے کیا؟“ کیجیے گا خرچ۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں جب آپ کو دوسرے خرچوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا ہے تو اس خرچ پر کیوں ہو رہا ہے؟"

امی نے تو خرچ پر اعتراض کیا تھا اور درحقیقت ان کو خرچ پر نہیں اصل اعتراض میرے یونیورسٹی میں داخلہ لینے پر تھا۔ اصل ہنگامہ دادی نے کیا تھا۔ جب ان کو پتا چلا تو انہوں نے سر پیٹ لیا تھا۔ "ارے اس لڑکے کی مت ماری گئی ہے۔"

میں موقع پر موجود تھی اور حسب معمول میری زبان قابو میں نہ رہی۔ "دادی جان اول تو ابو لڑکے نہیں ہیں بلکہ خود لڑکوں والے ہیں۔"

"چپ کر.... میرا تو لڑکا ہی ہے۔" انہوں نے جلبلا کر کہا۔ "آ جائے دفتر سے تو پوچھتی ہوں۔"

"دوسرے میرے ابو بہت ذہین ہیں۔ ان کی مت بالکل بھی نہیں ماری گئی ہے۔"

"مت ہی تو ماری گئی ہے جو تجھے یونیورسٹی میں داخل کرانے جا رہا ہے۔ ارے وہ کوئی جگہ ہے لڑکیوں کے جانے کی؟"

"کیوں کیا وہاں صرف لڑکے جاتے ہیں۔ دادی جان آپ جا کر دیکھیں وہاں لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔"

"فٹے منہ ان لڑکیوں کے جو لڑکوں کے درمیان بیٹھ کر پڑھتی ہیں۔"

بالکل بھی فٹے منہ نہیں ہیں دادی جان، یہ دیکھیں اخبار میں سالانہ کانووکیشن کی تصویریں آئی ہیں۔ ایمان سے دیکھیں کتنی پیاری پیاری صورتیں ہیں۔" میں نے اخبار ان کے سامنے کر دیا۔ دادی جان نے چشمہ درست کیا اور تصویریں دیکھیں پھر بولیں۔

"ہیں تو پیاری لیکن لڑکوں میں تو گھس کر بیٹھی ہیں۔"

"دادی جان آپ کو لگ رہا ہے ورنہ اتنا گھس کر بھی نہیں بیٹھی ہیں۔" میں نے منمنا کر کہا۔ "کچھ فاصلہ ہے۔"

"ہاں بی بی ایک دو انچ کا ہوگا۔" انہوں نے طنز کیا۔ "کندھے سے کندھا اور گھٹنے سے گھٹنا مل رہا ہے۔"

"کم بختی آئی تھی جو اخبار دکھا دیا۔" میں نے دل میں سوچا اور منہ سے بولی۔ "دادی جان میں بالکل بھی ایسی تصویر نہیں کھنچواؤں گی۔"

"نہ بی بی.... بھلے تصویر مت کھنچواؤ.... لیکن لڑکوں میں بیٹھو گی تو ضرور اور ابھی تمہارے گھر والے اتنے آزاد خیال نہیں ہوئے ہیں۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "دادی جان پکا وعدہ بیٹھوں گی بھی نہیں اپنی میز کلاس کے کونے میں لگوا لوں گی۔"

اتنی منت سماجت کے بعد دادی جان کا دل بس اتنا ہی پسیجا کہ انہوں نے دفتر سے آتے ہی ابو کو پکڑ کر اپنے تخت پر بٹھا لیا اور ہم سب کو بھگا کر ان سے سرگوشیوں میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ میں اور دوسرے پوری کوشش کے باوجود نہیں سن پائے تھے۔ مجھے تو اس لیے دلچسپی تھی کہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا لیکن دوسرے چسکے لینے کے لیے اس معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سب انتظار کر رہے تھے کہ انکار ہو اور وہ اس وقت تک میری زندگی اجیرن کر کے رکھیں جب تک میں رخصت ہو کر اس گھر سے کہیں اور چلی نہ جاتی۔ امی پہلے ہی اعلان کر چکی تھیں کہ ان کا پانچ سال سے پہلے کسی لڑکی کی شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور پہلے تین بڑے بھائیوں کی شادی ہوتی اسی دوران شازیہ کو رخصت کیا جاتا اور اس کے بعد میرا نمبر آتا۔ میرے گریجویشن میں دو سال رہ گئے تھے۔ اس کے بعد سارا وقت گھر کی چکی میں پسنا پڑتا اس کے لیے میں بالکل تیار نہیں تھی اب تو بہت ضروری ہو گیا تھا کہ کالج کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے۔

جب ابو دادی کے پاس سے اٹھ کر آئے تو میں نے احمقانہ انداز میں ان سے براہ راست پوچھ لیا۔ "ابو دادی کیا کہہ رہی تھیں؟"

"بیٹے یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔" ابو نے ملائمت سے کہا۔ "یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے۔"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ ہمارے گھر میں حفظ مراتب کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اور کسی چھوٹے کی مجال نہیں تھی کہ بڑوں کے معاملے میں دخل دے۔ "سوری ابو۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔" ابو اپنے کمرے میں چلے گئے۔

کچھ پتا نہیں چلا کہ دادی امی نے ان سے کیا بات کی تھی۔ دادی سے پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ابو نے تو نرمی سے جواب دے دیا تھا وہ جوتی اٹھا لیتیں۔ امی کے تاثرات سے بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اسی ٹینشن میں بی اے کی کلاسز شروع ہو گئیں۔ میں مجبوراً سب بھول کر پڑھائی میں لگ گئی کیونکہ ابو نے کہہ دیا تھا کہ یونیورسٹی میں جانے کی شرط یہی ہے کہ میں بی اے میں بھی ٹاپ کروں یعنی کالج میں پہلے نمبر پر آؤں۔ میں جس کالج میں پڑھتی تھی وہاں ساری ہی اچھی پڑھنے والی لڑکیاں تھیں اور وہ پڑھائی میں جان بھی

ماری تھیں۔ اتنی ساری لڑکیوں میں ٹاپ کرنا آسان نہیں تھا جب کہ مجھے گھر کے بہت سارے کاموں کے ساتھ شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھانا ہوتی تھی۔ امی نے مجھ سے کہا۔ "کیوں پاگل بن رہی ہے ٹیوشن چھوڑ دے۔ کالج سے آ کر کاموں میں لگ جاتی ہے اور پھر شام کو ذرا آرام کرنے کے بجائے بچوں کے ساتھ مغز ماری کرنے لگتی ہے۔"

"اور کیا امی دیکھیں نا اس کا رنگ کتنا ہلکا پڑ گیا ہے محنت کر کے۔" شازیہ نے امی کی تائید کی۔ میں نے اسے گھورا۔

"زیادہ چالاکی مت دکھاؤ.... پتا ہے مجھے تم کس لیے اتنی ہمدردی دکھا رہی ہو۔"

شازیہ نے منہ بنایا۔ "دیکھیں امی کس طرح کہہ رہی ہے آپ کو۔"

میں نے دانت پیسے۔ "شازیہ بات مت گھماؤ۔"

میں سمجھ رہی تھی مجھ سے ٹیوشن چھڑوا کر گھر کے مزید کام مجھ پر لادنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ صفائی کرنے اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی لیکن تینوں ٹائم کا کھانا اور دوسرے ڈھیروں کام گھر کی خواتین کو ہی کرنا پڑتے تھے۔ صبح ناشتا شازیہ بناتی تھی کیونکہ بی اے کر چکی تھی اور اس بات پر بہت جلتی تھی کہ میں صبح مزے سے تیار ہو کر کالج چلی جاتی تھی اور اسے پورے گھر کے لیے ناشتا بنانا پڑتا تھا۔ گیارہ افراد کا ناشتا بنانا آسان کام نہیں تھا لیکن شازیہ چند مہینے سے ہی کر رہی تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ بھی کالج جاتی تھی اور امی ناشتا بناتی تھیں۔ اس لیے جب وہ مجھ سے کچھ کہتی تو میں اسے جواب دیتی۔

"تم تو ایسے رو رہی ہو جیسے پیدا ہوتے ہی ناشتا بنانا شروع کر دیا تھا۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" اس نے بھنا کر کہا۔ "دو گھنٹے کچن میں کھڑے کھڑے ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں۔"

"تو شروع سے کام کی عادت رکھتیں نا۔" میں کہہ کر فوراً کمرے سے نکل گئی ورنہ ایک جنگ شروع ہو جاتی۔ دوپہر کا کھانا امی اور دادی مل کر بناتی تھیں۔ میں کالج سے آتی تو کھانے کے برتن میرے منتظر ہوتے تھے۔ ان سے نمٹ کر کچن کی صفائی کرتی اور اس دوران میں بچوں کے آنے کا وقت ہو جاتا تھا۔ چار سے چھ بجے تک ان کو پڑھاتی اور اس کے بعد مجھے رات کی روٹیاں بنانا ہوتی تھیں۔ تقریباً تیس روٹیاں بنانا کتنا مشکل ہے یہ وہی جانتے ہیں جو اتنی روٹیاں بناتے ہیں۔ رات کے برتن اور کچن کی صفائی شازیہ کے فرض تھی۔ جب کہ میں اگلے روز کے لیے اپنے، ابو اور

معین الرحمن، ڈاکٹر سید

نقاد، محقق اور ماہر تعلیم۔ وہ بھٹنڈہ پٹیالہ بھارت میں حافظ سید امین الرحمن کے ہاں 1942ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات بہاول نگر سے، بی اے، ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات کراچی سے پاس کیے۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو سے 1972 میں غالبیات، کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ 1963ء تا 1964ء ریسرچ اسکالر ترقی اردو بورڈ کراچی اور 1964ء تا 1965 لیکچرار شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج بہاول نگر اور 1967ء تا 1973ء لیکچرار ایف سی کالج لاہور اور وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں 1974ء تا 1981 تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ان کی آخری تعیناتی گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوئی اور وہاں انہوں نے صدر شعبۂ اردو اور پنجابی پروفیسر صوفی تبسم چیئر اور ریسرچ جرنل کے مدیر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے۔ 1998ء میں انہیں حکومت پاکستان نے صدارتی ایوارڈ اور اعزاز فضیلت سے نوازا۔ اہم تصنیفات اور تالیفات کے نام یہ ہیں۔

(۱) اشاریۂ غالب (۲) غالب اور انقلاب ستاون (۳) متداول دیوان غالب (اردو) (۴) تحقیق غالب (۵) غالب کا علمی سرمایہ (۶) تحقیق اور تلاش غالبیات (۷) جاگیر غالب (پرتھوی چند) (۸) غزل، غالب اور حسرت (رشید احمد صدیقی) (۹) مطالب غیبی (غالب) (۱۰) نقوش غالب (۱۱) وقار غالب سید وقار عظیم (۱۲) غالب پیمائی (۱۳) تین اہم غالب شناس۔

مرسلہ: نسرین اختر، لاہور

بھائیوں کے کپڑے استری کرتی تھی۔ دس سے بارہ بجے تک پڑھتی تھی کیونکہ یہ بھی لازمی تھا۔ ورنہ پوزیشن کیسے آتی۔
بچوں کو پڑھا کر مجھے جو فیس ملتی تھی اس میں سے کچھ میں بچا کر محفوظ کر لیتی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر مجھے یونیورسٹی میں جانے کا موقع ملا تو میرے پاس کم سے کم ابتدائی اخراجات کے لیے تو رقم ہو گی اور مجھے ابو پر بوجھ ڈالنا نہیں پڑے گا۔ مجھے امید تھی کہ جب تک میں گریجویشن کروں گی میرے پاس خاصی رقم جمع ہو جائے گی۔ وقت گزرتا گیا، میں نے پارٹ ون میں کالج میں ٹاپ کیا۔ ابو خوش ہو گئے تھے انہوں نے مجھے وعدہ یاد دلایا۔
''تم سے کہا تھا کہ بی اے میں ٹاپ کرو گی؟''
''میری کوشش ہو گی ابو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ابو پھر مجھے یونیورسٹی جانے کی اجازت ہو گی نا؟''
''بیٹا جب میں نے ایک بار کہہ دیا تھا تو آپ بار بار کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' ابو نے کسی قدر خفگی سے کہا۔
''وہ ابو! امی اور دادی بالکل تیار نہیں ہیں۔'' میں نے اپنا خدشہ بیان کیا۔ ''وہ آپ کو منع کر دیں گی۔''
''وہ منع کر چکی ہیں۔'' ابو نے جواب دیا۔ ''لیکن فیصلہ مجھے کرنا ہے تم میری اولاد ہو۔''
میں خوشی ہو گئی تھی کیونکہ سال بھر سے میں اسی کشمکش میں تھی کہ نہ جانے ابو، امی اور دادی کی مخالفت کے سامنے کھڑے ہو پاتے ہیں یا نہیں۔ ''مجھے ڈر لگ رہا تھا ابو۔''
ابو نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''بیٹا آپ یونیورسٹی کیوں جانا چاہتی ہو؟''
''ابو مجھے وہاں کا ماحول اچھا لگتا ہے۔ ابو وہاں تعلیم کا معیار اچھا ہے اور پڑھانے والے بھی اچھے ہیں۔''
ابو مسکرائے۔ ''آپ نے اپنا تو ذکر کیا ہی نہیں آپ وہاں کیا کرنا چاہتی ہیں؟''
''ابو میں وہاں پڑھنا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے مجھے ملازمت تو کرنی نہیں ہے اس لیے آپ اسے میری خواہش سمجھ لیں۔''
''ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن بعض اوقات انسان جو سوچتا ہے وہ اس طرح سے پورا نہیں ہوتا ہے۔''
''ابو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بلکہ انسان جو سوچتا ہے وہ کبھی اس طرح پورا نہیں ہوتا ہے اس کے باوجود انسان جو چاہتا ہے وہ کرنے کی کوشش تو کرتا ہے۔''
''تمہاری سوچ بہت اچھی ہے بیٹے۔'' ابو خوش ہو کر بولے۔ ''تم جانتی ہو تمہاری امی اور دادی تمہارے یونیورسٹی جانے کی مخالفت کیوں کر رہی ہیں؟''
''جی ابو ان کے خیال میں یونیورسٹی کا ماحول لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہے اور ان کو ڈر ہے کہ وہاں کے ماحول کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہو جائے۔''
''ان کا ڈرنا ٹھیک ہے فوزیہ کیونکہ آج کل حالات اچھے نہیں ہیں خاص طور سے لڑکیوں کے لیے، لیکن مجھے آپ پر اعتماد ہے۔''
''میں کبھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔'' میں نے یقین سے کہا تھا۔
ابو نے میرا سر سہلایا۔ ''مجھے آپ سے بھی زیادہ یقین ہے۔'' اس وقت میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور میرے دل نے بے ساختہ کہا تھا کہ اللہ میری نہیں بلکہ میرے ابو کے یقین کی لاج رکھے گا۔

☆☆☆

وہ تقریباً پچاس برس کے بہت سوبر اور اچھے لگنے والے آدمی تھے۔ وہ کلاس میں داخل ہوئے تو پوری کلاس بے ساختہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ان کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ آج یونیورسٹی میں ہمارا پہلا دن تھا۔ میرا خیال تھا کہ نفسیات کے مضمون کی طرف لڑکے اور لڑکیاں کم آتے ہوں گے اور نیا بیج اتنا بڑا نہیں ہو گا۔ لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب مجھے پتا چلا کہ دو سو سے زیادہ طلبہ نے ماسٹر میں داخلے کے لیے اپلائی کیا تھا اور ان میں سے پچاس منتخب ہوئے تھے جن میں ایک نام میرا بھی تھا۔ بی اے میں اگرچہ میں کالج میں ٹاپ نہیں کر سکی تھی اور دوسرے نمبر پر آئی تھی۔ جب نتیجہ آیا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا اور میں رو رو کر پاگل ہو گئی تھی۔ امی اور دادی کو میری ذرا بھی پروا نہیں تھی اور وہ خوش تھیں کہ اب مجھے یونیورسٹی جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ خود میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن ابو کو شاید میری حالت پر ترس آ گیا اور انہوں نے ایک دن دفتر سے آنے کے بعد مجھے بلایا۔ میں اس وقت بھی اپنی قسمت پر رو دھو رہی تھی۔ آنکھیں صاف کر کے ابو کے پاس آئی۔ ''جی ابو؟''
''کیا ہوا آپ کی آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں؟''
''بس ایسے ہی ابو۔'' میں نے کہا۔
''مجھے پتا ہے آپ کو یونیورسٹی نہ جانے کا غم ہے۔''
''جی ابو۔'' میں رو دی تھی۔ ''شاید میری قسمت ہی خراب ہے۔''
''کس نے کہا ہے میری بیٹی کی قسمت خراب ہے۔''
ابو نے یونیورسٹی پراسپیکٹس سامنے کیا تو مجھے شادیٔ مرگ ہو گیا، کچھ دیر تو میں ایسے ساکت رہی کہ خود بھی شبہ ہوا کہ انتقال تو نہیں کر گئی ہوں۔ پھر چونکی اور روتی ہوئی ابو کے گلے لگ گئی۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔ ''پاگل اب کیوں رو رہی ہو؟''
اس کے بعد گھر میں کیا ہنگامہ ہوا اور دادی اور امی نے ابو کا یہ فیصلہ منسوخ کرانے کی کیا کیا کوشش نہیں کی، اس کی تفصیل میں جانا بے کار ہے قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں۔
بہرحال سارے مراحل طے کر کے آج یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ زیادہ تر طلبہ کا تعلق بڑے گھرانوں سے تھا جو شوقیہ نفسیات میں ماسٹر کرنے آئے تھے۔ لیکن یہ سب پڑھنے والے طلبہ تھے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہمارے استاد پروفیسر سید احمد رضا تھے۔ وہ اس شعبے کے سربراہ بھی تھے لیکن پہلے بیج کو خود پڑھاتے تھے۔ یہی وجہ تھی ہماری پہلی کلاس وہی لیتے۔ وہ میز کے پاس آئے اور اس سے ٹک کر بولے۔
''اسلام علیکم ڈیئر اسٹوڈنٹ آئی ایم احمد رضا۔''
''وعلیکم سر۔'' سب نے جواب دیا۔
''ممکن ہے آپ توقع کر رہے ہوں کہ میں نفسیات کا پروفیسر ہونے کے ناتے ذرا مختلف انداز میں آپ سے بات کروں گا لیکن میرے خیال میں نفسیات بہت سیدھی سی چیز ہے۔''
میرے ساتھ بیٹھی لڑکی شہلا نے ہاتھ اٹھایا۔ ''سر میں کچھ کہنا چاہتی ہوں؟''
''کہو۔'' پروفیسر احمد رضا بولے۔ ''میری کلاس میں کسی کو بولنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس وقت بھی جب میں بات کر رہا ہوں۔''
''سر مجھے یہ کہنا ہے کہ مجھے یہاں آ کر مایوسی ہوئی ہے۔ کیونکہ میں تو نفسیات کو خاص مضمون سمجھ کر آئی ہوں۔''
شہلا شوخ سی اور بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ گلابی رنگ اور تیکھے سے نین نقش جن کے ساتھ اس کا شولڈر کٹ ہیئر اسٹائل بہت جچ رہا تھا۔ لائٹ براؤن آنکھیں اور اسی رنگ کے بال تھے۔ اس نے بہت ماڈرن ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ کسی ہوئی جینز اور کچھ اسی طرح کی ٹی شرٹ تھی جس کی آستین اس کے شانوں سے کچھ ہی نیچے تھی۔ ظاہر ہے اس حلیے میں دوپٹے کا کوئی تکلف نہیں تھا۔ وہ اس کلاس میں واحد لڑکی تھی جو اس لباس میں تھی ورنہ باقی سب نے معقول قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ پروفیسر مسکرائے۔
''تب میں آپ سے ہمدردی کر سکتا ہوں۔ ویسے آدمی ہمیشہ اس شعبے کی طرف جاتا ہے جو اسے آسان لگتا ہے تو آپ کیوں اسے مشکل سمجھ کر آئی ہیں۔''
''کیونکہ میں مشکل پسند ہوں۔'' اس نے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔
''میں دعا کرتا ہوں کہ تمہاری مشکل کی امید پوری ہو جائے۔'' پروفیسر بولے۔ ''کیا خیال ہے اب تعارف نہ کرایا جائے۔''
باری باری سب اٹھ کر اپنا تعارف کرانے لگے تھے۔ اپنی باری پر میں نے اپنا تعارف کرایا۔ کیونکہ سب اپنا پس منظر بھی بتا رہے تھے اس لیے میں نے کہا۔ ''میرا نام فوزیہ کمال ہے۔''
''کمال ہی ہے۔'' پیچھے سے کوئی لڑکا بولا تو سب ہنس دیے تھے۔
''بھئی کمنٹس بعد میں۔'' پروفیسر احمد رضا بولے۔
''میرا تعلق ایک متوسط گھر سے ہے۔'' میں نے تعارف مکمل کرایا۔ اس وقت میں ذرا گھبرا گئی تھی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ میری جھجک نکل گئی۔ جیسا کہ یونیورسٹی میں قاعدہ ہے ہر لڑکا یا لڑکی کسی نہ کسی گروپ سے وابستہ ہوتا ہے۔ میرا بھی ایک گروپ بن گیا تھا جس میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ ہم سب کا تعلق مڈل یا اپر مڈل کلاس تھا۔ یعنی ہم میں کوئی ایلیٹ کلاس کا شامل نہیں تھا۔ لڑکے شاہد اور انور اچھی فطرت کے اور لڑکیوں کو صرف کلاس فیلو سمجھنے والے تھے اس لیے مجھے ان سے کبھی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ یونیورسٹی میں آنے سے پہلے میں نے کسی غیر لڑکے سے بات کرنے کا بھی نہیں سوچا تھا۔ لڑکیاں آشا اور دونیا تھیں۔ آشا ہندو تھی اور برہمن ہندو تھی اس کے باوجود وہ چھوت چھات کی قائل نہیں تھی۔ شروع میں ہم نے اس خیال سے کہ اس کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ لگے دوستی کے باوجود اس سے فاصلہ رکھا لیکن اس نے خود ہی فاصلہ چٹکیوں میں اڑا دیا۔ وہ ہمارے ساتھ کولڈ ڈرنک شیئر کر لیتی تھی اور کبھی کبھی تو گوشت کی بنی چیزیں جیسے قیمے والا سموسہ بھی کھا لیتی تھی۔ مزے کی بات تھی اس کے والد کٹر ہندو تھے اور چھوت چھات کے قائل تھے۔ اس نے ایک دن کہا۔ ''میرے بابا کسی مسلمان کے ہاتھ سے چھوئی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ایک بار مندر سے آتے ہوئے ان کی چھڑی ایک مسلمان سے چھو گئی تو انہوں نے اسے اسی وقت پھینک دیا۔''
''تب تو تمہیں ہم کو اچھوت سمجھنا چاہیے۔'' شاہد

نے شرارت سے کہا۔ ”وہ کیا کہتے ہیں تمہارا دھرم بھرم ہوجانا چاہیے۔“

”بھرشٹ۔“ آشا نے تصحیح کی۔ ”ممکن ہے میں بھی بابا کی طرح سوچتی تو ایسا ہی سمجھتی لیکن میں سمجھتی ہوں چیزوں سے زیادہ انسان کی اہمیت ہے۔ اس دن بابا چھڑی کے بغیر چلے آئے تو میں نے سوچا کہ کیا انسان لکڑی، جانور اور پتھر سے بھی زیادہ ناپاک ہوسکتا ہے۔ میرے اندر سے کسی نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ اس دنیا کو بنانے والا ان جسٹس نہیں کرسکتا تب میں نے سوچ لیا تھا کہ میں کسی کو اچھوت نہیں سمجھوں گی اور نہ ہی چھوت چھات کروں گی۔“

”ایکسی لینٹ۔“ شاہد نے داد دی۔ ”بالکل کسی اصلاحی انڈین مووی کے ڈائیلاگ لگتے ہیں۔“

آشا ہنس دی۔ ”بکتے رہو.... میں نے اصل بات بتا دی ہے۔“

شاہد اور آشا میں نوک جھوک چلتی رہتی تھی۔ آشا کا تعلق اندرونِ سندھ سے تھا اور وہ یہاں ہاسٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ شاہد کا جب موڈ ہوتا تو وہ اسے لے کر بیٹھ جاتا اور نت نئے طریقوں سے چھیڑتا تھا۔ کبھی کہتا کہ اسے شک ہے آشا برہمن نہیں ہے بلکہ کسی نچلی ذات سے ہے اور کبھی اسے سرے سے آشا کے ہندو ہونے پر شک ہوتا۔ آشا اسے برابر کا جواب دیتی تھی۔ لیکن اسے آشا کا خیال بھی تھا کیونکہ جب حالات خراب ہوتے تو وہ اسے ہاسٹل پہنچائے بغیر گھر نہیں جاتا تھا اس پر میں اور دونیا اسے چھیڑتے تھے کہ آشا کا اتنا خیال ہے اور ہمیں کبھی پوچھا بھی نہیں۔ اس پر وہ منہ بنا کر کہتا۔

”تم دونوں کو گھر پہنچا کر جواب میں تمہارے اباؤں اور بھائیوں سے جوتے نہیں کھانے ہیں۔“

”اچھا بہانہ ہے۔“ میں کہتی۔

کبھی کبھی ہمیں لگتا تھا کہ شاہد اور آشا کے درمیان .... پسند کا ایک ایسا رشتہ ہے جس سے وہ دونوں بھی بے خبر تھے۔ لیکن جب ہم ان کو الگ الگ کریدتے تو وہ یوں انجان نکلتے کہ پوچھنے والا خود شرمندہ ہوجاتا تھا۔ پہلا سمسٹر اسی طرح ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ لیکن ابو نے ٹھیک کہا تھا بہت ساری چیزوں کا اس وقت پتا چلتا ہے جب انسان ان کے قریب جاتا ہے۔ جب میں یونیورسٹی میں آئی تو مجھے پتا چلا یہاں وہ سب ویسا نہیں تھا جیسا کہ میں نے سوچا ہوا تھا۔ یہاں کے ماحول اور باہر کے ماحول میں بہت زیادہ فرق آگیا تھا جس سے ہم مڈل کلاس کی لڑکیاں مشکل سے عہدہ برآ ہو تی ہیں۔ میں نے دیکھا میرے طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں یونیورسٹی کے دروازے تک عبایا اور نقاب میں آتیں اور گیٹ کے اندر آتے ہی ان کا نقاب اترتا اور اپنے شعبے تک آتے آتے وہ عبایا اور قدامت کی دوسری نشانیوں سے بھی جان چھڑا چکی ہوتی تھیں اور ان کا میک اپ ہو چکا ہوتا تھا اور دوپٹا سر سے اتر کر بڑے سے ہینڈ بیگ میں عبایا اور نقاب کی طرح غائب ہوجاتا تھا۔ وہ نہ جانے کسے دھوکا دے رہی تھیں اپنے گھر والوں کو یا خود کو۔

میری خوش قسمتی کہ مجھے اچھے لوگ ملے تھے جو سادہ اور مخلص تھے۔ ہم میں کوئی دکھاوا یا دنیا داری والی بات نہیں تھی۔ اور بس یہی چند لوگ تھے جو دوسروں سے مختلف مزاج رکھتے تھے ورنہ باقی یا تو ایلیٹ کلاس کے تھے یا ان جیسا بننے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کو ہمارا گروپ ہضم نہیں ہوتا تھا اور وہ ہم سے الجھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن ہم انہیں منہ ہی نہیں لگاتے کیونکہ ہم یونیورسٹی پڑھنے آتے تھے۔ تمام کلاسیں لیتے تھے۔ سنجیدگی سے لیکچر سنتے اور نوٹ کرتے تھے۔ باقاعدگی سے لائبریری جاتے تھے اور اگر فارغ وقت ہوتا تو کینٹین چلے جاتے یا لان میں بیٹھ کر گپ شپ کرلیتے تھے۔ اس کا موقع بھی تین چار دن بعد جاکر کہیں ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کلاس سے دوسری کلاس میں جاتے ہوئے ہیلو ہائے ہوجاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب پہلا سمسٹر ہوا تو نتیجہ یہ نکلا کہ میں پہلے نمبر پر تھی اور شاہد دوسرے نمبر آیا تھا۔ ہمارا پورا گروپ پہلی دس پوزیشنوں میں موجود تھا۔

میں بہت خوش تھی کیونکہ میں نے کالج کے بعد یونیورسٹی میں بھی اپنا اعزاز برقرار رکھا تھا۔ جس دن نوٹس بورڈ پر رزلٹ آیا تو وہ بھی آئے ہوئے تھے جنہوں نے شاید ہی کبھی کلاسیں لی ہوں اور یوں نوٹس بورڈ کے سامنے جمع تھے جیسے پہلی دوسری پوزیشن کی امید لے کر آئے ہوں۔ آشا نے شاہد سے کہا۔ ”آج ٹریٹ تمہاری طرف سے ہوگی۔“

”واہ میری طرف سے کیوں فرسٹ تو فوزیہ آئی ہے۔ ویسے بھی کہتے ہیں لیڈیز فرسٹ۔“

”ہاں لیکن وہ لڑکی ہے اور دوسرے اس سے چھوٹی ٹریٹ نہیں لینی ہے۔ یہ فرسٹ آئی ہے۔“

”کوئی بڑی ٹریٹ نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جو کھانا ہے کینٹین میں کھالو۔“

”ٹھیک ہے پھر گفٹ بھی کینٹین والا ہی ملے گا۔“ انور بولا۔

”جی نہیں گفٹ ٹھیک ہونا چاہیے۔“

طے ہوا کہ آج شاہد ٹریٹ دے گا اور اگلے روز میں ٹریٹ دوں گی اور سب اسی طرح باری باری ٹریٹ دیں گے۔ ہم کینٹین میں بیٹھے تھے کہ شہلا بھی وہاں اپنے گروپ کے ساتھ آئی تھی۔ ہمارے پیچھے سب سے زیادہ ہاتھ دھو کر اسی کا گروپ پڑا رہتا تھا۔ لیکن آج ہم نے اس سے سارے بدلے لے لیے تھے کیونکہ سوائے شہلا کے سب ہی رہ گئے تھے۔ شہلا بھی مشکل سے پاس ہوئی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور نظر انداز کردیا کیونکہ وہ گھٹیا انداز میں شاہد اور انور کے حوالے سے ہم لڑکیوں پر باتیں کرچکی تھی اس کے بعد مجھے اس کی صورت سے نفرت ہوگئی تھی اور اس کا ذکر بھی مجھے گوارا نہیں تھا۔ اچانک میں نے اسے اپنے سر پر کھڑے دیکھا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے متوجہ پاکر وہ غرائی۔

”تم کیا سمجھتی ہو اس طرح سے پوزیشن حاصل کرکے تم نے کوئی تیر مارا ہے۔“

میں سمجھی وہ محنت کے حوالے سے بات کر رہی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں کمال تو اس وقت ہوتا جب میں دوسرے انداز میں پڑھ کر پوزیشن حاصل کرلیتی۔“

اس نے کہا تو اس کا لہجہ مزید زہریلا ہوگیا۔ ”میں اس کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم پروفیسر رضا سے کس طرح نمبر نکلواتی ہو۔“

ایک لمحے کو تو مجھے سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن جب سمجھ میں آیا تو میرا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور میں نے کھڑے ہوتے ہی شہلا کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ وہ تیار نہیں تھی اس لیے الٹ کر پیچھے جاگری۔ میرے ہاتھ میں اتنا زور تھا۔ اس پر ایک ہنگامہ شروع ہوگیا تھا۔ شہلا کا گروپ آگیا تھا اور میرے ساتھی بھی کھڑے ہوگئے تھے لیکن اس موقع پر وہاں موجود دوسرے طلبا درمیان میں آگئے اور شہلا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بکتی جھکتی وہاں سے چلی گئی تھی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے اپنا الزام نہیں دہرایا تھا۔ یعنی پروفیسر رضا کا نام نہیں لیا تھا۔ جب ذرا امن ہوا تو آشا نے غصے سے کہا۔ ”تم نے ٹھیک کیا اس گھٹیا لڑکی کے ساتھ۔“

میں خاموش رہی تھی۔ وہ سب باری باری میرے ساتھ اظہار ہمدردی کر رہے تھے اور شہلا کی مذمت کر رہے تھے جس نے میری ذات پر گھٹیا حملہ کیا تھا۔ اس کی یہ بات بالکل غلط تھی لیکن اس کی بات ایک لحاظ سے ٹھیک بھی تھی۔ میرا ذہن اتنا منتشر ہوا تھا کہ میں ان لوگوں سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی اور گھر جانے کے لیے باہر نکل آئی۔ بس میں بیٹھنے کے بعد میرے حواس کچھ ٹھکانے آئے تھے اور میں نے سوچا کہ جس بات کو میں خود سے بھی چھپاتی آئی تھی اس کو شہلا نے کس طرح جان لیا۔ یہ حقیقت تھی کہ جب میں نے پہلی بار پروفیسر احمد رضا کو دیکھا تھا تو ان سے متاثر ہوگئی تھی۔ لیکن اس وقت میں سمجھی کہ ایک استاد سے متاثر ہوں جس کی شخصیت بہت متاثر کن تھی اور اس سے متاثر ہونا کوئی اہم بات نہیں تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ یہ صرف ایک استاد سے متاثر ہونا نہیں تھا بلکہ احمد رضا نے مجھے دوسرے انداز میں متاثر کیا تھا جب مجھے یہ خیال آتا تو میں جان بوجھ کر اپنا ذہن کسی دوسری طرف لگالیتی تھی میں اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ دلچسپی جو محبت کا روپ دھار چکی تھی میرے اندر جڑ پکڑتی چلی گئی تھی اور میں اس کے آگے اتنی بے بس ہوگئی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کے بارے میں سوچنے لگ جاتی تھی۔ لیکن یہ سارا معاملہ بس سوچوں تک تھا۔ جو بات میں خود سے چھپاتی تھی وہ میں کسی اور سے کس طرح کرسکتی تھی۔ اب بس میں بیٹھی سوچ سوچ کر پاگل ہورہی تھی کہ شہلا کو کس طرح علم ہوا یا اس نے محض اپنا گھٹیا پن دکھایا تھا اس لیے بنا کچھ جانے یہ بات کرگئی تھی۔ لیکن نہیں میں نے اس کے لہجے میں ایک یقین محسوس کیا تھا جیسے وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس پر یقین رکھتی ہو۔ وہ کلاس میں عام طور سے میری برابر والی نشست پر بیٹھتی تھی۔ شعبے میں اصول تھا جو اسٹوڈنٹ جس سیٹ پر بیٹھ جاتا تھا بعد میں یہ جگہ اس کا حق بن جاتی تھی اور کوئی اسے وہاں سے اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے شہلا کو ازحد ناپسند کرنے کے باوجود میں اس جگہ سے اٹھنے کو نہیں کہہ سکی تھی پھر میرے دوسری طرف آشا بیٹھتی تھی اور میں اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔ کہیں اس نے ساتھ ہونے کی وجہ سے تو یہ بات نہیں جان لی تھی۔ میں نے احمقانہ انداز میں سوچا۔ اس روز مجھے اتنی ٹینشن ہوئی کہ گھر جاکر میں بیمار پڑ گئی تھی۔

امی اور دادی نے خوب لتے لیے کہ اور کرو اتنی محنت بیمار تو پڑنا تھا لیکن ابو خوش تھے کہ میں نے ان کے فیصلے کی لاج رکھ لی تھی اور میں ان سے آنکھ نہیں ملا پارہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا میں نے ابو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ بے شک میرا

ارادہ کبھی یہ نہیں رہا تھا کہ میں پروفیسر احمد رضا کی طرف بڑھوں یا ان کو اپنی طرف متوجہ کروں۔ اگر یہ محبت تھی تب بھی میں نے اسے اپنے سینے میں دفن رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے باوجود مجھے لگ رہا تھا کہ ابو نے مجھ پر جو اعتماد کیا تھا میں اس پر پوری نہیں اتری تھی۔ میں دو دن یونیورسٹی نہیں گئی تو پہلے آشا اور دونیا کا فون آیا اور تیسرے دن وہ خود مجھے دیکھنے چلی آئی تھیں۔ امی تو ان سے اچھے طریقے سے ملیں لیکن جب دادی امی کو پتا چلا کہ آشا ہندو ہے تو اٹھ کر ایسی گئیں کہ پھر نہ آئیں۔ ان کے اس طرح ہڑبڑا کر بھاگنے پر آشا نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اب ہم میں بھی ذات پات اور چھوت چھات کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔“

آشا نے ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اسے دادی کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا اور مجھے بھی دکھ ہوا تھا۔ حسبِ توقع ان لوگوں کے جاتے ہی دادی نے مجھے بلا لیا۔ ”کیوں بی بی تم یونیورسٹی اس لیے گئی تھیں کہ وہاں ہندو لڑکی سے دوستی لگاؤ۔“

”دادی، ہندو ہے تو کیا ہوا انسان بھی تو ہے اور ہمارے مذہب میں کسی سے میل جول منع نہیں ہے۔“

”وہ تو ہے۔“ انہوں نے کسی قدر لاجواب ہو کر کہا۔ ”لیکن ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا ٹھیک نہیں ہے۔“

مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے بحث کی تو ایک پینڈورا بکس کھل جائے گا جسے بند کرنے کا میرے پاس نہ وقت ہوگا اور نہ ہمت تو دفع بلیات کے لیے میں نے جھوٹ بول دیا۔ ”اس کا تو میں بہت خیال رکھتی ہوں۔“

”شکر ہے۔“ مزمل نے شرارت سے کہا۔ ”ورنہ تمہارا نہ سہی دادی کا دھرم ضرور بھرشٹ ہوجاتا۔“

”کیا... کیا بکواس کر رہا ہے لڑکے۔“ دادی نے جوتی اٹھالی اور یوں ایک مسئلہ ہنسی کے ساتھ ٹل گیا۔ چوتھے دن میری طبیعت تو ٹھیک نہیں تھی لیکن میں پھر بھی یونیورسٹی چلی گئی۔ شہلا والی بات کا اثر ختم ہوگیا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کے خیال میں اس میں سوائے بکواس اور شہلا کی ذہنی خباثت کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں بھی نارمل ہونے کا پوز کرتی رہی اور چند دن بعد پھر سے تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو سچ مچ نارمل ہوگئی تھی۔ لیکن جب پروفیسر احمد رضا کلاس لینے آتے تھے تو میرے دل کا چور بلاوجہ باہر نکل آتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ شہلا، آشا، دونیا، انور اور شاہد بہ غور میرے ردِعمل کا معائنہ کر رہے ہیں اور جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں کن نظروں سے پروفیسر کو دیکھ رہی ہوں۔ میری کیفیت عجیب سی ہوجاتی تھی اور میں ڈر کے مارے پروفیسر احمد رضا کی طرف دیکھتی ہی نہیں تھی بس سر جھکائے لیکچر سنتی رہتی تھی باوجود اس کے کہ میرا رُواں رُواں ان کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ ان کا ایک ایک لفظ میرے دل میں اتر رہا ہوتا تھا۔

لیکن یہ صرف میرا احساس تھا کوئی میری طرف توجہ نہیں دیتا تھا اور شہلا تو اکثر پروفیسر احمد رضا کی کلاس لیتی ہی نہیں تھی، وہ اپنی کلاس میں ہمیشہ نت نئے موضوع لاتے تھے۔ پھر ان کا بات کرنے کا انداز اور لہجہ ایسا ہوتا تھا کہ پڑھنے والے طلبا خود دلچسپی لینے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ اپنی دل کش اور باوقار شخصیت اور مہذب انداز سے وہ طلبا میں پہلے ہی مقبول تھے۔ خاص طور سے لڑکیوں میں۔ لیکن میں نے یا کسی اور نے کبھی ان کو اس چیز سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے نہیں دیکھا۔ ان کی شخصیت میں ویسے بھی سوفٹ نیس تھی لیکن لڑکیوں سے بہت ہی نرمی سے پیش آتے تھے۔ سب ان کی تعریف کرتے تھے اور جب کوئی ان کی تعریف کرتا تو نہ جانے مجھے کیوں بہت خوشی ہوتی تھی۔

ایک دن لیکچر کے دوران جب وہ انسانی احساسات پر بات کر رہے تھے تو انہوں نے اچانک سوال کیا۔ ”آپ کے خیال میں سب سے طاقت ور انسانی جذبہ کون سا ہے؟“

”سر کیا آپ اسے ٹاپک کر رہے ہیں؟“ آشا نے سوال کیا۔

”آپ چاہیں تو ٹاپک بھی کرسکتے ہیں؟“

”اس صورت میں سب کو اپنا خیال پیش کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے تو آپ سے ہی آغاز کرتے ہیں۔“ پروفیسر احمد رضا نے کہا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ میں ان کی کلاس میں بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ وجہ وہی تھی کہ کہیں کوئی میرے لہجے اور میرے چہرے کے بدلتے رنگوں سے کچھ جان نہ جائے۔ مگر اس روز لگ رہا تھا کہ میں پھنس گئی ہوں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا جب میری باری آئی اور میں کھڑی ہوئی تو میرے اندر کا سارا خوف ختم ہوگیا تھا میں نے مضبوط انداز میں کہا۔

”میرے خیال میں سب سے طاقت ور جذبہ نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کا ہوتا ہے۔“

پروفیسر احمد رضا نے چونک کر میری طرف

دیکھا۔ ”کیا مطلب مس کمال؟“

”سر محبت تو انسان خود سے کرتا ہے اور خوشی سے کرتا ہے۔ اس لیے یہ طاقت ور جذبہ نہیں ہوا۔ اصل جذبہ وہ ہے جب انسان نہ چاہے اور اسے پھر بھی کسی سے محبت ہوجائے۔“

”ایکسی لینٹ آپ نے بہت یونیک بات کی ہے۔“ پروفیسر احمد رضا تعریفی انداز میں بولے تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ ”اگرچہ کلاس کی اکثریت نے محبت کو ہی سب سے طاقت ور جذبہ کہا ہے لیکن میرے خیال میں مس کمال نے سب سے بہتر وضاحت کی ہے۔“

اس دن اتفاق سے شہلا موجود تھی اور جب پروفیسر احمد رضا نے میری تعریف کی تو اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ اس روز کے بعد سے میرے اندر کا خوف ختم ہوگیا اور اب میں پروفیسر احمد رضا کی کلاس میں پورے اعتماد سے بات کرنے لگی تھی۔ یہ بات سب نے ہی محسوس کی تھی۔ ایک دن آشا نے پوچھ لیا۔ ”کیا بات ہے آج کل تم پروفیسر احمد رضا کی کلاس میں زیادہ ہی نہیں بولنے لگی ہو۔“

”اچھا۔“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”واقعی ایسا ہی ہے؟“

”ہاں کیونکہ پہلے تم ان کی کلاس میں بالکل نہیں بولتی تھیں اور اب ان کی ہی کلاس میں بولتی ہو اور باقی کسی کلاس میں نہیں۔“

”شاید اس کی وجہ پروفیسر صاحب کی طرف سے لائے گئے ٹاپک ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں یہ تو ہے، وہ ٹاپک بہت اچھے لاتے ہیں ورنہ باقی تو بس روایتی لیکچر دیتے ہیں۔“ آشا قائل ہوگئی اور میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ورنہ میں ڈر گئی تھی کہ اس نے بھی تو محسوس نہیں کرلیا میرے دل کے چور کو۔ دوسرا سمسٹر قریب آرہا تھا۔ اس وجہ سے ہم سب ہی پڑھائی میں لگے ہوئے تھے۔ مجھے بعض نوٹس کے لیے لائبریری جانا تھا اور آشا یا دونیا میں سے کوئی میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی۔ وہ دونوں اگلی کلاس لینا چاہتی تھیں مجبوراً مجھے اکیلے ہی جانا پڑا تھا۔ لائبریری میں اس وقت سناٹا ہوتا تھا اس لیے مجھے جاتے ہوئے ڈر بھی لگتا تھا۔ بہر حال جانا تو تھا میں نے وہاں سے جا کر کتاب ایشو کرائی اور ریڈنگ روم میں جا کر اس سے نوٹس اتارنے لگی۔ کام مکمل کر کے میں باہر آئی تو سیڑھیوں پر مجھے شہلا نظر آئی۔ میں ٹھٹک گئی کیونکہ میں نے اسے کبھی لائبریری کے پاس بھی نہیں دیکھا تھا، سیڑھیوں پر دیکھنا الگ بات تھی۔ میں رکی تو وہ بھی رک گئی اور ایک کڑوی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”تیاری ہو رہی ہے اس بار بھی پوزیشن لانے کا ارادہ ہے؟“

میرا اسے جواب دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ ”حیرت ہے تم اور یہاں؟“ میں نے طنز کیا۔

”ایک بک لینی ہے۔“

”یہ تو اور بھی حیرت انگیز بات ہے۔“

”فکر مت کرو کورس بک نہیں ہے۔ ایک سائیکی ناول ہے۔“ وہ بولی اور اندر جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔

”شہلا مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔“

وہ رک گئی اور شرافت سے بولی۔ ”کرو۔“

”یہاں نہیں۔“ میں نے آس پاس آتے جاتے لوگوں کو دیکھا۔ پھر نزدیک لان کی طرف اشارہ کیا۔ ”آؤ وہاں چلتے ہیں۔“

اس بار بھی اس نے شرافت کا مظاہرہ کیا اور میرے ساتھ چلی آئی۔ یہاں کوئی اور نہیں تھا۔ ”ہاں بولو۔“

”شہلا اس دن تم نے کس وجہ سے مجھ پر الزام لگایا تھا؟“

”وہ الزام نہیں حقیقت ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”یہی تو میں جاننا چاہ رہی ہوں کہ اس کے پسِ پشت کیا بات ہے؟“

وہ سنجیدہ ہوگئی۔ ”تم جانتی ہو میں تمہارے برابر میں بیٹھتی ہوں اور کوئی نوٹ نہیں کرتا تھا لیکن میں نے نوٹ کیا تھا تم پروفیسر کو یوں دیکھتی تھیں جیسے وہ کوئی دیوتا ہو اور تم اس کی پجارن ہو۔“

میں اندر سے ہل گئی تھی، کیا واقعی میرے تاثرات اتنے واضح تھے یا شہلا مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”لیکن تم نے الزام لگایا تھا۔“

”اس وقت میں غصے میں تھی۔“

”غصے میں لیکن کیوں؟ میری کامیابی سے تمہیں غصہ کیوں آرہا تھا؟“

”یہ بات تم نہیں سمجھو گی۔“ وہ پُراسرار انداز میں بولی۔ ”شاید اس سمسٹر کے بعد تم مجھ سے پوچھو گی۔“

”کیا پوچھوں گی؟“

”یہ تم سمسٹر کے بعد خود جان جاؤ گی اور میرا ایک

مشورہ ہے اس احمقانہ محبت کو دل سے نکال دو یہ تمہیں سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں دے گی۔"

"بتانے کا شکریہ۔" میرا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ "دیکھتے ہیں سمسٹر کے بعد تم سے پوچھنے کی ضرورت پڑتی ہے یا نہیں۔"

میں نے کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہیں کیا تھا اور اس وقت اطمینان محسوس کیا جب شہلا بھی پہلے کی طرح رہی اس نے مجھ سے دوبارہ بات کرنے یا کسی سے اس ملاقات کا ذکر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دوسرا سمسٹر مشکل تھا اور پڑھائی کا بوجھ بڑھ گیا تھا اس لیے میں نے کچھ عرصے کے لیے ٹیوشن چھوڑ دی تھی اور اس کا وقت بھی پڑھائی کو دینے لگی تھی۔ اس بار میں نے پہلے سے زیادہ جان ماری تھی اور جب امتحان ہوئے تو ذرا سکون ملا تھا۔ پیپرز اتنے اچھے ہوئے تھے کہ مجھے یقین تھا کہ میں اس بار بھی ٹاپ کروں گی۔ رزلٹ والے دن جہاں دوسرے طلبا بوکھلائے ہوئے تھے میں بالکل پُرسکون تھی۔ سب سے پہلے شاہد نوٹس بورڈ تک پہنچا تھا اس وقت ہم راستے میں تھے۔ فوراً ہی وہ بھاگتا ہوا آیا اور چلا کر بولا۔ "ناقابل یقین۔"

"یعنی یہ بی بی پھر ٹاپ کر گئیں۔" انور نے آہ بھر کر کہا۔

"نہیں یار یہ بات نہیں' اس بار سب سے اوپر شہلا کا نام لکھا ہوا ہے۔" شاہد بولا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔"

کسی نے بھی اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا جب تک سب نے اپنی آنکھوں سے نوٹس بورڈ پر نہیں دیکھ لیا تھا واقعی وہاں شہلا کا نام ٹاپ پر تھا۔ آشا نے کہا۔ "ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔"

دونیا نے سر جھٹکا۔ "یہ ممکن ہی نہیں ہے۔"

اور مجھے شہلا کی بات یاد آرہی تھی کہ اس سمسٹر کے بعد تم مجھ سے پوچھو گی اور مجھے واقعی پوچھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ غائب تھی مزے کی بات تھی اس کے سوا سب ہی آئے ہوئے تھے۔ میرا نمبر دوسرا تھا اور باقی سب نے بھی پچھلے سمسٹر جیسی پوزیشنز حاصل کی تھیں لیکن پھر بھی اداس تھے۔ شاہد دفتر سے تصدیق کرنے گیا اور کچھ دیر بعد منہ لٹکائے واپس آ گیا۔ دفتر سے تصدیق ہو گئی تھی کہ شہلا نے واقعی ٹاپ کیا ہے اور اس معاملے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ کچھ دیر بعد ہم سب لان پر جمع تھے۔ انور نے گھاس پر مکا مارا۔ "یہ ممکن ہی نہیں ہے.... شہلا ایک دفعہ اور پیدا ہو جائے یا دس سال بھی اس شعبے میں پڑھتی رہے تب بھی یہ پوزیشن حاصل نہیں کر سکتی ہے۔"

"ضرور اس نے کوئی چکر چلایا ہے۔" دونیا بولی۔ "یاد نہیں پچھلی بار فوزیہ کے ٹاپ کرنے پر کس بری طرح تپ گئی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے کوئی دو نمبر کام کیا ہے۔" شاہد نے غور کیا۔ "بوٹی چلائی ہے۔"

"بکواس۔" میں نے کہا۔ "سب جانتے ہیں نقل کا کوئی چکر نہیں ہے اور اگر کوئی کرتا ہے تو چھپ نہیں سکتا۔"

"بی بی آج کل نقل کرنے کے جدید ترین طریقے آگئے ہیں۔" شاہد نے اسے گھورا۔ "اور خاص طور سے تم لڑکیوں کو بہت آسانی ہو گئی ہے۔ بالوں کے درمیان بلوٹوتھ اور ہینڈز فری لگایا اور چل میرا بھائی.... نقل شروع.... باہر بیٹھا کوئی بقراط پورا پرچہ حل کرا رہا ہے۔"

آشا نے منہ بنایا۔ "شہلا کے مختصر سے بال دیکھے ہیں ان میں پن بڑی مشکل سے ٹکتی ہے ہینڈ فری کہاں سے لگائے گی۔"

وہ سب آپس میں بات کر رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ شہلا نے کیا چکر چلایا ہے۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا سوائے شہلا کے اور وہ کسی کو کیوں بتانے لگی کہ وہ کس طرح ٹاپ پر آئی تھی۔ اس بات پر شعبے کا ایک فرد بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ شہلا نے پڑھ کر یہ پوزیشن حاصل کی ہے۔ بہر حال پچھلی پوزیشن کی وجہ سے مجموعی طور پر میں ہی سب سے آگے تھی۔ تیسرے سمسٹر کے لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں اس بار شہلا یا کسی کو بھی خود سے آگے نکلنے نہیں دوں گی۔ کچھ دن بعد شہلا سے سامنا ہوا اور اس نے متوقع نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں اس سے پوچھوں گی لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

شروع میں جب میں نے پروفیسر احمد رضا کے لیے دل میں پسندیدگی محسوس کی تو میں نے اسے ہمیشہ اپنے دل میں چھپا کر رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ میرے لیے اس فیصلے پر قائم رہنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے خیال آتا کہ ایسی محبت کا کیا فائدہ جب دوسرے فریق کو علم ہی نہ ہو کہ کوئی اس سے دل و جان سے محبت کرتا ہے۔ لیکن میں اس خیال کو کچل دیتی تھی۔ جب مجھے خیال آتا تو مجھے لگتا کہ میں ابو کے اعتماد کو مزید ٹھیس پہنچانے جا رہی ہوں۔ میں اپنی نظر میں ان کی مجرم بن گئی تھی لیکن اب ان کی نظر میں بھی مجرم بننے جا رہی تھی۔

تیسرے سمسٹر کا آغاز بہت مشکل تھا کیونکہ احمد رضا تقریباً روز ہی کلاس لیتے تھے اور جب وہ سامنے آتے تو دل جیسے بے قابو ہونے لگتا تھا۔ جتنی دیر وہ نظروں کے سامنے رہتے دھیان بس ان کی طرف رہتا اور ا... تو یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ پڑھا کیا رہے ہیں۔ میں نے ان کی کلاس میں بولنا ایک بار پھر چھوڑ دیا تھا۔ وہی پرانا خوف پھر ابھر آیا تھا کہ شاید مجھے خود پر قابو نہیں رہے گا اور دوسرے میری کیفیت جان جائیں گے۔ یہ بہت مشکل وقت ہوتا تھا اور میری خواہش تھی کہ کسی طرح تیزی سے گزر جایا کرے لیکن گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دوسروں نے شاید میری اس کیفیت کو محسوس کیا تھا یا نہیں لیکن آشا نے ضرور محسوس کر لیا تھا۔ اس نے ایک دن اکیلے میں پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے تم پروفیسر صاحب کی کلاس میں پھر پہلے کی طرح خاموش ہو گئی ہو۔"

"نہیں بولتی تو ہوں۔"

"نہیں نہ تو تم بولتی ہو اور نہ سنتی ہو بس سر جھکائے بیٹھی رہتی ہو۔" آشا نے مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ فوزی سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟"

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کوئی بات نہیں ہے۔"

"تم پریشان ہو کہیں پوزیشن کی ٹینشن تو نہیں لے لی ہے۔"

پوزیشن کا تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں خود سے جنگ کر رہی تھی اور انسان جب جنگ کی حالت میں ہو تو اسے کسی اور چیز کا خیال کہاں رہتا ہے۔ میں پڑھ رہی تھی لیکن پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی۔ بعض دفعہ تو دل کرتا تھا کہ ماسٹر چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں لیکن پھر یہ خوف روک دیتا کہ گھر والوں کو کیا جواب دوں گی کہ اچھی بھلی تعلیم کیوں چھوڑ دی۔ جیسے جیسے سمسٹر کا وقت قریب آرہا تھا میرا دل بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ خود کو جتنا سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی اتنا ہی بکھرتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ مر جاؤں۔ اگر میں اسی طرح بے قابو ہوتی رہی تو اپنے گھر والوں کے لیے بدنامی کا باعث بن جاؤں گی اور اس سے آسان مجھے مر جانا لگ رہا تھا۔

میرے کولیگز حیران تھے کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ ان کو لگ رہا تھا کہ میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے لیکن کیا گڑبڑ ہے یہ میں کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ ایک بار دونیا نے مذاق والے انداز میں کہا۔ "یار کہیں تمہیں محبت تو نہیں ہو گئی ہے؟"

"کس سے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بابا یہ پتا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتی۔"

"دونیا انسان کو کسی انسان سے محبت ہوتی ہے کوئی ہوا سے محبت نہیں کرتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے اینی وے میں مذاق کر رہی ہوں۔"

میں جانتی تھی کہ وہ مذاق کر رہی ہے اسی لیے میں نے اسے اتنی آسانی سے ٹال دیا۔ اگر وہ سچ مچ پوچھتی تو میرے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ ان دنوں سب ہی بری طرح کتابوں میں لگے ہوئے تھے۔ تیسرا سمسٹر سب سے مشکل ہوتا ہے اور آخری کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ آسان ہو جاتا ہے۔ پیپرز قریب آئے اور پھر ہو بھی گئے۔ میں نے جیسی تیاری کی تھی ویسے پیپرز دے دیے اور مجھے یقین تھا کہ ٹاپ کرنا تو دور کی بات ہے اس بار پہلے دس میں نام آجائے یہی بڑی بات ہو گی۔ پیپرز کے بعد چند دن کی مہلت تھی اور چھٹیاں تھیں۔ طلبا نہیں آتے تھے لیکن اساتذہ

اور دوسرا عملہ آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گھر میں بیٹھ کر میری بے چینی کم ہو جائے گی لیکن جب فارغ ہوئی تو بے کلی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ایک بار اس بے کلی سے بوکھلا کر میں نے گھر میں کہہ دیا۔

"بس اب میں مزید نہیں پڑھوں گی۔"

آنِ واحد میں یہ خبر پورے گھر میں پھیل گئی اور سب نے میرے ایسے لتّے لیے کہ بس۔ حد یہ کہ امی اور دادی نے بھی سنائیں کہ کہاں تو یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے مری جا رہی تھی اور کہاں گھر بیٹھنے کی بات کر رہی ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی کہ ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ میں گھر والوں کو کیا بتاتی کہ میں کس کیفیت سے گزر رہی ہوں۔ روز اندر سے مر مر کر جی رہی ہوں۔ ایک رات سونے کے لیے لیٹی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ آنسوؤں پر قابو نہیں تھا لیکن آوازیں روکنے کے لیے منہ میں دوپٹا ٹھونس لیا ورنہ شازیہ جاگ جاتی اور روتے دیکھ لیتی تو اس سے چھپانا ناممکن ہو جاتا۔ وہ بات کو کھود کر نکال لیتی ہے۔ اندر سے ایسی وحشت ابھری کہ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور جا نماز بچھا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اللہ کے سوا کوئی سہارا نظر نہیں آیا تھا۔ دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کی۔

"اے اللہ یہ بندی بہت گناہ گار ہے اس کے گھر والوں نے اس پر اعتماد کیا اور یہ ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے جا رہی ہے۔ یا اللہ اس کے گھر والوں کے اعتماد کی لاج رکھ لے۔"

یہ دعا مانگ کر دل بہت ہلکا ہوا تھا اور پھر لیٹی تو نیند بھی آ گئی۔ اگلی صبح میں یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہوئی شازیہ نے کہا۔ "ابھی تو چھٹیاں ہیں پھر کیوں جا رہی ہو؟"

"کچھ کام ہے لائبریری سے نوٹس بنانے ہیں۔" میں نے بہانہ کیا اور یونیورسٹی کے لیے روانہ ہو گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ آج وہاں کوئی نہیں آیا ہوگا۔ میں پھر بھی جا رہی تھی۔ پوائنٹ سے شعبے کی عمارت کے پاس اتری تو مجھے شہلا کی کار دکھائی دی تھی وہ آگے جا چکی تھی اور جب تک میں پیدل وہاں پہنچتی وہ کار پارکنگ میں کھڑی کر کے اندر جا چکی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی وہ تو کلاسز کے دنوں میں بھی مشکل سے آتی تھی تو اس وقت یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ دوسرے سمسٹر میں ٹاپ کرنے کے بعد بھی اس کا یہی وتیرہ رہا تھا۔ میں دفاتر والے حصے میں آئی۔ پروفیسر احمد رضا کا دفتر بھی یہیں تھا۔ میں بوجھل قدموں سے ان کے دفتر کے پاس پہنچی۔ میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ اب بھی وقت ہے پلٹ جاؤں لیکن میں پلٹ نہیں سکی۔ میں تو یہ بھی نہیں جان سکی تھی کہ یہاں کیوں آئی تھی اور کیا کرنے آئی تھی۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ اندر سے ایک مخصوص کھنکتی ہنسی کی آواز آئی۔ میں اس آواز کو پہچانتی تھی۔

"لڑکی تم بہت شریر ہو۔" پروفیسر کی آواز آئی اور ان کے لہجے میں ہلکا پن تھا۔ "پچھلی بار بھی تم نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔"

"تو اس بار بھی ہو جائیں۔" شہلا معنی خیز انداز میں بولی۔ "مجھے اس بار بھی ٹاپ پوزیشن چاہیے۔"

"اس بار یہ آسان نہیں ہے۔"

"آپ چاہیں تو آسان ہو جائے گا اور جو آپ چاہیں گے وہ میرے لیے آسان ہو جائے گا۔"

میں سن سی رہ گئی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ پروفیسر نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن ایک دن سے کام نہیں چلے گا تمہیں دو دن میرے گھر آنا ہوگا۔"

"آ جاؤں گی۔" شہلا بے شرمی سے ہنسی۔ "ٹاپ پوزیشن کے لیے آپ تین دن بلائیں تب بھی آؤں گی۔"

"بس تو آج پہلا دن ہے۔" پروفیسر نے اس طرح کہا کہ پھر مجھ میں مزید سننے کی تاب نہیں رہی تھی۔ اس لمحے میرا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ لیکن میں وہاں زمین پھٹنے کے انتظار میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ وہ دونوں کسی وقت بھی باہر آ سکتے تھے۔ ہاں واپس آتے ہوئے میں نے خود کو دل بھر کر سنائیں کہ اس شخص کے لیے میں مری جا رہی تھی اور اپنا کیریئر اور ماں باپ کی عزت خاک میں ملانے والی تھی۔ میں یقیناً اس قابل نہیں تھی کہ اللہ مجھے بچاتا وہ تو اللہ نے میرے گھر والوں کے اعتماد کی لاج رکھ لی تھی۔

❖